ترجمہ کے فن پر مستند مضامین کا انتخاب

تراجم کے مباحث

www.KitaboSunnat.com

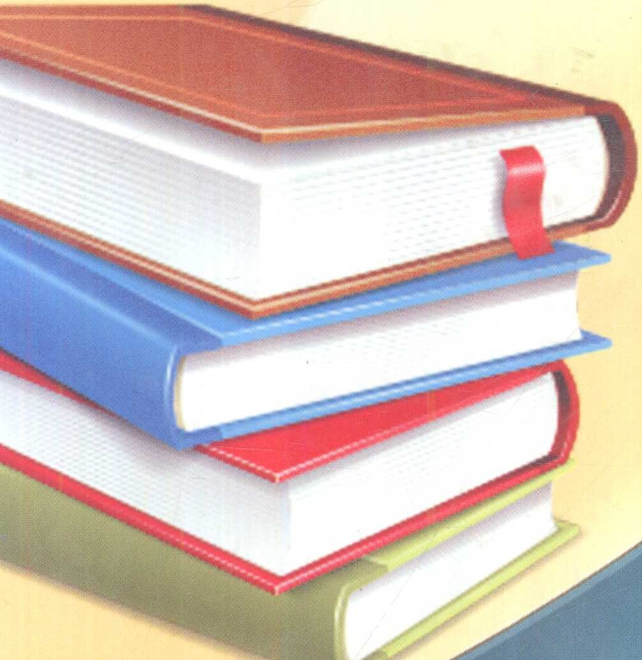

مرتب: محمد ابوبکر فاروقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کے فن پر مستند مضامین کا انتخاب

تراجم کے مباحث

مرتب: محمد ابو بکر فاروقی

CITY BOOK POINT
Naveed Square.Urdu Bazzar, Karachi
Ph # 021-32762483
E-Mail: citybookurdubazaar@gmail.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت ... معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے حوالے سے ... کی ہوں۔ اس ادارے سے ... شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری ... نہیں بلکہ تحقیق کی دنیا میں ... پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب ... اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ... ہیں ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے ... ادارے ہماری تحریری اجازت کے بغیر ہمارے ادارے کا نام ... اسناد ... ناشر ... طور پر اپنی کتابوں میں ... نام استعمال کرنے والے ... ہوگی اور ہمارا ادارہ بھی ہمارا نام استعمال کرنے والے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

... القیوم لائبریری
... ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: تراجم کے مباحث
مرتب: محمد ... فاروقی
ناشر: سٹی بک پوائنٹ
تعداد: 0
اشاعت: 2016ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترتیب

دیباچہ	ڈاکٹر امجد طفیل	6
پیش لفظ	محمد ابوبکر فاروقی	9
ترجمہ: تعریف، اہمیت اور ضرورت کے مباحث		
ترجمے کی ضرورت	پروفیسر جیلانی کامران	12
ترجمے کی ضرورت	انیس ناگی	18
ترجمہ کی اہمیت	خالد اقبال	23
ترجمہ کی اہمیت	شہباز حسین	28
ترجمہ کا تصور	خالد محمود خان	33
ترجمہ: اصول و مبادیات اور فنی مباحث		
فن ترجمہ کے اصولی مباحث	مظفر علی سید	37
ترجمے کے اصول	سید باقر حسین	46
ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن	ڈاکٹر سہیل احمد خان	53
فن ترجمہ کے اصول و مبادیات	سید غفران الجیلی	63
دور تراجم	حاجی احمد فخری	78
ترجمہ کا فن	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	91
ترجمہ نگاری: چند پہلو	احمد سہیل	125
ترجمہ کے بارے میں مختلف نظریے	خالد اقبال	133
منظوم ترجمے کا عمل	ڈاکٹر عنوان چشتی	149
مذہبی ترجمہ	ڈاکٹر فاخرہ نورین	161
غدار ترجمہ نگار	خالد محمود خان	172

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ: مسائل اور مشکلات کے مباحث

ترجمے کے بنیادی مسائل	ظ۔ انصاری	181
ترجمے کے چند پہلو (مذاکرہ)	سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالمجید سالک، ممتاز حسین	205
گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے	محمد حسن عسکری	213
ترجمے کے مسائل	ڈاکٹر جمیل جالبی	220
شاعری کا ترجمہ، چند عملی مسائل	ف۔ س۔ اعجاز	224
شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات	پروفیسر جیلانی کامران	235
آزاد اور لفظی ترجمہ	تھیوڈر سلوری/آصفہ جمیل	241
لفظی ترجمہ	خالد محمود خان	249

ترجمہ: روایت کے مباحث

اردو میں ترجمے کی روایت	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	260
اردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب	سید احتشام حسین	275
سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم	ڈاکٹر اصغر عباس	280
مذہبی تصنیفات کے اردو تراجم	ڈاکٹر عبدالحق	292
اردو میں بچوں کے ادب کے تراجم	ڈاکٹر اطہر پرویز	310
مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ	عبدالقادر سروری	320
دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی	سید ضمیر حسن	335

ترجمہ: اصطلاحات کے مباحث

تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل	آل احمد سرور	343
اصول وضع اصطلاحات	وحید الدین سلیم	355
اردو میں وضع اصطلاحات کے مسائل	میر حسن	362

ترجمہ: لسانی و ساختیاتی مباحث

فنِ ترجمہ کا لسانیات سے تعلق	خالد اقبال	371
ترجمے کا ساختیاتی نظریہ	احمد سہیل	387
بین متنیت اور ترجمہ	ڈاکٹر فاخرہ نورین	402

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتساب

ماں جی، چھوٹے بھائی عثمان علی، بہنوں،

ماریہ اور امامہ کے نام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیباچہ

انسانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ تہذیبوں نے ایک دوسرے سے افکار، تصورات اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ اخذ وقبول کئے ہیں۔ یہ عمل بنیادی طور پر لسانی سرگرمی تھی لوگ ایک دوسرے کی زبان سیکھتے، زبان سیکھنے کے عمل کے دوران وہ ایک دوسرے کی ثقافت سے شناسائی حاصل کرتے ایک دوسرے کے طرز زندگی میں وہ باتیں جو ان کے اپنے مزاج کے مطابق ہوتیں قبول کرتے۔ یوں تہذیب وثقافت کا سلسلہ آگے بڑھا۔ انسانی ثقافت اور علم کی ترقی کسی ایک قوم یا خطے کی مرہون منت نہیں۔ ہم آج جس مقام پر کھڑے ہیں اس میں تمام اقوام کا حصہ ہے کسی کا کم کسی کا زیادہ۔

تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی ایک صورت ترجمہ بھی ہے ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس نے انسانی علم اور تہذیب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس فن کے ذریعے انسانوں نے ایک دوسرے کے تجربات سے سیکھا، انسانی ذہن نے جو کچھ تخلیق کیا تھا اس سے حظ اٹھایا۔ انسانی تخیل کی جولانیوں نے جن عالموں کی سیر کی تھی انکی سیاحت بذریعہ ترجمہ کی۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، یونانی فکر سے زمانہ حال تک کا سفر تو سب کے سامنے ہے۔ یونانی علوم وفنون لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئے۔ لاطینی سے یہ عربی زبان میں منتقل ہوئے۔ عربی سے پھر لاطینی میں، جہاں سے یورپ کی دیگر زبانوں میں جرمن، فرانسیسی، انگریزی میں اور اب جب انگریزی زبان علم وفن کی سب سے بڑی زبان ہے تو اس سے ساری دنیا کی زبانوں میں تراجم ہورہے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ عمل یکطرفہ نہیں ساری دنیا کی زبانوں سے بھی علم وادب کی کتابیں ترجمہ ہو رہی ہیں یوں انگریزی زبان کی حیثیت اس وقت عالمی زبان رابطہ (Lango Frank) کی ہے۔

ترجمہ ایک فن ہے اور اس کے اصول وضوابط پوری طرح منضبط شکل میں موجود ہیں۔ اگرچہ اچھے ترجمہ کے حوالے سے ماہرین کے درمیان اختلاف موجود ہے لیکن اس کے باوجود موٹی موٹی باتوں پر کم وبیش اتفاق پایا جاتا ہے اصل متن اور ترجمہ شدہ متن ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں اور کتنا دور اس سے ہی ترجمہ کے اچھے ہونے یا خراب ہونے کا تعین کیا جاتا ہے۔

علمی متن کے ترجمے اور ادبی متن کے ترجمے میں بھی فرق کیا جاتا ہے جہاں تک علمی اور سائنسی متون کے ترجمے کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلق ہے تو اس میں چونکہ ان متون کی زبان سادہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اس لیے ترجمہ شدہ متن ،اصل کے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اعلیٰ کام ہے۔ چونکہ علمی متون میں بہت سی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں اس لیے ان کے ترجمے میں اختلاف موجود ہے۔ ماہرین کا ایک گروہ اس خیال کا حامل ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کی بجائے ان کو اصل بمطابق نقل اپنی زبان میں شامل کر لینا چاہیے جبکہ ماہرین کا دوسرا گروہ اس بات کو بہتر جانتا ہے کہ اصطلاحات کو مقامی زبان میں ڈھالا جائے تا کہ مقامی زبان میں اضافہ ہو اس بارے میں حتمی رائے دینا تو مشکل ہے لیکن میں ذاتی طور پر اصطلاحات کے ترجمے کو بہتر جانتا ہوں۔

جہاں تک تخلیقی اور شعری متون کے ترجمے کا تعلق ہے تو یہاں بات چونکہ تخلیقی تجربے کو گرفت میں لینے کی ہے تو لسان کی حدود آڑے آتی ہیں اور کم وبیش ہر زبان اس معاملے میں کوتاہ دکھائی دیتی ہے کہ وہ کسی دوسری زبان کے شعروادب کو من وعن اپنے دائرے میں شامل کر سکے۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجسم متن، سادہ زبان اور مجسم خیالات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے۔ جبکہ مجرد لسانی متن کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ ادب میں بھی چونکہ شاعری سب سے زیادہ مجرد ہوتی ہے اور اس میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال بہت ہوتا ہے اس لیے شاعری کا اچھا ترجمہ سب سے مشکل خیال کیا جاتا ہے۔

ترجمے میں زبانوں کی قربت اور دوری بھی کم ہے۔ وہ زبانیں جو اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں ان میں ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے جیسا کہ عربی، فارسی، پنجابی، ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ کرنا یا اردو سے ان زبانوں میں ترجمہ کرنا۔ مگر وہ زبانیں جو اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں ان میں ترجمہ کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے جیسے یورپی زبانوں سے اردو میں یا اردو سے یورپی زبانوں میں ترجمہ کرنا۔

اردو زبان اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ اس میں ترجمہ کرنے کی روایت کوئی تین سو سال پرانی ہے۔ ابتدائی ترجمے مذہبی متون کے تھے یا پھر قصے اور داستانیں؛ اس کے بعد شاعری اور علمی متون کو ترجمہ کرنے کا آغاز ہوا۔ اردو میں ترجمہ نگاری کا باقاعدہ آغاز تو رائل سوسائٹی کلکتہ اور فورٹ ولیم کالج سے ہوا اسی طرح دہلی کالج بھی علمی متون کے ترجمے کا اہم مرکز بنا اس کے بعد دارالترجمہ حیدرآباد دکن کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جہاں جامعہ عثمانیہ کے لیے جدید علوم وفنون کی کتب کے ترجمے کروائے گئے۔ ان میں سے بہت سی ترجمہ کردہ کتابیں آج بھی دستیاب ہیں اور اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اردو زبان میں فلسفیانہ اور سائنسی مطالب کو ادا کرنے کی کیسی عمدہ صلاحیت موجود ہے۔

پاکستان میں ابتدائی طور پر جامعات کے ساتھ ترجمہ کرنے کے ادارے بنائے جاتے تھے جیسے جامعہ پنجاب اور جامعہ کراچی میں یہ ادارے اب بھی موجود ہیں لیکن پھر اکیسویں صدی کے آغاز میں تعلیم کو انگریزی میں منتقل کر دیا گیا جس سے اردو میں علمی متون کے ترجمے کا کام بہت کم ہو گیا۔ جدید علوم کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے میں ہم "اردو سائنس بورڈ" کے کام کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے لیکن جب زمانے کا چلن بدلتا ہے تو پھر بہت کچھ بدلتا ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ ہم ساری قوم کو انگریزی پڑھانا چاہتے ہیں ہماری اشرافیہ کے تعلیمی منصوبوں میں اردو کی کوئی جگہ نہیں۔

جہاں تک ادبی وشعری متون کے ترجمے کا تعلق ہے تو یہ کام ہمارے ہاں بہت اچھے انداز میں جاری ہے۔ ہم خوش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قسمت ہیں کہ ہمارے عہد میں محمد سلیم الرحمٰن ،محمد حمید شاہد ،اجمل کمال ،فاروق خالد اور بہت سے دیگر اچھا ترجمہ کرنے والے اصحاب موجود ہیں جنھوں نے زمانہ حال میں بہت سے ہم ناولوں ،افسانوں اور شعری متون کو اردو میں نہایت عمدگی سے منتقل کیا ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ترجمہ نگاری ایک فن ہے ہمارے ہاں لوگ اس فن کو اپنی کاوش یا کسی ترجمہ کرنے والے کی ذاتی تربیت سے سیکھتے ہیں ۔ترجمہ کرنے کا فن سکھانے کا کوئی باقاعدہ ادارہ موجود نہیں رہا۔سوائے اس کے کہ چند سال پہلے گجرات یونیورسٹی نے ترجمہ کا ایک ادارہ قائم کیا ہے۔اسی طرح ترجمے کے فن کے بارے میں کتب بھی دستیاب ہیں ۔بہت سے لوگوں نے ترجمہ کرنے کے اصول وضوابط سے متعلق مضامین تو تحریر کیے ہیں مگر ایک پوری کتاب فن ترجمہ نگاری پر اردو زبان میں شاید ہی دستیاب ہو۔

اب ہمارے لکھنے والوں نے اس سمت بھی توجہ دینا شروع کی ہے آغاز فن ترجمہ پر شائع ہونے والے مضامین کو مرتب کرنے سے ہوا ہے اس میں پہلی کاوش صفدر رشید کی ہے جنھوں نے تقریباً ۲۴ مضامین کو "فن ترجمہ کاری" کے عنوان سے شائع کیا ہے اور اب جناب ابوبکر فاروقی نے "تراجم کے مباحث" کے عنوان سے بقول مرتب "ترجمہ کے فن پر مستند مضامین کا انتخاب" کیا ہے۔

مرتب نے ان ۳۸ مضامین کو ذیلی فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ابوبکر فاروقی نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں ترجمے کی ضرورت ،اہمیت ترجمہ کے اصول ومبادیات اور فنی مباحث ،ترجمہ کے مسائل اور مشکلات کے مباحث ،ترجمہ روایت کے مباحث ،ترجمہ: اصطلاحات کے مباحث کے عنوانات سے مضامین کو مرتب کیا ہے جس سے پڑھنے والے کے لیے سہولت ہو جاتی ہے کہ فن ترجمہ کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ پڑھ سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں اردو کے اہم مترجمین کے مضامین شامل ہیں ۔ان میں محمد حسن عسکری ،مظفر علی سید ،جیلانی کامران سے لے کر ممتاز حسین ،احتشام حسین ،عبدالمجید سالک ،اور ظ۔انصاری کے ساتھ ساتھ سہیل احمد خاں ،اور انیس ناگی جیسے لکھنے والوں کے مضامین بھی شامل ہیں ۔خود میری یادداشت میں جو فن ترجمہ نگاری کے حوالے سے مضامین آتے تھے وہ کم وبیش سارے کے سارے زیر نظر کتاب میں یکجا کر دئے گئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے قاری کو فن ترجمہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گا اور یہی اس کتاب کی کامیابی ہے۔

محمد ابوبکر فاروقی نے اس کتاب کو محنت سے مرتب کیا اور مضامین کی ترتیب میں بھی سلیقہ سے کام لیا ہے۔اس سے انداز ہوتا ہے کہ علم وادب کے ساتھ ان کی وابستگی سنجیدہ نوعیت کی ہے ان میں جستجو کا مادہ موجود ہے ان میں کام کرنے کی لگن بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ مزید ایسے تالیفی کام کریں گے اور قارئین سے داد تحسین وصول کریں گے۔

امجد طفیل

۱۶ جون ۲۰۱۶ء

سوات ،کالام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

ایک گھر میں بطور مہمان جانا ہوا، ابھی نشست پر براجمان ہی ہوا تھا کہ دو بچوں نے سامنے شرارتوں کے انبار لگا دیے جب ماں کی ایک خاص نظر بچوں پر پڑی تو قصہ تمام ہوگیا۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیسا ممکن ہوا وہ کونسی زبان تھی جس نے بچوں کو شرارتوں سے محروم کیا اور سنجیدگی پر مجبور کیا۔ حالانکہ بچوں کی ماں نے زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کیا اصل میں ماں کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر بچوں نے فوراً ترجمہ کیا کہ ایسے تاثرات اور دیکھنے کا مطلب ہے آرام سے بیٹھ جاؤ ورنہ دھلائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ترجمہ کے متعلق اس واقعہ نے میری مشکل آسان کر دی کہ تراجم محض زبانوں کے نہیں ہوتے بلکہ چہروں، ہاتھوں، ٹانگوں، تاثرات اور لہجوں کے بھی ہوتے ہیں ور تراجم کا آغاز یہاں سے ہی ہوتا ہے۔

ایک بات بہت تلخ کہی تھی اس نے
بات تو یاد نہیں یاد ہے لہجہ اس کا

باتیں بھول جاتی ہیں لیکن لہجوں کے ذریعے کئے گئے تراجم یاد رہتے ہیں۔ ایک عرصہ تک تراجم اور مترجمین کو برا بھلا کہا جاتا رہا۔ آج بھی کہیں کہیں ایسی صورتحال موجود ہے لیکن میرے خیال کے مطابق ترجمہ زندگی ہے۔ ترجمہ اور زندگی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایک انسان دوسرے کو سمجھ نہیں سکتا تو زندگی ختم ہو جاتی ہے، آج اگر دنیا گلوبل ویلج ہے تو اس میں تراجم کا بہت اہم کردار ہے۔ ترجمہ کے ذریعے انسان نے ایک دوسرے کو پہنچانا ایک دوسرے کی تہذیب کو جانا ہے اور ایک دوسرے سے تعلق استوار کیے ہیں۔ آج اگر ہم ہومر، بقراط، سقراط، افلاطون، ارسطو، لانجائینس وغیرہ کے نظریات و افکار سے آشنا ہیں تو یہ ترجمہ کی ہی مہربانیاں ہیں۔ عہد مسلم میں بھی خوب تراجم کیے گئے باقاعدہ مترجمین کے لیے عہدے تھے مسلمانوں کی لازوال ترقی کی بنیاد تراجم ہی تھے۔ پھر نشاۃ ثانیہ کا دور آتا ہے اور یورپ دنیا پر غالب آگیا اس کامیابی کے پیچھے بھی مسلمانوں کی لاکھوں کتب تراجم تھے۔ تب سے لے کر آج تک اہل مغرب تراجم کی بدولت دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مغرب میں مترجمین کے لیے سہولیات فراہم کی جاتی ہیں اور ان کی باقاعدہ تربیت کی جاتی ہے۔ مغربی ممالک میں حکومتی سطح پر اقدامات کیے جاتے ہیں اور جامعات میں باقاعدہ شعبہ جات قائم ہیں۔ ہمارے ہاں نہ تو قومی سطح پر ترجمہ نگاری کے حوالے سے کوئی خاص اقدامات کیے جا رہے ہیں اور نہ ہی جامعات اس طرف توجہ دے رہی ہیں پاکستان میں درجنوں بڑی بڑی جامعات موجود ہیں لیکن یونیورسٹی آف گجرات کے علاوہ کہیں بھی باقاعدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹرانسلیشن سٹڈیز کا شعبہ قائم نہیں کیا گیا۔ میرے بات کرنے کا صرف یہ مقصد ہے اگر ہم ادب اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہم سب کو آنے والی نسلوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنی ہونگی۔ مختلف تہذیبوں اور جدید نظریات پہ بھی ہزاروں کتب منتظر ہیں کہ ان کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اور ہمارے ہاں ایسے شاہکار موجود ہیں جن کا اردو سے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا باقی ہے۔ حکومتی سطح پر اس طرف توجہ دی جائے تو ہم اور ہمارے طلبہ کسی سے کم نہیں ہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

کچھ روز قبل محترم صفدر رشید صاحب کی مرتب کردہ کتاب "فن ترجمہ کاری" نظروں سے گزری، جس میں تقریباً ۴۴ مضامین شامل ہیں، اس کتاب میں مایہ ناز شخصیات کے مقالہ جات کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ ایک معیاری اور بہترین انتخاب ہے۔ ہماری جامعات میں ایم فل لیول پر ترجمہ کا پرچہ پڑھایا جارہا ہے طلبہ کی راہنمائی کے لیے یہ کتاب معاون ہے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ جو اہم اور نایاب مقالہ جات باقی رہ گئے ہیں ان کو مرتب کر دیا جائے تاکہ ایم فل کے طلبہ مستفید ہوسکیں۔

زیر نظر کتاب "تراجم کے مباحث" میں پروفیسر جیلانی کامران، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، آل احمد سرور، مظفر علی سید، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، محمد حسن عسکری، سید باقر حسین، انیس ناگی، ڈاکٹر ظ انصاری، سید غفران الجیلانی، خالد محمود خان، خالد اقبال، وحید الدین سلیم، آصفہ جمیل، ڈاکٹر امیر عارفی، سید ضمیر حسن، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر عبدالحق، ف س اعجاز، ڈاکٹر اصغر عباس، شہباز حسین، پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر اطہر پرویز، سید احتشام حسین، میر حسن، احمد سہیل اور ڈاکٹر فاخرہ نورین جیسی عظیم شخصیات کے نایاب مقالہ جات شامل ہیں۔ یہ مضامین کچھ صاحبان کی مرتب کردہ کتب میں شامل ہیں لیکن وہ کتب آج میسر نہیں ہیں طلبہ کی سہولت کے لیے نایاب کتب سے استفادہ کر کے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بھی بتا دیا جائے کہ مقالات کو موضوعاتی حوالے سے ترتیب دیا گیا ہے لہٰذا اس ترتیب کے پیش نظر کچھ جگہوں پر بزرگ لکھنے والوں کے مقالات نئے لکھنے والوں کے بعد لانا پڑے، جس کے لیے ہم اُن ادیبوں سے معذرت خواہ ہیں۔

اپنے اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر مختار احمد عزمی صاحب، پروفیسر ڈاکٹر مظفر عباس صاحب، پروفیسر ڈاکٹر ضیاالحسن صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے گاہے گاہے میری حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر امجد طفیل صاحب کا بھی شکر گزار ہوں اور اپنے نہایت عزیز رہبر دوست پروفیسر ایم خالد فیاض صاحب کا ممنون ہوں جو ہر پل میری راہنمائی کرتے ہیں۔ اپنی والدہ ماجدہ کو سلام پیش کرتا ہوں جو میری ہر مشکل کو آسانی میں بدل دیتی ہیں، جس کی بدولت میں کچھ کرنے کے اہل ہوتا ہوں۔

میں امید کرتا ہوں میرے اس کام سے طلبہ بھرپور فائدہ اٹھائیں گے اور ادبی و علمی کاموں کی طرف توجہ کرتے ہوئے اپنا کردار بھی ادا کریں گے۔

محمد ابوبکر فاروقی

لیکچرار (اردو)

یونیورسٹی آف گجرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ: تعریف، اہمیت اور ضرورت کے مباحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کی ضرورت

پروفیسر جیلانی کامران

'ترجمے کی ضرورت'۔ اس موضوع کے ساتھ ہی میرا ذہن شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور جو سوال اُٹھتا ہے یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر کو قرآن کریم اردو میں ترجمہ کرنے کی کیوں ضرورت پڑی تھی۔ بات شاہ عبدالقادر ہی پر ختم نہیں ہوتی۔ اُن سے پہلے یورپی مشنریوں نے بائبل کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اور کچھ یوں لگتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عیسائی مشنریوں اور شاہ عبدالقادر، دونوں کا ترجمے کے بارے میں مقصد اور نقطہ نظر یکساں تھا اور وہ ایک عام آدمی تک خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کے مفہوم اور پیغام کا پہنچانا تھا۔ جسے بعض مشکلات کے باعث عام آدمی جاننے اور جان کر محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ کیوں کہ قرآن کریم کی زبان عربی تھی (اور ہے) اور وہ بائبل جسے یورپی مشنری ترجمہ کر کے پھیلانا چاہتے تھے بعض اوقات ڈچ زبان اور عموماً انگریزی میں دستیاب ہوتی تھی۔ ترجمے کی ایسی ضرورت جو اس ضمن میں نظر آتی ہے خالصتاً مذہبی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت کا ذمہ لیتی ہے۔ لیکن جب ہم تاریخ کی کتابوں میں عباسیوں کے زمانے کے تراجم کا ذکر پڑھتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ سریانی، یونانی اور سنسکرت زبانوں کا علم اور فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا تھا تو پھر وہی سوال اُٹھتا ہے کہ عباسی دور کے عالموں کو پرانی کتابوں اور علوم کو عربی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی تھی۔ اور یہی سوال اُن کتابوں کے بارے میں بھی اُٹھتا ہے جنہیں مغلیہ دور کے عالم فارسی میں ترجمہ کرتے تھے۔ ترجمے کی ایسی ضرورت خالصتاً علمی تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے اور انسانی ذہن کی نشو و نما کا باعث بنتی ہے۔

اس صداقت کو سب مانتے ہیں کہ ترجمے کا عمل اُس وقت تک کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک کہ مقابلے میں کوئی دوسری زبان نہ ہو۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں لوگ ایک لسانی وحدت ہوں وہاں ترجمے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جب تک دو لسانی وحدتیں باہم سامنے نہ ہوں اور دونوں کے درمیان رابطہ نہ ہو، ترجمے کا عمل ظاہر نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوسکتا۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ زبانیں لفظوں سے مل کر اور لفظوں کے مجموعے سے بنتی ہیں۔ اور غالباً کوئی بھی لفظ ایسا نہیں ہے جس کا مطلب یا معنی نہ ہو۔ اس لیے جب دو لسانی وحدتیں باہم عمل پیرا ہوتی ہیں تو نہ صرف متاثر ہونے والی زبان کے الفاظ ہی اس عمل میں شریک ہوتے ہیں بلکہ اُس زبان اور لسانی وحدت کے معانی بھی دوسری زبان میں منتقل ہونے لگتے ہیں۔ ایک سطح پر ترجمے کا عمل متاثر ہونے والی زبان کے ذخیروں کو آزماتا ہے۔ اور دوسری سطح پر اُس لسانی وحدت کے علمی اور ثقافتی تصورات میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ اس طرح ترجمے کے عمل کے ساتھ قوموں کی علمی تاریخ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ اور ان کی زبانیں اُس علمی تاریخ کو محفوظ کرتے ہوئے وہ تمام منزلیں بھی طے کرتی ہیں جنہیں ہم بچپن، بلوغت اور جوانی کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ اور جب زبانیں پختہ ہوجاتی ہیں اُس وقت وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ذہنی اور علمی پختگی کو قائم کرنے میں معاون بھی ثابت ہوتی ہیں۔

ترجمے کے عمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک عجیب بات دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ غیر ادبی تصانیف کا ترجمہ دراصل ایک زبان کی لسانی موت سے پیدا ہوتا ہے اور دوسری زبان کی لسانی افزائش کا باعث بنتا ہے۔ ''لسانی موت'' کی ترکیب قابل غور ہے۔ میں نے اسے استعارۃً استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ ہم جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اُس کے الفاظ ہمیں عزیز نہیں ہوتے۔ اور نہ ہمیں اُس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ ہمیں لفظوں کی شکل وصورت، اُن کے تلفظ، اور اُن کے حسن اور موسیقی سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ دل چسپی ہوتی ہے تو صرف اُس شے سے جو لفظوں کا لباس پہنے لفظوں کے پرے کسی طلسمی راز کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ ہم اُسے برآمد کرنے اور اپنی زبان میں کامیابی اور ایمان داری سے منتقل کرنے کے لیے الفاظ کے سب ناطے اور اصل زبان کے سلسلے فراموش کردیتے ہیں۔ اور یوں سمجھتے ہیں کہ اصل زبان مرچکی ہے اور ہم اُس کے جادو سے اپنی زبان کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ کے لوگ ارسطو اور افلاطون کو اصل یونانی میں پڑھتے تھے لیکن ترجمے کے ساتھ ہی ارسطو اور افلاطون یورپی قومی زبانوں میں دوبارہ جی اُٹھتے ہیں۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ارسطو کی شعریت پڑھنے کے لیے اصل یونانی کی طرف جاتا ہو۔ سب کے سب ارسطو کا نام سنتے ہیں، بوچر اور انگرم بائیواٹر ہی تک پہنچتے ہیں۔ اور یہاں جس ارسطو سے متعارف ہوتے ہیں وہ زندہ ارسطو ہے جو یونانی زبان کے ارسطو کی وفات سے رونما ہوا ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم ترجمے کی ضرورت پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ترجمے کے عمل کے ذریعے ان زبانوں کی علمی برتری کو ختم کرنا چاہتے ہیں جن کی علمی برتری ہمیں پریشان کرتی ہے۔ اور اس طرح اپنی زبان کو وہی قامت، گہرائی اور پھیلاؤ دینا چاہتے ہیں جو یورپ کی قومی زبانوں کو آج حاصل ہے لیکن کچھ صدیاں پہلے وہی فضیلت لاطینی اور یونانی کو حاصل تھی۔

غالباً ہر زبان علمی تحقیق کے فرائض کو سرانجام دیتے ہوئے گھبراتی ہے کیوں کہ زبانیں، قوموں اور اشخاص کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح اس دور میں ابتدائی تربیت حاصل کرتی ہیں۔جس دور میں لوگ شعر کہتے ہیں اور ان کے عالم شعری طرز کا فلسفہ اور علم دریافت کرتے ہیں۔جس طرح بچپن اور جوانی کے بعد انسانی زندگی میں پختگی کا دور آتا ہے اور تو میں تصورات اور علمی تحقیق کی طرف رجوع کرتی ہیں۔اسی طرح زبانیں بھی شعری دور سے باہر نکل کر سائنسی دور میں داخل ہوتی ہیں۔اور مناسب تربیت نہ ہونے کی وجہ سے سائنسی اور فلسفیائی ذمہ داریوں کو نبھانے میں ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ محسوس کرتی ہیں۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئی ظاہر ہونے والی زبانوں کی تربیت کے کون سے طریقے ہیں؟ اور ان کی گھبراہٹ کو کس طریقے سے دور کیا جاسکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ترجمہ ہے۔ترجمے کے ذریعے زبانیں تجربہ اور اعتماد حاصل کرتی ہیں۔اور کسی بڑی اور وسیع زبان کو اپنے قالب میں سمو کر وہ یقین اور خود اعتمادی پالیتی ہیں جو ترجمے کی مشق اور کوشش، تربیت اور کامیابی کا واضح نتیجہ ہیں۔

ترجمے کے ذریعے زبان کئی طرح پھلتی اور پھولتی ہے۔اور اس کی کئی طرح کی خوبیاں ترجمے کے مضامین کے حوالے سے پیدا ہوتی ہیں۔وہ ایک وقت میں علم الشعر کو بیان کرسکتی ہے۔اور دوسرے وقت میں وہی زبان فلسفے کی زبان بھی بن سکتی ہے۔اسی زبان میں طب کی باتیں کی جاسکتی ہیں۔اور وہی زبان ٹریفک کے اصولوں کی، بچوں کی نظموں اور قانون کی زبان بھی بن سکتی ہے۔لوگ اسی کے ذریعے ریاضی کے مسائل حل کرتے ہیں۔اور سائنس کے طالب علم ٹھوس، مائع اور گیس کی باتیں کرتے ہیں۔نفسیات،عمرانیات، اکنامکس، تاریخ اور دقیق علمی مسائل بھی زبان ہی کے ذریعے بیان کیے جاتے ہیں۔لیکن شرط زبان کے تجربے اور تربیت کی ہے۔اگر زبان میں خود اعتمادی ہے اور اسے مناسب مشق حاصل ہے۔تو کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے جسے وہ بیان نہ کرسکتی ہو اور اپنی لپیٹ میں لے لینے سے قاصر ہو۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو ایک دوسری زبان کے قالب میں موجود رہنے والے تصورات سے تعلق رکھتی ہیں۔یعنی ایسی چیزیں ہیں جنہیں لفظوں کے پردے سے باہر نکالا جاسکتا ہے اور اصل لفظوں کے حوالے کے بغیر استعمال کیا جاسکتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ایسی صورت حال میں الفاظ کی خوب صورتی اور زبان کی جمالیاتی اور فنی خوبیوں پر زور نہیں دیا جاتا۔ترجمے کا عمل، اس حالت میں، صرف علمی اثاثے کی نشوونما میں حصہ لیتا ہے۔

ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس میں ترجمے کی تمدنی اور ثقافتی ضرورت بھی مضمر ہوتی ہے، وہاں ترجمے کا عمل زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔خیالات اور جذبات کو بیان کرنے کے لیے نئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں۔نئے الفاظ وضع کرنا پڑتے ہیں۔پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔نئے محاورے اور نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں۔اور نئے علوم سے آشنائی ہوتی ہے۔علاوہ ازیں نئی نئی اصناف کے ساتھ ذہن کا تعارف ہوتا ہے۔اور فکر اور تحقیق کے لیے نئے سانچے، اور نئے اسالیب مل جاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات مجھے زبان کے مزاج کی طرف لے جاتی ہے۔ بعض زبانیں کرخت اور سنگلاخ ہوتی ہیں جن میں میٹھی اور دل کش باتوں کو بیان کرنے کی صفت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق بولی جاسکتی ہیں۔ اور ان کا مزاج ایک ہی سطح پر کارآمد ہوتا ہے۔ ایسی زبان ایک مخصوص طرز کی شاعری پیدا کرسکتی ہے۔ اور جس جذبے کو صورت دینے کے قابل ہوتی ہے وہ اسی مزاج ہی کے مطابق ہوتا ہے۔ کچھ ایسی حالت انگریزی زبان کی تھی جب بائبل کا بھی اس زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ سٹائل کے لحاظ سے انگریزی نثر رومی انشاپردازوں کے زیر اثر تھی۔ اور پرانی انگریزی کا اسلوب کہانیوں ہی کے لیے کارآمد سمجھا جاتا تھا۔ ادبی طرز کا ایک اسلوب شان وشکوہ کا تھا۔ لمبے بلند آہنگ جملے، قواعد اور علمیت کے مظاہرے اس طرز کے اسلوب سے پیدا ہوتے تھے۔ اس اسلوب میں رومی قیصر کا دبدبہ تھا مگر دل کی آگ نہ تھی۔ مگر دوسری طرح کا سٹائل شان وشکوہ سے کہیں زیادہ متانت اور سلاست کا سٹائل تھا۔ جس کے فقرے مختصر اور نپے تلے ہوتے تھے۔ تیسری طرز کا سٹائل پرانی انگریزی نثر کا سٹائل تھا۔ جسے گولاطینی کے انشاپردازوں کی حمایت حاصل نہ تھی مگر گرجا کے عہدیدار اسے استعمال کرنے کے عادی تھے۔ احیائے علوم کی تحریک سے پہلے اسے مذہبی لیکچروں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ اسلوب شعری طبیعت کا اسلوب تھا اور اس میں سیدھی سادی باتیں کہی جاسکتی تھیں۔ لیکن اس میں گہرائی نہ تھی۔

اسی صورت حال کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ احیائے علوم کی تحریک کے زمانے کی انگریزی نثر رومی اور قدیم انگریزی اجزا سے مل کر بنتی تھی۔ لیکن انگریزوں کی ثقافتی اور فکری شخصیت خالصتاً ان اجزا کے مجموعے سے مرتب نہ ہوتی تھی۔ عبرانی اجزا بھی اسی شخصیت کا حصہ تھے مگر ابھی تک نثر میں نمودار نہ ہوئے تھے۔ بائبل کا انگریزی میں ترجمہ دراصل انگریزی نثر میں عبرانی اجزا کی شمولیت کا واقعہ ہے۔ عبرانی جملے کی شکل، قدیم انگریزی اور رومن جملے کی شکل سے مختلف تھی۔ عبرانی کا ایک جملہ، ایک ہی وقت میں تکرار اور مکرر تکرار کے ساتھ جملے کی واقعیت کو شاعری کی سرحدوں میں پھیلا دیتا تھا۔ اور جملے کا مفہوم عالم گیر خصائص اختیار کرلیتا تھا۔ نثر مختلف استعاروں کی مدد سے ایک ایسا شعری تجربہ پیش کرتی تھی جو پیدا تو جسم اور حواس کے جغرافیے سے ہوتا تھا مگر پیدا ہوتے ہی غیر مرئی اور غیر مادی شکل اختیار کرلیتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ بائبل کا مزاج شمالی یورپ اور قدیم اٹلی کے مزاج سے مختلف تھا۔ اس کے جذبات کا رنگ گہرا اور اس کی تاثیر فوری تھی۔ بائبل کی نثر شاعرانہ تھی، جو قدیم انگریزی اور رومن نثر سے مختلف تھی۔

انگریزی نثر کی خوب صورتی جس میں کلیسا کے بڑے عہدیدار، سیاسی زندگی کے مقرر اور کارلائل شامل ہیں، اسی عبرانی انداز کی بدولت ہے۔ مگر بائبل کا ذکر کرنے سے میرا مقصد ترجمے کی اس خوبی سے ہے جو ترجمہ کرنے سے کسی زبان میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے جملے کی ساخت، اس کی تشبیہیں اور استعارے، اس زبان کا سوز، یہ باتیں مل کر اثر قبول کرنے والی زبان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اور اسے وہ رنگ دیتی ہیں جو پہلے اس کے پاس نہیں ہوتا۔ کچھ یہی باتیں جو انجیل کے ترجمے سے متعلق ہیں۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمے پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو زبان، جو آج ہر لحاظ سے ہمارے کلچر اور علوم کی زبان ہے ایسی عظمت اور وسعت حاصل نہ کر سکتی اگر اسے فورٹ ولیم کالج، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، اور شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ اگر ہم اُردو شاعری کی زبان کا مقابلہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی نثر سے کریں تو ہمیں ترجمے کی خوب صورتی اور تاثیر واضح طور پر نظر آئے گی۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو عظمت اور کلاسیکی شوکت اصل عربی میں ہے وہی ترجمے کی اردو میں ہے۔ فرق تو ضرور ہے لیکن یہ کوئی کم فخر کی بات نہیں ہے کہ اس زمانے کی اردو نے عربی کے وسیع مفہوم اور معانی کے سمندر کو اپنے کمزور اور شرمیلے قابل میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس میں کامیاب ہوئی تھی۔ تاہم یہ بتانے کے لیے کہ ایک زبان دوسری زبان کے محاورے کو اپنے طور اور طریق پر کسی طرح ڈھالتی ہے میں سورہ قیامت کی چند آیات کا ترجمہ نقل کرتا ہوں:

"قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی جو اُلہنا دیتا ہے۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ ہم جمع نہ کریں گے اُس کی ہڈیاں، کیوں نہیں۔ سکتے ہیں ہم، پوچھتا ہے کب ہے دن قیامت کا۔ پھر جب چندلانے لگے تیور، اور گہہ جاوے چاند اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند، کہے گا اس دن آدمی، کہاں جاؤں بھاگ کر کوئی نہیں، کہیں نہیں بچاؤ۔ پھر مقرر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول بتانا، کوئی نہیں۔ پر تم چاہتے ہو شتاب ملنے کو اور چھوڑتے ہو دور آئے کو، کتنے منہ اس دن تازے ہیں، اپنے رب کی طرف دیکھتے۔ اور کتنے منہ اس دن اداس ہیں، خیال میں ہیں کہ ان پر ہووے جس سے کمر ٹوٹے، کوئی نہیں۔ خرابی تیری تس پر پھر خرابی تیری، خرابی پر خرابی تیری۔ کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بے قید!"

(شاہ عبدالقادر کا ترجمہ، الہ آباد مشن پریس ۱۸۴۴ء)

اس ترجمے کی انفرادیت جملے میں الفاظ کی مخصوص نشست سے پیدا ہوتی ہے۔ الفاظ اپنی نشست اپنے اصل عربی متن سے اخذ کرتے ہیں۔ اور اس طرح عربی گرامر اور اردو گرامر کے اتصال سے جو جملہ رونما ہوتا ہے وہ اس ترجمے کا جملہ بن جاتا ہے۔ اس ترجمے کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت مترجم نے عالمانہ زبان کو اپنے اوپر وارد نہیں ہونے دیا۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شاہ عبدالقادر فارسی انشاپردازی سے ناواقف تھے۔ انہوں نے ترجمے کے لیے اس زبان کو استعمال کیا جو لوگ بولتے تھے اور جس کی لغت غیر فہم نہ تھی۔ ایسے مواد کے ساتھ شاہ عبدالقادر نے اردو نثر کو جو اعتماد اور یقین مہیا کیا وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ حیرت کی بات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ سلاست اور بے ساختگی کی جو روایت اس ترجمے کے ذریعے قائم ہوئی تھی اسے مناسب شہرت نہیں دی گئی۔ اور اردو زبان کی ان صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا گیا جو شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں۔

مجھے بخوبی احساس ہے کہ میرا موضوع ترجمے کی ضرورت ہے۔ اور میں نے ''ضرورت'' کی تائید میں بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں جو سرسری طور پر ترجمے کی ضرورت پر غالباً بہت کم روشنی ڈالتی ہیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ترجمے کی ضرورت علم اور زبان کی افزائش سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ہم نہ صرف زبان کی وسعت چاہتے ہیں بلکہ ذہن کی وسعت بھی ہمارے سامنے ہوتی ہے جب ہم ترجمے کا ذکر کرتے ہیں۔ ترجمہ اصل میں دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے مابین پل کا کام دیتا ہے۔ جس کے ذریعے خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری کی طرف، اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی جانب جاتے ہیں۔ اور اس سارے عمل میں درآمد اور برآمد دونوں کیفیتیں شامل ہوتی ہیں۔ ایک طرف کے تصورات دوسری طرف اور دوسری طرف کے اس جانب آتے ہیں۔ لیکن میرا مضمون برآمد کی کیفیت کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کرتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں پروفیسر آربری، وکٹر کیرنین، اور صوفی اے۔ کیو۔ نیاز کا ذکر کرتا۔ ترجمے کی ضرورت ہمارے قومی مقاصد کے تابع ہے۔ اور درآمد کے اصولوں کو پورا کرتی ہے۔ جس طرح ہم دساور سے مشینیں منگواتے ہیں تاکہ کارخانے قائم کریں اور اس طرح ملک کے معیار زندگی کو بلند کریں۔ اس طرح دساور سے کتابیں منگوا کر اس ملک میں تصورات اور سائنسی تعلیم کو علمی فضا کا حصہ بنانا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کی تہذیب کا تندرست اور قیمتی سرمایہ ہماری زبان میں شامل ہو کر ہماری تعلیم کا حصہ بن جائے اور ہم اپنی سوچ بچار کے علاقے وسیع سے وسیع تر کر سکیں۔

لیکن ایسی ضرورت سراسر افادی ہے۔ ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشو و نما کے لیے بھی لازمی ہے۔ کیوں کہ تہذیبیں ایک عرصے کے بعد اپنے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہیں۔ اور اپنے آپ میں سے پھر کوئی نئی شے پیدا نہیں کر سکتیں۔ اس طرح وہ ذہنی علیحدگی اور یک طرفہ تہذیبی تعصب کا شکار ہو جاتی ہیں اس بیماری کو ترجمے کا عمل دور کرتا ہے۔ اور قومیں اور تہذیبیں، مسافت اور جغرافیے کی دقتوں کے باوجود ایک دوسرے سے آشنا ہوتی ہیں۔ اور انسانوں کے گروہ مختلف دوسرے گروہوں کو پہچاننے لگتے ہیں۔ اور انسانی برادری کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے جس کی جانب انسان ہمیشہ سے سفر کر رہا ہے۔ کئی ایک دوسری سرگرمیوں کی طرح ترجمے کا عمل بھی انسان کو انسان کے قریب تر لاتا ہے۔ اور ذہن کی سرحدیں پھیلاتے ہوئے کہتا ہے۔ زبانیں مختلف سہی، ملک دور دور سہی، مگر انسان ایک غیر منقسم صداقت ہے!

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کی ضرورت

انیس ناگی

آج کل ضرورتوں کا سیلاب امڈ آیا ہے، جدھر اور جہاں نگاہ جاتی ہے ضرورتوں کا بھوت منہ چڑاتا ہے، جب چاروں طرف دل لبھانے اور ترسانے والی ضرورتوں کا حصار ہو، کونسی ضرورت غلبہ پاتی ہے، اس کا دارومدار مغلوب ہونے والے پر ہے کہ وہ کس ضرورت کو اولیت کا درجہ دیتا ہے۔ ضرورت موجود میں غیر موجود کی تلاش یا موجود کے حصول کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ ضرورت اور ضرورت مند کے مابین بعد کا قیام لازمی ہے، ورنہ حصول یا تکمیل، ضرورت کے وجود کو ختم کر دیتے ہیں۔ ضرورتوں میں حفظ مراتب، تقدیم و تاخیر کا مدار، نقطۂ نظر زندگی کے مختلف مظاہر سے متعلق رویوں کی اجتماعی ہیئت سے عنوان پاتا ہے۔ چنانچہ زندگی میں ایک ضرورت کا انتخاب دیگر شعبہ ہائے زندگی کی ضرورتوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اطمینان نئی ضرورت کی سرگوشی ہے۔

آج کل ضرورتوں کا سیلاب امڈ آیا ہے، چھوٹی چھوٹی انفرادی ضرورتوں کے غلبے نے اجتماعی ضرورتوں کے تصور کو محو کر دیا ہے، نتیجہ خود مرکزیت، یہ معروضیت کا انہدام ہے! موضوع سے معروض کا سفر کسی صورت حال یا شے کو اپنے آپ سے علیحدہ کر کے دیکھنے کا عمل ہے جس میں ذات ایک حوالہ بن کر اپنے سے باہر ایک وسیع تر وجود میں شرکت پر آمادہ کرتی ہے۔ ایسی معروضیت کی عدم موجودگی نے جہاں ہمارے معاشرے میں بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، وہاں ہماری فکری زندگی بھی عجیب کسمپرسی کی حالت میں ہے۔

ہمارے معاشرے میں سوچ کے دھارے روز بروز خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے محرکات کے علاوہ، اہم اور غیر اہم ضروریات کی افراط تفریط میں انتخاب کی عدم صحت نے اس صورت حال کو زیادہ تشویشناک بنا دیا ہے، سوچ کے سوتے اگر ایک طرف معاشرتی عمل اور تعمل سے جنم لیتے ہیں تو دوسری طرف علم و ادب کے میدان میں بھرپور تخلیقی عمل سے وجود اختیار کرتے ہیں۔ لیکن تخلیقی میدان میں بھی یہی مشکل درپیش ہے کہ یہاں بھی دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح ابتری اور خود مرکزیت ہے۔ اول تو ادیب حقیقی تخلیق سے گریز کر رہا ہے اور اگر تخلیق کرتا بھی ہے تو اس کا روئے سخن اپنے زمانے سے نہیں ہے۔ اس وقت جب کہ اجتماعی طور پر ہم کسی دستورالعمل یا نظریے کی تائید پر آمادہ نہیں ہیں، اس وقت جب کہ ہم نے غیر اہم ضروریات کو اس قدر اہم بنا دیا ہے کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی منفعتوں کے بجز اور کچھ نظر نہیں آتا، لفظ کا بے اثر اور بے حرمت ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس بے حس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورت حال کے حصار کو ہر قسم کی رکاوٹوں اور دل شکن بندشوں کے باوجود، خواہ وہ ناشروں کی طرف سے ہوں یا کسی اور ادارے کی جانب سے، پیہم تخلیقی عمل کے ذریعے توڑا جاسکتا ہے ایک خاص قسم کی ذہنی اور جذباتی فضا کے ذریعے نظریات کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً ایسے نظریات کو جو اجتماعی قلب ماہیت کا یارا رکھتے ہوں، جو زندگی کی نئی عقلی اور جذباتی بنیادوں پر استوار کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوں، لیکن یہ تب ممکن ہوگا اگر ہم اپنے معروضی وجود سے غافل رہنا پسند نہ کریں۔

اس صورت حال میں جب تخلیقی عمل سست روی کا شکار ہو، اور نئے نظریات اور جذباتی پیرایوں کی تشکیل و تدوین کی اہلیت کسی قدر سلب ہوچکی ہو تو اس وقت خیالات کی ترویج اور نظریات کی تشکیل غیر ملکی ادب، فکر اور دیگر شعبہ ہائے تخلیقات کے ذریعہ متواتر تراجم کی ضرورت نہ صرف ایک اجتماعی تقاضے کی سطح پر ابھرتی ہے۔ بلکہ ادبی اور علمی سطح پر بھی ناگزیر ہوجاتی ہے کیونکہ تصوراتی اور فکریاتی سطح پر اس جمود کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ تصوراتی اور جذباتی رویوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال ہے۔ غیر ملکی ادب، فنون اور سائنسی علوم کے تراجم کے سلسلے میں سب سے اہم ضرورت اپنی ضروریات کا احساس ہے کہ ہم کس قسم کے نظریات، ادبی لہجے اور فکری پیرائے کی ترویج یا احیا چاہتے ہیں؟ کیا ہمیں واقعی ایسے تراجم کی ترویج سے گریز کرنا چاہیے جن کی غیر ملکی حقیقتیں مخصوص عزائم کے پیش نظر سرپرستی کا وعدہ کرتی ہیں؟ کھری بات تو یہ ہے کہ ذہنوں کی تبدیلی، فکری نشوونما اور تہذیبی سانچوں کی پرورش کے لیے ایسے تصورات کے فروغ کی ضرورت ہے جو علمی و ادبی سطح پر نہ صرف ایک وسیع تناظر مہیا کرکے اشیاء، موجود اور وقائع کی تصریح میں تغیر یا اضافے کی ضامن ہوں بلکہ ایک مخصوص زمانی سیاق و سباق میں پیدا شدہ تضادات اور مسائل کے تجزیہ، تردید یا ایجاب کا قرینہ بھی مرتب کریں۔ ثقافتی سطح پر ترجمہ دو مختلف تہذیبوں کے مخصوص رویوں کے روبرو ہونے کا عمل ہے، بلکہ یہ ایک تہذیبی مزاج کا اور دوسری تہذیبی شخصیت کا تعارف ہے، یورپی اور مغربی زبانوں کے برعکس بیشتر مشرقی زبانیں اور خصوصاً اردو زبانوں کے حوالے سے تنہائی کا شکار ہے اور اس تنہائی نے اس شخصیت کے خطوط کو اتنا بھدا کردیا ہے کہ وہ ارتباط سے عموماً گریز کرتی ہے اسے اپنے علاوہ ہر دوسرا اوپرا نظر آتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اُردو زبان میں ہر طرح کے موضوعات و مضامین کی ادائیگی کی صلاحیت بہت کم ہے۔ جب بھی فلسفہ، نفسیات یا سائنسی علوم پر کچھ لکھنے کی نوبت آئی ہے تو ذہن قدیم فارسی، عربی یا بعض اوقات ہندی اصطلاحات کا تعاقب کرتا ہے، نتیجہ اس کا ظاہر ہے، اپنی مکمل شکل میں تحریر ایسے ادق الفاظ کا مجموعہ بن جاتی ہے کہ مافی الضمیر اوجھل ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں کچھ تو مناسب الفاظ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور کچھ اردو کا ڈھیلا لسانی سیاق و سباق ہے جسے تصورات کی تشکیل کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے، اس لیے اردو زبان بالغ اور بھرپور اظہار کی صلاحیت سے عاری رہی ہے۔ ابھی تک اُردو زبان میں غیر ملکی ادب کا جو کچھ ترجمہ ہوا ہے وہ ہر ایک کے سامنے ہے، دنیا کی دوسری زبانوں میں قارئین دوستوفسکی، بودلیر، شیکسپیئر، سنوکلیز، نطشے، ہیگل، کانٹ نہ جانے کون کون سے ادیبوں اور مفکرین کی تخلیقات سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن ہمارے یہاں صرف انگریزی خواں طبقہ ان سے مستفید ہوسکتا ہے، علم اور ہدایت کے یہ سرچشمے ایک خصوصی طبقاتی حق بن گئے ہیں، لیکن کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں اپنی اہم ضرورتوں کا احساس نہیں ہے۔ ہمارا شاعر یا ادیب ایک لنگڑی سی غزل اور نیم جان سا افسانہ لکھ کر اپنی جان چھڑاتا ہے اور اپنی مکمل ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے گریز کرتا ہے یہ ذکر بے محل نہیں کہ ہمارے شاعروں یا ادیبوں نے اپنے تخلیقی عمل کو شعری یا نثری ہیئتوں کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھا ہے، جب شعر وادب ایسی نزاعی موقعیت میں الجھا ہو کہ زبان بالیدگی فکر کی متحمل نہ ہو تو اس وقت تمام شاعروں اور ادیبوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ من حیث المجموع شعروادب اور زبان میں مختلف ذرائع سے توانائی پیدا کریں اس کے مزاج، رنگ و آہنگ اور ذرائع کے امکانات کا جائزہ لیں۔

اس کے برعکس ہمارا دانشور طبقہ ملکی تخلیقات کے تراجم کی بجائے سرقہ بالجبر سے کام لیتا رہا ہے۔ جب جی چاہا حسب ضرورت کسی مفکر یا مصنف کی تخلیق سے کچھ حصہ اخذ کیا، بعض دفعہ اس کا حوالہ درج کیا اور بعض دفعہ اس کا نام گول کر کے اپنا نام جڑ دیا، جس سے نہ تو ماخوذ تصور کی صحت کا سراغ مل سکتا ہے اور نہ اس کے سیاق وسباق کا، کیونکہ اُردو خواں قاری کے لیے اصل متن دوسری زبان کے لبادے میں نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ ترجمے کا یہ بالواسطہ اسلوب گو جزوی طور پر نظریات کے انتشار میں معاون تو ضرور ثابت ہوتا ہے، مگر ان کی صحت اور افادیت ایک حد تک مشکوک رہتی ہے۔ اگر ایک طرف نئے معاشرتی، سیاسی، علمی وادبی نظریات کی آفرینش کے لیے براہ راست تراجم کی ضرورت ہے تو دوسری طرف اُردو زبان کی نئی تشکیل اور وسعت کے لیے اس میں نئے تصورات، نئے الفاظ اور نئے جذباتی پیرایوں کو منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ اہل ایران کو دیکھیے کہ انہوں نے اپنے کثیر علمی وادبی ذخیرے کے باوجود فارسی جدید کی تعمیر وتشکیل کے لیے بیسویں صدی کا نصف سے زیادہ حصہ وقف کر دیا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اہل ایران نے تمام دنیا کے عظیم ادب کے تراجم کر کے فارسی جدید کو اظہار کے اس مرحلہ پر پہنچایا ہے، جہاں اس میں ہر طرح کے علمی، سائنسی، معلوماتی الفاظ، تراکیب اور اصطلاحوں کے ذخیرے دستیاب ہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سرکاری اور تعلیمی سطح پر فارسی کو ابلاغ واظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایران جدید کا سیاسی ماضی ہمارے سیاسی ماضی سے مختلف ہے، تاہم انہوں نے من حیث القوم تراجم کیے اور ان کی معیاری اشاعت، کے نہ ختم ہوتے سلسلے کے ذریعے جدید فارسی کی تعمیر کی ہے۔ اہل ایران نے جدید فارسی کی تعمیر میں فرانسیسی زبان سے بھی مدد لی ہے جو ایران میں فارسی کے بعد ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ اہل ایران کے برعکس ہمارے یہاں اُردو زبان کی تشکیل کا کوئی واضح لائحہ عمل نہیں ہے کہ اردو زبان کی توسیع وتشکیل کے عمل میں کن زبانوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، مغربی زبانوں میں انگریزی زبان کا اثر ونفوذ اتنا واضح ہے کہ مزید شرح کا محتاج نہیں ہے البتہ اس کے بارے میں بھی لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے الفاظ وتراکیب کو کس حد تک اور کس طرح ''اردوایا'' جائے۔ اسی طرح فارسی زبان سے بھی ہمارا تعلق کچھ مبہم سا ہوتا جا رہا ہے۔ لسانی سطح پر ابھی تک ہمارا رابطہ کلاسیکی فارسی سے رہا ہے اور ہم نے عمداً کلاسیکی فارسی کے لہجوں کو اپنایا ہے، اردو زبان نے جو کچھ فارسی سے حاصل کیا ہے وہ کلاسیکی ہے، اس کی اغلب وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اہل ایران سے ہمارا رابطہ ختم ہو چکا تھا اور اُردو زبان نے اپنے تشکیلی مراحل میں انگریزی کی طرف رجوع کیا تھا۔ مختلف زبانوں میں زبان کی رنگت سیاسی اور تجارتی اور دیگر محرکات کے زیر اثر بدلتی رہتی ہے، اب جب کہ قومی سطح پر انگریزی زبان کو واپس اس کے ملک بھیجنے کا مسئلہ زیر غور ہے، اس لیے اس کا نعم البدل تلاش کرنے کی ضرورت بھی ہے کیونکہ پسماندہ زبانوں کو اپنے توسیعی عمل میں ترقی یافتہ زبانوں سے تعلق رکھنا اگر ناگزیر نہیں تو ضروری ہے، اس لیے کوئی زبان تنہائی میں نشوونما نہیں پا سکتی۔ فی زمانہ علوم، ادبیات اور فنون تنوع اور لسانی قیود و بند کے باوجود ایک زبان سے دوسری میں منتقل ہونے کا رجحان رکھتے ہیں، وہ نظریاتی اور جذباتی بعد جو ٹیکنالوجی کی عدم موجودگی میں مختلف زبانوں اور ادبیات کو تہا رہنے پر مجبور کرتا تھا، کم وبیش ختم ہو چکا ہے۔ جہاں بھی کسی زبان یا ملک میں کوئی غیر معمولی کارنامہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پذیر ہوتا ہے۔ ہر ایک اُس سے رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عہد جدید میں زندگی گزارنے کے لیے اپنے اردگرد سے آگاہی لازمی ہے۔ ہر ایک زبان کو عہد جدید سے ربط استوار رکھنے کے لیے ایک دوسری زبان پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اُردو زبان کی توسیع اور تعمیر کے لیے انگریزی کو ملک بدر کرنے کے باوجود علمی و ادبی سطح پر قائم رکھنا ہوگا۔ کیونکہ ہمارا بیرونی دنیا سے رابطہ اسی زبان کے توسط سے ہے۔ اگر پہلے اس زبان کو ہمارے معاشرے میں مرکزیت تھی تو اب اس کی حیثیت خبر کے ایک ذریعہ کی ہونی چاہیے دوسری طرف اردو زبان میں نئے لہجے پیدا کرنے کے لیے اسے نہ صرف مقامی زبانوں سے متصل کرنا ضروری ہے بلکہ فارسی جدید سے اس کا ربط استوار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، فارسی اردو زبان کی نسبت زیادہ باصلاحیت اور مضبوط زبان ہے جس نے اپنی قوت کے لیے غیر ملکی ادب کے ہزار ہا تراجم اپنے اندر سمونے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ محنت جو اہل ایران نے علوم وفنون اور ادبیات کی سطح پر کی ہے اردو زبان مزاج، رسم الخط صرف ونحو اور ذخیرۂ الفاظ کے اشتراک کے باوصف اس سے بکمال آسانی مستفید ہوسکتی ہے، وہ کٹھن، وہ بے بسی اور کم مائیگی جو اردو زبان میں سنجیدہ اور غیر رسمی تحقیقات کے دوران پیش آتی ہے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

تراجم کا عمل انسانی تمدن، مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا ایک بھرپور ذریعہ ہے، انسان جو رنگوں، زبانوں اور جغرافیائی بندشوں اور سیاسی تفرقات کی بدولت انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے، ترجمے کے ذریعے ایک زبان کو اپنی زبان کے حروف تہجی میں ڈھالنے سے انسانی سطح پر ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتا ہے۔ ابھی تک ہمارا غیر ملکی دنیا سے تعلق صحافتی اور اخباری سطح پر رہا ہے یعنی ہم یہ جانتے ہیں کہ فلاں ملک کس جگہ پر واقع ہے۔ وہاں کس کی حکومت ہے اور لوگ کون سی زبان بولتے ہیں، یہ تعلق معلوماتی اور ہمی اعتبار سے آفادی تو ضرور ہے لیکن وہاں کے جمہور کے مزاج، تمدن اور زندگی کے ذہنی اور جذباتی رنگ و آہنگ کی خبر نہیں دیتا، اپنے آپ کو جذباتی اور ذہنی سطح پر باخبر رکھنے کے لیے دوسروں کا دکھ درد جاننے اور شرکت کرنے کے لیے ترجمہ ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جو خبر کا ذریعہ بنتا ہے۔ جو انسانوں میں اشتراک کا قرینہ پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ زبان کی توسیع تمدن کے تعارف، انسانی کائنات کی دریافت اور تاریخ کے وقوف کے لیے ایک سے زیادہ زبانوں سے رابطہ پیدا کرنا ضروری ہے ہمارے یہاں تہذیبی، معاشرتی اور ادبی سطح پر وہی معیار رہے ہیں جو انگریزی زبان کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں، جس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کے لوگوں کے لیے انگریز اور انگریزی زبان، مغربی تمدن اور علم کی واحد اور آخری صورت تھی، اسی طرح آج بھی ہمارے لیے لسانی مجبوریوں کی بدولت انگریزی زبان مغربی علم وفنون کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ جو فکر اور جذباتی اسلوب ہمیں انگریزی زبان کے ذریعے ملتے ہیں، ہم اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ درست ہے کہ انگریزی مغرب کی سب سے اہم زبان ہے لیکن کیا یہ تمام دنیا کے ادب اور علوم کو ہم تک پہنچا رہا ہے؟ فی زمانہ ہر کوئی تعصبات اور سیاسی مصلحتوں کی زنجیر میں ہے اور صرف اسی فکر یا چیز کی نمائندگی پر توجہ دیتا ہے جو اس کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہے، اگر اس مفروضہ نما حقیقت کی صحت پر اعتماد کیا جائے تو پھر تراجم کے لیے ایک سے زیادہ زبانوں کے ادبیات اور دیگر علوم سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم براہ راست تراجم، بالواسطہ تراجم اور براہ راست مطالعہ کے توسط سے اہل مغرب کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ہماری نگاہ سے مشرق وسطیٰ، مشرق بعید اور ہند چینی کی دنیا کے بہت سے گوشے مخفی ہیں، ایک اعتبار سے ان علاقوں کے لوگوں کا سیاسی اور معاشی مقدر ہم سے چنداں مختلف نہیں ہے اور وہ جغرافیائی اور کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حد تک نسلی اعتبار سے بھی ہم سے کچھ قریب ہیں، ہم ان کی دنیا سے بے خبر ہیں، ہم براعظم افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا یواین او کی مطبوعات ہمیں بتاتی ہیں۔ ان علاقوں اور خطوں کے لوگ اپنے مقسوم کی تشکیل میں جس جدوجہد سے گزر رہے ہیں، ہم ان سے واقف نہیں ہیں، کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم تراجم کے ذریعے ان کی زندگی میں شرکت کر سکیں اگر وہ مظلوم ہیں تو ان کی حمایت میں آواز اٹھا سکیں؟ اگر وہ ظالم ہیں تو ان کے خلاف جدوجہد کریں؟ لیکن ان تک پہنچنے کے لیے انہیں جاننا ضروری ہے چنانچہ اس وقت تراجم کے سلسلے میں خصوصاً ایسی اقوام کی ادبیات کو اہمیت دینی چاہیے جو تاریخی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ ترجمے کی ضرورت کا ایک اہم پہلو ہے جو اتنا ہی اہم ہے جتنا متمدن ملکوں کی ترقی یافتہ زبانوں کے علم وادب کے ترجمہ کا!

دوسری زبانوں سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کا عمل دوسری تہذیب کو اپنی طرف کھینچ کر لانے کا عمل ہے۔ ترجمہ کا دوسرا رخ اپنے آپ کو دوسری تہذیبوں تک لے جانے کا ہے! اس ذیل میں اردو زبان اور دیگر علاقائی زبانوں کے ادب کا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا غیر ملکی ادب اور دیگر علوم کا۔ ملکی ثقافتی ہم آہنگی کے لیے (جب کہ اردو زبان پاکستان کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتی) یہ ضروری ہے کہ علاقائی زبانوں کے ادب کو نہ صرف بین الصوبائی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے بلکہ تمام کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت بھی ہے کہ ایک ہی خطے کے لوگ تمدنی سطح پر ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ اردو زبان کی ترویج و توسیع کے لیے لازم ہے کہ اسے پاکستان کی سرزمین پر اس کے زمینی رشتے سے وابستہ کیا جا سکے اس میں فوک لور، اساطیر اور تہذیبی عناصر کو شامل کیا جا سکے۔ چنانچہ اس لسانی اور ثقافتی ضرورت کے پیش نظر بین الصوبائی ادبی رابطے کے لیے ایسے تراجم کے مستقل ادارے قائم کیے جانے چاہئیں۔ اسی طرح ملکی سطح پر یہاں کے ادب کو غیر ملکی زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے قومی سطح پر مختلف زبانوں میں تراجم کے ادارے قائم کیے جانے اشد ضروری ہیں، جس طرح غیر ملکی ادب کو اردو اور دوسری علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح پاکستانی ادب کی غیر ملکی ترسیل بھی کسی قدر غیر اہم نہیں ہے ایک طرف غیر ملکی ادبیات اور علوم کو اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں منتقل کرنا اور دوسری طرف اپنے ادب کو دنیا کی ہر سمت میں پھیلانا بین الاقوامی سطح پر ایک وسیع تر رابطے کی کوشش ہے۔

ادبیات کی درآمد و برآمد کا عمل اسی وقت سنجیدگی کا رتبہ اختیار کر سکتا ہے اگر ہم ضرورتوں کے سیلاب میں اہم اور غیر اہم ضرورتوں میں حفظ مراتب کا قرینہ معین کر سکیں، اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنے وجود کا معروضی مشاہدہ کریں، زندگی اور انسانی مسائل کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کی اہمیت

خالد اقبال

علمی ادبی نقطہ نظر سے ترجمہ کی اہمیت مسلمہ ہے۔ کسی ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا یہ عمل از سر نو تخلیق کہلاتا ہے۔ اقوامِ عالم کے ادب، ان کی فکر، نظریات اور خیالات کو سمجھنے کا وسیلہ ترجمہ ہی ہے۔ ترجمے کی اہمیت اور وسعت آفاق جیسی ہے جو انسانی سوچ کے دریچوں کو مزید کشادگی عطا کرتی ہے، قومی بصیرت اور شناخت کو نمایاں کرتی ہے۔ Paul St. Pierre لکھتے ہیں:

"The importance of translation can be located in the fact that translation brings the reader's writers, and critics of one nation into contact with those of others,not only in the field of literature, but in all areas of human development. science and philosophy, medicine, political science, law and religion, to name but a few translations, in this way plays essential role in determining how a nation establishes its identity in terms of other be this through opposition to

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

foreign influence, through assimilation or "naturalization" of the foregin where by differences are creased to as great a dgree possible, or through imitation of another, usually dominant culture. these are all different strategies of translation becoming possiblities at different moments in history and under lining the various types of relations between nation's which can exist."(1).

آج Global Village Age میں ترجمے کی توسط سے ہی جدید علوم وفنون سائنس، طب اور ٹیکنالوجی کے علاوہ بہت سے نئے تصورات اور خیالات کو سمجھنے، دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والی اقوام اور ان کے مختلف زبانوں کے قریب لانے میں ترجمے کا کردار لازم حیثیت کلیدی ہے۔ اقوام عالم میں زبان علم وادب، ابتداہی سے مشترک سرمایہ تصور کیے جاتے رہے ہیں۔ اس لیے سرمائے کو وسعت دینے اور کسی بھی زبان کی تفہیم وتشریح کے لیے ترجمہ بنیادی اساس ہے کیونکہ "ترجمے کے ذریعے زبان کئی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے ترجمہ جہاں الفاظ اور زبان کی نشوونما کے ذریعے انسانی علوم میں اضافے کا باعث بنتا ہے وہیں ذہنی سرحدوں کو بھی کشادگی بخشتا ہے زبان کی سطح پر ترجمہ خیالات وجذبات کی ہر کروٹ کو سمونے کی خاطر نت، نئے اسالیب بیاں متعارف کرواتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت جہاں یوں زبانیں Give and Take کے عمل سے باہم ترقی کرتی ہیں زبانوں کی یہ ترقی کئی سطحوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً ذخیرہ الفاظ کا تبادلہ محاوروں اور محاکات میں تبادلہ، علمی، تخلیقی، تحقیقی انداز میں تبدیلی، زبانوں کے ادب میں بطور خاص اسلوب ہیئت کی متنوع صورتیں بلاشبہ ترجمہ کی مرہون منت ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے مفکروں، دانشوروں، شاعروں کی فکر ایک زبان سے دوسری زبان کے ادب میں ترجمے کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے آج ہم شیکسپیئر، ارسطو، افلاطون، نطشے، ہیگل، کانٹ باولیر، دوستوفسکی، شوپن ہار، ڈارون، ٹیگور، فردوسی، سعدی، مولانا روم ودیگر اقوام کے عالی دماغ کی تخلیقات ترجمے کے سبب جانتے ہیں:

"ہر زبان کے نثری ادب میں تخلیقی اور شعری ادب میں پہلے تراجم کا عمل شروع ہوتا ہے ہماری زبانوں خصوصاً اردو، سندھی اور پنجابی وغیرہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسا ہی ہوا ہے، نثری ادب کا دور بیشتر تراجم سے شروع ہوتا ہے ہمارے ادیبوں نے ترجمہ شدہ شہ پاروں سے متاثر ہو کر تخلیق کا م شروع کیا گویا تراجم کے دور سے ادب کا تخلیقی دور شروع ہوتا ہے یعنی تخلیقی ادب کا انحصا ر بڑی حد تک ترجمہ شدہ پاروں پر ہے"۔(۳)

یہ بات عالمی سطح پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ ایک ملک کے اندر رہتے ہوئے کثیر اللسانی سماج میں بھی سچ ثابت ہوتی ہے جس کی مثال پاکستان میں اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا آپس میں بڑھتا ہوا تال میل ہے۔اس لسانی، ادبی، ثقافتی جڑت کا نتیجہ پاکستان کی قومی یکجہتی کا سبب بنے گا۔ پاکستانی زبانوں نے اردو زبان سے آج کے دور صنفی، ہیئتی ، ادبی رجحانات و دیگر حوالوں سے تبدیلیوں کو قبول کیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ پاکستانی زبانوں میں لا ک ادب کی بہت سی اصناف ،صوفی شعراء شاہ لطیف بھٹائیؒ وارث شاہؒ ۔ بلے شاہؒ۔ سچل سرمستؒ ۔ بابا فریدؒ ۔خواجہ غلا م فریدؒ۔خوشحال خان خٹکؒ۔ جام درکؒ۔ مست توکلیؒ ۔ رحمٰن باباؒ کا کلام ترجمے کے ذریعے اردو، انگریزی زبان میں منتقل ہوا ہے اور کروڑوں انسانوں کی روحانی آسودگی کا سبب بنا ہے۔یوں ترجمے کی احسان مندی نے ہمیں یہ نکتہ بھی سمجھایا ہے کہ کوئی زبان بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتی بلکہ اصل بات کسی زبان کو مواقع مہیا کرنے کی ہے ۔دوسری جانب جن زبانوں میں دوسری زبانوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے ،متوجہ ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ ترقی کر جاتی ہیں۔ لیکن ترقی کا یہ راستہ ترجمے کی وادی سے ہو کر جاتا ہے۔کوئی بھی زبان ترجمے کے بغیر ترقی کا دعویٰ نہیں کر سکتی جس کے بارے میں معروف نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید امجد کہتے ہیں:

"جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے جس کے بغیر عالمی سطح کی علمی وا دبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اپنی قومی زبان کیا ہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے گلوبل علم سے واقفیت حاصل کرنے اور جدید ٹیکنالو جی کا ساتھ دینے کے لیے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔"(۴)

جس طرح ملکوں کے مابین اشیائے ضرورت جدید ٹیکنالوجی ،مشینری، آلات، سامان طب و سائنس منگوا کر اپنے طرز زندگی میں تبدیلی لانے کی خواہش رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں اسی طرح سے ہم جدید تحقیق برائے علم، سائنس، فلسفہ، ادب، سیاست، زراعت و دیگر علوم کو ترجمے کے ذریعے اپنا کر بہت سے شعبوں میں ترقی کر سکتے ہیں دنیا کی کوئی بھی تہذیب۔۔۔قبولیت کے عناصر خالی ہو تو ہو اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہے بالآخر تنہائی کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔تہذیبیں ہمیشہ کروٹ بدلتی رہتی ہیں۔تہذیب کے شجر کو زندہ اور توانا رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو توانائی بخشنے والے دیگر اجزاء کی طرح ترجمے کے جزو کو بھی شامل کیا جائے کیونکہ کسی خطے اور معاشرت کی تہذیبی نشوونما کے لئے ترجمہ ضروری ہے بسا اوقات یک رخ حالات اور ماحول کی گھٹن کے سبب معاشرے میں جمود کی سی کیفیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طاری ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ فکری طور پر بانجھ پن کا باعث بنتا ہے مگر یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ

''ترجمہ ایک زبان کے علمی اور ادبی سرمائے کو دوسری زبان بولنے والے انسانی گروہوں تک پہنچاتا ہے دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرتا ہے اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور ربط وضبط کی راہیں کھولتا ہے''۔(۵)

زندگی کی خوبصورتی اس کی رنگا رنگی میں ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے افراد، طرح طرح کی زبانیں بولتے ہیں، ہر خطے کی اپنی تہذیبی ثقافت ان کی پہچان بنتی ہے یہ ایک الگ بات کہ وہ جغرافیائی فاصلوں کی وجہ سے ایک فکری صلاحیتوں کے بارے میں جستجو کرتے ہیں، جستجو کا یہ مرحلہ ترجمے کے عمل سے ممکن ہو سکتا ہے، ابھی تک خالق کائنات کی اس وسیع و عریض دنیا۔ دور بہت آباد اقوام، ان کے خیالات کے بارے کتنا کچھ جان سکتے ہیں ؟ یقیناً بہت کم! ماسوائے ترقی یافتہ اقوام کے علمی ادب سائنسی سرمائے کے، بہت جاننا ابھی باقی ہے۔ دنیا کے بے شمار خطوں، انسانوں اور ان کی زبانوں، ان کے حوالے سے جاننا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح ترقی یافتہ اقوام اور ان کی زبانوں کی تخلیقی جہتوں اور وسعت کے بارے میں آگاہ ہونا کم ترقی یافتہ اقوام اور ان کی زبانوں کے بارے جاننا ضروری ہے اس ضمن میں ڈاکٹر غلام شبیر رانا ترجمہ کی اہمیت کے بارے میں کہتے ہیں۔

''کسی بھی زبان کی علمی اور ادب معیار کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے برابر لانے کے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ادبیات عالم پر گہری نظر رکھتے ہوئے دوسری زبانوں میں موجود ادبی سرمائے کو اس زبان میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ اس کی ثروت میں اضافہ ہو اور یہ عمل مستقل طور پر جاری رہنا چاہیے، تخلیقی عمل نت نئے تجربات، حیات آفریں تصورات کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔ ترقی یافتہ زبانوں میں موجود ادبی سرمائے کو ترقی پذیر زبانوں میں منتقل کرنا ایک صحت بخش رجحان ہے اس طرح تخلیقی علم کو نئی جہات سے آشنا کرنے میں مدد ملتی ہے اور تنقید و تحقیق کے وسیلے سے ادب میں خیال افروز مباحث کا دروازہ کھلتا ہے''۔(۶)

کلچرل گلوبلائزیشن کا یہ تقاضا ہے کہ قدیم دور کے ادب تہذیب و ثقافت کو محفوظ کیا جائے، ترقی یافتہ اقوام کے علمی ادبی و دیگر علمی سرمائے سے آگاہی اور آگہی حاصل کی جائے اور پھر اپنے علمی ادبی تہذیبی ثقافتی سرمائے کو قومی نقطۂ نظر سے آج کی ترقی کے عمل میں شامل کیا جائے اور یوں ترجمے کے توسط سے زندگی کی رنگا رنگی (Diversity) کو نئی معنویت دی جا سکتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات

1-Paul st. Pierre,"Translation and National Identity", A Hand book of translation studies,Bijay Kumar Das , ATLANTIC Publisher's and distributer's,B2, vishal enclave, opp. RajouriGarden, New Dheli, Page:79

۲۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، اشاعت طبع اول، مئی ۱۹۹۸ء، ص ۱۶

۳۔ غلام علی الانا، ڈاکٹر، ادب میں تراجم کی اہمیت، شمولہ اردو زبان میں ترجے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۶۴

۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ترجمہ کا فن، مشمولہ ''رویے اور شناختیں''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳

۵۔ سجاد حیدر پرویز' ڈاکٹر اردو ور سرائیکی کے باہم تراجم' سرائیکی ادبی بورڈ رجسٹرڈ' ملتان' اشاعت' مئی ۲۰۰۱ء' ص ۱۳

۶۔ غلام شبیر رانا' ڈاکٹر اسیر عابد کا منظوم ترجمہ'' دیوان غالب'' (پنجابی میں)' مشمولہ '' ماہِ نو'' فروری ۱۹۹۴ء' ص ۲۴

☆☆☆

)(مشمولہ فن ترجمہ، مصنف خالد اقبال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کی اہمیت

شہباز حسین

ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کے لیے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے۔دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔جو عام طور پر کمیاب ہوتی ہے۔ترجمے بہت ملتے ہیں اچھے ترجمے خال خال ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دو زبانیں جانتا ہے بزعم خود مترجم بن بیٹھتا ہے اور ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتا ہے کہ ترجمے کی اہمیت اور افادیت مجروح ہو جاتی ہے اور ترجموں پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ذرائع آمد و رفت میں وسعت اور سرعت آ جانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والوں میں ارتباط اور اختلاط روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان سیکھنی پڑتی ہے اور ملوکیت میں وہ افراد یا طبقے ہمیشہ ممتاز رہے جنھوں نے حاکموں کی زبان سیکھنے میں سبقت کی۔حاکموں نے بھی محسوس کیا کہ امن واستحکام کے لیے صرف زور بازو ہی کافی نہیں ہے دلوں کو بھی مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے محکوم قوموں کی زبان اور ثقافت سے بھی آشنائی ضروری ہے۔اجنبیت اور مغائرت کو کم کرنے کے لیے ترجموں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

علم کی وسعت اور علمی اور سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے۔ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم وفنون کے خزانے سب کے لیے کھل جاتے ہیں۔اسی لیے روز بروز ترجموں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پا لیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں اصل کے تمام محاسن آ ہی نہیں سکتے۔یہ بات مشرقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کے لیے یا ان زبانوں کے لیے تو ٹھیک ہے جو ابھی ترقی یافتہ نہیں ہیں جو ہر قسم کے معانی و مطالب کے اظہار پر قادر نہ ہوں مگر دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اب اس مرحلے پر پہونچ گئی ہیں کہ وہ کم از کم نثری تخلیقات کو بجنسہ دوسری زبانوں میں منتقل کر سکیں۔ کسی دوسری زبان سے براہ راست استفادہ کرنے والے ہمیشہ تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں لہٰذا ترجمے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی کیونکہ کالی داس، عمر خیام، اقبال اور ٹیگور کی عظمت کا اعتراف ترجموں کی بدولت ہی ہوا ہے۔

مغلیہ دورِ حکومت میں سنسکرت سے فارسی میں کافی ترجمے ہوئے انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی سے مقامی زبانوں میں ترجموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریزی سے کسی کتاب کا ترجمہ اردو میں نہیں ہوا لیکن عربی اور فارسی اور سنسکرت کے تراجم ضرور ہوئے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ شدہ پہلی کتاب جس شہر کا "انجیل مقدس" ہے جو 1748ء میں شائع ہوئی۔ بعدہ مرزا فطرت نے دل ہیز کی مدد سے 1805ء میں انجیل کے "عہد جدید" کا ترجمہ شائع کیا۔ بعد میں اکا دکا انفرادی کوششیں ہوتی رہیں۔ بعد میں امراء اور نوابین نے جو جدید علوم کی اشاعت اور فروغ میں دلچسپی رکھتے تھے، ترجموں کی سرپرستی کی۔ جیسے حیدر آباد کے نواب فخر الدین خاں شمس الامراء کی کوششوں سے بعض رسالے شائع ہوئے۔ رسالہ مختصر جر ثقیل، رسالہ کسورات اعشاریہ، رسالہ اسطرلاب، کردنی، کیمسٹری کا مختصر جو رسالہ شاہان اودھ نے بھی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اور مطبع سلطانی سے شائع کیے۔ جیسے رسالہ ہیئت، رسالہ علوم طبیعہ، رسالہ قوت مقناطیس، رسالہ علم الحرارۃ، رسالہ علم مناظر، غیرہ۔ لیکن ترجموں کی پہلی باضابطہ کوشش دہلی کالج میں ہوئی۔ کیونکہ مغربی علوم کے پڑھانے میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اردو میں کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ لہٰذا "انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی" یا "دہلی" ورینکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کو ترقی دی جائے۔ انجمن نے ترجمے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے تھے انکا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ مترادف لفظ اردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے۔

۲۔ سائنس کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوگا۔ اس لیے انگریزی الفاظ کا استعمال ناگزیر ہے۔

۳۔ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اس کا مفہوم اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس ادارے میں بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ غدر کے ہنگامہ میں یہ کالج بند ہوگیا اور پھر نہ کھلا۔ اس کے بعد دوسری قدرے منظم کوشش سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تحت ہوئی اور تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور معاشیات کی متعدد کتابیں ترجمہ ہوئیں اس کے بعد زمانے میں انگریزی تعلیم کے عام ہو جانے کی وجہ سے بہت سے مترجم پیدا ہوگئے لیکن یہ تراجم زیادہ ناولوں، ڈراموں، کہانیوں کے تھے۔ ذریعہ تعلیم انگریزی تھا انہیں نصابی ضرورتوں کے لیے ملکی زبان میں علوم کی کتابوں کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دراصل اردو میں سب سے منظم اور باضابطہ کوشش جامعہ عثمانیہ کے قیام (1917) کے بعد شروع ہوئی۔ کیونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں "سررشتہ تعلیم وترجمہ" قائم ہوا جس کے تحت 500 کے قریب کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ یہ کتابیں آرٹس اور سائنس، انجینئرنگ اور میڈیسن تقریباً تمام جدید علوم پر حاوی تھیں ہندوستان کی کسی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کا یہ پہلا تجربہ تھا جو بحیثیت مجموعی کامیاب رہا۔

دارالترجمہ میں دو طرح کے رکن تھے۔ ایک وہ جو مستقل اس کے رکن تھے اور دوسرے وہ جو اجرت پر کام کرتے تھے۔ ترجمے کی تکمیل کے بعد کسی ماہر فن سے اس پر نظر ثانی کرائی جاتی اور پھر ادبی ناظر زبان و بیاں کی اصلاح کے لحاظ سے نظر ثانی کرتے اور کتاب شائع ہو جاتی۔ ترجمہ کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجلس وضع اصطلاحات میں بھیجتے تھے جن کے مترادف الفاظ اردو میں نہیں تھے۔ اس مجلس کے اراکین میں علم کے ماہرین کے علاوہ، عربی، فارسی اردو اور ہندی میں دستگاہ رکھنے والے بھی شامل ہوتے تھے جو زبان کی ادبی اور لسانی خصوصیت کو مدنظر رکھتے تھے۔ اردو کے دامن کو مالا مال کرنے میں دارالترجمہ نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

ترجمہ کے سلسلے میں سب سے پہلی مشکل اصطلاحات کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ یہ مشکل سائنسی علوم کے سلسلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اصطلاح ایک معین معنی دیتی ہے اور اس کے لیے ایسا متبادل لفظ ہونا چاہیے جو وہی مخصوص معنی دیتا ہو مثلاً Agreement یا Treaty کے لیے اردو میں سمجھوتہ یا معاہدہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ Agreement کے لیے معاہدہ اور Treaty کے لیے سمجھوتہ ہی استعمال ہوگا۔ لہٰذا جس کا جو جی چاہتا ہے استعمال کر لیتا ہے۔ یہ سہولت سائنس میں نہیں ہے اسی طرح قوانین اور قانون کی کتابوں یا عدالتوں کے فیصلوں کے ترجموں کے لیے بھی مخصوص اور معین الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی ترجمے ہوئے اصطلاحات سازی بھی ہوئی۔ دارالترجمہ حیدرآباد نے وسیع پیمانے پر اصطلاحات وضع کیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم نے اپنی بیش بہا تصنیف "وضع اصطلاحات" مرتب کی اور پہلی بار اصطلاحات وضع کرنے کے اصول مدون کیے جو آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں۔

اصطلاحات سازی کے سلسلے میں بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان کی اصطلاحوں کو تقریباً بین الاقوامی اصطلاحوں کا درجہ حاصل ہو گیا ہے لہٰذا ان کو جوں کا توں اپنا لینا چاہیے لیکن یہ صورت قابل عمل نہیں ہے۔ کیونکہ اصطلاحوں سے جو مشتقات بنتے ہیں۔ ان کو اردو میں جوں کا توں اپنا لینے سے بڑی قباحت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اب اصطلاحوں کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ اردو میں ان کے بے محابا استعمال سے عبارت بڑی عجیب وغریب ہو جائے گی۔ لہٰذا انہیں انگریزی اصطلاحوں کو اپنانا چاہیے جو آسانی سے اردو میں کھپ سکیں۔

ترجمے کے سلسلے میں بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرنا ہو اور جس زبان میں ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنا ہو، دونوں پر قدرت حاصل ہو۔ صرف اسی حد تک نہیں کہ دونوں زبانوں کے مطالب سمجھ میں آ جائیں بلکہ زبان کی ساخت، مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر سے بھی اچھی آگاہی ہو۔ عام طور پر اردو میں جو ترجمے دیکھنے میں آتے ہیں وہ ادھ کچرے سے ہوتے ہیں اور پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ عبارت کا لفظی ترجمہ ہوا ہے۔ کیونکہ زبان اکھڑی اکھڑی ہوتی ہے اور جملوں کی ساخت بھی انگریزی جملوں کے مطابق ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ترجمہ لفظ کا نہیں مفہوم کا کیا جاتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی بات کو اپنی زبان میں کہیے تو کس طرح کہیے ایسا انداز اپنانے سے ترجمے کے عیوب دور ہو جاتے ہیں۔ یوں تو ہر معاملے میں عقل سلیم کی ضرورت ہوتی ہے مگر مترجم کے لیے تو یہ شرط کی حیثیت رکھتی ہے عام طور پر ڈکشنری میں ایک لفظ کے کئی معنی دیئے ہوئے ہیں اب سیاق و سباق کے مطابق مترجم صحیح لفظ کا انتخاب کرتا ہے اس کے لیے استعداد اور لیاقت تو خیر ضروری ہے ہی مگر سمجھداری کی بھی بڑی اہمیت ہے مثلاً ایک جگہ ایک ترجمہ یہ دیکھا:

"I solemnly dedicate myself for the service of the nation"

''میں انتساب سے قوم کی خدمت کا عہد کرتا ہوں''

اب Dedicate کے معنی انتساب کے بھی ہیں مگر یہاں اس کا محل استعمال نہیں ہوگا۔ جنگ کے زمانہ میں ایک ترجمہ اس طرح کیا دیکھا کہ ''ہواباز بحفاظت تمام طیارے کو واپس لے آیا حالانکہ اس کی نظر کمزور تھی۔'' ''نظر کمزور تھی'' انگریزی کے ان الفاظ کا ترجمہ تھا: Theough the visibility was poor" عقل سلیم سے معلوم ہو جائے گا کہ ایسا شخص ہواباز نہیں بن سکتا جس کی نظر کمزور ہو۔ بعض دفعہ سیاق کو صحیح نہیں سمجھنے سے ترجمہ غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً

A Muslim is required to performs Haj without causing distress to his family.

''مفہوم یہ ہے کہ کسی مسلمان پر حج اس وقت فرض ہے جب اس کے فریضہ حج پر چلے جانے سے اس کے خاندان کے لوگ کسی طرح کی مالی مشکلات میں نہ پھنس جائیں'' مگر ایک مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا۔ ''خاندان کو تنگ کیے بغیر حج کو جا سکتا ہے۔'' بعض دفعہ عبارت کو صحیح نہ سمجھنے سے بالکل غلط ترجمہ ہو جاتا ہے۔ جیسے: "Hold fast to truth" کا ترجمہ سچائی کے لیے برت رکھنا۔ بعض دفعہ مترجم بالکل نااہل ہوتا ہے جیسے Outstanding Scientist کا ترجمہ باہر کھڑے ہوئے سائنسداں یا Steel Plants ''فولاد کے پودے'' اس طرح کی بہت مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

ترجمہ محض ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ خیالات اور احساسات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو اس ترتیب کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ہے کہ مصنف نے کس جگہ پر زور دیا ہے۔ کہاں پر طنز ہے، کہاں پر محاورہ یا روزمرہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں نہیں پیدا کی جاسکتیں لیکن بہت سی خوبیاں ضرور سموئی جاسکتی ہیں۔

اردو میں اچھے ترجموں کی کمی رہی ہے خصوصاً علمی اور سائنسی موضوعات میں اچھے ترجمے کمیاب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کبھی نہیں رہی، جب جامعہ عثمانیہ نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تو وہاں خاصی تعداد میں (5 سو کے لگ بھگ) کتابوں کے ترجمے ہوئے اور اب ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ تقریباً سو کتابیں ترجمہ کرائی جارہی ہیں اس سلسلہ میں مترجمین کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا۔ یعنی اصطلاحات کی کمی، اچھی انگریزی اردو ڈکشنری کی عدم موجودگی۔ عبدالحق صاحب کی ڈکشنری 1936ء میں تیار ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے لاکھوں الفاظ آگئے ہیں یا الفاظ کے معنی اور استعمال بدل گئے ہیں۔ کسی اچھے نمونے کی کمی پھر اردو کی اپنی نارسائی۔

فی الحال ترقی اردو بورڈ وسیع پیمانے پر علمی اور سائنسی موضوعات پر تراجم کرا رہا ہے اس سلسلے میں تقریباً ہر موضوع کے مترجمین کو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی وضع کردہ قدیم اصطلاحات مہیا کردی گئی ہیں لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے میں سائنس اور علوم نے اتنی ترقی کی ہے جتنی کہ پچھلے دو سو برس میں نہیں کی تھی اور نہ صرف اصطلاحوں میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے بلکہ اصطلاحوں کے معنی تک بدل گئے۔ لہٰذا عثمانیہ کی اصطلاحیں ہماری رہنما ثابت ہوسکتی ہیں اور ایک مثال کے طور پر کام دے سکتی ہیں لیکن ہمارے لیے مکتفی نہیں ہوسکتیں۔ ہمیں تو آج خود کنواں کھود کر پانی پینا ہے۔

ترجمہ ایک مستقل فن ہے جو بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ اخبار، ریڈیو اور اب تدریسی ضرورتوں کے تحت اردو ترجموں کی مانگ بڑھتی جارہی ہے ایک دو یونیورسٹیوں میں ترجمے کے شعبے کھل گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مزید یونیورسٹیوں میں شعبے کھلیں۔ اردو بورڈ کی ترجمہ کردہ کتابوں اور اصطلاحوں سے اس کام میں بہت مدد ملے گی۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کا تصور

خالد محمود خاں

جہاں کہیں زندگی ظہور پذیر ہوتی ہے وہاں ذی روح اپنا ماحول بنا لیتے ہیں۔ انسان حیوان، درندے، حشرات الارض اور دیگر قبیل کی زندہ چیزیں اپنا اپنا ماحول بناتے ہیں۔ یہ ماحول ایک بڑے ماحول، یعنی حیات کا اجتماعی ماحول کا حصہ ہوتا ہے۔ اس ماحول میں زندہ چیزوں کے علاوہ زمین، پانی، ہوا، صحرا، جنگل، پہاڑ وغیرہ بھی بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ زندگی کے اس ماحول میں جب بھی کوئی آوازیں بار بار سنی جائیں تو انہیں زندہ چیزیں اپنی یاد میں محفوظ Register کر لیتے ہیں۔ جب بھی ان کو کوئی خاص آوازیں سنائی دیتی ہیں تو یہ ان کو کسی خاص واقعہ یا چیز کی علامت سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر بادل گرجنے سے ہر قسم کی زندہ چیز یہ سمجھ جاتی ہے کہ بارش کا امکان ہے۔ وہ اسی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنی حفاظت کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے یہ آوازیں علامت سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔ یہ عمل انسان اور دیگر قبیل کے ذی روح ایک انداز میں سرانجام دیتے ہیں۔

انسان اپنی جدت پسندی اور اختراعی صلاحیت کی وجہ سے آوازوں کی ان علامتوں کو معنی بنا لیتے ہیں۔ دیگر ذی روح ان آوازوں کو خاص واقعہ یا چیز کی علامت سمجھتے ہیں۔ کوئی آواز اور اسکی علامت معنی کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ علم لسانیات Linguistics میں ان آوازوں کو "لفظ" Word کہا جاتا ہے۔ ہر لفظ کے معنی ہوتے ہیں۔ ان لفظوں کو "لغت" Diction کہا جاتا ہے۔ ان کے معنی اپنے پس منظر میں آوازوں یعنی لفظوں کے ساتھ گہر تعلق رکھتے ہیں۔ آوازیں اور ان کی علامتیں مسلسل وقوع پذیر ہوتی ہیں اس لیے مستقل شکل اختیار کر کے "لفظ" یا "لغت" بن جاتی ہے۔ اس طرح آواز کا معنی کے ساتھ رشتہ برقرار رہتا ہے۔ آواز ایک حقیقت ہے اور معنی اس کا سایہ ہے۔ یہ معانی اس آواز یا صوت کا ترجمہ ہوتے ہیں۔ جب بھی کوئی لفظ بولا یا لکھا جاتا ہے تو اس کے معانی پڑھنے یا سننے والے کے ذہن میں ترجمہ کے عمل ہی سے واضح ہوتے ہیں۔ آواز، صوت، علامت، معانی وغیرہ سب چیزیں ترجمہ کے عمل سے متعلق ہو جاتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ واقعات یا خاص مظاہر کسی خاص ماحول علاقہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ان کے اظہار کے لیے اسی ماحول یا علاقہ میں آواز صوت، علامت، لفظ یا لغت بن جاتی ہے۔مگر یہ لغت اسی ماحول یا علاقے میں محدود رہتی ہے۔مثال کے طور پر صحراؤں اور سمندروں میں ہونے والے واقعات ایک دوسرے سے مختلف ہونگے۔اس طرح ان کے اظہار کے لیے مختلف لفظ اختراع کیے جائیں گے۔صحراؤں کی لغت میدانوں اور پانیوں کے ماحول میں ترجمہ کے عمل سے قابل فہم بنائی جائے گی۔ماحول کے علاوہ مختلف معاشرے، ثقافتیں، ممالک، مذاہب، قومیں اور قبیلے اپنی اپنی لغت اختراع کرتے ہیں۔ترجمہ کے عمل کے ذریعے ان کو دوسرے، مختلف یا دور دراز لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔اس طرح کوئی علمی کارنامہ یا کرشمہ کسی ایک جگہ پر محدود رہ جانے کی بجائے ترجمہ کے عمل کے ذریعے ساری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔علم کا فیضان محدود ہونے کی بجائے لامحدود ہوجاتا ہے۔ترقی یافتہ معاشروں اور ترقی پذیر معاشروں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ معاشروں کی زبان بھی ترقی یافتہ ہوتی ہے اور ترقی پذیر معاشروں کی زبان ترقی پذیر یا شاید پسماندہ ہوتی ہے۔جس طرح ترقی یافتہ زبانوں میں سوچ اور تخلیق بہتر انداز میں سمجھائی جاسکتی ہے اسی طرح ترقی پذیر یا پسماندہ زبانوں میں اتنے اچھے انداز میں نہیں سمجھائی جاسکتی۔ترقی یافتہ زبانوں میں ایجاد اور تخلیق کو دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ترقی پذیر اور پسماندہ زبانوں میں ترجمہ کا مشکل ہونا گمراہی کی شکل بھی اختیار کرسکتا ہے۔اپنے معانی سے ہٹ کر کوئی اور شکل بھی دکھا سکتا ہے۔ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ان زبانوں کی لغت زیادہ جامع نہیں ہوتی۔اس طرح کی صورتحال میں ترجمہ نگار کی صلاحیت کا بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔جس طرح فن ترجمہ مختلف معاشروں اور ثقافتوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا ہے اسی طرح ترجمہ نگار دو مختلف زبانوں میں رابطے اور رشتے کا باعث بن جاتا ہے۔

فن ترجمہ نگاری محض "لغات Dictionary" کے مشینی استعمال کا نام نہیں ہے۔ترجمہ نگار جس فن پارے یا علمی تحریر کا ترجمہ کررہا ہوتا ہے وہ اس کی روح کو سمجھتا ہے اور گہرائی تک دسترس پیدا کرتا ہے۔اس عمل میں ترجمہ نگار کی تخلیقی، فنی اور فکری صلاحتیں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔اچھا ترجمہ نگار بہت اچھا طالب علم بھی ہوتا ہے۔وہ اصل تحریر اور ترجمہ کے علاوہ بہت چیزوں کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔مختلف ذرائع سے حاصل کیے ہوئے خیالات اور معنی اس کی سمجھ بوجھ کو بہت زرخیز اور توانا کردیتے ہیں۔کسی تحریر کا ترجمہ کرتے ہوئے وہ اپنی صلاحیتوں کا شعوری اور غیر شعوری استعمال کرتا ہے۔ترجمہ نگار کی بنیادی صلاحیتوں میں طلب علم، ذہانت، تلاش، تجزیہ اور دریافت کی صلاحیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ترجمہ محض ایک زبان کا وہ لباس نہیں ہے جسے دوسری زبان کو پہنا دیا جائے بلکہ وہ روح اور روشنی ہے جو ایک تحریر سے دوسری زبان میں منتقل کی جاتی ہے۔اچھے ترجمہ نگار کثیر المطالعہ، ذکی الحس، فہیم، محنتی اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔ترقی یافتہ معاشروں میں فن ترجمہ کی سرپرستی ان کے تعلیمی ادارے، تحقیقی ادارے اور حکومتیں کرتی ہیں اس مقصد کے لیے کافی زیادہ اخراجات بھی اٹھ لیے جاتے ہیں مگر ہمارے یہاں اس طرح کی علمی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدریں فروغ نہیں پا سکیں۔البتہ کچھ تجارتی Commercial گروہ تراجم کرنے اور کرانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں اچھے تراجم ذاتی اور شخصی سطح پر کیے گئے ہیں۔کاروباری ترجمہ نگار گروہ کسی گرما گرم Bestseller یا Hot Favourite کتاب کا جلتا ابلتا Sizzling ترجمہ کر کے کافی منافع کا کام کر لیتے ہیں۔قاری پر نہ اصل کتاب کی معنویت منکشف ہوتی ہے اور نہ ترجمہ کی کتاب میں اس کی روح منقلب ہوتی ہے۔اس طرح کے ترجمہ نگاروں کی سرپرستی بعض منافع پرست اشاعتی ادارے بھی کرتے ہیں۔

اردو زبان میں فن ترجمہ نگاری کو کبھی بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی ہے۔برصغیر میں علاقائی زبانیں بولی جاتی تھیں جو کہ اب بھی بولی جاتی ہیں۔ان میں سندھی، سرائیکی، پنجابی، براہوی، بلوچی، ہندکو، پشتو، ہندی اور دیگر زبانیں شامل تھیں۔ریاست کی زبان انگریزوں کی آمد سے پہلے فارسی تھی۔مسلمان حکمرانوں کے بعد انگریزوں نے اپنی زبان English سے ریاست کا نظام چلایا۔یہی زبان بعد میں تحصیل علم Medium of Instruction کا ذریعہ بن گئی۔انگریزوں نے ہندوستانی عوام کے ساتھ بہتر رسم و راہ بڑھانے کے لیے انگریزی سے اردو کے تراجم کا راستہ اختیار کیا۔انہوں نے یہ سب کچھ اپنی ضروریات پورا کرنے کیلئے کیا تھا۔اس کے باوجود ہندوستان کی عوام کو ان تراجم سے بہت زیادہ علمی فائدہ ہوا۔خاص طور پر فورٹ ولیم کالج نے بے مثال کردار ادا کیا۔ہندوستان میں ترجمہ کی کسی بڑی تحریک کی تاریخ موجود نہیں ہے۔چند ایک دارالتراجم کے علاوہ کوئی اہم آثار موجود نہیں ہیں۔دارالترجمہ حیدرآباد اور دارالترجمہ دہلی کے علاوہ کوئی نمایاں مثال نہیں ملتی ہے۔البتہ انفرادی سطح پر کیا ہوا کام اردو ادب کی تاریخ میں جا بجا بکھرا ہوا غیر منظم انداز میں نظر آ جاتا ہے۔اس کے باوجود اردو زبان و ادب میں ثروت مندی کا باعث ہے۔ترقی یافتہ معاشروں میں فن ترجمہ نگاری سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔دنیا بھر کے علوم کو فن ترجمہ کے ذریعے اپنی اپنی زبانوں میں پیش کیا جاتا ہے۔اس سے ان کے تعلیمی ادارے اور عوام کو بہت زیادہ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔جبکہ ہمارے ہاں تو پاکستان میں اس فن پہ خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔تعلیمی اداروں میں تراجم کے ادارے بنانا تو درکنار، خود تعلیمی اداروں کی بقاء بے شمار خطرات سے دوچار ہے۔حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے تعلیمی ادارے مسلسل زوال پذیری کا شکار ہیں۔

☆☆☆

(مشمولہ: فن ترجمہ نگاری، مصنف خالد محمود خاں)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ: اصول ومبادیات اور فنی مباحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فن ترجمہ کے اصولی مباحث

مظفر علی سید

گوئٹے کا قول ہے کہ:

"جملہ امور عالم میں، جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں، ان میں ترجمہ بھی شامل ہے"۔

لیکن گوئٹے کے مدنظر، عالمی ادب کا ایک عظیم الشان نصب العین تھا اور جیسا کہ اقبال نے "پیام مشرق" کے دیباچے میں لکھا ہے اس کے لیے مغرب و مشرق کا ادب انسانیت کا ایک مشترک سرمایہ تھا۔ چنانچہ دانتے اور حافظ، سوفوکلیز اور کالی داس میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ دیوان حافظ اور شکنتلا سے اس کی آشنائی ترجموں کے ذریعے ہوئی تھی جو زیادہ تر اس کے اپنے احباب نے کیے تھے، یہی وسیع القلبی اور کشادہ نظری اس دور کے جرمن فلسفیوں میں نظر آتی ہے، شوپن ہائر، ہرڈر بلکہ ہیگل تک میں جس نے "جمالیات" پر اپنے خطبوں میں فردوسی اور نظامی، سعدی اور مولانائے روم کی طرف اہل مغرب کو توجہ دلائی، ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان کے تراجم بھی جرمن زبان میں کسی حد تک فرانسیسی اور انگریزی میں ہو چکے تھے، یہ تو نہیں کہ گوئٹے اور اس کے ہم خیال فلاسفر شغل ترجمہ کے خلاف اس قدیم تعصب سے ناواقف ہوں، جس کے زیر اثر ظریف لوگوں کے مترجمین کے بارے میں دلچسپ جملے بنا رکھے تھے، مثلاً Traditore Traduitore جسے انگریزی میں یوں کہا گیا ہے Translators are traitors اردو میں اس کا بدل ملنا بہت مشکل ہے، لیکن عربی میں کہہ سکتا ہے ان المترجمین مخربین اور فارسی میں شاید کوئی ایرانی یہ نعرہ لگائے "ترجمہ داری تخریب کاری" در حقیقت گوئٹے اور اس کے ساتھی ادب ترجمے کے فن کو اعتبار دے رہے تھے، تقریباً اسی طرح جیسے جرمن زبان میں بائبل کا ترجمہ کر کے مارٹن لوتھر نے دیا تھا یا برطانوی بادشاہ جیمز اول کی تشویش و حمایت میں کام کرنے والی ان ۴۷ علما نے جو انگریزی میں ایک مصدقہ ترجمہ مرتب کرنے کا باعث بنے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دراصل یورپ میں مذہبی ترجمے کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی۔ سیفیہ (Septuagwt) کا یونانی ترجمہ ولادت مسیح سے پہلے ہو چکا تھا اور دوسری صدی عیسوی تک "نیا عہد نامہ" یعنی اناجیل واعمال ومکاتیب کا یونانی متن بھی جس کے متعدد اجزا سریانی سے ترجمہ ہوئے ہونگے، تیار ہو چکا تھا۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی میں مکمل بائبل کا مقابلتاً آسان لاطینی میں جو ترجمہ ہوا (جیسے Vulgate یا عام پسند کہا جاتا ہے) فن ترجمہ کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے ایک تو اس وجہ سے کہ یہ ترجمہ اس وقت کی مقبول عام زبان میں، روزمرہ استعمال کے لیے کیا گیا اور دوسرے اس کے ممتاز مترجم سینٹ جیروم کو مذہبی تاریخ میں پہلی بار ولایت کے مرتبے پر فائز کیا گیا، یہ الگ بات کہ بعد کے مترجمین میں سے لوتھر کو کلیسا سے خارج کیا گیا اور انگلستان کے ولیم ینڈبل کو شہید ترجمہ کا رتبہ نصیب ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان جو عزت وتکریم خانوادہ شاہ ولی اللہ کو ملی، اس میں بہت بڑا حصہ ان تراجم کا ہے جو شاہ صاحب اور ان کے لائق وفائق صاحبزادوں نے سپرد قلم فرمائے، لیکن ترجمے کے سلسلے میں دونوں مذاہب کے درمیان اتنا فرق ضرور ہے کہ مسلمانوں نے متن سے جدائی قبول نہیں کی اور قرآنی تراجم کو لازمی طور پر متن کے بین السطور شائع کرنا ہی مناسب سمجھا۔

مشرقی تہذیبوں میں ترجمے کی تاریخ مذہبی اور ادبی متون کے سلسلے میں کتنی قدیم ہے، اس موضوع پر کوئی تحقیق ہو چکی ہے تو کم سے کم میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن مغرب کی مثال سے یہ عمومی نتیجہ نکالنا شاید غلط نہ ہو کہ ترجمے کے فن کا مذہبی تبلیغ واشاعت کے علاوہ جدید زبانوں کی نشوونما اور قومیت کے شعور سے بہت گہرا تعلق ہے اور ان دونوں کا لازمہ ہے، تعلیم طباعت کی ترقی اور معاشرے میں درمیانے طبقے کا عروج چنانچہ آج بھی تیسری دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے کہ جہاں بھی تعلیم اور طباعت عام ہوتی ہے اور متوسط طبقہ کشمکش حیات میں شریک ہوتا ہے وہاں اور چیزوں کے علاوہ ترجمے کے فن کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے، اس لیے ترجمے کو کسی معاشرے کی روشن خیالی کا مظہر بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۲)

اور اب ترجمے کا لفظ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنے ہیں، "پار لے جانا" اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں، یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے، عربی زبان سے آیا ہے اہل لغت اس کے کم سے کم چار معنیٰ درج کرتے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر وتعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیان احوال یا تذکرہ شخصی ہے یہ سب معنیٰ باہم مربوط ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح ترجم بھی (ت کی پیش اور ج کی زیر کے ساتھ) جس کے معنیٰ ہیں: التباس کرنا، غلط ملط کرنا اور ترجم (ج کی زبر کے ساتھ) کا صفیٰ ہے، مشکوک اور مخلوط، غالباً یہ معنیٰ ان بے احتیاط مترجمین کی وجہ سے پیدا ہوئے ہونگے جن کی کسی زمانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور جو اپنی کثرت کی وجہ سے جملہ مترجمین کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، واضح طور پر سب معنیٰ ثانوی اور مراوی ہیں کہ ان کا تعلق تاریخ کے نسبتاً متمدن ادوار سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ اصلی اور قدیم معنوں کے لیے مادے کو دیکھنا ہوگا اور اس کے دیگر مشتقات کو تاکہ لفظ ترجمہ کے گرد گرد ایک معنویاتی دائرہ کھینچا جا سکے، یا زبان شناسی کی اصطلاح میں اس کو اپنے Semantic Fifld میں رکھ کر اس کی ماہیت معلوم کی جائے۔

چنانچہ ابن منظور کی مبسوط تصنیف "لسان العرب" سے رجوع ناگزیر ہے، جس نے لفظ ترجمہ و "ترجمان" کے ساتھ سہ حرفی مادے "رجم" کے تحت درج کیا ہے (جب کہ بعض جدید لغات جیسے الفرائد الدریہ اس کو چار حرفی مادے "ترجم" کی ذیل میں لاتی ہیں جو عربی زبان کے اصول اشتقاق کے مطابق نہیں، جب تک اس کی بنیاد کسی دخیل کلمے پر نہ ہو غالباً عربی کے جدید علماء لفظ "ترجمان" کو اساسی کلمہ سمجھتے ہیں۔ یونانی لفظ Dragoman کی تعریب، اس طرح ترجمہ وغیرہ کو اشتقاق معکوس یا Back Formation کہا جا سکتا ہے، ترجمے و "رجم" سے منسوب کرنے میں بڑی دقت یہ ہے کہ اس کام کو گناہ کبیرہ کے ساتھ کیوں مربوط کیا جائے اور بیچارے مترجمین کو مد شرعی کے کیسے محفوظ کیا جائے؟ بہر حال ابن منظور نے بھی جو اس مادے کے متعدد مشتقات درج کیے ہیں، ان میں سے چند ایک کا معنوی رابطہ خود اس کی نظر میں واضح نہیں۔ تاہم قتل اور سنگساری پتھر، کنکری، سنگ مزار، مزار موضع پہاڑ اونچی دکان اور مینار وغیرہ کا "رجم" سے تعلق سامنے کی بات ہے۔ دوست اور بھائی اور مصاحب کے معنیٰ جن پر کلاسیکی لغت نگاروں نے حیرت کا اظہار کیا ہے، رجم سے زیادہ Dragoman کی سمت اشارہ کرتے ہیں مشتقات رجم کے ثانوی معنیٰ با آسانی مادے سے مربوط ہو جاتے ہیں لعن طعن، سب وشتم قذف بالغیب الزام و افترا، قیاس وگمان، اتہام اور فہم کلام (کلام مرجم)۔ یہ آخری معنیٰ ایک جگہ قرآن حکیم میں بھی دیکھے گئے ہیں اور ممکن ہے۔ "ترجمہ" بطور اصطلاح اسی سے مستفاد ہو۔ البتہ ایک سوال یہ ہے کہ شیطان کو کیوں "رجم" کہا جاتا ہے لعنت کی وجہ سے؟ (مرجوم بالعنہ) سب وشتم کی وجہ سے؟ (مشوم ومسبوب) ان کنکریوں کی وجہ سے جو منیٰ میں حج کے دوران جمعرات کو ماری جاتی ہیں (مرجوم بالحجارۃ) یا شہاب ثاقب کی وجہ سے جو اس پر گرتے ہیں (مرجوم بالکواکب، وجعلنا ھا رجوما للشیاطین) خود شہاب ثاقب کو رجوم کہا جاتا ہے کہ نجوم کواکب سے الگ ہو کر کہیں نہ کہیں یا کسی نہ کسی کو جا لگتے ہیں۔

ترجمے کا تعلق اصل تصانیف سے تقریباً وہی ہے جو شہاب ثاقب کا نجوم و کواکب سے ہوتا ہے، یہ بھی اکثر اوقات ایک نہ ایک سیارے سے جدا ہو کر تاریخ کے کسی نہ کسی ریگستان میں گم ہو جاتا ہے یا پھر اپنی اصل کے دائرہ کشش ثقل میں گردش کرتے کرتے خود بھی ایک چھوٹا موٹا سیارہ بن جاتا ہے جیسا کہ فن ترجمہ کی تاریخ میں کئی بار ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چکا ہے پھر جس طرح ایک ہی سیارے سے مختلف وقتوں میں ایک سے زیادہ شہاب ثاقب نمودار ہو سکتے ہیں۔
اسی طرح مختلف ادوار ادب میں ایک ہی کلاسیکی کارنامے میں بار بار نئے ترجمے نمودار ہوتے ہیں۔ بلکہ کلاسیک تو کہتے ہیں اس کارنامے کو ہیں۔ جس کے ترجمے کی بار بار ضرورت پڑے اور جیسے کوئی بھی شہاب ثاقب حتمی اور آخری نہیں ہوتا، اسی طرح کسی بھی ترجمے کو حرف آخر نہیں کہا جاسکتا، ان ترجموں کو بھی نہیں، جن کو اپنے زمانے میں تخلیق تک سے بہتر کیا گیا ہو۔
. رسل پروست نے اپنے عہد آفریں ناول" گم شدہ وقت کی تلاش" کے انگریزی ترجمے کو اصل فرانسیسی کے فزوں تر کہا تھا۔ لیکن نصف صدی کے بعد اس کا نئے سرے سے ترجمہ کرنا ضروری محسوس ہوا۔ اس طرح لاطینی امریکہ کے مشہور ادیب گابرئیل گارسیا ماوکیزر نے اپنا زوردار ناول "ایک صدی" تنہائی کی "انگریزی زبان میں پڑھا تو اسے اصل اسپانوی زبان کی نسبت قابل ترجیح سمجھا لیکن خراج تحسین منکسر مزاج مترجم گریگری باسا کے خیال میں انگریزی زبان کو ملنا چاہیے کہ جملہ تراجم کی طرح ایک نہ ایک دن یہ ترجمہ بھی متروک ہو جائے گا، بالکل ایسے جیسے "ڈون کوئیزوٹ" کو اصل اسپانوی زبان میں پڑھا جائے تو تقریباً چار صدیاں پہلے کا یہ ناول آج بھی نسبتاً جدید محسوس ہتا ہے لیکن سروینس کے معاصرین نے اس کے جو ترجمے کیے تھے، اب خوفناک حد تک فرسودہ لگتے ہیں۔
اس لیے کہ شہاب ثاقب کی طرح، ہر تازہ ترجمہ، لوگوں پر ایک نئے سرے سے اثر انداز ہوتا ہے۔
غرض کہ ترجمے کا کوئی نہ کوئی رابطہ "رجم" سے قائم کیا جاسکتا ہے بلکہ اسی وجہ سے ترجمے کا فن بہت سے ظریفانہ اقوال کا ہدف بنتا ہے جیسے من ترجم یرجم (جس نے ترجمہ کیا، سنگسار ہوا)

(۳)

"عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے" یہ خیال تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ نے اپنی عمدہ تصنیف "مقدمہ ادب عالم" میں ظاہر کیا تھا لیکن ساتھ ہی بڑی دردمندی سے یہ ٹھوس حقیقت بھی تسلیم کی تھی کہ:

"ترجمہ نام ہے ایک سعی نامشکور کا جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے"۔

یہ فقرہ آج سے کوئی ۴۵ برس پہلے لکھا گیا تھا۔ جب کہ نوبل انعام اور دوسرے بین الاقوامی امتیازات کے خواہشمند ادیب، مترجمین کی تلاش میں سرگرداں نہیں پھرتے تھے اور نہ عالمی ادب کے تراجم مقبول عام پیپر بیک ایڈیشنوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ تاہم دیکھا جائے تو اب بھی صورتحال میں نہایت معمولی سا فرق پڑا ہے۔ شاید

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کا معاوضہ پہلے سے زیادہ ہو گیا ہو اور مترجم کا نام اب کتاب کے سرورق پر بھی چھپنے لگ گیا ہے۔ اس کے علاوہ تقابلی ادبیات کا مطالعہ دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں ہونے لگا ہے۔ (چنانچہ "پاکستانی ادب بشکل ترجمہ" ایک مضمون کے طور پر امریکہ اور کناڈا میں پڑھایا جا رہا ہے) ترجمے کا عام معیار بھی غالباً پہلے سے بہتر ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود، کم سے کم تیسری دنیا میں، جہاں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ ترجمے کو اب تک حقارت کی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی حقیر کام کم سے کم مغرب میں ایسے لوگوں نے بھی انجام دیا ہے۔ جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو تھے۔ انگریزی میں چوسر سے لے کر ڈرائیڈن، پوپ، کولرج اور براؤننگ تک اور بیسویں صدی میں لارنس، ژیٹس، پاؤنڈ، ایلیٹ، آڈن اور بیکٹ تک نے یہ کام کیا ہے۔ فرانسیسی میں بودیلیئر سے لے کر آندرے ژید تک کتنے بڑے فنکاروں نے خود کو مترجم کہلانے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی۔ (بلکہ ژید نے تو یہاں تک کہا ہے۔ کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شہکار اپنی زبان میں منتقل کرے) جرمن زبان میں گوئٹے کے علاوہ شلر اور روسی زبان میں پاسترناک کے تراجم کی اہمیت مسلم ہے۔ (گوئٹے نے آٹھ دس زبانوں میں ترجمہ کیا ہے اور پاسترناک کو شکسپئر کے عمدہ ترین مترجمین میں شمار کیا جاتا ہے) پھر یہ بھی نہیں کہ اتنے بڑے لکھنے والوں نے یہ کام محض پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا ہو یا اس کو لڑکپن کا ایک مرحلہ تربیت سمجھا ہو انہوں نے تو اپنی اپنی شخصیت کو اور شہرت کو داؤں پر لگا کر یہ کام کیا ہو۔

بیسویں صدی کے اردو ادب میں، پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے لیکر اختر حسین رامپوری، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، اور انتظار حسین نے نثری ادب کا ترجمہ کیا ہے اور اقبال سے لیکر فیض، راشد، فراق، میرا جی، مجید امجد اور شان الحق حقی جیسے شاعروں نے شعری ادب کے تراجم کیے ہیں۔ ان میں کون ہے جس نے کسی بھی دوسری شخصیت کا خیمہ بنا قبول کیا ہو۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق ادب کے مقابلے میں، ترجمے کا کام، نفی خودی کا مظہر ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ پھر یہ کام اثبات خودی کے پیامبر حضرت علامہ نے کیوں انجام دیا! شاید اس لیے کہ اسرار خودی سے ہی نہیں رموز بے خودی سے بھی ان کا رشتہ اتنا ہی گہرا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیائے اول کا اصول حیات، انفرادیت پرستی اور دنیائے دوم کا فلسفہ، زندگی اجتماعیت پرستی ہے لیکن اس کے باوجود مغربی یورپ اور امریکہ میں علمی، ادبی اور اجتماعی ادارے صدیوں سے چل رہے ہیں اور مشرقی یورپ اور روس میں انفرادی کمال اور تخلیقی امتیاز کا حصول ناممکن نہیں۔ اس کے برعکس تیسری دنیا میں نہ انفرادی جوہر درجہ کمال تک پہنچ پاتا ہے، نہ تہذیبی تعاون کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ دونوں کی جگہ ایک ناپختہ انانیت پسندی کا دور دورہ ہے۔ ایسے میں ترجمے کا کام، کسی اعلیٰ پیمانے پر، کہاں سے ہو؟ ترجمے کا تو اصل الاصول ہی تعاون ہے۔ مصنف کے تعاون، قاری کے تعاون، اصل زبان کے تعاون، اپنی زبان سے تعاون، موضوع کتاب کے خصوصی، ماہرین سے استدار بلکہ مختلف قسم کے پیشہ وروں کے تعاون کا حصول بھی لازم ہے۔ تاکہ عمومی سطح پر استعمال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونے والے اصطلاحی الفاظ کا زندہ مفہوم سمجھ میں آئے۔ ورنہ علم وادب کا رابطہ زندگی سے کٹ کر رہ جائے گا۔ چنانچہ ترجمہ ایک نہایت مشقت طلب کام ہے اور جو طبیعتیں اس کے خلاف تعصب اور مزاحمت سے کام لیتی ہیں، در حقیقت محنت سے جان چراتی ہیں۔ ایسے میں تخلیقی الہام اور آمد پرستی سے بہتر بہانہ کون سا ہو سکتا ہے۔

ترجمہ ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں۔ جو رج سٹائنز کا کہنا ہے کہ ۹۹ فیصد تراجم ناقص ہوتے ہیں (اور طبع زاد تحریریں کتنے فیصدی ناقص نہیں ہوتیں؟) پھر ترجمے کی بہت سی اقسام ہیں کہ یہ کام تو بازار سے لیکر اقوام متحدہ تک اور اخبار سے لیکر وی سی آر تک کسی نہ کسی شکل میں چلتا ہی رہتا ہے۔ چاہے محض چالو قسم کا ہو۔ عام زندگی میں بھی ترجمے کا معیار قدرے بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو فن کے طور پر نہ سہی، ایک روزمرہ ہنر کی طرح سے ہی سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کیا جا سکے۔ ان کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ محض تعلیم و تعلم سے نہیں آتا، اگرچہ اس میں بھی ایک عنصر ہنر کا ضرور ہوتا ہے جو ماہرانہ تربیت سے نکھر سکتا ہے۔ لیکن ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان تو خیر آنی ہی چاہیے۔ اس موضوع کے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور صنف ادب یا شاخ علم سے بھی، جس سے متن پیوست ہے۔ مترجم کو پیوستگی حاصل ہو، تب شاید ترجمہ چالو معیار سے اوپر اٹھ سکے۔

تاہم ترجمے کی زیریں انواع میں اتنی ساری شرائط کا اجتماع نہیں ہوتا۔ مثلاً تعلیمی اور تکنیکی ترجمہ بلکہ علمی ترجمہ بھی مصنف کی شخصیت اور مترجم کی پیوستگی پر اصرار نہیں کرتا۔ تاہم اس قسم کا ترجمہ بھی، لسانی اور علمی (یا تعلیمی اور تکنیکی) اہلیت سے بے نیاز نہیں کیا جا سکتا، تعلیمی اور تکنیکی ترجمے کے بارے میں البتہ ایک صراحت ضروری ہے کہ جس چیز کو علمی ترجمہ کہا جاتا ہے۔ یعنی نظریاتی علوم، ان کی تاریخ طرز فکر اور طریق کار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا، اس کے بغیر تعلیمی ترجمے کے بارے میں البتہ ایک صراحت ضروری ہے کہ جس چیز کو علمی ترجمہ کہا جاتا ہے۔ یعنی نظریاتی علوم، ان کی تاریخ طرز فکر اور طریق کار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا، اس کے بغیر تعلیمی اور تکنیکی ترجمہ ایسے ہے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی درآمد کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے بے پروا ہو کر کہ آیا معاشرہ اس ٹیکنالوجی کو جذب بھی کر سکے گا یا نہیں۔ در حقیقت جب تک کسی معاشرے میں ایک عمومی آگہی کی فضا پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک اجتماعی سطح پر کوئی علمی سرچشمہ وجود میں نہیں آتا۔ تب تک ٹیکنالوجی کے خریدار، خریدار ہی رہتے ہیں۔ اسکے تولید کار نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو نظام تعلیم، تحقیقی ترقیاتی (آر اینڈ ڈی) اہلیت رکھنے والے افراد پیدا نہیں کر سکتا محض رسمی تعلیم اور رسمی نصاب کے ذریعے چاہے وہ کسی زبان میں ہو دوررس نتائج کا حامل نہیں ہو سکتا۔ نصابی کتب کا ترجمہ اور طباعت، ناشرین کے سپرد ہو، تب بھی ان میں مطابقت اور ہم آہنگی کسی نہ کسی قومی ادارے کی ذمہ داری تو ہوگی۔ اس سے زیادہ نظریاتی علوم کی بنیاد جن فکری تصانیف پر ہے۔ ان کا ترجمہ تعلیمی اور تکنیکی ترجمے کے لیے ایک ایسی بنیاد فراہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے گا۔ جس کی روشنی میں نصابی تراجم کے معیار بھی ترقی کر سکتا ہے۔

(۴)

ترجمے کی دو انواع البتہ ایسی ہیں جن کے مقصد منہاج میں بظاہر شدید مخالفت کی صورتحال پیدا ہو سکے۔ یہ ہیں مشین ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ مشینی ترجمے کا مقصد ہے انسانی زبانوں میں باہمی ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا تاکہ تعلیمی اور تکنیکی، معلوماتی اور تبلیغاتی مسالہ کم سے کم وقت میں تیار ہو سکے۔ ربع صدی پہلے جب ایک "خودکار مترجم" تیار کرنے کے لیے ابتدائی تحقیق شروع ہوئی تھی تو یہ توقع پورے جوش وخروش سے کی گئی تھی کہ جلد ہی ایک ایسا آلہ ایجاد ہو جائے گا جس کے ایک طرف کسی زبان کا متن داخل کیا جائے تو دوسری طرف سے مطلوبہ زبان کا ترجمہ کھٹ سے باہر نکل آئے گا۔ اس دوران میں جدید زبان شناسی کے ماہرین نے مختلف زبانوں کے اجزائے ترکیبی کا تقابلی مطالعہ کر کے واضح کر دیا ہے کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں۔ چنانچہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کمپیوٹر میں لسانیاتی پروگرام بھرنے کے بعد بھی لسانی ماہرین کی ضرورت برقرار رہے گی اور وقت اور سرمائے کی بچت شاید پھر بھی نہ ہو سکے تاہم دنیا کے کئی ملکوں میں مزید تحقیق جاری ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ پوری طرح خودکار نہ سہی مشینی ترجمہ کسی قدر آسان ضرور ہو جائے گا تاہم اس کا دائرہ کار ایسی زبان تک محدود رہے گا جس میں زبان کو تہ در تہ معنویت کے ساتھ استعمال نہ کیا گیا ہو اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ تو ہوتا ہی ایسی تخلیقات کا ہے جو تہ در تہ معنویت کی حامل ہوں اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن قسم ہے یہاں تک کہ تاریخ ادب میں متعدد تخلیقی فنکاروں نے اسے کلیتہً خارج از امکان قرار دے دیا ہے۔ رابرٹ فراسٹ کا جملہ مشہور ہے کہ شاعری اس چیز کا نام ہے جو ترجمہ سے باہر رہ جائے۔ شیلی کے نزدیک ترجمہ کرنا ایسا ہے جیسے کسی پھول کو کیمیاوی تجزیے کا ہدف بنانا لیکن شیلی کا شمار خود اپنی زبان کے عمدہ ترین مترجمین میں ہوتا ہے ہمارے زمانے کے ایک ممتاز مترجم (جے ایم ۔ کوہین) کے خیال میں تو شیلی کے تراجم ہی سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شاعر کسی ایسے متن کو منتخب کرے جو اس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو، تو فن ترجمہ کیسی بلندیوں تک جا سکتا ہے ان ترجموں میں فاؤسٹ کے اجزا بھی شامل ہیں اور فاؤسٹ کو ناقابل ترجمہ کیا جاتا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عالمی ادب میں جس فنکار نے ترجمے کے فن کو اعتبار بخشا خود ذاتی اور انفرادی احساس کی اہمیت سب سے مافوق ہے لیکن یہ امکانات اور انفرادی احساس کی اہمیت سب سے مافوق ہے لیکن یہ امکانات کہاں تک جا سکتے ہیں اس کا اندازہ ترجمے ایک ایسے اتفاقی حادثے کا نام ہے جس کی پیش بینی نہیں ہو سکتی یہ تو ٹھیک ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بلفظ مماثلت نہیں ملتی جو با معنی بھی ہو اور درست بھی تاہم تخلیقی ترجمے کرنے والوں نے صرف ایسی مماثلتیں دریافت کی ہیں بلکہ جہاں نہیں بھی تھیں اپنے تخیل سے پیدا کر کے دکھا دی ہے چنانچہ ترجمے کی یہ قسم آزادی اور پابندی کے درمیان ایک جدلیاتی کشمکش کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب یہ تضاد داخلی سطح پر موافقت اور مطابقت کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو فن ترجمہ کی رسائی کا اندازہ ہوتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

لیکن عام قسم کا لفظ بلفظ ترجمہ جس میں اصل زبان کی زندگی مفقود ہو، یا ایسا رواں دواں اور آزاد ترجمہ جس میں اصل کی تہ در تہ معنویت قربان ہو جائے فن ترجمہ کی مشکلات سے نا آشنائی یا دانستہ گریز کا مظہر ہے۔ یہ گویا ترجمے کے جدلیات سے آسانی کا ایک راستہ نکالنے کی کوشش ہے۔ ہمارے یہاں محمد حسن عسکری مرحوم نے اس قسم کے رواں ترجمے کو جس میں اصل متن کے اسلوب بیاں کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہو اور اس کی جگہ کوئی مماثل اور متوازی اثر پیدا کرنے کی کوشش بھی نہ کی گئی ہو عالمی ادب کی یا اپنی زبان کی کوئی خدمت تسلیم نہیں کرتا اصولی طور پر ایسے ترجموں کو تلخیص یا تسلی کی ایک مشق تو سمجھا جا سکتا ہے کوئی تخلیقی کمال نہیں سمجھا جا سکتا دراصل تخلیقی سطح کا ہر ترجمہ اپنے ساتھ ایک نیا مسئلہ لے کر آتا ہے کیونکہ اس کا رابطہ ایک ایسے متن سے ہے جو اپنی زبان میں ایک مثالی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

عسکری صاحب نے ایک جگہ فرانسیسی ناول "سرخ وسیاہ" کے ترجمے میں مصنف سے بے وفائی کی معذرت کی ہے۔

وفائیں بھی لازم وملزوم نہیں ہوتی چنانچہ فرانسیسی زبان میں کہا گیا ہے (انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو)

Translation are like women: when they
are faitful, they are not beautifull,
when they are beautiful they are not
faithful.

آخر میں دو ایک باتیں ترجمے اور تہذیب کے ربط باہم پر۔ ترجمے کا فن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطہ نظر کی پیداوار بھی ہے اور ایک بین الاقوامی انداز نظر پیدا کرنے کا وسیلہ بھی۔ بشریات کے عالم مالینو سکی نے اس کو تہذیبی قوتوں کے اتحاد کا نام دیا ہے لیکن ایک تو کوئی بھی اتحاد یک طرفہ نہیں ہو سکتا دوسرے زبان کی سرحدوں کو پار کرنے کے مفاہمت باہم کی فضا پیدا کرنا کوئی آسان کام بھی نہیں عربی تعریف کے مطابق ترجمہ "نقل کلام" کو کہتے ہیں۔ نقل مطالب یا نقل معانی کو نہیں اور "نقل کلام" کا تقاضا یہی ہے کہ جس زبان میں نقل ہو جائے اس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں ہوا تھا اور یہ بھی لازم ہے کہ کلام سے مکالمے کی صورت پیدا ہو ورنہ ترجمے کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔

دوطرفہ اثر یعنی اثر پذیری اور اثر انگیزی کی مثال ہے یونانی علوم کی منتقلی مسلمانوں میں مسلمانوں کے علوم کی منتقلی یورپ میں جو حران کے نصاریٰ اور اندلس کے یہودیوں کی وساطت سے ہوئی آج ہم جملہ علوم وفنون درآمد کرنے پر لگے ہوئے ہیں اور شاید یہ بھی سمجھتے ہوں کہ تہذیبی سطح پر ہمارے پاس برآمد کی کوئی چیز نہیں اگر سچ مچ ایسا ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر تو ہم کسی دوسری تہذیب کے تخلیقی کارنامے کو اپنی زبان اور اپنی تہذیب میں جذب بھی نہیں کر سکتے۔ بین الاقوامیت قومی کی نفی نہیں، اقوام عالم کے درمیان افہام وتفہیم پیدا کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح ترجمہ بھی اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے تشخص کو اور اسکی اجتماعی خودی کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ اسی کی تعمیر وترقی کے لیے یہ ساری مشقت قبول کی جاتی ہے۔

چنانچہ جذب وانجذاب کی یہ کشمکش جب تک ترجمے میں جلوہ گر نہیں ہوئی اس وقت تک ترجمے کی کوئی تہذیبی اہمیت نمودار نہیں ہوسکتی۔ ترجمے سے خوفزدہ ہونے کی بجائے ہمیں تو اس تنگ نظری سے خوفزدہ ہونا چاہیے جو اثر انگیزی کا دعویٰ تو رکھتی ہے لیکن اثر پذیری کو حرام سمجھتی ہے۔

اور اب خاتمہ کلام کے طور پر "گوئٹے" کا ایک اور اقتباس:

> "ہمارے مترجمین اپنی زبان کے محاورے کے بے حد احترام کرتے ہیں اصل کارناموں کی روح کو گرفت میں لانے سے کہیں زیادہ کسی مترجم کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کی موجودہ حالت کو برقرار رکھنے پر مصر ہے اور اس کو غیر زبان سے کوئی زوردار اثر قبول نہ کرنے دے، لازم ہے کہ یہ زبان کی مدد سے اپنی زبان میں وسعت اور گہرائی پیدا کی جائے ابھی تک صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکا کہ یہ بات کہاں تک ممکن ہے اور کوئی بھی زبان کی حد تک اپنی ہیئت کو تبدیل کرسکتی ہے لیکن ترجمے کے ذریعے یہ کوشش جاری رکھنا ہر مترجم کا فرض منصبی ہے"۔

☆☆☆

(مشمولہ:: اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی (مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کے اصول

سیّد باقر حسین

ابھی چند روز کی بات ہے کہ میں نے ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ شروع کیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ایک بحرِ بے کنار ہے اور میں ایک چھوٹی سی کشتی چپو کی مدد سے چلا رہا ہوں۔ قدم قدم پر زبردست لہریں ملتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشتی اب ڈوبی اور تب ڈوبی لیکن کوشش اور ہمت ابھی تک سہارا دیتی رہی ہے۔ کہنے کو تو یہ محض استعارہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری دلی کیفیات کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔

چند ہفتے قبل تک میں اُن لوگوں میں تھا جو اُردو کو ایک بہت گرانمایہ زبان سمجھتے ہیں اور اسے ہر خیال کو ادا کر سکنے کے قابل تصور کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس ترجمے کے کام نے مجھے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر دیا ہے اور اب میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُردو کی گرانمایگی صرف شعر و ادب اور اس مخصوص درباری تہذیب تک ہے، جو ہمارے پیشرو ہمارے لیے ورثہ میں چھوڑ گئے ہیں۔

میں اکثر حیران ہوا کرتا تھا کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اپنی زبان کیوں نہیں بول سکتا اور کیوں اسے تقریباً ہر جملے میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ اب سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو میں ابھی تک وہ الفاظ ہیں ہی نہیں جو مغرب سے آئے ہوئے خیالات کو ادا کر سکیں۔

اور یہ بات کچھ اصطلاحات ہی تک محدود نہیں ہے، اُردو میں اصطلاحات کا نہ ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ جب علوم و فنون ہی نہیں تو اصطلاحات کہاں سے آئیں گی غضب تو یہ ہے کہ ترقی یافتہ زبانوں میں جو عام بول چال کے الفاظ ہیں ان سب کے مترادفات بھی اردو میں موجود نہیں ہیں۔ شاید بعض لوگوں کو یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہو ان کی تشفی کے لیے صرف تھوڑے سے ایسے عام الفاظ دیے جاتے ہیں جن کے مترادفات کم از کم میری دانست میں اردو میں اب تک موجود نہیں ہیں:

Confidential, Vulnerable, Public, Explosive, Civil, Sleek,

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Manning, Streamlined, Mood, Graceful, Policy.

اس قسم کے الفاظ کی سیکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔لیکن میرے دعوے کے ثبوت کے لیے غالباً اتنی ہی کافی ہیں۔

میں ان کوششوں سے بے خبر نہیں ہوں جو ریاست حیدرآباد مرحوم میں درسی اور غیر درسی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی گئی ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اصطلاحی اور غیر اصطلاحی الفاظ کی فرہنگیں بھی مرتب کی جاچکی ہیں۔لیکن ان کوششوں کا دائرہ اثر زیادہ تر حیدرآباد ہی تک محدود رہا اور جو الفاظ اور اصطلاحات حیدرآباد میں بالعموم استعمال کیے جاتے تھے، حیدرآباد سے باہر ان کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔لہٰذا یہ کہنا زیادہ غلط نہیں کہ حیدرآباد الفاظ اور اصطلاحات اُردو میں عام طور پر کبھی رائج نہیں ہوسکے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اُردو کی بجائے کسی اور زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کے حق میں ہوں۔ یا اردو کی کم مائگی کا ذکر بطور استحقار کر رہا ہوں۔نہیں یہ اردو کی محبت ہی ہے جو مجھے نہایت افسوس کے ساتھ صاف گوئی پر مجبور کر رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے۔کہ ہم سب اظہار مطلب کے لیے انگریزی کے اس درجہ دست نگر ہیں۔

یہاں ایک ممکن غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔اُردو کی تہی دامانی سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس میں امکانی قوتوں کا بھی فقدان ہے یا یہ کہ اس میں ترقی کی گنجائش ہی نہیں۔ایسا سمجھنا بالکل خلاف واقعہ ہوگا۔اُردو کے بڑے ماخذ تین ہیں۔عربی، فارسی اور ہندی اور ان تینوں میں کم و بیش ایسی خصوصیات ہیں جو ترجمے کے کام میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔عربی کی قواعد کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک ہی لفظ کے بہت سے الفاظ بنائے جاسکتے ہیں۔فارسی زبان اپنی لطافت، اور شیرینی اور شعریت کی وجہ سے ترجمے میں چار چاند لگا دیتی ہے اور بعض اوقات ہندی سے بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو اپنی گویائی کے لحاظ سے لاجواب ہوتے ہیں۔جس زبان کو تین تین زبانوں کی امداد حاصل ہو اس میں ترجمہ کرنے کا کام بہت دشوار نہیں ہونا چاہیے۔

ترجمے کے کام میں انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔سینکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہو کر اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کا ترجمہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔وہ بلاتکلف اُردو کے الفاظ کی طرح استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ایسے الفاظ کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔لیکن بہت سے انگریزی الفاظ ایسے ہیں، جو باوجود پشتوں سے استعمال ہونے کے ابھی تک اردو کا جز نہیں بن سکے اور ان کا بدیسی پن صاف نظر آتا ہے۔ایسے الفاظ کی دو قسمیں ہیں اول وہ جو ہو بہو یا اردو لب و لہجہ کے مطابق خفیف ترمیم کے ساتھ اپنائے جاسکتے ہیں مثلاً

تکنیک Technique اسٹوڈیو Studio

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رومان Romance	اسٹنزا Stanza
سانیٹ Sonnet	پروپیگنڈا Propaganda
پوزیشن Position	میکانیکی Mechanical

اور دوسرے وہ جو اُردو سے بالکل میل نہیں کھاتے۔ ایسے الفاظ کے مترادف تلاش کرنے پڑینگے۔

الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے علٰیحدہ علٰیحدہ اصول ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ کرنے میں میری رائے میں مندرجہ ذیل اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔

(۲) حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے۔

(۳) سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے۔

ترجمے کا صحیح ہونا بہرحال ضروری ہے، کیونکہ جو تصور اصل میں ہے وہ اگر نقل میں ادا نہیں ہوتا یا اصل کی سی شدت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو ایسا ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہوسکتا۔

ترجمے کا حتی الامکان عام فہم ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر ترجمے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ ترجمے کا مقصد تو یہ ہے کہ عوام کو ان تصورات سے روشناس کرایا جائے جو اصل میں موجود ہیں اگر ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کے معنی معمولی تعلیم یافتہ طبقہ نہ جانتا ہو تو وہ ان تصورات کو کیا سمجھے گا؟

ترجمے کے سبک اور خوبصورت ہونے کی شرط زیادہ تر جمالیات کے نقطۂ نگاہ سے ہے۔ لیکن اس کا ایک عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ بھدا یا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنے سے بیان میں اُلجھاؤ اور گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور مطالب کے اظہار اور تفہیم دونوں میں دشواری ہوتی ہے لہٰذا ترجمے کا مقصد یوں بھی جیسا چاہیے پورا نہیں ہوتا۔

ان تینوں شرائط پر برابر توجہ دینا مشکل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا ترجمہ سب شرطوں پر پورا اُترے۔ مثال کے طور پر انگریزی کا لفظ Blast لیجیے۔ اصطلاح میں اس لفظ کے معنی ہیں ''ہوا کا سخت جھونکا جو بم گرنے کے بعد چلتا ہے۔'' اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بعض اوقات عمارتیں تک گر جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ لفظ ''جھونکا'' اس سارے مفہوم کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جھونکا اصل میں لفظ (Gust) کا ترجمہ ہے۔ میں نے بہت سوچا لیکن ''ہوائی تھپیڑے'' کے سوا اور کوئی لفظ Blast کا مترادف نہیں مل سکا ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ نہ تو سبک ہے اور نہ خوبصورت، لیکن چونکہ باقی دو شرطوں پر پورا اُترتا ہے، یعنی صحیح اور عام فہم ہے، اس لیے مجبوراً اسی کو اختیار کرنا پڑا۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے عربی کے مقابلے میں فارسی الفاظ اُردو دانوں کے لیے زیادہ عام فہم ہوتے ہیں، اور سبک اور خوبصورت بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فارسی	عربی	انگریزی
تپش پیما	مقیاس الحرارت	Thermometer
بلند آواز	مکبر الصوت	Loud speaker
آتش کش	قاطع النار	Fire-extinguisher
پرواز	طیران	Flight
تراشہ	قطعہ	Cutting

لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔ بعض اوقات عربی ترجمے بھی نہایت سبک اور حسین ہوتے ہیں، مثلاً:

معجل Urgent قاصد Messenger تقدیم یا تقدم Priority

استقلال یا تصدیق یا تصویب (محل استعمال کے مطابق Confirmation

تلبیس Camouflage عکاسی Photography

کبھی کبھی عربی اور فارسی کی آمیزش سے بہت خوبصورت ترجمہ ہوسکتا ہے، مثلاً

طیارہ بان Pilot طیارہ برد Air-borne

خیراندیش Good-will

یہ ضروری نہیں (اور کوئی اچھی بات نہیں) کہ ہر لفظ کا لفظی ترجمہ کردیا جائے۔ اصل عبارت میں اکثر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول رکھتے ہیں اور ایک خاص تلازمۂ خیال پیش کرتے ہیں۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کرکے ان کے مترادف الفاظ رکھ دیے جائیں تو نتیجہ اکثر مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ Labour کا ترجمہ عام حالات میں محنت یا مشقت کرنا ٹھیک ہے لیکن کہیں اسپتال کے Labour Room کو محنت یا مشقت کا کمرہ نہ کہہ دیجیے گا۔ اسی طرح اگر I have to recruit about 500 labour کا ترجمہ آپ یوں کریں کہ مجھے تقریباً ۵۰۰ محنت بھرتی کرنی ہے، تو ممکن ہے آپ مترجم سمجھے جائیں لیکن معقول آدمی سمجھے جانے میں ذرا شک ہے۔

الفاظ کا ترجمہ کرنا پھر بھی نسبتاً آسان ہے، لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو تضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو، اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوب اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے اور یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں، تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:۔

The common interests of mankind are numerous and weighty, but our existing political machinery obscures them through the scramble for power between different nations and different parties.

لفظی ترجمہ:۔

انسان کے مشترک مفادات کثیر اور وزنی ہیں، لیکن ان کو ہماری موجودہ سیاسی مشینری مختلف قوموں اور جماعتوں کے کشاکش اقتدار کے ذریعہ دھندلا کر دیتی ہے۔

بامحاورہ ترجمہ جو حتی الامکان تحت اللفظ ہے:۔

انسان کے مشترک مفادات کثیر اور وزنی ہیں، لیکن ہماری موجودہ سیاسی مشینری کچھ ایسی ہے کہ اس میں مختلف قوموں اور جماعتوں کے درمیان حصول اقتدار کے لیے کشاکش ہونا ضروری ہے۔ اور یہ چیز اُن مفادات کی اہمیت گھٹا دیتی ہے۔

اس ترجمے کی پہلی مثال صرف کہنے کو اُردو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سولا ہیٹ کو ترکی ٹوپی کے قالب پر زبردستی چڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری مثال میں کچھ الفاظ اپنی طرف سے بڑھائے گئے ہیں اور جملے کے آخری حصے کی ساخت کس قدر بدل دی گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرا جملہ اُردو کا معلوم ہوتا ہے اور سمجھ میں بھی آسانی سے آتا ہے۔

ہر زبان کے الفاظ میں ایک وزن اضافی ہوتا ہے۔ بظاہر اکثر الفاظ ہم معنی نظر آتے ہیں اور ایک ہی لفظ کے کئی معنے ہوتے ہیں۔ لیکن گہری نظر ڈالنے سے ان الفاظ یا معانی میں نازک امتیازات قائم کیے جا سکتے ہیں بلکہ اکثر یہ امتیازات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اردو میں بظاہر ہم معنی ہیں۔

عریاں۔ برہنہ۔ ننگا۔

لیکن ان کے محل استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت فرق ہے۔ لفظ ''برہنہ'' میں حقیقت اتنی بے لباس نہیں ہے۔ جتنی کہ لفظ ''ننگا'' میں ہے، اور لفظ ''عریاں'' میں اس سے بھی کم ہے۔ اگر کہا جائے کہ ''بچہ ننگا ہے'' تو یہاں اس لفظ کا استعمال بالکل بامحل ہے۔ خیال فرمایئے کہ ''بچہ برہنہ یا عریاں ہے'' کہنے میں کس قدر ثقل آ گیا ہے۔ اس سے ہی بہت پائی جاتی ہے! لیکن جب مرد یا عورت کا ذکر آئے گا تو بہ لحاظ حاجت ستر لفظ ''برہنہ'' یا ''عریاں'' استعمال کرنا بالکل درست ہوگا۔ البتہ اگر پاگل مرد یا عورت کا معاملہ ہو تو اس کو عریانیت کا تیسرا درجہ دینے میں کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرج نہیں۔ مطلق الفاظ کا ترجمہ ہو، یا عبارت کا، اس ''وزن اضافی'' کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہو چکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص وقت نہیں ہوتی لیکن اردو ابھی تک زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے۔ لہٰذا ترجمہ کرنے میں ایسے جملوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا بہتر ہوتا ہے اور یہ ٹکڑے مناسب حروف عطف کی مدد سے آپس میں جوڑے جا سکتے ہیں۔ مثال

Provision will also have to be made for the construction of baffle walls designed to afford protection against the blast and splinter effects of a 500 lbs. General purposes Bomb falling at a distance of not less than 50 feet.

انگریزی کا یہ جملہ باوجود اتنا لمبا ہونے کے Simple ہے۔ Compound یا Complex نہیں ہے۔ لیکن اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے اس کے دو ٹکڑے کر لینا مناسب ہوگا، اس طرح۔

۵۰۰ پونڈ کے ایک ہمہ مقصد بم کے کم از کم ۵۰ فٹ پر گرنے سے جو ہوائی تھپیڑا پیدا ہوتا ہے اور پرخچے اُڑتے ہیں (حصہ نمبر ۱) اُن کے اثرات سے عمارات وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے لیے حفاظتی دیواروں کی تعمیر کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔ (حصہ نمبر ۲)

ترجمہ کرنے میں اکثر یہ مشکل آ پڑتی ہے کہ بہ مقابلہ ترقی یافتہ زبانوں کے اردو میں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی سہولت تقریباً مفقود ہے۔ مثال دیکھیے۔

The hygienic siting and spacing of new buildings in a crowded area presents a difficult problem.

اس جملے کا ترجمہ کرنے میں دشواری صرف یہ ہے کہ اُردو میں Site اور Space کے مترادفات تو موجود ہیں لیکن انہیں آسانی کے ساتھ Siting اور Spacing میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مجبوراً نئے الفاظ گھڑنے پڑیں گے چنانچہ میری کوشش ملاحظہ ہو۔

گنجان علاقے میں نئی عمارات کی صحت مندانہ نہائش اور فصل آرائی ایک مشکل مسئلہ ہے۔ اس جملے کا سیدھا سادہ ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

گنجان علاقے میں نئی عمارتیں کہاں کہاں اور کتنے فاصلے پر بنائی جائیں، یہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔

لیکن ایسا ترجمہ اُردو کے حق میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ Siting اور Spacing تشنۂ ترجمہ رہ جاتے ہیں۔ اگر زبان کو وسیع بنانا ہے تو نئے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ترجمے میں بھی نئے الفاظ وضع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے چاہئیں۔

سطور بالا سے عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے حسب ذیل اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں:

(۱) ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے۔اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔

(۲) ترجمہ حتی الامکان محاورہ زبان کے مطابق ہونا چاہیے۔

(۳) الفاظ کے وزن اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تا کہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔

(۴) حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اُردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے، خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو۔

(۵) اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہو، تو ایسی صورت میں جملے کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

زیادہ غور کرنے سے شاید اور اصول قائم کیے جاسکیں۔لیکن موٹے موٹے اصول یہی ہیں۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن

سہیل احمد خاں

بہتر ہوگا کہ اس مضمون کی حدود کا شروع ہی میں ذکر کر دیا جائے۔ اس تحریر کا مقصد نہ تو اردو میں تراجم کا تاریخی جائزہ پیش کرنا ہے اور نہ ہی انفرادی طور پر مختلف تراجم کا تجزیہ مقصود ہے۔ یہ مضمون براہ راست ترجمے کے نظری مباحث سے منسلک ہے اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ترجمے کے جواز، اس کی اہمیت اور مختلف ترجمہ کرنے والوں کے عمومی رجحانات کا جائزہ لیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک دوسری حد بندی یہ کی گئی ہے کہ صرف تخلیقی ادب کے تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔ صحافتی ترجمہ، فلسفہ، نفسیات اور دوسرے علوم کے ترجمے اس مضمون کے دائرے سے باہر سمجھے گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عمومی طور پر ترجمے کے بارے میں بیان کی گئی بعض باتیں ان چیزوں کے تراجم پر بھی منطبق کی جا سکتی ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کو سب سے پہلا سوال تو خود سے یہی کرنا چاہیے کہ ترجمے کا جواز یا اس کی اہمیت کیا ہے۔ اگرچہ خود تخلیقی ادب کے نمائندے بھی اکثر صورتوں میں اپنی تخلیق کے جواز سے باہر نہیں ہوتے اور تحریک تخلیق کے دباؤ کے تحت ادب تخلیق کرتے ہیں۔ محمد حسن عسکری کے لفظوں میں ''سچا فن کار ستارے ڈھونڈنے نہیں نکلتا اس کے لیے اس کا بادبان ہی ستارہ ہے۔ فن کار فن کی تخلیق پر مجبور ہے یہ اس کی کوئی باطنی ضرورت ہے۔ اس بنیادی سچائی کو آپ مختلف نفسیاتی، عمرانی یا جمالیاتی اصطلاحوں میں بیان کر سکتے ہیں اس سے اس کی سچائی ختم نہیں ہوتی۔ ترجمہ چونکہ تخلیق سے علیحدہ چیز ہے اور انسان شعوری طور پر کسی متن کو اپنی زبان میں منتقل کرتا ہے اس لیے ترجمے کا جواز عموماً جو سمجھا جاتا ہے۔ یوں اگر دیکھیں تو یہ جواز خود تراجم کے اندر موجود ہوتا ہے مثلاً آپ نے دیکھا ہوگا کہ پابندیوں کے خلاف زمانے میں ایسے افسانوں اور ایسی نظموں کے تراجم زیادہ ہونے لگتے ہیں جن میں پابندیوں کے خلاف باغیانہ لہجہ یا جبر کا احساس نمایاں ہو۔ ایسی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ادیبوں کی یہ روحانی ضرورت بن گئی ہے یا وہ شعوری طور پر تہذیبی اور سماجی صورت حال کے پیش منظر میں ایک خاص نوع کی تخلیقات سے دل چسپی لینے پر مجبور ہیں وہ باتیں جو خود نہیں کر سکتے انہیں ترجموں کی زبان سے ادا کر رہے ہیں۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح کے تراجم خود ان ادیبوں کے گرد کھڑے جبریت کے حصار کو کسی حد تک توڑتے ہیں اور قاری بھی صورت حال کے بعض گوائف کو ان میں پہچان کر ایک حد تک ان کے ذریعے جبر و احتساب کی فضا سے نکل آتا ہے۔ اس لحاظ سے ان تراجم کا جواز اصل تخلیقات کے بعض موضوعات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس جواز کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ ترجمے کا لازمی یا اکلوتا جواز نہیں بعض ادبی حلقے اس چیز کو ترجمے کا واضح جواز سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جو ترجمے یہ جواز نہیں رکھتے وہ سرے سے غیر ضروری ہیں۔ یہ بالکل خاص طریق کار ہے جس طرح ادب پوری انسانی زندگی اور جذبوں اور افکار کی ہمہ گیر شکلوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح ترجمہ بھی صرف چند جذبوں اور انسانی زندگی کی چند ضرورتوں تک محدود نہیں رکھا جا سکتا اسی سلسلے میں ترجمے پر ایک اعتراض یہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کے ذریعے بعض مضر قسم کے اثرات ہماری تہذیبی زندگی پر رونما ہو سکتے ہیں۔ اس اعتراض میں بھی کچھ سچائی ہو سکتی ہے مگر جس طرح کی حفاظتی دیوار ادب کے چاروں طرف کھڑی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کیا وہ معاشرے کے دوسرے شعبوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ اس طرح کی مصنوعی دیوار موجودہ دنیا میں کتنے دن کھڑی رہ سکتی ہے۔ اگر کسی معاشرے کی تہذیبی بنیادیں مضبوط ہیں تو وہ باہر سے آنے والے اثرات کا تجزیہ کر کے ان کو اپنی تہذیبی اوضاع کے معیار پر پرکھ کر رد یا قبول کر سکتا ہے صرف خطرے کا اعلان کر کے ان خطرات کے نفوذ سے بچا نہیں جا سکتا۔ یہ ضروری ہے کہ باہر سے آنے والے افکار کا تجزیہ ہوتے رہنا چاہیے مگر اس کے لیے جس علمی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے آنکھیں چرا کر سطحی الزام تراشی میں عافیت تلاش کی جاتی ہے۔ اس پس منظر کی طرف اشارہ اس لیے ضروری تھا کہ ترجمہ کرنے والے اپنے منصب کے بارے میں خود بھی سوچیں اور اپنی کاوشوں کا تہذیبی پس منظر میں بھی ادراک کریں۔

ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ترجمے کو اپنی زبان کے ادب میں ایک غیر فطری سا اضافی عنصر سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ترجمہ ہمارے ادب کے خمیر میں شامل ہے۔ تخلیق ادب کی عظمت کو تسلیم کرنا ضروری ہے مگر یہ کہنے سے تخلیق ادب کی عظمت کی نفی نہیں ہوتی کہ تخلیقی ادب کی بہت سی اعلیٰ شکلوں کے پیچھے ترجمے یا اخذ شدہ چیزوں کی چمک بھی موجود ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگ اس حقیقت کا شعوری طور پر احساس رکھتے ہیں کہ کلاسیکی اردو نثر کا بیشتر سرمایہ تراجم یا اخذ شدہ تحریروں کی ذیل میں آتا ہے۔ ''باغ و بہار'' ہو یا ''بوستان خیال'' کے دائرے کی داستانیں یا ''داستان امیر حمزہ'' ''آرائش محفل'' ''بتیال پچیسی'' ''مذہب عشق'' ''سنگھاسن بتیسی'' غرض کہ ہمارا قابل قدر نثری سرمایہ اخذ یا ترجمے کی شکل میں ہے البتہ اس وقت کی تہذیبی فضا میں ترجمہ کرنے والے کے لیے آزادی یہ تھی کہ وہ قصہ بیان کرتے وقت بہت سی چیزوں کا اپنی طرف سے اضافہ بھی کر سکتا تھا۔ بہرحال یہ اور اس طرح کی مشہور نثری تصانیف جو در اصل تراجم ہی ہیں اسی شاندار اسلوب میں لکھی گئی ہیں کہ اردو کے نثری اسالیب کا عظیم ترین معیار بھی یہی ہیں۔ اردو ناول کے ابتدائی نمائندوں نذیر احمد، سرشار اور شرر کے ہاں بھی اخذ شدہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مواد بہت ہے۔شاعری میں آزاد اور حالی کی جدید شاعری بھی اسی رجحان سے پھوٹی۔افسانے کے ابتدائی نمائندوں میں سجاد حیدر یلدرم کی ''خیالستان'' کا بیشتر مواد ترکی ادب سے ماخوذ ہے۔جدید اردو افسانے کے قارئین اس بات سے تو باخبر ہی ہوں گے کہ سعادت حسن منٹو کی ابتدائی شہرت روسی اور فرانسیسی افسانوں کے تراجم سے ہوئی۔ ظاہر ہے یہ مثالیں صرف عمومی اثر قبول کرنے کی نہیں براہ راست اخذ و ترجمہ سے متعلق ہیں۔اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ترجموں کا دھارا ہمارے ادب کی کھیتیوں کو کس کس طرح سیراب کرتا رہا ہے۔

اب کچھ باتیں ترجمہ کرنے والے کے مزاج کے بارے میں۔ترجمہ خود پسندی کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہاں بعض اوقات ادیبوں کی نرگسیت انہیں تراجم کی طرف مائل کرتی ہے مگر اصولی طور پر ترجمہ نرگسیت اور خود پسندی کی ضد ہے کیونکہ ترجمہ کسی دوسرے شخص کی تخلیق سے رابطہ قائم کرنے کا نام ہے اسی بات کو اردو میں ہومر کے مترجم محمد سلیم الرحمٰن نے ایک مرتبہ یوں کہا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کے مزاج میں اطاعت ہونی چاہیے۔ظاہر ہے متن کی اطاعت قبول کیے بغیر اچھا ترجمہ کیسے ہوسکتا ہے گو بہت سے مترجم ایسے بھی ہیں جو متن کے کان مروڑ کر بھی عمدہ ترجمہ کر لیتے ہیں (یہ مثالیں آگے چل کر آئیں گی) مگر بنیادی طور پر اطاعت اور وفاداری کا اصول مترجم کی سرشت میں ہونا چاہیے اور شروع میں تو لازمی طور پر ہونا چاہیے۔انکساری تو ہر ادبی کام کے لیے ضروری ہے مگر ترجمہ کرنے والا تو اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کسی دوسرے کی تخلیق کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ایک طرح کی انکساری ہی ہے۔ترجمہ کرنے والے کا اصل مقصد ادبی اسالیب میں تازگی پیدا کرنا یا کسی دوسری زبان کے کسی شاہکار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ہے اپنے آپ کو نمایاں کرنا نہیں ہاں یہ کاوش از خود اس کو بھی کسی انداز سے نمایاں کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔صحیح ادبی مترجم خود کو گمنامی کے لیے بھی تیار رکھتا ہے۔روایتی تہذیبوں میں تو شہ کاروں پر فن کاروں کے نام تک نہیں ہوتے تھے۔ہماری ادبی تاریخوں میں بھی ترجمہ نگاروں کو چاہیے زیادہ جگہ نہ دی گئی مگر اکثر انہی کی کاوشوں سے ان فنکاروں کی بنیاد اٹھی جن کے ذکر سے یہ تاریخیں بھری ہوئی ہیں۔حقیقت پسند افسانے کے ساتھ ساتھ جو افسانوی تراجم ہوئے ان میں سے اکثر ترجمہ کرنے والے جیسے عبدالقادر سروری، پروفیسر مجیب جلیل قدوائی، خواجہ منظور حسین کے نام اب کم ہی لوگوں کو یاد ہوں گے۔مگر ان لوگوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ اردو افسانے کے لیے عمدہ نمونے فراہم کیے جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی بلکہ میں تو بعض اوقات یہ سمجھتا ہوں کہ آج کل جدید علامتی افسانہ جس طرح چند برسوں ہی میں بعض اسالیب سے ٹکرانے لگا ہے کہیں اس کا ایک سبب یہ تو نہیں کہ اس کے متوازی اس طرح کے افسانوں کے ترجمے کی کوئی مضبوط روایت موجود نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ تخلیقی فن کار خود باہر کے اچھے افسانہ نگاروں کو پڑھ نہیں سکتے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والے اس طرح کی تخلیقات کے لیے فضا ہموار کر دیتے ہیں ورنہ حقیقت پسند افسانہ نگار یہی ترجمے پڑھ کر ہی افسانے تو نہیں لکھتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مترجم کے مزاج کے بارے میں آخری بات یہ کہ اسے اس زبان پر مہارت ہونی چاہیے جس سے وہ ترجمہ کررہا ہے اور خود اپنی زبان پر بھی۔ یہ بہت بیش بہا، افتادہ، متنوع اسالیب سے واقف ہوتا کہ ہرقسم کے اسلوب کے لیے کوئی متبادل اسلوب تلاش کر سکے۔ بہت سے ترجمہ کرنے والے ایک سے ہوتے ہیں اور ہر اسلوب کو اپنے بنے بنائے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس طرح کے ترجموں میں گھٹن پیدا ہوتی ہے اور مدتوں کے بند کمروں کی سی فضا ان میں رچ جاتی ہے۔ مترجم اس صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے جب کسی خاص اسلوب کے لیے ایسا پیرایہ استعمال کرے جو اس کے لیے موزوں ہو۔ میراجی نے ایڈگر ایلن کی نظموں کے جو تراجم کیے ہیں ان کے اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> ''اس مضمون کے ساتھ ساتھ جو ترجمے دیکھیں گے ان میں سے اکثر میں ہندی بہتر استعمال کی گئی ہے جو فارسی میں نہ تھی لیکن اردو والوں نے ہندی سے لے کر اپنالی۔ یہ ڈھیلی ڈھالی بحر (جس میں ضرورت کے وقت ایک تیزی بھی پیدا کی جاسکتی ہے) نہ صرف موسیقی گیتوں کے لیے بہت موزوں ہے بلکہ خواب دیکھنے والی طبائع سے ایک فطری مناسبت رکھتی ہے چنانچہ میرتقی میر کی اکثر غزلوں میں (اور اچھی غزلوں میں خصوصاً) آپ اسی بحر کو پائیں گے پھر ترجموں میں بھی اس بحر کا زیادہ استعمال ہونا اس کی خواب آلود ذہانت کی نسبت سے ہے۔'' دھیرے
>
> ، دھیرے، دھیرے، دھیرے، جیون ندی بہتی جا۔

ممکن ہے کوئی دوسرا مترجم ''پو'' کی نظموں کے لیے کوئی دوسری بحر منتخب کرلے مگر دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ میراجی نے پو کی خواب آلود ذہانت کی مناسبت سے بحر منتخب کی ہے۔ یہ چیز بھی عیاں ہے کہ اگر کوئی دوسرے انداز کا شاعر ہوتو اس لیے اسلوب بھی اسی انداز کا لانا ہوگا۔ ظ انصاری نے پوشکن کی نظموں کے جو تراجم کیے ہیں ان میں اردو کے مختلف شعری اسالیب سے ان کی واقفیت کس طرح مددگار رہی ہے اسے آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔

کہیں غالب کا اسلوب کام آیا کہیں نظیر کا۔ کہیں مثنوی نگار شعراء کا اور کہیں فیض کا۔ نثری ادب سے بھی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ محمد حسن عسکری نے میلول کے ناول موبی ڈک کا جو ترجمہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ انگریزی کے ساتھ اردو کے مختلف نثری اسالیب سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے اس ناول میں بے شمار اسالیب گلے ملے ہیں اور عسکری صاحب نے بھی اردو کے اتنے اسالیب گھلا ملا دیے ہیں کہ خوش گوار سی حیرت ہوتی ہے۔ ریڈ انڈین کے دور کے لیے جو اسلوب منتخب کیا گیا اور اسے جس طرح پورے ترجمے میں نبھایا گیا ہے دیکھنے کی چیز ہے۔ اس ناول کا ایک باب ہے جس میں مختلف قوموں کے جہازی، جہاز کے عرشے پر شور مچاتے دکھائے گئے ہیں۔ صرف اسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب کو دیکھ لیجیے اس میں مختلف قوموں کے ملاحوں کی رعایت سے کتنے اسالیب گھلا ملا دیئے گئے ہیں۔ موبی ڈک کے ترجمے سے بہتر نثر جدید دور کے کسی اردو ناول میں مشکل ہی سے ملے گی مگر میرا وہ زمانہ نہیں اور اب ترجمے کا خانہ الگ ہے اس لیے اس نثر کے بارے میں اتنی توجہ نہیں ہوئی اسی طرح عسکری صاحب کا ''مادام بوواری'' کا ترجمہ جس میں فلابیر کے اسلوب کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے عمداً ایک طرح سے بہت بڑے چیلنج کو قبول کیا گیا ہے۔

حصہ دوم

اب ترجمے کی کچھ عملی دقتوں کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہیے۔ ایک بات تو یہی ہے کہ ترجمے کے لیے کیا منتخب کیا جائے۔ اول تو یہ محبت کے تجربے کی طرح ایک داخلی تجربہ ہے۔ کوئی چیز آپ کے باطن کو گرفت میں لیتی ہے تبھی آپ اس کے ترجمے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ہاں بعض اوقات کوئی ادارہ یہ ترجمہ کرواتا ہے مگر ہمارے ہاں ایسے ادارے بہت کم ہیں اس لیے اکثر ترجمہ کرنے والے اپنے انتخاب ہی سے کسی چیز کا ترجمہ کرتے ہیں بعض اوقات سیاسی اور تہذیبی صورت حال بھی اس انتخاب میں کوئی کردار ادا کرتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہندی کی چیزوں کا ترجمہ بہت کم ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان سے ہمارے تعلقات درست نہیں تھے یا پچھلے چند برسوں میں عربی ادب کی طرف اور فلسطینی شاعروں کے کلام کی طرف کچھ توجہ ہوئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم تہذیبی سطح پر ان سے کوئی رشتہ محسوس کرتے ہیں۔ آر سی ڈی کے زمانے میں کچھ ترکی شاعر بھی ہمارے ہاں ترجمہ ہو گئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیبی صورت حال بھی اس انتخاب میں کوئی کردار کرتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہندی کی چیزوں کا ترجمہ بہت کم ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان سے ہمارے تعلقات درست نہیں تھے یا پچھلے چند برسوں میں عربی ادب کی طرف اور فلسطینی شاعروں کے کلام کی طرف کچھ توجہ ہوئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم تہذیبی سطح پر ان سے کوئی رشتہ محسوس کرتے ہیں۔ آر سی ڈی کے زمانے میں کچھ ترکی شاعر بھی ہمارے ہاں ترجمہ ہو گئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیبی صورت حال بھی کسی نہ کسی شکل میں ہمارے انتخاب میں دخیل ہو جاتی ہے۔ بعض ترجموں کا تعلق ادبی اسالیب سے ہوتا ہے اگر ہمارے ادب میں ایک اسلوب ابھرتا ہے تو اس اسلوب سے دلچسپی لینے والے شاعر اس اسلوب کی بعض غیر ملکی چیزوں کے تراجم سے اپنے اسلوب کا جواز بھی مہیا کرتے ہیں اور بعض اوقات ان ترجموں کے حوالے سے اسالیب میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب شاعری کے ترجمے کے سلسلے میں بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے بعض خوف زدہ کرنے والے اقوال ہیں۔ ڈانٹے، سروانتیس، سیموئیل، جانسن اور وکٹر ہیوگو نے ترجمے بالخصوص شاعری کے ترجمے کو تقریباً ناممکن بتایا ہے اس میں شک نہیں کہ شاعر کا جوہر زبان سے گہرے انداز سے وابستہ ہوتا ہے اور یہ بات آخری حقیقت کے طور پر تو درست ہے لیکن اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ترجمہ نہ کیا جائے اگر ترجمہ نہ ہوتا تو خورڈ انٹے یا سروانتیں کی عظمت کا کچھ نہ کچھ احساس دوسری زبانوں کے قارئین پر کیونکر ہوتا۔

شاعری کے ترجمے کے سلسلے میں ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اسے نثر میں ترجمہ کیا جائے یا شاگردی ہی میں اور اگر شاگردی میں ترجمہ ہو تو کس اسلوب میں ہو۔ اگر شعر کا ترجمہ نثر میں کیا جائے تو سپاٹ ہو جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے اور شعر کے شعر میں ترجمے کی صورت میں اکثر مصنوعی یا مشینی انداز کی کاوش کا شک گزرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ چیز بھی ذہن میں ہونی چاہیے کہ ترجمے کی کئی جہتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک جہت تو یہ ہے کہ کسی علاقائی زبان یا کسی ایسی زبان سے ترجمہ کرتے ہیں جو تہذیبی طور پر ہم سے قریب ہے مثلاً فارسی۔ اس سلسلے میں میرا تاثر یہ ہے کہ ایسی زبانوں سے شعر کا ترجمہ زیادہ تر نثر میں ہو تو بہتر ہوگا۔ متن کے مشکل الفاظ حل کر دیئے جائیں اور شعر کا ترجمہ اچھی نثر میں دے دیا جائے تو قاری اس سے زیادہ بہتر انداز میں لطف اندوز ہو سکتا ہے ورنہ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ علاقائی زبانوں کے عظیم شاعر اردو نظم کے روپ میں ترجمہ ہو کر اردو کے دوسرے درجے غزل گو معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے اس کے سلسلے میں تو یہ چیز با قاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہونی چاہیے، عطار، رومی، نظامی، خسرو، جامی، بیدل کی مثنویوں کے اردو نثر میں تراجم ہو جائیں تو اردو کے نئے ادیب اپنے تہذیبی سرمائے سے گہری دلچسپی لے سکتے ہیں۔ ن۔ م راشد نے جدید فارسی شاعروں کے تراجم نثر میں کیے ہیں اور بہت کامیاب ہیں ظاہر ہے اس تمام بیان سے منظوم تراجم کی نفی نہیں ہوتی مگر قریبی زبانوں کی شاعری کو کسی نئے قالب میں منظوم کرنا بہت محنت طلب کام ہے۔ تراجم کی دوسری جہت ان زبانوں کے تراجم کی ہے جو تہذیبی طور پر ہم سے دور ہیں۔ عملی طور پر اس سے مراد انگریزی سے ترجمہ ہے کیونکہ ہمارے ہاں دوسرے یورپی زبانوں سے واقفیت رکھنے والے بہت کم لوگ ہیں اور دوسری زبانوں کا ادب بھی ہم عموماً انگریزی کی وساطت سے ترجمہ کرتے ہیں۔ ان تراجم کے سلسلے میں بہت میرا تاثر یہ ہے کہ ان زبانوں سے منظوم تراجم ہونے چاہئیں کیونکہ اس طرح کچھ ایسے اسالیب ہاتھ آنے کی توقع ہو سکتی ہے جو جدید نظم کے قالب میں ڈھل کر اسے وسعت بخش سکیں مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ۔ تو چلیے نثری تراجم ہی سہی مگر یہ کیا کہ آج کل ہر کوئی نثر میں ترجمے کی طرف ہی مائل ہے شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ آج کل نثری نظم کا چرچا ہے اور نثری نظم کے شاعر اپنے تجربوں سے مماثل چیزیں اردو میں منتقل کرنا چاہتے ہیں اور یقیناً یہ رجحان ہماری نثری نظم میں کچھ وسعت پیدا کر سکتا ہے مگر اس محدود جواز سے منظوم تراجم کی اہمیت کم نہیں ہوتی ہاں یہ ضرور ہے کہ مصنوعی بناوٹ اور جھوٹی زیبائش نثری نظم کا سپاٹ لہجہ بھی ہمیں کچھ زیادہ مزا نہیں دے سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ نثر بالخصوص ناول کا ترجمہ ہمارے ہاں بہت کم ہو گیا ہے اس کی ایک وجہ تو ترجموں کے لیے مناسب اداروں کا نہ ہونا ہی ہے مگر اس کا کچھ تعلق عام ترجمہ کرنے والوں کی صلاحیتوں سے بھی ہوگا۔ اسی طرح ڈرامے کا ترجمہ ہمارے ہاں کیوں بہت کم ہو رہا ہے یہ بھی سوچنے کی چیز ہے۔ ترجمے کرنے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے متن کے انتخاب کے ساتھ اس کے لیے مناسب اسلوب کا تعین بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ خود ایک زبان ہی میں اسالیب کا اتنا تنوع ہوتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ وہ کس اسلوب کو چنے۔ مثلاً ایک ہی چیز ہندی آمیز اسلوب میں بھی ترجمہ ہو سکتی ہے، فارسی آمیز اسلوب میں بھی ایک ہی چیز کو پابند نظم کو قالب بھی دیا جا سکتا ہے اور آزاد نظم کا بھی۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنے والا اصل متن کے اسلوب کو جس حد تک گرفت میں لے گا اس کے تہذیبی سیاق وسباق کو جس حد تک سمجھے گا مصنف کے مزاج کو جس حد تک پہچانے گا اس حد تک وہ اس کے لیے مناسب اسلوب بھی چن سکے گا۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں ترجمہ کرنے والے کی ذمہ داری اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اردو میں کسی چیز کا عموماً ایک ہی ترجمہ ہوتا ہے اور پھر مدتوں تک اس پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ متن کا تعلق جس صنف سخن سے ہو اس کے تقاضوں کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہے۔ شاعری کا ترجمہ کچھ مخصوص تقاضے کرتا ہے ناول اور افسانے میں یہ تقاضے کچھ مختلف ہو جائیں گے اور ڈرامے میں ان کی نوعیت کسی حد تک تبدیل ہو جائے گی۔

ہر زبان کی طرح اردو میں بھی مختلف انداز کے ترجمے ہوئے ہیں۔ زیادہ تعداد تو انہیں تراجم کی ہوتی ہے جو متن سے تو ایک حد تک وفادار ہوتے ہیں مگر ان کے ذریعے اردو کے اسالیب بیان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ بعض تراجم ایسے ہوتے ہیں جو متن سے وفادار بھی ہیں اور اردو کے اسالیب میں بھی ان کے ذریعے کچھ تنوع پیدا ہوا۔ اکبرالہ آبادی، ظفر علی خان پھر بالخصوص مولوی عنایت اللہ کے ترجمے اور دور جدید میں محمد سلیم الرحمان کا ہومر کی اوڈیسی کا ترجمہ ''جہاں گرد'' کی واپسی ایسی چند مثالیں ہیں۔

ترجمہ کرنے والوں میں سے بعض ایسے ہیں جو متن کی پروا ایک حد تک ہی کرتے ہیں مگر اپنی زبان میں ایک طاقتور اسلوب پیدا کر دیتے ہیں جس کا اثر بہت دور تک جاتا ہے۔ ایذرا پاؤنڈ نے اسی طرح کے ترجمے کو ادب کے لیے سب سے کارآمد قرار دیا ہے اور محمد حسن عسکری بھی اس کو تخلیقی ادب کے لیے بامعنی قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ایسے تراجم میں ترجمہ کرنے والا ایک نیا قالب بنانے کے لیے بہت کچھ اپنی طرف سے بھی شامل کر دیتا ہے۔ اس لیے بعض نقاد اس کے لیے ''توضیحی ترجمے'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں نادر کاکوروی اور میرا جی کے بعض تراجم اس کی مثال ہیں۔ مثلاً نادر کاکوروی کا ایک مشہور ترجمہ ہے ''گزرے زمانے کی یاد'' یہ ٹامس مور کی نظم The Light of Other Days کا ترجمہ ہے۔ اس نظم کا پہلا بند دیکھیے۔

Oft, in the stilly hight
Eve Slumber's chair has bound me?
Fond memory brings the light
Of other days around me:
The smiles, the tears

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

of boyhood's years
The words of love then spoken,
the eyes that shone
Now dimn'd and gone,
The cheerful hearts now broken;
Thus, in the stilly night
Eye slumber's chair has bound me,
Sad memory brings the light
of other days around me.

اس کا ترجمہ دیکھیے اور یہ بھی کہ نادر کاکوروی نے اپنی طرف سے کیا کچھ شامل کر دیا ہے۔

اکثر شب تنہائی میں
کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دل چسپیاں
بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی
اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی
وہ رونا وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے
وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عشق وہ عہد وفا
وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذت بزم طرب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یاد آتے ہیں ایک ایک سب
دل کا کنول جو روز و شب
رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے
اک سبزہ پامال ہے
اک پھول کملایا ہوا
ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر

متن سے زیادہ قریب نہ ہوتے ہوئے بھی اس ترجمے کا جادو آج تک سر چڑھ کر بول رہا ہے بعد میں جب میراجی نے ٹامس مور کی نظموں کے تراجم کیے تو اس نظم کے لیے نادر کاکوروی ہی کے کو درج کیا۔ نظم طباطبائی کے مشہور ترجمے "گورغریباں" کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس طرح کے تراجم خود اس زبان کے قالب میں حل ہو کر اس کا حصہ بن جاتے ہیں مگر خود نادر کے بھی اس ترجمے کے علاوہ کتنے ترجموں کو یہ درجہ نصیب ہوا۔ اس طرح کے ترجے کی اصل خوبی اس کا جیتا جاگتا اسلوب اور اس کے اندر دوڑتا ہوا لہو ہوتا ہے۔ فٹز جیرالڈ نے عمر خیام کی رباعیات کا جو ترجمہ کیا اس کی شہرت بے پناہ ہے حالانکہ اس میں متن سے زیادہ وفاداری نہیں کی گئی۔ موجودہ دور کے ایک اور مشہور انگریزی شاعر رابرٹ گریوز نے فٹز جیرالڈ کے ترجمے پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اپنا ترجمہ پیش کیا۔ یہ ترجمہ بھی اچھا خاصا ہے اور متن کے بہت قریب مگر اس میں وہ توانائی پیدا نہیں ہو سکی۔ ایک نقاد نے دونوں تراجم کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ فٹز جیرالڈ کا ترجمہ ایک ننھی چڑیا ہے مگر یہ چڑیا زندہ ہے اور بسیط فضاؤں میں اڑ رہی ہے۔ رابرٹ گریوز کا ترجمہ بڑا سا عقاب ہے مگر مردہ جس میں بھس بھر کے ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا ہو۔ اسی طرح ایک پروفیسر صاحب کو ایذرا پاؤنڈ کے چینی ادب سے تراجم قابل اعتراض نظر آئے۔ پاؤنڈ نے جگہ جگہ متن کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنا ترجمہ پیش کیا ہے اور متن کے قریب رہنے کے شوق میں ساری تازگی اور شگفتگی کو ختم کر دیا۔ اقبال نے بعض انگریزی نظمیں اتنی خوبصورت اخذ کی ہیں کہ ان کی اپنی تخلیقات بن گئی ہیں۔ لوول کے مشہور اخذ شدہ تراجم اس کی اپنی نظمیں بن گئی ہیں۔ اسی طرح محمد حسن عسکری صاحب نے سرشار کے "خدائی فوجدار" کی مثال پیش کی ہے۔ ترجمے کے لحاظ سے یہ ناکامیاب ہے مگر سرشار نے ایسا نثری اسلوب پیدا کر لیا۔ اس کا اثر خود ان کے اپنے ناولوں پر بھی پڑا اور اس عہد کے دوسرے ناول نگار بھی اس سے متاثر ہوئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایذراپاؤنڈ اور عسکری صاحب کی پیروی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ تخلیقی ادب کے لیے ایسا ترجمہ زیادہ بامعنی ہوسکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کے لیے پختہ کار ادیب ہی موزوں ہوسکتا ہے دوسرے اس کی حیثیت استثنائی ہوتی ہے۔ شروع میں تو اگر آدمی متن کے مفہوم ہی کو کامیابی سے اپنی زبان میں منتقل کردے تو یہی بڑی بات ہے یوں بھی اعلیٰ فنی شہکار کئی متراجم کا تقاضا کرتے ہیں اور ایسے ترجمہ کی جو متن کو خوبی سے منتقل کرتا ہو ہر وقت گنجائش موجود ہوتی ہے۔

میں نے اس مضمون میں بنیادی مسائل کی وضاحت کی ہے، اسلوب کے ضمنی مسائل کی بھی ترجمے میں بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کی ذراسی چوک آپ کے ترجمے کو مضحکہ خیز بنا سکتی ہے مثلاً کوئی خاص محاورہ جسے آپ لفظی طور پر ترجمہ کردیں یا کسی جگہ کا نام جسے آپ کسی لڑکی کا نام سمجھ لیں، کسی دریا کا نام جسے آپ شہر کا نام فرض کرلیں اسی طرح عام بول چال کے لفظ بھی ہمیں طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا کرسکتے ہیں۔ پھر علوم کی اصطلاحیں جن کے تراجم کے سلسلے میں ہم ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ اسی طرح مترادفات کا مسئلہ ہے۔ آپ ایک ہی لفظ کے لیے کھڑکی، دریچہ، عرفہ، روزن جیسے لفظوں میں سے کسی کو چنیں گے اس کا فیصلہ تو متن کی نوعیت کے اعتبار سے اور سیاق وسباق کے حوالے ہی سے ہوگا اور آپ کو بار بار لغت سے بلکہ کئی لغات سے کام لینا ہوگا۔ ایک مشہور مترجم سے میں نے اس کے ترجموں کی کامیابی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے انکساری سے یہ کہا میں لغت دیکھ لیتا ہوں باقی لوگ اس کام میں بھی سبکی محسوس کرتے ہیں۔

ریناتو پوگی ولی نے مترجمین کو ادب کی جمہوریہ کے سب سے زیادہ عالمی شہری قرار دیا ہے جن کی عدم موجودگی ادبی روایت کو آہستہ آہستہ بے حد محدود اور گوئٹے کے لفظوں میں ایک طرح کی اکتاہٹ کا شکار کرسکتی ہے اس لیے قصر ادب میں ترجمے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہنا چاہیے اور ایسے لوگوں کی آمد پر خوش آمدید کہنا چاہیے جو مترجم کی ضمنی حیثیت کو قبول کرکے محنت کرنا چاہتے ہیں ان کی کاوشوں سے کتنے ہی نئے دروازے کھلنے کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔

☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فن ترجمہ کے اصول ومبادیات

سید غفران انجیلی

ترجمے کے بارے میں ''تاریخ زبان انگریزی'' کے مصنف البرٹ سی بش نے کہا ہے کہ

''کسی فن پارے یا ادبی تخلیق کے مافیہ کو ترجمے کے ذریعے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج، اپنا آہنگ اور اسلوب و پیرایہ بیان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں روزمرہ، تشبیہات، محاورات، ضرب الامثال استعارات و کنایات، مخصوص معاشرتی، معاشی، تاریخی اور سیاسی زندگی کی نمائندگی اور تہذیب وتمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔''

اسی قسم کے خیالات کا اظہار گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر نے بھی کیا ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ

''ہمیں ترجمے پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اصل مفہوم سمجھ کر اسے اپنی زبان میں بیان کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر لائٹنر کا بیان ترجمے کے بارے میں کچھ زیادہ واضح ہے۔ یہ بجا ہے کہ کسی بھی زبان کا لفظی ترجمہ ممکن نہیں، لیکن مفہوم کا ترجمہ ایک ایسی شے ہے کہ اگر مناسب اسلوب کے ساتھ پیش کیا جائے تو تخلیق کا مقام پا سکتا ہے۔

اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے

ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ترجمہ سے متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش کرنا نہیں بلکہ ان افراد کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے جو دوسری زبان کو نہیں جانتے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے افراد کے لیے غیر زبان کے مفاہیم کو ان کی اپنی زبان اور اسلوب بیان میں بتانا پڑتا ہے اور یہ ایک اعتبار سے بازیافت کا عمل ہے۔ اصل کو پڑھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرا سے ترجمے کی زبان میں اس کے روزمرہ اور محاورے کے مطابق بیان کرنا کسی تخلیق سے کم نہیں ہوتا۔

مولانا ظفر علی خاں کے ترجمہ ''معرکہ مذہب وسائنس'' پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے اچھے ترجمہ کی تعریف میں مولوی عبدالحق کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب ''شاہنامہ'' کو پڑھا ہے انہیں جنگ سہراب ورستم کی دلکش داستان یاد ہوگی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف وفصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب وسائنس کی رزم دکھائی ہے۔ مصنف کا زور قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مسنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونہی ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان اندھیرے میں اسی دھکڑ پکڑ اور دگدا میں رہے گا؟ کیا وہ یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا اور نور ہدایت کو کبھی نہ پہنچے گا؟ میں اس موقع پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے اس کتاب کے ترجمہ میں دو بڑی مشکلیں تھیں۔ ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث دوسری زبان کی خوبی وفصاحت اور اردو کی بے بضاعت زبان میں ان دونوں کو قائم رکھنا بہت دشوار تھا مگر مولوی ظفر علی خان صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارک باد ہیں، اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے لیکن یہ اس سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی کہ فاضل مترجم کو حاصل ہے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخر ترجمہ ہی کیوں؟

جب ترجمہ اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں رہنا چاہیے تو پھر ہم اسے ترجمہ ہی کیوں کہیں، تخلیق کیوں نہ کہیں۔ کسی بھی مفہوم کو اپنے انداز سے بیان کرنا تخلیقی حیثیت رکھتا ہے۔ مترجم اس میں نہ کوئی تبدیلی کرتا ہے نہ ترمیم اور نہ اضافہ اس لیے ہم اسے ترجمہ ہی کہیں گے خواہ وہ تخلیق کے کتنا ہی قریب ہو۔

رہی یہ بات کہ ترجمے کی ضرورت کیا ہے؟ اگر چہ اسے دہرانے کی ضرورت تو نہیں، لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ سابق دور میں ترقی یافتہ اقوام کا علم وادب ترقی پذیر اقوام تک پہنچانے کے لیے ترجمے کی ضرورت درپیش ہوتی تھی۔ لیکن جدید دور میں جب کہ اکثر اقوام علمی ترقی کی دوڑ میں حصہ لے رہی ہیں۔ ان کے کاموں کو باہمی طور پر ترجمہ کرنے کی ضرورت ہمیشہ درپیش رہتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ لسانی رنگارنگی ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ دیگر اقوام کی زبان کو اپنی علمی ترقی کا ذریعہ بنائے۔ جہاں جہاں ایسا کیا گیا ہے وہاں چند افراد تو یقیناً علمی ترقی پا سکے لیکن قوم مجموعی طور پر پیچھے ہی رہی۔ چنانچہ بصیرت رکھنے والی اقوام نے علمی ادبی کارناموں کو اپنی ہی قومی زبان میں انجام دینے کا فیصلہ کیا اور بہت جلد اقوام عالم میں اپنا مقام بلند کر لیا۔ جاپان اور چین کی مثالیں سامنے ہیں۔ فرانس، اٹلی اور جرمنی بھی اپنی ہی زبانوں میں علمی ادبی کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ تک دوسری زبانوں میں ہونے والے کاموں کو اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کر لیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دارالترجمہ بنا رکھے ہیں۔ ترجمے کی ضرورت کے بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ ایجاد واختراع اور غور وفکر کا مادہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔ تخیل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے۔ علم کا دارومدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے۔ اس وقت قوم یا تو بے کار اور مردہ ہو جاتی ہے یا سنبھلنے کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''جس طرح یونان کا اثر روما اور دیگر اقوام یورپ پر پڑا، جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا، جس طرح اسلام نے یورپ کی تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی، اسی طرح آج

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانون عالم ہے جو
یوں ہی جاری رہا اور جاری رہے گا۔

''دیے سے دیا جلتا رہا ہے۔''

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے۔ اس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمے کے ذریعے سے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے۔ جمود کو توڑیں گے اور قوم میں یک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر یہی ترجمے تصنیف و تالیف کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سمجھائیں گے ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف و تالیف سے زیادہ قابل قدر زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔

ترجمہ کے سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:

> ''یہ کام ہندوستان کے مختلف مقامات میں تھوڑا تھوڑا انجام پایا مثلاً فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زیر نگرانی ڈاکٹر گلکرسٹ، دہلی سوسائٹی میں، انجمن پنجاب میں زیر نگرانی ڈاکٹر لائٹز و کرنل ہالرائڈ، علی گڑھ سائنٹفک انسٹی ٹیوٹ میں جس کی بنا سر سید احمد خاں مرحوم نے ڈالی۔ مگر یہ کوششیں سب وقتی اور عارضی تھیں۔

۱۹۱۶ء میں حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ قائم ہوا۔ اس بارے میں مولوی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> ''احیائے علوم کے لیے جو کام آگسٹس نے روم میں خلافت عباسیہ میں ہارون الرشید اور مامون الرشید نے، ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن ثالث نے بکرماجیت واکبر نے ہندوستان میں، الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹر اعظم وکیتھرائن نے روس میں اور مت شی ہتو نے جاپان میں کیا وہی فرمانروائے دولت آصفیہ نے اس ملک کے لیے کیا۔''

پاکستان میں ترجمہ کس لیے؟

پاکستان میں ترجمہ کی ضرورت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں انگریزی سرکاری اور تعلیمی زبان رہی۔ آزادی کے بعد قوم کو اپنی زبان ہی کا سہارا لے کر ترقی کی منازل طے کرنا تھیں۔ اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ سرکاری تعلیمی، علمی اور ادبی امور کے لیے دنیا بھر کی زبانوں سے بشمول انگریزی اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ تاکہ ایک تو اردو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے علمی ادبی سرمایہ میں اضافہ ہو سکے۔ دوسرے دفتری عدالتی، قانونی اور سرکاری امور کو جلد از جلد اردو میں انجام دیا جا سکے۔ قومی تشخص کی پہچان کے لیے ضروری ہے، کہ جتنی جلد ممکن ہو دیگر غیر ملکی زبانوں سے پیچھا چھڑایا جائے اور اپنی قومی زبان کا سرمایہ وسیع کیا جائے۔

ترجمہ کے اس کام کے لیے جہاں نجی طور پر بہت کام کیا گیا، وہاں سرکاری اور نیم سرکاری ادارے بھی وجود میں آئے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ضروری ہوگا:

۱۔ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی)

یہ ادارہ قیام پاکستان سے بہت پہلے قائم ہوا۔ اور اب تک کام کر رہا ہے پہلے صرف تحقیقی و تحریکی دونوں کام کرتا تھا۔ اب صرف تصنیفی، اشاعتی کام میں مصروف ہے۔

۲۔ سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان کراچی:

یہ سوسائٹی ۱۹۵۵ء میں قائم ہوئی اس کے قیام کا مقصد سر سید احمد خان کی اولین کاوش سائنٹفک سوسائٹی کی یاد تازہ کرنا نیز سائنس کے علوم کو عام فہم، قومی زبان میں ہر خاص و عام تک پہنچانا اور سائنسی تحقیقات کو فروغ دینا اور انہیں شائع کرنا ہے۔

۳۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد:

یونیورسٹی کے زیر اہتمام اردو زبان میں سائنسی علوم کی ایسی کتابوں کی اشاعت جو درمیانے درجے کی زرعی تعلیم پانے والے طلبہ، زرعی کارکنوں اور عام زمینداروں کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

۴۔ ترقی اردو بورڈ۔ کراچی:

یہ بورڈ اردو لغت کی تدوین کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔

۵۔ مجلس ترقی ادب، لاہور

۱۹۵۰ء میں حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے اردو کی بقا اور اس کے ارتقاء کے لیے یہ ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے نے مشرق و مغرب کی بلند پایہ علمی کتابوں کے اردو ترجمے کرائے اور انہیں شائع کیا۔

۶۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور:

قومی قدروں کو فروغ دینے اور اردو زبان کو درس و تدریس کا ذریعہ بنانے کے لیے مئی ۱۹۶۲ء میں مرکزی اردو بورڈ معرض وجود میں آیا۔

۷۔ مجلس زبان دفتری پنجاب:

پنجاب کے تمام محکموں اور عدالتوں میں انگریزی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۴۹ء میں "آفیشل لینگویج کمیٹی" موسوم بہ "مجلس زبان دفتری" قائم کی گئی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس:

یہ قدیم انجمن (قائم شدہ ۱۹۶۶ء) اردو کے فروغ کے لیے پاکستان میں بھی سرگرم عمل ہے۔

۹۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی:

یہ اکیڈیمی اردو واعلیٰ علمی مضامین کے اظہار اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی۔

۱۰۔ ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور:

ستمبر ۱۹۶۲ء میں ادارہ تالیف و ترجمہ نے اپنا کام شروع کیا۔

۱۱۔ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی:

یہ شعبہ علوم و فنون کی اعلیٰ سطح پر قومی زبان اردو میں تحقیق و تدوین کا اہتمام کرنے کے کسی پاکستانی یونیورسٹی میں قائم ہونے والا ادارہ ہے۔

۱۲۔ مقتدرہ قومی زبان (کراچی):

یہ ادارہ وفاقی حکومت پاکستان نے ملک میں مختلف علمی و ادبی اداروں کے کاموں کو مربوط کرنے اور اردو کو انگریزی کے بجائے سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کی غرض سے قائم کیا۔ اس کی نویں مجلس، مجلس ترجمہ ہے جو ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کی نگرانی میں کام کر رہی ہے۔ اس کے ذمہ یہ کام ہے کہ نہ صرف ضروری کتابوں اور رسالوں کی نشاندہی کرے بلکہ کل پاکستان مترجمین کی فہرست بھی تیار کرنا ہے۔ اس کی دسویں ذیلی مجلس اصطلاحات سے متعلق ہے جو ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی زیر نگرانی اصطلاحات کے ترجمے اور توسیع کا کام کر رہی ہے۔

ترجمہ کتنی اقسام کا ہوتا ہے؟

عمومی طور پر میں لفظی ترجمے اور مفہوم کے ترجمے کا ذکر آ چکا ہے۔ جہاں تک ترجمے کی مختلف اقسام کا تعلق ہے ان میں حسب ذیل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:

۱۔ علمی ترجمہ،

۲۔ ادبی ترجمہ،

۳۔ صحافتی ترجمہ،

ان میں سے ہر ایک ترجمہ دو طرح سے انجام دیا جا سکتا ہے۔ یہ یا تو لفظی ترجمہ ہوگا یا مفہوم کا ترجمہ۔

۱۔ علمی ترجمہ

علمی ترجمے کی ذیل میں تمام سائنسی علوم و فنون کی کتابیں آتی ہیں جن میں جغرافیہ، تاریخ، ریاضیات، معاشیات، قانون، طبیعات، انجینئری، میکانیات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ علمی ترجمہ عام طور پر لفظی ترجمے کی ذیل میں آتا ہے۔ کیونکہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جائے وہ ان معنوں میں ہر جگہ استعمال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جائے تا کہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے۔ ان ترجموں میں سب سے اہم مسئلہ علمی اصطلاحات کے ترجموں کا ہوتا ہے۔ علمی اصطلاحات وضع کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصولوں کے مطابق وضع کی جائیں۔ یونانی، لاطینی اور دوسرے سابقوں اور لاحقوں کے ترجمے مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ رکھا جائے۔ مختلف اداروں نے ترجمہ اصطلاحات کے لیے اصول وضع کر رکھے ہیں۔ مولوی وحید الدین سلیم نے ایک کتاب ''وضع اصطلاحات'' اسی موضوع پر لکھی ہے۔ جہاں تک علمی اور فنی تراجم کا تعلق ہے، ضروری ہے کہ متعلقہ علم وفن کا ماہر ہی انجام دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علم وفن میں اصطلاح کا اپنا مفہوم ہوتا ہے جو دوسرے علوم میں نہیں ہوتا۔ مثلاً ثقافت کا لفظ فنون میں کوئی اور معنی دیتا ہے اور عمرانیات میں اس کا کچھ اور مفہوم متعین ہے، جب کہ لغت میں اس کے کئی معانی دیئے گئے ہیں۔

۲۔ ادبی ترجمہ:

ادبی ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بامحاورہ کیا جائے اور اپنی زبان کے روزمرہ، ضرب الامثال، تشبیہات استعارات و کنایات اور رموز و علامات سے کام لیا جائے تا کہ ترجمے میں ادبی رنگ آجائے اور تحریر طبعزاد نظر آئے۔ اس سلسلے میں ہاشمی فرید آبادی کی رائے قابل ذکر ہے:

''انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کا ایک یہ گر مترجم کو سیکھنا لازم ہے کہ جو جس اور جن سے فقرے کو پیچیدہ نہ بنائے۔ ان کی انگریزی میں بڑی کثرت ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں ربط وضبط کی دوسری تدبیریں کام میں لائی جاتی ہیں۔ بیان کے متین و شگفتہ اور متعدد پیرائے اردو میں موجود ہیں۔ سوائے فنی اصطلاحات کے بلیغ اور پرمعنی الفاظ کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ البتہ انہیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد بلند اور اپنے معیاری ادب سے اسے خوب واقفیت ہونی چاہیے۔''

ادبی ترجمے کے لیے ادبیت کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مزید بحث آگے آئے گی۔ مختصر یہ کہ مصنف کی بات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی اصل حیثیت مسخ بھی نہ ہو اور ترجمہ بامحاورہ اسلوب کے ساتھ ہو جائے۔

۳۔ صحافتی ترجمہ

اسے کھلا ترجمہ بھی کہتے ہیں اور یہ مفہوم کے ترجمے کی ذیل میں آتا ہے۔

''مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہے۔ ایسے ترجموں میں کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طور پر بیان کردے، جس فن کا ترجمہ کرنا مقصود ہو، اگر وہ طویل اور پیچیدہ جملوں پر مشتمل ہو تو لازمی نہیں کہ اس کا ترجمہ بھی اسی طرح طویل اور پیچیدہ جملوں میں کیا جائے۔ بہتر ہے کہ اصل مفہوم کو چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں میں ادا کیا جائے۔''

عبدالمجید سالک کے نزدیک ''اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ ان کو چاہیے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل مطلب ادا ہو گیا ہے۔ اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہو گیا ہو تو سبحان اللہ ورنہ ادھر اُدھر کی بیشی کر کے اسے پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی دان اور بڑے اردو خوان ہیں کیونکہ ممکن ہے وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔

ترجمہ کون کرے؟

ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں۔ یہ ایک تخصیصی کام ہے۔ اچھے مترجم کی خصوصیات میں بہت سے امور شامل ہیں۔ مثلاً فن پاروں اور ادبی تخلیقوں، صاحب طرز ادیبوں اور مصنفوں کی کتب کا مطالعہ، زبان کی گرامر، الفاظ، روزمرہ استعارات و کنایات، تشبیہات، ضرب الامثال اور ان زبانوں سے واقفیت جن سے اردو کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ اس میں زبان کا مزاج، رنگ ڈھنگ اور اسلوب پیرایہ بیان بھی شامل ہے۔

اختصار کے ساتھ تو یہ بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ مترجم کے لیے تین باتیں ضروری ہیں:

۱۔ وہ اُس زبان پر جس سے ترجمہ کرنا ہے اور اس زبان پر جس میں ترجمہ کیا جاتا ہے، کامل عبور اور قدرت رکھتا ہو۔

۲۔ مضمون سے اگر پوری نہیں تو کم از کم اس کے مبادیات سے واقفیت ہو۔

۳۔ اس کا طرز تحریر اور پیرایہ بیان ایسا ہو کہ بات جو اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے، اسے اچھی طرح سمجھ کر اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفہوم کو صحیح طور پر اس طرح اپنی زبان میں منتقل کر سکے، کہ قاری ترجمہ شدہ مواد کا مطالعہ کرتے وقت کسی ابہام کا شکار نہ ہونے پائے اور جو بات اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے اس تک قاری کے ذہن کی رسائی ہو جائے۔ یعنی خود صاحب اسلوب ادیب ہو۔

کہا تو یہ بھی جاتا ہے اور یہ بڑی حد تک درست بھی ہے کہ کسی زبان کے مواد کو بعینہ دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ ہر زبان کا اپنا آہنگ اور مزاج ہوتا ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب مترجم بھی بڑی حد تک اصل مصنف کے اوصاف کا حامل ہو، وہ نہ صرف ہر دو زبانوں کی لغات پر قدرت بلکہ ان کے مزاج، تراکیب اور اسلوب سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہو اور ترجمہ کرتے وقت اصل عبارت کو خوب اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو اپنی زبان میں اس کے مزاج اور آہنگ کے مطابق اس طرح سمو کر ایسے پیرایہ بیان میں منتقل کر دے کہ زبان کی سلاست و روانی اور موضوع و مفہوم کے بیان میں کہیں بھی ابہام کا شبہ تک نہ ہو سکے بلکہ قاری جس نے اصل کتاب نہ پڑھی ہو اسے اس کے اصل ہونے میں کچھ شک و شبہ نہ ہو اور جنہوں نے کتاب کا مطالعہ کیا ہو وہ بھی ترجمے کو پڑھتے وقت کسی مقام پر اٹکیں نہیں بلکہ مترجم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں۔

مترجم کا مطالعہ جتنا وسیع ہو گا اسکے کام میں اتنی ہی عمدگی پیدا ہو جائے گی۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ فنون لطیفہ ادب، فلسفہ، نفسیات، سائنس، مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، غرضیکہ ہر طرح کے مضامین اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واقفیت رکھتا ہو۔ یہ بات خاص کر اخباری مترجم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اچھا مترجم اپنے انداز بیان، لب و لہجہ، ذاتی عقل و شعور اور فہم و ادراک سے ایک کم مایہ تصنیف کو بھی بام عروج پر پہنچا دیتا ہے۔

اچھے ترجموں کے لیے موزوں الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ مترادفات سے کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے صرف ایک لفظ ہی موزوں ترین ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اچھا مترجم وہی ہے جو موقع کی مناسبت سے موزوں ترین لفظ کا انتخاب کرے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہے، جب مختلف لغات مترجم کے زیر مطالعہ رہیں تاکہ وہ حسب ضرورت اپنے مطلب کا لفظ چن سکے۔ علمی اصطلاح کا ترجمہ اصطلاح میں کرے۔ اس سلسلے میں مختلف لغات میں جو ترجمے دیئے گئے ہوں، ان میں سے موزوں اصطلاح کا انتخاب کرے۔ اگر اصطلاح نئی ہو تو مسلمہ اصولوں کے مطابق نئی اصطلاح وضع کر سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے لغات پر عبور حاصل ہو، جو وسیع مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ اسے نہ صرف ان لغات کو دیکھنا پڑے گا جن میں الفاظ کے معنی بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان لغات پر بھی نظر ڈالنا ہو گی جن میں اصطلاحوں کے ترجمے اصطلاحوں کی صورت میں دیئے گئے ہیں کیونکہ "کوئی شخص بھی ہمہ دان نہیں ہو سکتا۔ مترجم خواہ کتنا ہی قابل ہو اور اسکا ذخیرہ لغت خواہ کتنا ہی وسیع ہو، ترجمے کے وقت بعض اوقات اسے ضرور لغت دیکھنے کی ضرورت محسوس ہو گی۔ لغت دیکھنے میں تساہل برتنا یا اسے کسر شان سمجھنا غلطی ہے۔ نہ صرف لغت دیکھنی چاہیئے بلکہ اظہار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے زیادہ موزوں الفاظ تلاش کرنے چاہئیں اور لغت سے خوب کام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لینا چاہیے۔مترجم کو چاہیے کہ وہ موزوں الفاظ اور اصطلاحات کو ایسے پیرائے میں بیان کرے کہ مطلب صاف اور واضح طور پر قاری کے ذہن پر نقش ہو جائے۔اگر جملے طویل ہوں تو انہیں توڑ کر الگ الگ بیان کرے۔یہ ضروری نہیں ہے کہ ترجمہ کرتے وقت بھی اصل متن کے جملوں کی ساخت اور تراکیب کی پیروی کی جائے۔ترجمے کی اصل غایت ابلاغ ہے۔اس کے لیے وہ جو طریقہ بھی مناسب خیال کرتا ہے اسے اپنانے میں آزاد ہے۔

مترجم کو چاہیے کہ وہ متعلقہ مضمون کا ترجمہ کرنے سے پہلے اس فن یا علم کے بارے میں ضروری کتب کا مطالعہ کرے تاکہ ہر بات کا مفہوم واضح اور صاف طور پر بیان کیا جاسکے۔اگر کسی بات کے بارے میں مترجم کا ذہن صاف ہوگا وہ اسے نہایت خوبی سے قاری تک پہنچاسکے گا ورنہ مفہوم میں ابہام اور بیان میں الجھاؤ کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

اردو مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو زبان کی ہیئت ترکیبی کا علم رکھتا ہو۔اس کو مندرجہ ذیل چار بنیادی امور کا علم ہو۔

ا۔ اردو کی اصل

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اردو لشکری زبان ہے اور اس کا خمیر بہت سی زبانوں سے مل کر اٹھا ہے۔اس کی اصل ہندی ہے۔بقول مولوی عبدالحق:

> ''اردو ہندی نژاد ہے اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت ہے۔ برج بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہے۔اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں، وہ زمانہ دراز کے استعمال اور زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدا پن اور کرختگی اور تلفظ اور لہجے کی دقت بھی، بالکل جاتی رہی اور چھپٹ چھنا کر پاک صاف سیدھے سادے رہ گئے ہیں جس سے زبان میں لوچ، گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہوگئی اور اردو کے ہندی عناصر ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ بیرونی زبانوں کا اثر صاف اسماء وصفات میں ہوا ہے ورنہ زبان کی بنیاد ہندی پر ہے۔ مقام حروف فاعلی، مفعولی، اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں۔لیکن عربی فارسی الفاظ کے اضافے نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔ہندی الفاظ میں دلنشینی کا خاص اثر ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اورعربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت میں بلکہ خیالات میں وسعت پیدا کردی ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا اور وہ زیادہ وسیع اور کارآمد بن گئی۔

''فارسی کی آمیزش نے اس زبان میں وہ آبداریاں پیدا کی ہیں جن کے بغیر اس تیغ ہندی کے سارے جوہر کبھی نہ کھلتے۔''

''مگر اصل بنیاد جس پر وہ قائم ہے ہندی ہے۔محض غیر زبانوں کے اسماء وصفات کے اضافہ سے اس کے ہندی ہونے میں مطلق فرق نہیں آسکتا۔مثلاً آج کل بہت سے انگریزی لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں لیکن اس سے زبان کی اصلیت و ماہیت پر کچھ اثر نہیں پڑسکتا۔ایک دوسری بات اردو زبان میں یہ ہے کہ وہ اس اصول پر قائم ہے جو تمام جدید زبانوں میں اس وقت پایا جاتا ہے یعنی صورت ترکیبی سے حالت تفصیلی کی طرف اس کا رجحان ہے۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''سید انشا پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی فارسی کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت واصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے۔''

وہ اس بارے میں یوں فرماتے ہیں:

''ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہوگیا،عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔اس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلاف اردو ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو غلط ہے اور جو کچھ موافق اردو ہے، صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔اس اصول کو قائم کرنے کے بعد بہت سے عربی الفاظ کو جو اردو میں کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں۔صحیح بتاتے ہیں مثلاً سید انشا کی رائے میں برقا صحیح اردو لفظ ہے گو وہ خلاف اصل ہے یا وہ غدر کو بفتح ''د'' اردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصل میں بسکون دال ہے۔"

۲۔ الفاظ و معانی

ہر فن کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ کچھ شرائط وقیود ہوتی ہیں اور کچھ پابندیوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ فن کار اپنے فن پارے کی تخلیق اپنے خون جگر سے کرتا ہے۔ موزوں الفاظ کے انتخاب میں کاوش کرتا ہے صحیح لفظ کی تلاش کے لیے تگ ودو کرتا ہے اور پھر اُسے اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ جب وہ موزونیت، ہیئت اسلوب اور پیرایہ بیان کے قالب میں ڈھل کر نکلتا ہے تو اپنے اندر اک ندرت لیے ہوئے ہوتا ہے۔

ہر لفظ اپنے اندر ایک کائنات سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک تاریخ رکھتا ہے، اخلاقی، سماجی، معاشی، علمی، سائنسی اور فنی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور اپنے مخصوص معنی سے قاری کے ذہن کے دریچے اس طرح کھول دیتا ہے کہ وہ ایک لفظ سے اس کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم اخلاق، مذہب یا سائنس کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے سامنے غور و فکر کی ایک وسیع دنیا آباد ہو جاتی ہے۔

الفاظ اور معانی کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ہر لفظ کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مخصوص لفظ ہوتا ہے۔ اور اس سے صرف وہی مفہوم مراد لیا جا سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> "علم معانی ابلاغ واظہار کے موزوں ترین وسائل سے بحث کرتا ہے۔ مترادف الفاظ کے اختلاف دکھاتا ہے۔ الفاظ کی تقدیم وتاخیر سے جملے کی وہ مخصوص ترتیب پیدا کرنا چاہتا ہے جو ابلاغ کامل اور اظہار تام کو لازم ہے۔ معانی کے اظہار کے لیے مناسب ترین الفاظ، کلمات اور مرکبات کا جویا ہے۔"

۳۔ مترادفات و مرادفات

مترادفات کے ضمن میں سید عابد علی عابد لکھتے ہیں۔

> "لغت کا ذخیرہ الفاظ بہت محدود ہے اور ذہن انسانی کی پرواز بے کراں۔ اس لیے لغت تو یہ کر سکتی ہے کہ ایک کلمے کے کئی سلسلہ معانی متعین کر دے، لیکن یہ نہیں کر سکتی کہ ایک ہی معانی کے لیے دو لفظ مہیا کر دے جہاں ایسا اشتباہ ہوگا وہاں الفاظ مترادف ہوں گے مرادف نہیں۔ مراد یہ ہے کہ معانی میں قریب تر تو ہوں گے لیکن کوئی دلالت ضرور مختلف ہوگی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔اصطلاح کی ضرورت

اصطلاح کی ضرورت ہے،ہم سب آگاہ ہیں۔بقول مولوی وحیدالدین سلیم:

''اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب کے ادا کرنے میں طول لا طائل سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔جہاں ایک چھوٹے سے لفظ سے کام نکل سکتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے لمبے جملے لکھنے پڑتے ہیں اور ان کو بار بار دہرانا پڑتا ہے۔کہنے والے کا وقت جدا ضائع ہوتا ہے اور پڑھنے والے کی طبیعت جدا ملول ہوتی ہے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کردیتی ہیں۔''

لغت اور اصطلاح کا فرق محمد حسین آزاد یوں بیان کرتے ہیں

''عرب کے اہل تحقیق نے کہا ہے کہ لغت وہ ہے جس پر جمہور کا اتفاق ہو۔اصطلاح وہ ہے جس پر خاص گروہ کا اتفاق ہو۔البتہ کوئی علمی مصنف یا صاحب ایجاد قادرالکلام شخص بھی الفاظ ایجاد کرسکتا ہے۔لیکن ان کے قیام عمر کے لیے اسے بھی جمہور کا حسن قبول کرنا پڑے گا۔''

اصطلاحات کی بنیادی خوبی کے بارے میں سید عابد علی عابد نے بڑی اچھی وضاحت کی ہے:

''اصطلاحات کا تعلق علم معانی سے ہے کہ اصطلاح میں بھی دلالت ہمیشہ وضعی ہوتی ہے۔یہ درست ہے کہ ایک لفظ کے عام معانی اور ہوتے ہیں اور اصطلاحی معانی اور۔لیکن دونوں صورتوں میں دلالت کی صورت وضعی ہی قائم رہتی ہے۔مثال کے طور پر اردو محاورے میں فکر،تشویش اور غور وفکر کو بھی کہتے ہیں لیکن نفسیات کی اصطلاح میں یہ عمل ذہنی ہے جس سے کام لے کر ہم مقدمات کو ترتیب دیتے ہیں اور نتائج کا استنباط کرتے ہیں۔اگرچہ لفظ کے معانی اصطلاح بننے پر بدل گئے لیکن لفظ جب اصطلاح بن چکے تو پھر متعلقہ علم میں ہمیشہ اسی معنی میں استعمال ہوگا اور اس کے لیے کبھی کوئی دوسرے معانی نہیں لیے جائیں گے۔یہی دلالت وضعی کی شناخت ہے کہ درخت کہہ کر پتھر کبھی مراد نہ لیں گے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کے بنیادی اصول

ان تمام امور کی بنا پر ترجمہ کے لیے جو اصول بنیاد بنتے ہیں کچھ یوں ہیں:

۱۔ ہر انگریزی لفظ کے لیے ایک ہی اردو لفظ کا استعمال کیا جائے۔ بشرطیکہ خود اس انگریزی لفظ کے متعدد معنی نہ ہوں۔

مثلاً انگریزی لفظ ڈیفنس کے لیے اردو میں اگر ہم کہیں اس کا ترجمہ دفاع کریں، کہیں تحفظ اور کہیں حفاظت وغیرہ تو غلط ہوگا ہمیں چاہیے کہ ڈیفنس کے لیے ایک ہی لفظ رکھیں مثلاً دفاع۔ البتہ بعض الفاظ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کے متعدد اور مختلف معنی ہوں۔ اردو میں ایسے الفاظ کے ترجمے میں ان مختلف معانی کا خیال رکھنا چاہیے مثلاً ایوارڈ کا ترجمہ عطیہ بھی ہو سکتا ہے اور فیصلہ بھی عطیہ اس وقت جب مفہوم رقمی ہو اور فیصلہ اس وقت جب مفہوم ثالثی ہو۔ اسی طرح کا ایک لفظ کیس ہے جب کہ اس کا مفہوم عدالتی ہو تو اس کا ترجمہ مقدمہ ہوگا۔ طب میں مریض، میکانیات میں خانہ اور دفتری استعمال میں مسل یا معاملہ۔

۲۔ علمی کتاب کا ترجمہ کرنے سے پہلے مترجم کو چاہیے کہ وہ پہلے پوری کتاب کا مطالعہ کرے اور اصطلاحوں کو نشان زدہ کرنے کے بعد ان کی فہرست تیار کر لے۔ ان کے لیے موزوں ترجمے تجویز کرے اور ہر جگہ وہی اصطلاح اختیار کرے۔ کتاب کے آخر میں ان اصطلاحوں کی ایک فہرست بترتیب الف بائی درج کرے۔

۳۔ کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل جہاں تک ممکن ہو اس قسم کا لفظ منتخب کرنا چاہیے کہ اس سے مشتقات وضع ہو سکیں مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظام ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم تنظیم، تنظیمی، منتظم، نظامی اور انتظامیہ وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں مختلف انگریزی الفاظ کے لیے مختلف اور متبادل مخصوص کرنے پڑتے ہیں مثلاً آرگنائزیشن کے لیے تنظیم اور مینجر کے لیے منتظم۔

یہ بات درست نہیں ہوگی کہ انگریزی کے لفظ کا ترجمہ کچھ ہو اور اس کے مشتقات کا کچھ اور جو اصل لفظ سے مشتق نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً اگر ہم ڈیفنس کے لیے دفاع کا لفظ رکھیں تو ''ڈیفنس ایریا'' کے لیے ''حفاظتی علاقہ'' تو درست نہیں ہوگا۔ اس کا ترجمہ ''مدفوعہ علاقہ'' ہونا چاہیے۔

۴۔ انگریزی کی فنی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو نہ کہ تشریح کی۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے اصطلاح کی یہ تعریف کی ہے

> ''کہ یہ ایک چھوٹی سی علامت ہوتی ہے جو بڑے مفہوم کی طرف اشارہ
> کرتی ہے اور بولنے والوں اور لکھنے والوں کو وقت ضائع کرنے سے
> بچاتی ہے۔''

کسی فنی اصطلاح کا مقصد اختصار ہے لیکن ایسا اختصار جو معنویت سے لبریز ہو۔ ایک اصطلاح کوئی مخصوص شے یا تصور ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مفہوم مبہم نہ ہونا چاہیے۔ ہر شعبہ فن کی اصطلاحات مخصوص ہوتی ہیں۔ ان میں شک وشبہ اور ابہام نہیں ہوتا۔ اگر ہم لمبی چوڑی تشریح یا ترکیبیں استعمال کریں تو اصطلاح کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

مولانا وحید الدین سلیم کے الفاظ میں

> ''اصطلاح سے اختصار مقصود ہوتا کہ ایک چھوٹے سے لفظ سے وسیع معنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مراد لیے جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کی جاتی
کہ عبارت خواہ کسی قدر طولانی ہو جائے تاہم پورا اور صحیح مفہوم
ظاہر ہو تو پھر اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔"

مثلاً اگر "سیکشن پائپ" کا ترجمہ یوں کیا جائے۔ وہ نل جو ہوا، پانی یا کسی اور مائع چیز کے چوسنے کا کام کرے، تو یہ اصطلاح نہ ہوئی۔ اس کے لیے "چوسنا نل" اصطلاح کے طور پر زیادہ درست ہوگا۔

۵۔ اگر اردو میں کسی انگریزی لفظ کے لیے پہلے سے کوئی لفظ موجود ہے تو نیا لفظ نہ گھڑا جائے۔ بہتر ہے کہ اسی کو استعمال کیا جائے۔ مثلاً بل آف ایکسچینج کے لیے اردو میں پہلے سے ایک لفظ "ہنڈی" موجود ہے۔ اگر ہم اس لفظ سے صرف نظر کر کے اس کا نیا ترجمہ "تبادلہ بل" وغیرہ کریں تو درست نہ ہوگا۔

۶۔ بہت سے انگریزی الفاظ اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ انہیں جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ مثلاً رجسٹری، بل، ڈاک، ٹکٹ وغیرہ۔

۷۔ بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں آ کر بگڑ گئے ہیں لیکن وہ اردو میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ انہیں بھی جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ یہ کوشش نہ کی جائے کہ انگریزی کا صحیح لفظ ان کی جگہ بولا جائے کہ مثلاً رونڈ (راؤنڈ) فیس، ڈگری، کارتوس، اردلی وغیرہ۔

۸۔ اگر کوئی انگریزی اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہیں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو رہنے دیا جائے۔ مثلاً کمیٹی اور مجلس وغیرہ۔

۹۔ ایسے موزوں مقامی الفاظ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے جو خاصے مقبول ہو چکے ہوں۔ بجائے اس کے کہ کوئی مصنوعی اور بھونڈی اصطلاح وضع کی جائے مثلاً "بلینک ایمونیشن" کو پشتو بولنے والے "شلغی" کہتے ہیں۔ "برسٹ آف فائز" کو پنجابی "چھٹا" کہتے ہیں۔ ان انگریزی الفاظ کے اگر کچھ اور ترجمے ہم کریں تو وہ نامانوس ہوں گے۔ پھر کیوں نہ مستعمل لفظ "شلغی" اور "چھٹا" رکھ لیے جائیں۔

۱۰۔ جہاں تک ممکن ہو ہندی اضافت اور حروف جار استعمال نہ کیے جائیں۔ مثلاً "ٹائم گلاس" کا ترجمہ "ریت گھڑی" کیا جائے بجائے اس کے کہ "ریت کی گھڑی" کیا جائے یا کنٹریکٹ اگریمنٹ" کا "ترجمہ اقرار نامہ ٹھیکہ" بجائے اس کے کہ اسے ٹھیکے کا اقرار نامہ کہا جائے۔

۱۱۔ جس موضوع کا ترجمہ کرنا مقصود ہو اس سے متعلق کتب وغیرہ کا مطالعہ کر لیا جائے۔

۱۲۔ مختصرات کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ پورے لفظ کا ترجمہ اختیار کیا جائے۔ مثلاً گورنمنٹ کے لیے انگریزی میں مختصر طور پر گوبٹ اور لیفٹیننٹ کرنل کے لیے (لٹ کول) لکھا جاتا ہے۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت ان کا ترجمہ مکمل صورت میں کیا جائے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دورِ تراجم

حاجی احمد فخری

ہمارا زمانہ تعلیم وتربیت کا زمانہ ہے، ہمارا زمانہ تہذیب وتمدن کا زمانہ ہے، ہمارے زمانے میں علوم وفنون کی کثرت ہے، ہمارے زمانے میں اختراعات وایجادات کی بھرمار ہے۔ آج کل تصنیفات وتالیفات کا بازار گرم ہے۔ ان دنوں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کے آثار نمودار ہیں، مگر اس دور میں جو شے اوروں سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ترجمہ ہے۔ اس لیے اگر اس دور کو 'دور تراجم' کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس زمانے کی تصنیف اور تالیف جو کچھ ہے وہ ترجمے کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اس امتیاز کی سب سے بڑی وجہ سلطان العلوم اعلیٰ حضرت شہنشاہ دکن کی علم پروری اور اردو نوازی ہے۔ آپ کی شاہانہ فیاضیوں اور علمی قدر دانی نے ہندوستان میں اردو یونیورسٹی قائم کر کے کم مایہ اور نو عمر اردو کا پایہ عرش اعلیٰ تک بلند کر دیا ہے۔ اگر چندے یہی لیل ونہار رہے تو وہ وقت دور نہیں کہ یہی سبک مایہ اور نوخیز زبان ''السنۂ عالم'' کے دوش بدوش نظر آئے گی۔ جن لوگوں کو حضرت مولانا مولوی سید وحید الدین سلیم (مرحوم) پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کی زندۂ جاوید تصنیف 'وضع اصطلاحات' کے مطالعے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو کی کیا شان ہے اور اس میں ترقی کرنے اور علمی زبان بننے کی کس قدر صلاحیت مضمر ہے۔

یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم وفنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے۔ اور زندہ اقوام کی سعی وکوشش کے نتائج کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی علمی خزانوں کو معمور کرتی ہے۔ چنانچہ قدمائے عرب نے اپنی ترقی کے زمانے میں یہی کیا کہ دوسری اقوام کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا اور ان کے جواہر ریزوں کو اپنی زبان کے نقش ونگار میں برتا۔ یہی باعث ہے کہ علوم قدیمہ میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جس سے عربی کا خزانہ خالی ہو۔ اگر دنیا میں عربوں کا وجود نہ ہوتا تو صدیوں تک اقصائے عالم پر جہل ونادانی کا بادل اسی طرح محیط رہتا جس طرح عروج اسلام سے قبل تھا۔ اگر ایک ابن رشد کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذات عالم وجود میں جلوہ گر نہ ہوتی تو ارسطو اور اس کا فلسفہ دونوں کے دونوں صفحۂ ہستی سے اس طرح معدوم ہو جاتے کہ گویا کبھی عالم وجود میں آئے ہی نہ تھے۔

جب یہ مرحلہ خاطر خواہ طے ہو چکتا ہے تو قوم ترقی کے میدان میں دوسرا قدم اٹھاتی ہے اور تصنیف و تالیف کا جامہ پہن کر زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں نظر آنے لگتی ہے۔ نہ آج تک کبھی اس کے خلاف ہوا ہے اور نہ توقع ہے کہ اس کے خلاف کبھی ہو گا۔ یہی باعث ہے کہ فرماں روائے دکن کی شاہانہ اولوالعزمیوں کے طفیل ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اپنی تمام تر توجہ اسی مفید و کارآمد صنف کی طرف مبذول فرما رہے ہیں۔ اندریں حالات یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترجمے کے مالہ و ماعلیہ پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ ترجمہ کیا ہے اور وہ اصول کیا ہیں جن کی پابندی سے ترجمہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور جس کی خلاف ورزی سے ترجمہ اپنے مرتبے سے گر جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ اس پر ترجمے کا اطلاق ہو سکے۔ آخر کچھ تو بات ہے کہ 'معرکۂ مذہب و سائنس' اور 'فلسفۂ تعلیم' معمولی تراجم سے ممتاز ہیں۔

ترجمے کی تعریف:

ہمارے نزدیک ترجمے کی تعریف یہ ہے کہ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز میں پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔

اس تعریف کی رو سے یہ امر بلا شائبہ شک ثابت ہوتا ہے کہ ترجمے میں مترجم پر مصنف کے خیالات کی پابندی فرض ہوتی ہے، اس کے الفاظ و محاورات اور اس کے اسلوب بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی۔ اگر ان باتوں کی پابندی ضروری ہوتی تو اصل زبان میں کیا برائی تھی کہ زحمت ترجمہ گوارا فرمائی جاتی۔ اگر اس قسم کی لغو اور لایعنی پابندیاں کہیں نبھ جائیں اور کوئی باکمال مترجم ان بے کار اور غیر ضروری بندشوں سے عہدہ برا ہو بھی جائے تو اس کو حسن اتفاق پر معمول کرنا چاہیے۔ اس کو شمع ہدایت سمجھنا اور اس پر فخر کرنا جائز نہیں اس لیے کہ بسا اوقات دو زبانوں کے انداز بیان میں اس قدر مغائرت ہوتی ہے کہ تقلید ناممکن ہوتی ہے۔ اگر کوئی خام مذاق اور نو مشق مترجم تقلید کے پیچھے پڑتا ہے تو وہ غیر زبان کے الفاظ و محاورات کی بندشوں میں خود گم ہو کر رہ جاتا ہے پڑھنے والوں پر یہ بھی نہیں کھلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور کس لیے کہہ رہا ہے۔ مصنف کا مطلب کچھ ہوتا ہے، مترجم کے الفاظ سے کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تقلید کی بدولت ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ لفظوں کا گورکھ دھندہ بن جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک ترجمے کا اصل اصول وہی بدنام اور مکروہ شے ہے، جسے عرف عام میں تصرف اور پروفیسر حمید اللہ خاں صاحب کی زبان میں خیانت اور بددیانتی کہتے ہیں تصرف کے بغیر ترجمے میں نہ کبھی کام چلا ہے اور نہ آئندہ چلنے کی امید ہے۔ اسی باب میں جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدر آزادی سے کام لیا جائے گا ترجمہ اسی قدر تصنیف کے قریب آ جائے گا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ترجمے میں تصرف کرنا کچھ اُن ہی بزرگوں کو زیبا ہے جو دونوں زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں اور اُس علم میں یہ طولیٰ رکھتے ہیں جس کا ترجمہ کرنے کی وہ جسارت فرماتے ہیں۔ بلکہ دونوں زبانوں میں سے ایک زبان مترجم کی مادری زبان ہوتی ہے۔ آج کل جن دو زبانوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک انگریزی ہے اور دوسری اردو۔ ایک قدیم اور سرمایہ دار زبان ہے اور دوسری نوعمر اور کم مایہ۔ ایسی حالت میں مترجم کا فرض ہے کہ انگریزی سے کماحقہ واقف ہو اور اردو اس کی مادری زبان ہو۔ اگر اردو اس کی مادری زبان نہ ہوگی تو وہ ترجمے کی بندشوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گا اور اگر انگریزی سے پوری طرح واقف نہ ہوگا تو مصنف کے خیالات کی تہ تک نہ پہنچ سکے گا۔ الغرض ان اوصاف سہ گانہ میں جس نسبت سے کمی ہوگی، ترجمے میں اسی نسبت سے خامیاں رہ جائیں گی۔

زبان دانی کا معیار:

اب بحث طلب امر یہ ہے کہ زبان دانی کا معیار کیا ہے اور وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر کس کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون شخص زبان دان ہے اور کون نہیں اور کس کے مضمون میں کس قدر الفاظ و محاورات ہیں کہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں اور کس قدر ہیں کہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان اور قلمرو نظام میں ایک شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو اُردو دانی کا مدعی نہ ہو اور جسے اس امر کا دعویٰ نہ ہو کہ اردو میری مادری زبان ہے اور میں نے اس کو اُس عالم میں حاصل کیا ہے جب میں نہ تھا دلی اور لکھنؤ کے رہنے والے تو خالص اہل زبان ہیں، اُن کا تو کیا کہنا، ان کے لیے تو یہ امر باعث ننگ و عار ہے کہ اُن کا دامن ادب شرمندۂ تعلیم ہو مگر:

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

روز مرہ بول چال میں اپنا مافی الضمیر ادا کر دینا اور معمولی چھپی چھپاتی لکھ لینا اور بات ہے اور ادیبانہ انداز سے اپنا مطلب بیان کرنا اور اس میں کشش و گہرائی پیدا کر کے ناظرین کے دلوں پر اثر کرنا اور بات ہے۔ اس بات میں اہل زبان اور بیگانۂ زبان و لسان، نیم تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل، سب برابر ہیں، جب تک کوئی شخص متواتر اور پے در پے زبان کی نزاکتوں پر غور نہیں کرتا اور جب اپنے خیالات مختلف اور گوناگوں انداز سے پبلک کے سامنے پیش کرنے کی مشق و مزاوات بہم نہیں پہنچا تا اس وقت تک وہ ترجمے اور تصنیف و تالیف کی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہو سکتا، لیکن دلی اور لکھنؤ والے اس سے جس قدر جلد اور جس قدر آسانی سے کمال پیدا کر سکتے ہیں اس قدر جلد اور آسانی سے غیر نہیں کر سکتے، خواہ وہ پنجاب کے رہنے والے ہوں یا دکن کے، خواہ وہ دلی اور لکھنؤ میں سے کسی کی تقلید کو ضروری سمجھتے ہوں یا دونوں سے آزاد ہونا اپنی شان کے شایان خیال کرتے ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس زمانے میں یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ لوگ انگریزی میں فی الجملہ بصیرت حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے پروں پر اُڑ کر مملکت اردو کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر اس خیال خام کا غلبہ ہوتا ہے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے، اس میں کدو کاوش لا حاصل ہے، اس میں سعی و کوشش ہماری شان کے شایان اور ہماری ہمت کے لائق نہیں۔ اس طرف صرف وہی کوتاہ بین اور ناعاقبت اندیش لوگ توجہ کرتے ہیں جن کے دماغ عقل سلیم سے عاری ہوتے ہیں۔ اردو انگریزی کے تابع ہے، جب انگریزی آ گئی تو اردو خود بخود آ جائے گی۔ "بانو کو تسخیر کر لو باندی خود بخود حاضر ہو جائے گی۔" مگر یہ اُن حضرات کی کوتاہ نظری اور خام مذاقی کی دلیل ہے۔ اردو کتنی ہی سبک مایہ اور نوعمر سہی، مگر زندہ زبان ہے، اس کا وجود انگریزی پر مبنی نہیں۔ صرف چند بڑے بڑے اصول ہیں کہ انگریزی سے ملتے جلتے ہیں، ورنہ دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔ جب تک اردو پر اردو کی حیثیت سے توجہ نہیں کی جاتی، اس وقت تک اردو میں بصیرت نصیب نہیں ہوتی۔ کسی موضوع کو لینا اور اُس کو موثر اور دلکش انداز سے پڑھنے والوں کے دلوں پر نقش کرنا، ایک فن ہے جو مدتوں کی کدوکاوش اور سالہا سال کی سعی و کوشش سے حاصل ہوتا ہے اور جس شے کا نام ادبی سادگی ہے وہ تو ایک ایسا کمال ہے جو تمام کمالات ادب کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ میر انیس جیسے قادر الکلام بزرگ کو کہنا پڑا ہے کہ:

اس سادگی کی قدر کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

(ہمارے نزدیک مترجم اور مصنف میں کچھ فرق نہیں، دونوں کی حدیں ایک مقام پر جا ملتی ہیں۔ کامیاب اور قابل تقلید مترجم وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں مصنف بننے اور تصنیف کرنے کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے اور ترجمے کی گونا گوں ذمہ داریوں سے وہی شخص عہدہ برا ہو سکتا ہے، جس نے انداز بیان پر اس درجے قدرت حاصل کر لی ہو کہ جس مطلب کو جس پہلو سے چاہے ادا کر جائے۔ بہترین مترجم وہی بزرگ ثابت ہوئے ہیں جن میں یہ قوت بوجہ اتم موجود تھی) لیکن جن لوگوں میں یہ قوت کم تھی وہ کامیابی اور شہرت کے میدان میں اسی قدر پیچھے رہ گئے جس قدر اس قوت میں کمی تھی۔ جو لوگ مصنف کے انداز بیان کی تقلید سے انحراف کرنے اور ترجمے میں تصرف سے کام لینے کی قوت نہیں رکھتے اُن کی ادبی زندگی محض عارضی اور چند روزہ ہوتی ہے، بلکہ مرنے سے پہلے ہی اُن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حیات ابدی اور شہرت سرمدی کچھ ان ہی بزرگوں کا حصہ ہے جو منظر عام پر جلوہ گر ہونے سے پہلے کمالات صوری و معنوی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور شب و روز کی متواتر اور جانکاہ محنت سے اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر لیتے ہیں جو ادائے فرض کے لیے ضروری اور لابدی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر مرزا غالب کو لیجیے اور ان کے ایک شعر پر غور کیجیے۔ فرماتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محرم نہیں ہے توہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کیا کوئی شخص اس غیرفانی شعر پر ترجمے کا الزام عائد کرسکتا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے، کیا اس میں وہ تمام خوبیاں موجود نہیں ہیں جو اعلیٰ درجے کے شعر میں ہونی چاہئیں، کیا اس میں وہ تمام اوصاف وصفات موجود نہیں جو شعر کی جان اور ادب کی روح رواں ہیں؟ اب ذرا عرفی شیرازی کا شعر ملاحظہ ہو:

ہرکس نہ راز است وگرنہ
ایں نہا ھمہ رازست کہ معلوم عوام است

کیا مرزا کا شعر عرفی کے شعر پر مبنی نہیں ہے، کیا مرزا نے اس سے استفادہ نہیں کیا ہے، کیا مرزا نے اس شعر کی روح کو اپنے الفاظ میں جلوہ گر نہیں کیا ہے، اور کیا اپنی طرف سے اس پر ایک گونہ لطیف اور پاکیزہ اضافہ نہیں فرمایا ہے، اور کیا اپنے انداز خاص میں کدوکاوش اور مذاق سلیم کی داد نہیں دی ہے، کیا اس میں اور تصنیف میں کچھ فرق ہے، کیا اس میں وہ تمام باتیں موجود نہیں ہیں جو تصنیف کے لیے لازمی ہیں اور کیا مرزا اس میں حق بہ جانب نہ تھے، کیا اس پر سرقے کا الزام اور چوری کا بہتان عائد ہوسکتا ہے؟ ہمارے نزدیک اس قسم کے باریک اور لطیف اضافوں پر سرقے کا الزام لگانا اور ان کو خیانت اور بددیانتی پر محمول کرنا ذوق سلیم کا منہ چڑانا ہے اور یہ صرف ان ہی لوگوں کا حصہ ہے جو انگریزی کے پروں پر اڑ کر قلمرو اردو کو عبور کرنا چاہتے ہیں۔ اس امر سے کوئی صاحب ذوق انکار نہیں کرسکتا کہ اس قسم کے نازک اور لطیف اضافے کا نام تصرف ہے اور یہی ترجمے کی جان اور ادب وانشا کی روح رواں ہے۔ ہمارے نزدیک ترجمے کی بہترین مثال یہی ہے اور اسی کی تقلید ہونی چاہیے۔

اسی طرح شیخ علی حزیں، کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

چون نفی اثبات است، ازمردن نمی ترسم
بقائے من، چو شمع کشتہ باشد درفنائے من

میر انیس اس کو لیتے ہیں اور اپنے انداز میں یوں ادا کرتے ہیں:

خودنویدزندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں، فنامیں ہے بقا میرے لیے

کیا میر صاحب کا یہ شعر شیخ کے شعر کا ترجمہ نہیں ہے، کیا میر صاحب نے اپنے شعر کی بنیاد اسی شعر پر نہیں رکھی ہے اور کیا اس میں اپنی غیرمعمولی شاعرانہ قابلیت سے تصوف نہیں فرمایا ہے؟ اگر میر صاحب زحمت تصرف گوارا نہ فرماتے تو یہ شعر اس بلندی پر جلوہ گر نہ ہوتا، جس پر اس وقت میر صاحب کے ذوق لطیف کے طفیل نظر آ رہا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ملا طاہر وحید کا ایک شعر ہے:

زشیخ شہر جاں بردم بہ تزویر مسلمانی
مدارا گر بہ ایں کافر نمی کردم چہ می کردم؟

ایک شخص نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں اس کا ترجمہ کر دیا:

مسلمان بن کے جاں میں نے بچائی شیخ نجدی سے
مدارا گر نہ اس کافر سے میں کرتا تو کیا کرتا؟

کیا یہ شعر ملا کے شعر کا صحیح ترجمہ نہیں ہے، کیا اس میں کہیں کور کسر ہے، کیا مترجم نے اس میں تصرف سے کام نہیں لیا، کیا شیخ شہر کی جگہ شیخ نجدی نہیں کر دیا ہے، اور ''بہ تزویر مسلمانی کا ترجمہ'' ''مسلمان بن کے'' نہیں کیا، کیا اس سے بہتر انداز میسر ہو سکتا ہے؟ یہ سب کچھ ہے، مگر ارباب ذوق جانتے ہیں کہ یہ شعر اس قدر بلند نہیں ہے جس قدر ملا کا شعر ہے۔ اس لیے کہ تصرف کچھ زیادہ باریک اور لطیف نہیں ہے اور مترجم اپنی طرف سے کوئی ایسا اضافہ نہیں کر سکا جس سے تصرف کرنے میں حق بہ جانب سمجھا جائے۔ 'عرفی شیرازی' کا ایک اور شعر ہے:

مدہ عنان تعلق بہ حسن ہر ذرہ برآر
دستے و برفرق آفتاب انداز

اس کا ترجمہ جناب، آزاد انصاری ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

ذرات کی چمک پر کب تک مٹا رہے گا
اٹھ اور اٹھ کے اک دم ہاتھ آفتاب پر ڈال

کیا اس میں جناب 'آزاد' ترجمے کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکے کیا اس میں تصرف کا عمل جلوہ گر نہیں ہے، کیا جناب 'آزاد' پر خیانت اور بد دیانتی کا الزام لگایا جائے گا؟ اس لیے کہ 'عرفی' کے شعر میں کہیں 'اٹھنے' کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح حزیں کا شعر ہے:

مسی مالیدہ لب رارنگ پان است
تماشا کن تہ آتش دخان است

'سودا' نے اس کو لیا اور ان الفاظ میں ادا کر دیا:

مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے
تماشا ہے تہ آتش دھواں ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں 'سودا' نے کسی قسم کا تصرف نہیں کیا، اسی لیے اصل شعر میں کسی قسم کا اضافہ نہ کر سکا، بلکہ شعر کو اس بلندی پر نہ پہنچا سکا، جہاں حزیں نے اپنے شعر کو پہنچا دیا تھا۔

قرآن مجید میں ایک آیت ہے۔ انا عرضنا الامانۃ الخ۔ خواجہ حافظ اس کو لیتے ہیں اور اپنے ناقابل تقلید انداز میں یوں ادا کرتے ہیں:

آسماں بار امانت نہ توانست کشید   قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار واقوال کو لیجیے اور فرداً فرداً ہر ایک پر غور کیجیے اور یہ دیکھیے کہ ان میں کوئی شعر یا کوئی قول ایسا ہے جو تصرف کی دست برد سے محفوظ ہو:

بوے یار من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

(نظیری نیشاپوری)

کیفیت چشم، اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

(سودا)

در محفل خود راہ مدہ ہم چو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے
دوستو! درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

(خواجہ میر درد)

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

(سعدی)

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی پوچھیے تم ایسے کیوں پیارے ہوے

(میر تقی میر)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گفتہ بودم غم دل باتو بگویم چو بیائی
چہ بگویم کہ غم ازدل برود چوں تو بیائی

(سعدی)

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(مرزا غالب)

داماں نگہ تنگ، گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد
مرے ذوق نظر کو دیکھنا بزم حسیناں میں
وہ گلچیں ہوں بجائے گل بھرونگا رنگ داماں میں

(وفارام پوری)

عربی اقوال وضرب الامثال:
''الکلب انجس ما یکون اذا اغتسل''
سگ بدریائے ہفت گانہ بشو چونکہ تر شد پلید تر گردد

(سعدی)

الصمت زینۃ العالم وستر الجاہل:
ترا خامشی، اے خداوند ھوش
وقار است وناہل را پردہ پوش

(سعدی)

راع اباک یراع ابنک:
تو بجائے پدر چہ کردی خیر
تاھماں چشم داری از پسرت

(سعدی)

کل یوم ھو فی شان:
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

(درد)

سناء ذکاء لایزال من دعاء الخفاش:

شپر گرد نور آفتاب نہ خواہد
نور بازار آفتاب نہ کاہد

(سعدی)

السعید من اکل وزرع والشقی من مات وودع:

نیک بخت آنکہ خورد و کشت
وبد بخت آنکہ مرد و ہشت

(سعدی)

السلطان احوج الی العقلاء من العقلاء الی السلطان:

پادشاہاں بہ خردمنداں محتاج
تراند کہ خردمنداں بہ پادشاہاں:

(۱)۔

منم ہر سخن را بیان معانی
منم جان وعقل و ہنر را قوالب
منم ازنژاد بزرگان ساماں
کہ بودند شاہان چتر و کواک

(منوچہری)

I can explain the deepest thought in all sciences,

I am the heart and soul of reason and knowledge,

I am descended from the Imperial House of Saman,

Whose kings bore the power of sovereignty.

(۲)۔

آب جیحون از نشاط روے دوست

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خنک مارا تامیان آید ہمی

(رودکی)

Glad at the friend's return, the Oxus deep,

Up to our girths in laughing waves shall leap.

(۳)۔

اگر شہ روز را گوید شب است این

بباید گفت اینک ماہ و پروین

Should he (the king) say "the night is day"

Reply: Behold the moon and the pleides.

(۴)۔

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لانبی بعدی

ابیات وقصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

The sphere, poetic has its prophets three

(Although there is no prophet after me)

Firdausi in the epic, in the ode

Sadi and in qasida anwari. (Prof. Brown's translation)

(۵)۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار عرب راہجائے رسیداست کار

کہ تخت سا گیاں راکند آرزو تفو برتو اے چرخ گرداں تفو

(فردوسی)

From feeding on camel's milk and desert lizard, so

have the affairs of the Arabs prospered.

That they covet the throne of the Chosroes.

Shame on thee O circling Heavens, shame,

(۶)۔ عاقلے راپرسیدند نیک بخت کیست و بد بخت چیست، گفت نیک بخت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آ نکہ خورد وکشت و بد بخت آ نکہ مرد وہشت

(سعدی)

They asked of a wise man who is the man of good fortune & who of bad?

He said "The man of good fortune is he who ate & tilled; the man of bad fortune is he who died and left (everything) he had,

(۷)۔

اگر جز بہ کام من آید جواب من وگرز و میدان وافراسیاب

(فردوسی)

If the answer prove contrary to my wish

Then I shall take the mace and the field against afrasiyab,

(۸)۔

خروشید و جوشید و جامہ درید بزاری بر اں کودک نارسید

برآورد بانگ و غریو وخروش زماں تازماں زوہمی رفت ہوش

(فردوسی)

She screamed and raved and rent her garment in lamentation over the unblossomed youth.

She sobbed and wailed and shouted & fainted again & again.

(۹)۔ دلیرے کہ بدنام او اشکبوس ہمی برخروشید برسان کوس

The intrepid Ashkboos roared like a drum

(۱۰)۔

دلم از خدمت شیراز بہ کلی بگرفت

وقت آنست کہ پرسی خبراز بغدادم

سعدیا! حب وطن گرچہ حدیثے است صحیح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتوان مرد بہ سختی کہ من ایں جازادم
(سعدی)

My soul is weary of shiraz, utterly sick and sad
If you seek news of my doings, you will have to ask at Baghdad
Saadi, that love of one's native land is a true tradition is clear,
But I can not afford to die of want because my birth was here.

(۱۱)۔

آن را کہ جائے نیست ہمہ شہر جائے اوست
درویش ہرکجا کہ شب آمد سرائے اوست
حدیث از مطرب و مے گو وراز دھر کمتر جو
کہ کس نکشاید ونکشاید بہ حکمت ایں معمارا
(سعدی)

Speak of the musician and of wine and search less into the secrets of futurity;
For no one in his wisdom ever hath discovered or everwill discover that mystery.

من از آں حسن روزافزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

I can understand how the beauty of Joseph, which added now luster to the day,
Withdraw zalikha from the veil of her modesty.

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکوگفتی
جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکرخارا

Thou hast spoken evil of me, and I am contented-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

God forgive thee.

Thou hast spoken well; for even a bitter word is

beseeming when it cometh from a ruby sugar-dropping lip.

نصیحت گوش کن جاناں کہ ازجاں دوست تردارند
جوانان سعادت مند پند پیرد انارا

Give ear O my soul, to good councel, for better

than their own souls love youths of happy disposition

the admonition of the aged wise.

غزل گفتی و درسفتی، بیاؤخوش بہ خواں 'حافظ'
کہ برنظم توافشاند فلک عقدثریارا

Thou bast composed thy ghazal; thou hast strung

thy pearls.

thy poetry the harmony-of the pleiades.

مندرجہ بالا سطور میں ترجمے کے جونمونے ہدیۂ ناظرین کیے گئے ہیں ان سے ارباب بصیرت یہ ضرور محسوس کریں گے کہ ترجمے میں جو زبان برتی گئی ہے وہ انگلستان کی ٹکسالی زبان ہے، وہ ایسی زبان ہے جو شب وروز وہاں بولی اور لکھی جاتی ہے، وہ ایسی زبان ہے جو وہاں کے روزمرہ اور محاورے کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، وہ ایسی زبان نہیں جس کو دیکھ کر فصحائے انگلستان ناک بھوں چڑھائیں اور ٹکسال باہر سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں، بلکہ وہ ایسی زبان ہے کہ انگلستان کے آدمیوں اور انشاپردازوں کے لیے باعث ناز اور موجب افتخار ہے۔ ہم نے متعدد انگریز حضرات سے سنا ہے کہ فٹز جیرلڈ نے عمر خیام سے صرف خیالات کا اقتباس کیا ہے اور مشرقی جذبات کو مغربی لباس میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ اگر وہ عمر خیام کا نام نہ لے تو کوئی متنفس اس پر سرقے کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح پروفیسر براؤن کی نسبت علمائے ادب کی یہ رائے ہے کہ ''فارسی زبان کے شہ پاروں کو فصیح اور بلیغ انگریزی کا جامہ پہنانا اسی کا حصہ ہے'' یہ ہے ترجمہ جو مترجم کے لیے مایۂ فخر وناز اور اس کی شہرت اور ناموری کے لیے چشمۂ آب حیات ہے۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں کے ترجموں کو لیجیے اور ان پر ایک سرسری نظر ڈالیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے مترجم حضرات جو زبان برتتے ہیں وہ اردو نہیں ہے، بلکہ اچھی خاصی انگریزی ہے۔ وہی الفاظ ومحاورات ہیں، وہی بندشیں اور ترکیبیں ہیں، وہی طرز ادا اور وہی اسلوب بیان ہیں کہ بے کم وکاست اردو میں برتے جاتے ہیں، اس لیے کہ ان بزرگ زادوں کے یہاں تصرف کا نام خیانت اور اجتہاد کا نام بددیانتی ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کا فن

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

فن ترجمہ سے متعلق سب سے پہلے ناقدین کی چند آراد یکھتے چلیے:

1۔ ''مترجم کا کام لفظ کی جگہ لفظ نہیں بلکہ مصنف کے کے اسلوب اور زبان کی طاقت کو اپنی زبان میں محفوظ کرنا ہے۔''
سیسرو (46 قبل مسیح)

2۔ ''شاعری ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی۔'' ڈاکٹر سیموئل جانسن (18 ویں صدی عیسوی)

3۔ ''نثر میں ترجمہ ناقابل فہم اور ناممکن ہے۔'' وکٹر ہیگو (19 ویں صدی عیسوی)

4۔ ''ترجمے کی زبان قابل التفات دکھائی نہیں دیتی۔'' جے۔ایچ۔فریئر (1820ء)

5۔ ''زندہ کتا، مردہ شیر سے بہتر ہے۔'' ایڈورڈ فٹز جیرالڈ (19 ویں صدی عیسوی)

6۔ ''ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بنا جاتا ہے، سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صنعت و لوازمات کا اس ایک لفظ کے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے۔'' محمد حسین آزاد (1881ء)

7۔ ''ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے۔'' گرانٹ شاورمین کریلی (1916ء)

8۔ ''ترجمہ، نام ہے ایک سعی ناشکور کا، جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔''
پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ (1940ء)

9۔ ''ترجمہ، ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے۔'' رابرٹ فراسٹ (1955ء)

ترجمہ نگاری سے متعلق محولہ بالا آرا یا حتمی فیصلوں کو حادثاتی نتائج نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی کوئی حتمی فیصلے ہیں۔ ان آرا (یا حتمی فیصلوں) کو اتنی ہی آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے، جس قدر آسانی سے انہیں جنم دیا گیا۔

دنیا کا قدیم ترین ادبی ترجمہ ہومر کی ''اوڈیسی'' کا یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ تھا۔ یہ 250 قبل مسیح کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصہ ہے جب لیویس اینڈرونیکس (Livius Andronicus) نے ہمر کے رزمیہ کو لاطینی زبان میں منتقل کیا۔ لیویس اینڈرونیکس کے سامنے ترجمہ نگاری کا کوئی اصول نہیں تھا، شاید اس لئے اس نے ترجمے کو از سرِ نو تخلیق کرنے کا درجہ دیا۔ لیکن یہ کام عملی سطح پر ہوا تھا، اینڈرونکس نے نظری سطح پر کسی قسم کی نظریہ سازی نہیں کی تھی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ اس زمانے میں تخلیق کے مقابلے میں ترجمے کو کم تر ثابت کرنے یا برابری کا درجہ دینے کے معاملے میں بحث مباحثے نے جنم نہ لیا۔ یہاں تک کہ 46 قبل مسیح میں (Cicero) نے مترجم کو ایک ترجمان کی بجائے ''مقرر'' کہا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ 250 قبل مسیح سے 46 قبل مسیح تک ترجمہ ایک حد تک تخلیق کے درجے پر فائز تھا۔ 15 ویں صدی عیسوی تک آتے آتے تخلیق اور ترجمے میں درجہ بندی تو ہو گی لیکن ترجمے کی اہمیت کسی طرح کم نہ ہوئی۔

مشرق اور مغرب، ہر دو اطراف میں ایک زبان سے دوسری زبانوں میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ مشرق میں تراجم کی تاریخ کو کھنگالا جائے تو آج 2012ء سے ٹھیک ایک ہزار چار سو انسٹھ برس قبل ساسانی دور کے ایران میں سنسکرت کی کتاب ''پدیش'' کے ایک حصے ''پنچ تنتر'' کا ترجمہ بزرجمہر اور حکیم برزویہ کی کوششوں سے (550ء) پہلوی زبان میں ''کلیلک ودمنک'' کے نام سے ہوا۔ اس سے پیچھے جائیں تو دنیا کے قدیم ترین ادب کی معلومہ مثال سامرہ (5 ہزار سال قبل مسیح) سے ملتی ہے۔ اس زبان کی تہذیب 'سومیری' یا 'سومیرا' کہلاتی ہے۔ 'سومیری ادب' 'رگ وید' سے کم از کم اڑھائی سال اور زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سال قبل حیطۂ تحریر میں آنا شروع ہوا، یوں عبرانی اور یونانی ادب سے دو ہزار سال پہلے کا زمانہ بنتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ سومیری ادب بھی اپنی تہذیب کے اوج کمال کے ساتھ اُس وقت کی معلومہ دنیا پر اثر انداز ہوا ہوگا۔ کیا معلوم 'رگ وید' پر سومیری ادب نے کس قدر اثر چھوڑا، یونانی علم وادب 'سومیری ادبیات' سے کس قدر اثر پذیر ہوا؟ ان سوالات کا جواب خود سومیری زبان کت علاقے ''سومیری'' (جنوبی عراق) کے لوگوں کے پاس نہیں۔

('دنیا کا قدیم ترین ادب' از ابن حنیف، کاروان ادب، ملتان چھاؤنی، 1983ء)

کہا جاتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرے گا، آریاؤں کی 'رگ وید' عبرانیوں کے 'عہد نامہ قدیم'، قدیم یونان کی 'الیڈ' اور 'اوڈیسی' اور ہندوؤں کی 'رامائن' 'مہابھارت' پر سومیری ادب کے اثرات واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

روم کا زوال اور نشاۃ الثانیہ کی درمیانی صدیاں مورخین کے نزدیک 'ازمنۂ تاریک' قرار پائیں لیکن دراصل یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں نے قدما کے علمی اور ادبی سرمائے کو برباد ہونے سے بچا لیا۔

مامون الرشید (عباسی) نے حران کے صابیوں، نسطوری عیسائیوں اور ہند کے علما کی مدد سے سریانی، پہلوی، یونانی اور سنسکرت سے مختلف علوم وفنون کو عربی میں منتقل کروایا۔ عباسی 'بیت الحکمت' کم وبیش دو سو سال تک کام کرتا رہا۔ مترجمہ علوم میں ارسطو کی 'منطق'، افلاطون کا 'اشراق'، بقراط کی 'طب'، فلاطینوس کا 'عرفان' اور آریا بھٹ کا 'علم ہیئت' عربی ادب کو مالا مال کر گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

12 ویں اور 13 ویں صدی عیسوی میں ابن رشد اور بوعلی سینا کی تالیفات لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر مغربی ممالک میں شائع ہوئیں، جنہوں نے مغرب کی ہزار سالہ جہالت اور بے عملی کی زندگی کو حقیقی معنوں میں کاجتن بنانے میں مدد دی۔ ابن رشد کے 'حقیقت دوگونہ' کے نظریے نے خاص طور پر مغربی اذہان کو متاثر کیا جب کہ یونانی فلسفے کی ترویج کے سلسلے میں ابن ماجہ، ابن طفیل اور ابن رشد کے تراجم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ دوسری طرف 'ارسطو کی کتاب' 'الروح' (شرح: اسکندر افرودیسی) کی مقبولیت سے 'نوفلاطونی' یا 'نواشراقی' فلسفے نے رواج پایا۔ لیکن در حقیقت یہ شرح کا کمال تھا اور ارسطو کے افکار کے ساتھ اس کا محض واجبی سا تعلق پایا جاتا ہے۔

عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا بھر کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ بیروت کے عیسائی مؤرخ نوفل آفندی نے کتاب 'صناجتہ الطرب' میں اس دور پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

حضرت امیر معاویہؓ کے زمانے میں حدیث، فقہ اور تفسیر کا علم اپنی انتہاؤں پر تھا۔ امیر معاویہؓ کے پوتے خالد نے عیسائی اور اہل یہود سے علم طب پڑھا تھا۔ خالد نے غیر زبانوں سے تراجم پر خصوصی توجہ دی اور یونانی فلسفے کو مصر کی درس گاہوں سے منتقل کیا۔ واضح رہے کہ اس وقت مصر کی زبان 'قبطی' تھی۔

شبلی نعمانی نے ''رسائل شبلی'' مطبوعہ الیکٹرک پریس، امرتسر (1898ء) میں لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں ابنِ آثال (حمص کا عیسائی کلکٹر) نے یونانی زبان سے طب کی بعض اہم کتب عربی میں منتقل کیں۔ اسے عربی میں ترجمے کی جدید روایت کا سر آغاز کہنا چاہیے۔ اس عہد کا سب سے اہم مترجم اصطفن تھا، جس نے سریانی سے عربی میں اہم تراجم کیے۔ اس دور میں ترجمے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی کہ مالگزاری اور خراج کے دفاتر غیر زبانوں کے سہارے چلتے تھے۔ مثال کے طور پر عراق کا دفتر فارسی میں، شام کا لاطینی میں اور مصر کا قبطی میں۔ صالح بن عبدالرحمٰن نے 87ھ مطابق 705ء میں عراق کا دفتر عربی میں منتقل کر دیا۔ ہشام بن عبدالملک (سال خلافت: 105ھ مطابق 723ء) نے شام کے دفتر کو عربی میں منتقل کروایا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں فارسی، لاطینی اور قبطی کے جاننے والے خود مسلمانوں میں (بڑی تعداد میں) موجود تھے۔ ہشام کے میر منشی سالم نے ارسطو کے دو رسائل 'بوطیقا' اور 'رطوریقا' جو سکندر اعظم کے نام تھے، کو عربی میں ترجمہ کیا۔ جب کہ سالم کے بیٹے جبلہ نے فارسی ادب اور فلسفے سے متعلق کتب ترجمہ کیں۔

(دیکھیے: ''الفہرست'' از علامہ ابن الندیم ص: 244)

دولت عباسیہ (750ء تا 1258ء) کے خلیفہ ابوجعفر منصور نے جن عجمیوں کو اپنے دربار میں جگہ دی، انہوں نے فارسی سے طب اور فلسفے کی کتابیں ترجمہ کیں۔ اس دور کا سب سے اہم مترجم عبداللہ بن المقفع تھا جس نے سنسکرت 'پنج تنتر' اور پہلوی 'کلیلک ودمنک' کا عربی میں ترجمہ کر کے 'کلیلہ ودمنہ' نام رکھا۔ اس کے فارسی سے کیے ہوئے دیگر تراجم میں ایرانی تاریخ کی نادر کتابیں خصوصاً 'آئین نامہ'، 'یزدک نامہ'، 'نوشیرواں نامہ' یادگار ہیں جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ اس نے مانی کی فارسی تصنیف کو بھی عربی کا جامہ پہنایا۔اسی طرح پارسی علم الاخلاق سے 'الادب الکبیر' اور 'الادب الصیغر' اس کے یادگار تراجم ہیں۔جارج ابن جبریل نے اس زمانے کی طب سے متعلق اہم کتابوں کو عربی میں منتقل کیا۔منصور کے ایک درباری بطریق (عیسائی) نے یونانی سے بقراط اور جالینوس کے افکار کو ترجمہ کیا۔جب کہ ابن رشد نے ارسطو کے فلسفیانہ رسائل کو عربی کا جامہ پہنایا۔اسی عہد میں مانی اور مجوسیوں کے تراجم کے بعد عرب دنیا میں پہلی بار دوسری اقوام کے مذہب پر ریسرچ کا رجحان پیدا ہوا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے 'بیت الحکمت' کی بنیاد رکھی تو اس میں دارالتراجمہ بھی قائم کیا۔یوں عربی میں ترجمے کی بکھری بکھری انفرادی کوششوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔

ہارون الرشید کے عہد سے متعلق دو بڑے مترجمین:

1۔فضل بن نوبخت مجوسی اور

2۔یوضنا بن ماسویہ تھے۔جنہوں نے بالترتیب فارسی اور یونانی زبانوں سے ترجمے کیے۔

مامون الرشید کا زمانہ عربی میں تراجم کی تاریخ کا سنہری دور تھا،شاید اس لئے بھی کہ بقول شبلی نعمانی:

''ہر بات میں وہ شاہان عجم کی تقلید کرتا تھا اور اردشیر آئین سلطنت اُس کا دستور العمل تھا۔''

(رسائل شبلی،ص:218)

فلسفے سے اس کی رغبت کا احوال بتانے والا قیصر روم کے نام اس کا خط ہے،جس میں اس نے لکھا تھا کہ ارسطو وغیرہ کی جس قدر کتابیں بہم پہنچا سکیں،پہنچائی جائیں،یہ وہ زمانہ تھا جب خلفائے عباسیہ کے خطوط قیصر روم کے لئے حکم کا درجہ رکھتے تھے۔(رسائل شبلی،ص:143)

مامون الرشید سے پہلے عربی میں لفظی ترجمے کا رواج تھا اور کتاب (اصل متن) کی مشکلات ترجمے مین بھی اس طرح قائم رہتی تھیں۔اس مشکل کو اس دور کے مشہور مترجم حنین ابن اسحاق (عیسائی) نے دور کیا اور مامون الرشید نے اس کی ہر تصنیف (ترجمہ) کے برابر سونا تول کر دیا۔حنین نے اڑتالیس برس کی عمر تک مامون الرشید کے لئے جالینوس کی 121 کتابوں اور رسالوں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا۔جب کہ دوسرے عظیم مترجمین یعقوب کندی،سہل بن ہارون اور قسطا بن لوقا نے بالترتیب سنسکرت و یونانی فلسفہ، 'کلیلہ و دمنہ' کے طرز پر 'ثعلہ وعفراء' اور یونانی علوم وفنون کے تراجم کیے۔

یہ سب کچھ اس لئے بھی ممکن ہو سکا کہ مامون الرشید کے عہد میں مناظرے بازی (برمکی عہد کی یادگار) کے مقابلے میں علوم عقلی پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔جن کہ اصطرلاب پر یونانی فلسفر بطلیموس کے رسالے کا عربی ترجمہ ھارون الرشید کے عہد میں یحیٰی برمکی کی زیر نگرانی ہوا تھا۔

227ھ مطابق 841ء میں خلیفہ واثق باللہ نے حنین ابن اسحاق کو دارالترجمہ کا مہتمم مقرر کیا۔جب کہ اسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زمانے میں موسیٰ بن خالد جیسے مترجم وہاں ترجمے کے کام پر مامور تھے۔ سیف الدولہ کے عہد میں عیسیٰ رقی جیسا اہم مترجم موجود تھا۔ ادھر اندلس میں عبدالرحمن ناصر نے مترجمین سے وہ کام لیا جو شاہنامہ سلام (فردوسی) کے لئے مضبوط بنیادیں فراہم کر گیا۔ اسی زمانے میں عزالدین نے علم نجوم پر ’دلائل فیروزی‘ جیسا ترجمہ مکمل کیا اور ثابت ابن قرۃ نے 826ء میں ریاضی اور علم ہیئت سے متعلق متعدد کتب کو یونانی سے عربی میں منتقل کر دیا۔

داستانوی ادب کے تراجم میں ’کلیلہ و دمنہ‘ کا دوسرا اہم ترجمہ عبداللہ بن ہلال اہوازی نے 65ھ مطابق 684ء میں مکمل کیا تھا۔ یہ زمانہ یحییٰ کا تھا۔ اس دور میں عمر بن فرحان (جسے رئیس المترجمین کہا جاتا ہے) دارالترجمہ میں موجود تھا۔ اسی دور میں مہاندس محمد ابن ابراہیم فزاری نے زیج کی مشہور زمانہ تصنف ’سدھانت‘ از برہم گپت کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ مکمل کیا۔

مندرجہ بالا اہم مترجمین کے بعد موسیٰ بن شاکر کا خاندان ترجمے میں اہم مقام حاصل کر گیا۔ سی خاندا کے ثابت بن قرہ کو اپنے زمانے کا ’رئیس المترجمین‘ مانا گیا۔

قدیم عرب کے مترجمین زبان فارسی

عبداللہ بن المقفع، فضل بن نوبخت، ابوسہل اسماعیل بن علی بن نوبخت، حسن بن موسیٰ، حسن بن سہل، موسیٰ بن خالد، یوسف بن خالد، ابوالحسن علی، جبلہ بن سالم، احمد بن یحییٰ البلاذری، اسحاق بن یزید، محمد بن جہم البرمکی، موسیٰ بن عیسیٰ، ہشام بن القاسم، محمد بن بہرام بن مطیار الاصفہانی، بہرام بن مراد شاہ، عمر بن فرخان الطبری، عبداللہ بن علی، سہل بن ہارون، سعید بن ہارون، اسحاق بن علی اور عبداللہ بن ہلال اہوازی۔

قدیم عرب کے مترجمین زبان سنسکرت

منکہ، ابن دھن، اسماعیل تنوجی، ابوریحان بیرونی اور فیضی۔

قدیم عرب کے مترجمین زبان سریانی

ماسرجیس (یہودی)، عیسیٰ بن ماسرجیس، ہشدی کرخی، ایوب الرہادی، یوحنا، منصور بن باناس، ایوب بن قاسم اور متی بن یونان۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدیم عرب کے مترجمین زبان یونانی ولاطینی نیز سریانی

اصطفن، بطریق، یحییٰ بن بطریق، حبیب بن بہریز، حجاج بن مطر، عبدالمسیح ابن ناعمۃ الحمصی، سلام ابرش، عیسیٰ بن نوح، ابراہیم قویری، حلیبا، ایوب ہادی، باسیل، قسطا بن لوقا، حنین بن اسحاق۔

عربی ادب میں جدید دور کا آغاز تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے نپولین کے مصر پر حملے سے ہوا اور اہل مصر جدید مغربی علوم سے روشناس ہوئے۔ نپولین کی فوجیں فرانس واپس جاتے ہوئے اپنے علوم وادب کے کچھ آثار چھوڑ گئیں اور یہی سبب ہے کہ مصر کے حکمران محمد علی پاشا نے اپنے ملک کے چنیدہ ذہین طلبہ پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھیجے اور جدید تر مغربی علوم کے تراجم عربی زبان میں کروائے۔ ان جدید تر علمی عناصر کی مصر میں نشوونما سے پہلے فرانسیسی ادبیات کو عربی میں منتقل کرنے کا کام مکمل کیا جاچکا تھا۔ ترجمے کے اس کام میں شام ولبنان کے ان عیسائی ادبا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو مصر میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ تراجم کے زیر اثر شوقی نے پہلی مرتبہ فرانسیسی منظوم ڈراموں کی طرز پر کامیاب منظوم ڈرامے لکھے۔ یہی وہ تخصیصی اوصاف ہیں، جن سے حافظ ابراہیم کی شاعری خالی ہے اور یہ صرف تراجم کے باعث پیدا ہوئے۔

مصر کے نابینا زیر تعلیم ڈاکٹر طہٰ حسین یونانی ادبیات کے ماہر تھے اور انہوں نے چاہا تھا کہ تراجم کا ایک اور دور چلے۔ اس سے پیشتر جنگ عظیم کی بدولت ادبیات عالم میں جو نمایاں انقلاب برپا ہوا تھا اس کے ثبوت عربی ادب میں بھی ملتے ہیں۔ خلیل جبران لکھتا ہے:

> ''میں مشرق کا ماتم اس لئے کرتا ہوں کہ مردہ لاش کے آگے رقص کرنا محض پاگل پن ہے۔ میں اہل مشرق کے حال زار پر اس لئے روتا ہوں کہ بیماروں پر ہنسنا جہل مرکب ہے۔''

خلیل جبران کا نام ساری دنیا میں ترجمے کی تحریک کا نمایاں تر نام ہے۔ خلیل جبران کی بازگشت شام اور لبنان کے ادبی حلقوں میں بھی سنی گئی۔ جنگ عظیم کے بعد عقاد کا زمانہ آیا۔ یہ زبردست نقاد اور انشائیہ نگار فرانسیسی ادب کی بہ نسبت انگریزی ادب سے زیادہ متاثر تھا۔ اس نے انگریزی ادب کے جدید تر رجحانات کو عربی میں منتقل کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔

عربی ادب کے 'اپولو گروپ' کی قیادت مصری شاعر ڈاکٹر ابوشادی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ وہ گروپ ہے جس کی شاعری میں مغرب اور مشرق کی حدیں مٹی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

عراق میں فکشن کی ابتدا ''الف لیلہ'' اور قدیم حکایات وقصص کے تراجم کے زیر اثر ہوئی جب کہ بعد میں اس کی جگہ مصر اور لبنان کے رسائل میں شائع ہونے والے افسانے اور مغربی ادب کی ناکام نقالی نے لے لی۔ البتہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کا کام مغربی زبانوں سے واقفیت نہ ہونے کے سبب نہ ہوسکا پھر بھی محمود السید، انور شاؤول، عبدالمجید لطفی، ذوالنون اور ڈاکٹر خلوص نے خلیل جبران اور امریکی ادب کے زیر اثر نئی تکنیک بھی برتی اور تراجم کی محدود تعداد میں ترجمے کا حق بھی ادا کیا۔ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ عراقی ناول نگاروں میں محمود احمد سید، ذوالنون ایوب اور جعفر خلیلی نے انگریزی ادب سے اثر قبول کیا۔ کال مارکس کی 'داس کیپیٹل' کے ترجمے کے ساتھ ہی اشتراکی خیالات کی ابتداء ہوگئی تھی تاہم موجودہ دور میں یہ اثرات کہیں زیادہ نمایاں ہیں۔ عربی کے جدید ناولوں میں حقیقت پسندانہ کردار نگاری کے معاملے میں مغربی اصولوں ہی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، جبکہ جدید ترین فکشن میں فرانس کے فلابیر اور ایمائل زولا کے بعد سارتر کے زیر اثر نظریۂ وجودیت تک کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

ایران میں اکثر ترجمے عربی زبان سے ہوئے اور دور جدید میں فرانسیسی اثر کو بھی قبول کیا گیا۔ ساسانی دور کے ایران میں سنسکرت کی کتاب ''ہتوپدیش'' کے ایک حصے ''پنچ تنتر'' کے ترجمے (550ء) کے بعد متعدد یادگار ترجمے فارسی میں ہوئے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

'تاریخ طبری' کا ترجمہ وزیر محمد عبداللہ بلعمی نے 963ء میں کیا۔ 'ترجمہ تفسیر طبری' بھی منصور بن نوح سامانی (961ء۔976ء) کے دور میں ہوا۔ علم نجوم کی کتاب 'برہان الکفایہ' نام کا ترجمہ احمد بن عبدالجلیل سجزی نے کیا جو ابومعشر بلخی کی عربی کتاب 'احکام الموالید' کا ترجمہ ہے۔ عرب مورخ احمد بن اعثم کوفی کی کتاب 'فتوح ابن اعثم' کا ترجمہ المستوفی ہروی نے ''تاریخ فتوحی'' کے نام سے کیا۔ طوسی کی کتاب 'اخلاق ناصری' ابوعلی مسکویہ کی کتاب 'تہذیب الاخلاق' کا آزاد ترجمہ ہے۔ آداب واخلاق پر ابن المقفع کے ایک رسالے کا ترجمہ بھی نصیرالدین طوسی نے 1235ء میں کیا تھا۔

عربی کتاب ''ینبوع الحیوۃ'' کا ترجمہ بابا افضل الدین کاشانی نے کیا۔ عربی کتاب 'الفرج بعد الشدۃ' از ابوالحسن علی مداینی کا ترجمہ حسین دہستانی نے 1264ء کے قریب کیا۔ عربی کتاب 'کنزالدقائق' از نسفی کا ترجمہ نصراللہ کرمانی نے کیا۔ ابوجعفر کلینی کی کتاب 'الکافی' کا ترجمہ خلیل قزوینی نے 1654ء میں کیا جب کہ 'تحفۃ المومنین' از محمد مومن معاصر شاہ سلیمان صفوی (1666ء۔1693ء) بھی عربی کتاب 'مالابسع الطبیب جہلہ' کا ترجمہ ہے۔

چینی ادب زمانہ قدیم سے ایک الگ تھلگ جزیرے کی مانند رہا ہے۔ البتہ سفرنامہ نگاروں نے اس کا رابطہ باقی ماندہ دنیا سے جوڑنے کی سعی کی ہے۔ ابن بطوطہ سے ابن انشاء تک چین کا علاقہ ہمارے لئے اور دیوارِ چین سے ادھر کا علاقہ چینیوں کے لئے ایک گھمبیر اسرار سے کم نہیں رہا۔

چین میں نثری رومانوی قصوں کا آغاز عہد تانگ (960ء۔590ء) میں یونانی قصوں کے زیر اثر ہوا۔ یوں چین میں رومان پسندی کا عہد شباب 1368ء کا زمانہ ہے۔ سان کوچی (San Kuo Chi) اور شوئی ہوچوان (Shui Huchuon) کے دو قصوں بالترتیب 'تین سلطنتوں کا زوال' اور 'تمام انسان بھائی بھائی ہیں' نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خصوصی شہرت حاصل کی۔ آخر الذکر قصہ پرل ایس بک نے 1933ء میں ترجمہ کر کے نیویارک سے طبع کروایا۔

چین کی مشہور رومانوی داستان 'مغرب کی سیاحتوں کے حالات' از ہئی یوچی کے عالمگیر اثرات ادبیات عالم پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً 'مغرب کی سیاحتوں کے حالات' میں مئیو کی 'مدر انڈیا' اور جان ماسٹر کی 'بھوانی جنکشن' تک ایک ہی تسلسل (اسرار سے متعلق) دکھائی دیتا ہے۔

ہئی یوچی نے بدھ مت کی تبلیغ سے سلسلے میں مورتیوں اور کتابوں کی کھوج کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ بعد میں اس کتاب کو آرتھر ویلی نے 'بندر' کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا۔ چینی سماجی آداب زندگی سے متعلق چن ننگ مئی (Chin ping Mai) کی داستان 'سنہری کملے کا کابیر' کو کلیمنٹ اجرٹن نے 'سنہری کنول' کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا۔ اسی طرح 'سنہری کمرے کا خواب' (Hung lou mong) از ساؤ سوچو (1710ء۔1966ء) کو بعد میں چی چنگ وانگ نے نظر ثانی کے بعد 'ڈریم آف دی ریڈ چیمبر' کے نام سے انگریزی منتقل کیا۔

جیمز لیگی (James legge) نے چینی شاعری کے اولین مترجم کے طور شہرت پائی لیکن اس خصوص میں خاتون مترجم Helen Waddell کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ 'Lyrics from the Chiness' میں اس نے James Legge کے ترجموں اور نوٹس کو بنیاد بنایا اور لفظی ترجمے کو تخلیقی ترجمے کے درجے پر محسوس کروایا۔ اس ضمن میں 'Great Ancient Lyrics' کے سلسلے کی نظمیں ہمیشہ خصوصی توجہ کی طالب رہیں گی۔

'The Tale of Meng Chiang' بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول رہی ہے۔ اسے Genevieve Wimsatt نے 'The Long wall' Lady of the کے نام سے ترجمہ کیا اور کولمبیا یونیورسٹی پریس سے شائع کروایا۔

آرتھر ویلی (Arthur Waley) نے چینی شاعر Chu yuan کے علاوہ کئی دیگر چینی شعراء کو تراجم کے ذریعے یورپی دنیا سے متعارف کروایا۔ Chu Yuan کی طویل نظم The Great Summons کے ترجمے کو آج بھی اہم گردانا جاتا ہے۔ شاعر Lipo کے ترجموں کے سلسلے میں Witter Bynner کو اہمیت حاصل ہے۔ چینی شاعری کے ان مترجمین کے کام کے نمونے The Wisdom of china مرتبہ Lin Yutang مطبوعہ 1956ء، 1۔ Jako Publishing House, 125, Mahatma Gandhi Road, Bombay دیکھے جاسکتے ہیں۔

نئے زمانے کے چینی ادیب نے اپنی بیداری کا آغاز 1840ء کی 'افیون لڑائی' سے کیا۔ موجودہ انقلابی کروٹوں تک چین کے ادب نے تیاپنگ کی آسمانی حکومت، 1894ء کی چین جاپان جنگ، 1898ء کی اصلاحی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک، 1911ء کی ژی ہوتن تحریک، انقلاب 4 مئی 1919ء شمالی مہمات اور کسانوں کی جھڑپیں، اگست 1949ء میں عوامی فوج کی فتح اور چیئرمین ماؤزے تنگ کا ادیبوں کے لئے لائحہ عمل سے لے کر ثقافتی انقلاب تک آسمان کے سبھی رنگ دیکھ لیے ہیں۔ البتہ چینی ادب اس اعتبار سے یقیناً ادبیات عالم سے کٹا رہا ہے کہ وہ اپنے آپ میں گھمسان کی جنگ سے دوچار تھا۔ اس موضوعاتی فلک الافلاک کو چینی ادیبوں کے کے سرخیل ماؤزے تنگ اور لوہشون نے اس طرح سمیٹا ہے کہ چینی ادیبوں کو عمومی طور پر ادبیات عالم کیے گئے تکنیکی تجربات کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

نئے چین میں تا حال افسانے کی تکنیک کم برتی جا رہی ہے۔ کہانیوں میں اکثر ماؤ کے کسی قول کو اساس بنا کر ہمت اور حوصلہ بڑھانے کا درس دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوچن چاؤ کی کہانی 'سمندروں میں طویل سفر'، چانگ ژی کی کہانی 'پہرہ دار سنتری' اور وانگ ین چن کی کہانی 'معمولی مزدور' وغیرہ لیکن اس سارے منظر نامے کے پیچھے چینی کہانی (حکایت) کی مضبوط روایت بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ مثلاً قدیم چین کے مشہور فی ون لی کی حکایات لذیذ کے مجموعہ ''وی لی'' کو چین کی حکایات سعدی شیرازی کہنا چاہیے۔

''نیرنگ خیال'' لاہور کا چینی افسانہ نمبر بابت: اپریل مئی 1968ء دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہوان چن (افسانہ: پیاسی بلی) تویان موہونگ لیانگ (افسانہ: چور) شین سونگ دین (افسانہ: دوگوریلے) ہی چن چوئیں (افسانہ: البم) وانگ کوانگ دین (افسانہ: گھاس کا سفر) کاؤفنگ کو (افسانہ: تدبیر کند بندہ) ہوکٹ تنگ (افسانہ: زنگ آلود کیل) ماؤتن (افسانہ: خزاں کی کھیتی) ہوشو (افسانہ: پرچھائیاں) چینگ تین ای (افسانہ: پیتل کی دیوار) نے تکنیکی اعتبار سے روسی افسانے کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سیاسی سطح پر ناہمواری کے باوجود موضوعات اور نظریہ سازی کی مطابقت تھی۔ نئے لوگوں میں (مثلاً شن چن سن، شی سین لینگ اور کاؤ پاؤ چوان) افسانے کے جدید رجحانات تلاش کرنا مشکل نہیں رہا۔ جس کا سبب امریکی، فرانسیسی، جاپانی اور ہندی اور اُردو کا چینی زبان میں ترجمہ ہوتا ہے۔

18 ویں صدی کی ابتداء کے ساتھ ہی ترکی حکومت نے مجبوراً یورپی اقوام کو مذہبی اور قانونی تحفظات کے ساتھ ساتھ تجارت کے لئے منڈیاں فراہم کر دیں۔ معاشی اور سیاسی سطح پر اس خرابی میں خیر کی صورت بھی پیدا ہوئی اور یوں 18 ویں صدی کی پہلی دہائی ہی میں ترکی ادب مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ خود ہمارے ہاں مغربی علوم اور افکار براستہ ترکی وارد ہوئے اور فکری سطح پر منظر نامے کی اس وسعت نے نت نئے مباحث کے ذریعے مشرقی اقوام کو چوتھے کھونٹ کے سفر پر آمادہ کر لیا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ خود ترک دانشور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مشرقی روایات وافکار مغرب کے مقابلے میں پنپنے کی سکت نہیں رکھتے، اس لئے مغربی چال چلن اختیار کرنے ہی میں بہتری ہے۔ سو 1717ء میں مغربی علوم خصوصاً طب، طبیعات اور جغرافیہ کے تراجم بڑی تعداد میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی پر فرانس کا ادبی غلبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ترکی میں ترجمے کی ابتدائی کتب سعید محمد بن چلپی کے اولین چھاپہ خانے (قیام: 1727ء) سے چھپ کر سامنے آئیں۔ سعید محمد نے یہ چھاپہ خانہ ہنگری کے ایک نومسلم ابراہیم متفرقہ کے ساتھ مل کر قائم کیا تھا۔ یوں ترکی میں چھاپہ خانے 1557ء سے کام کر رہے تھے لیکن شیخ الاسلام کے فتوے کے مطابق صرف اہل سہو اور عیسائی مذہبیات سے متعلق ہی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔

ابراہیم شناسی آفندی (1824ء۔1871ء) پہلا ترک ادیب تھا جس نے ترکی فیبل اور فرانسیسی ادب کے تراجم شائع کروائے اور یوں عثمانیوں کے دور حکومت میں زبان و ادب کے ساتھ برتی جانے والی غفلت کا ازالہ کیا۔ یوں زولا، بالزاک، فلابیئر اور ستاں دال کے ترجمے ترکی زبان میں ہوئے اور ضیاء پاشا نے اوسوکی ''ایمیل'' کا ترجمہ کیا۔

روسی ادب اپنی ابتداء سے ایک خاص قسم کے بکھراؤ کا شکار رہا۔ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ زار کے زمانے تک 'روسی زبان و ادب' کے نام کی کوئی شے تھی ہی نہیں۔ مختلف علاقائی بولیاں: ایک دوسرے سے کٹ کر محض لین دین کی زبان یا محدود تر علاقائی لوک ادب کی صورت میں مردنی کا شکار تھیں۔ زار کے عہد تک باہمی رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کسی اخبار یا رسالے کے شائع نہ ہوسکنے کے سبب روسی زبانیں اپنے تکمیلی عمل سے نا آشنا تھیں۔ قبیلے قبیلوں سے جدا اور علاقے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے اور بیشتر نامکمل زبانیں بیسیوں لہجوں میں بٹ کر رہ گئے تھیں۔ روسی انقلاب کے بعد زبانوں کو ہمہ گیر بنانے کا سوال سب سے اہم مسئلہ رہا۔

روسی زبان و ادب کے اثر انداز اور اثر پذیر ہونے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ تاتاری شاعری نے ازبکی اور ترکمانی شاعری کو نکھار بخشا جب کہ تاجیکی ادب نے ازبکستان اور ترکمانستان پر اپنے اثرات چھوڑے اور ایرانی تہذیب کی معرفت جارجیا اور آذربائیجان کے ادب کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔

روسی ادب کا اثر یوکرینی ادب پر بہت گہرا رہا ہے اور اس کے بدلے میں یوکرین کے ثقافتی منظرنامے نے روسی ادب کو بھی بہت کچھ دیا، جس کا سب سے بڑا ثبوت گوگول کی تخلیقات ہیں۔

مجموعی طور پر روسی ادب، ادبیات عالم سے کٹ کر رہنے کے باوجود اس لئے بھی مرجھا کو نہیں رہ گیا کہ وہاں مختلف النوع علاقائی تہذیبوں کے باہمی میل ملاپ نے ادب کی کونپل کو ہرا رکھا۔ اس ضمن میں پشکن کی کوششیں خصوصاً روسی تھیٹر کو نیا روپ دینے کی مہم اور اس سلسلے میں ماضی کی تاریخ اور لسانی رابطوں کی طرف توجہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اسی سلسلے کی دوسری کڑی پشکن کے منظوم ناول 'ایوگنی اونیگین' تھی جسے عظیم روسی ناقد وبیاریان بیلنسکی نے 'روسی زندگی کی انسائیکلوپیڈیا' کہا تھا۔ عوامی انقلاب کے بعد قومی سطح پر زبان و ادب کی ترویج کا کام بڑے پیمانے پر ہوا جس کی 1917ء سے قبل کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آئی۔ شماریاتی جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ 1913ء میں غیر روسی زبانوں میں صرف تین کتابیں شائع ہوئیں جب کہ 1939ء تک ان کی تعداد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوسترانوے تک پہنچ گئی۔

ڈراما نگار حمزہ نے 1921ء میں شہرت پائی۔ وہ ایک تو ازبکی شاعر مایا کافسکی کی شعری روایت کو پروان چڑھا رہا تھا اور دوسری طرف شیکسپیئر اور مولیئر کی فنی روایتوں سے اثر قبول کر رہا تھا۔ اس عہد کے دیگر اہم مصنفین مثلاً آرمنی ادیب زاریاں، کازکی ادیب ثابت اور ترکمانی ادیب جارجی نے گورکی کے اثرات کے تحت لکھا۔ ثابت نے اپنی سوانح عمری گورکی "My Childhood" سے متاثر ہو کر لکھی، جو 'کازکی ادب' میں اولین 'سمیت پسندانہ' تحریر ثابت ہوئی ہے۔ اسی طرح عفوری نے اپنی مشہور کہانی The Goldfields of a poet گورکی کے تتبع میں لکھی۔ آرمنی مصنف زاریاں کے ناول "Khatsaban" کا مرکزی کردار لیون، گورکی کی ناول 'ماں' کے کردار پاول کے زیر اثر جنم لیتا ہے۔

یہ روسی زبان و ادب کا عالمی منظرنامے سے کٹ کر رہتے ہوئے خالصتاً قومی بنیادوں پر یکجہ نے کا مختصر خاکہ ہے، لیکن کون جانتا تھا کہ صنفِ افسانہ گوگول کے 'اوورکوٹ' سے برآمد ہوگی اور روس کے پشکن، گورکی اور ٹالسٹائی کے بعد چیخوف بھی عالمی ادب پر حکمرانی کریں گے۔

یونان کو مشرق اور مغرب کا سنگم کہنا چاہیے۔ اسلئے کہ یونان نے تراجم کے ذریعے مشرق اور مغرب کے درمیان پل کا کام کیا۔ ترجمے کی معرفت ہومر (پ 850 قبل مسیح) کے تخیل اور فکر نے یورپ میں علوم و فنون کے میدانوں کو متاثر کیا، یوں یورپ نے وہ کارنامے انجام دیے جو آج انسانیت کی معراج ہیں۔ خاص طور پر نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں یونانی ادب اور یونانی فلسفیوں کے نظریات کا یورپ نے براہ راست اثر قبول کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں نے یونانیوں کو شکست دی اور اس کے نتیجے میں یونانی لوگ یورپ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اس زمانے میں ولیم شیکسپیئر کے ایک ہمعصر شاعر چیپ مین نے ہومر کو انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپ سے متعارف کروادیا۔ اس دور میں یونانیر زمیوں خصوصاً ہومر کی 'ایلیڈ' اور 'اوڈیسی' کا اثر یوری ڈراموں اور داستانوں میں بہت نمایاں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یورپی ادب میں جس قدر حوالے یونانی اساطیر کے ملتے ہیں وہ سب کے سب ہومر کی شاعری سے مستعار ہیں۔

اب یورپی اور امریکی ادب پر 'ہومر' کے براہ راست اثرات کی چند مثالیں دیکھیے:

۱۔ انگریزی شاعری کے جدامجد 'چاسر' کی مشہور نظم Troilus and cresede ہومر کی نظم 'ایلیڈ' سے متاثر ہو کر لکھی گئے۔

۲۔ 'ٹینی سن' کی اہم ترین نظم 'یولی سس' کا بنیادی خیال 'اوڈیسی' سے ماخوذ ہے، خصوصاً 'کنول کے پھول کھانے والے کردار' تو ہیں ہی ہومر کی اختراع۔

۳۔ کیٹس نے ایک سانیٹ چیپ مین کے ترجمے کو پڑھ کر لکھی۔ اس سانیٹ پر کیٹس نے ہومر اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیپ مین کا حوالہ بھی دیا ہے۔

۴۔ جیمز جوائس کا ناول 'یولی سس' کا بنیادی خیال 'اوڈیسی' سے ماخوذ ہے۔

۵۔ ہنری جیمز (امریکہ) نے 1895ء تا 1900ء تک 'ہومر' کے اثرات کے تحت تحیر آمیز کہانیاں لکھیں۔

۶۔ ہرمن میلول (امریکہ) کا ناول 'موبی ڈک' سمندروں کی مہم جوئی سے متعلق ہے۔ 'موبی ڈک' میں انسان کا ویل مچھلی سے مقابلہ ہمت اور ضبط سے مایوسی اور محرومی پر غلبہ اوڈسیوس کے سمندری سفر کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

۷۔ نوبل انعام یافتہ 'ناول نگار' ارنسٹ ہیمنگوے (امریکہ) نے اپنی مشہور زمانہ ناولٹ 'بوڑھا اور سمندر' میں اوڈسیوس اور غضبناک سمندر کی علامت استعمال کی ہے۔ ایک موقع پر بوڑھا اپنی جوانی کے ہیرو کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ہیرو بیس بال کھیلتا تھا لیکن اس کی ایڑی خراب ہوگئی۔ یہ 'ناکارہ ایڑی' کی علامت بھی ہومر سے مستعار ہے۔ ہومر کا جنگی ہیرو اکیلیز (Achillies) جب ہیکٹر کو قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو اپنی رتھ سے باندھ کر ٹرائے کے گرد فاتحانہ چکر لگاتا ہے تو اپالو کا بیٹا پیرس، اکیلیز (Achilies) کے دشمنوں کو مشورہ دیتا ہے کہ اکیلیز (Achilies) کی ایڑی پر تیر مارو، وہ ناکارہ ہو جائے گا۔

اسی طرح 'اوڈیسی' میں سمندر، تقدیر کی علامت ہے 'بوڑھا اور سمندر' میں بھی یہ علامت انہی معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔

۸۔ یورپ اور امریکہ کے ادب میں 'ٹروجن ہارس' (لکڑی کا گھوڑا) کی علامت ہومر کی اختراع ہے۔ اوڈسیوس، ٹرائے کے قلعہ کو فتح ہی ٹروجن ہارس کے ذریعے کرتا ہے۔

۹۔ یورپ اور امریکہ کے ادب میں ٹروجن ہارس' سے متعلق کئی محاورے ملتے ہیں۔ 'بظاہر کچھ اور درحقیقت کچھ' کے معنوں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔

۱۰۔ 'ہومر' کی 'اوڈیسی' کا ایک آنکھ والا دیو عالمی ادب میں ایک زندہ کردار بن گیا۔ خود اردو کی بیشتر داستانوں اور حکایتوں میں ایک آنکھ والا دیو ملتا ہے۔

۱۱۔ 'اوڈیسی' میں سرسے کا ایک خیالی جزیرہ 'ہومر' کی تخلیق ہے۔ آج کے یورپی ادب میں 'سرکے سے کا جزیرہ' ایک علامت کے طور پر ملتا ہے۔

۱۲۔ انسان کا 'ناانسان' میں بدلنے پر قادر بدی کی طاقت کی علامت عالمی ادب میں پائی جاتی ہے جو در حقیقت 'اوڈیسی' کی کرکی جادوگرنی سے ماخوذ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۳۔'اوڈسیوس' کی بیوی پی نے لوپی (Penelope) کا انتظار عالمی ادب میں خاوند کے ساتھ وفا شعاری کی ایک علامت بن چکا ہے۔

۱۴۔ اسپین کے داستان طراز سر دانتیس کا ڈون کیخو تے (Donquixote)، مرکزی کردار کی سطح پر 'اوڈسیوس' سے خاصی مشابہت رکھتا ہے۔

۱۵۔ یورپ اور امریکہ میں 'اوڈیسی' کے خیال کو بنیاد بنا کر بچوں اور بڑوں کے لئے لاتعداد فیچر فلمیں بنیں۔ جن میں سے Wessex لندن فلمز کی The wooden horse (1950ء) ہالی وڈ امریکہ کی Helen of troy (1956ء) اور M.G.M امریکہ کی Odyssey (1968) A Space 2000 خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

"Every Men" انسائیکلو پیڈیا (جلد نہم) میں ناول کے باب میں لکھا ہے کہ یونان سے قدیم ترین نثری قصے Milesian Tales ارسطو کے ایک گمنام شاگرد کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ یونان میں رومانی قصوں کی ابتداء تھی۔ ڈرامہ نگار ایس کائی لیس (Acshylus) کی پیدائش 525 قبل مسیح کی ہے۔ اسی ڈرامہ نگار کے ڈرامے 'پرومی تھیوس' کی طرز پر شیلے نے ۱۸۱۸ء میں 'پرومی تھیوس زنجیر بستہ' انگریزی میں لکھا۔ انتونیو دیو جانس (Antonius Diogenes) کا ڈیناس (Dinias) اور ڈرسائل (Dercyllis) کا چوبیس الواب پر مشتمل قصہ اور دوسری صدی عیسوی میں دو داستان طرازوں: لوسین (Lucian) اور لوسیس (Lucius) کے اثرات قصہ گوئی کے باب میں مغربی یورپ کے لئے مشعل راہ بنے۔

یونان کے دو عیسائی مصنفین ہلیوڈورس (Heliodours) (اور ایک گمنام مصنف نے قصہ گوئی کو مذہبی روایات کے ساتھ باہم ایک کر کے مسیحی رہبانیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنا دیا۔ یونانی قصے کی یہ نئی کروٹ عالمی سطح پر توجہ کا مرکز بنی۔ یہی وجہ ہے کہ گمنام مصنف کا قصہ 'برلام اینڈ جوزافٹ' (Barlam and Josafhat) قرون وسطیٰ کی عیسائی دنیا میں تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہوا۔ خود مغربی یورپ کی رامانیک زبانوں میں قصہ گوئی کی ابتداء ہی اس یونانی قصے کے زیر اثر ہوئی۔ زبانوں کے اس باہمی لین دین کا سلسلہ قدیم وقتوں سے چلا آتا ہے۔ دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدے کا سب سے بڑا اور قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔ بقول ابوالکلام آزاد

''غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید (Neoplationism) نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اشراقی عمارتیں استوار کیں''۔ جس طرح نویں صدی عیسوی سریانی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت سے عربی زبان میں تراجم کی صدی شمار ہوتی ہے بعینہ اسی طرح 12ویں صدی (1125ء تا 1280ء) کا زمانہ عربی سے لاطینی زبان میں ترجمے کا زمانہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جب اسپین میں عربی، لاطینی اور فرانسیسی زبانیں خوب پھل پھول رہی تھیں۔ اس دور میں اطالوی عالم اور مفکر جرارڈ آف کری مونا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(1114ء۔ 1187ء) نے 80 ضخیم کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیں۔ جن میں خوارزمی کی کتاب 'الجبرا و المقابلہ' بطلیموس کی 'المجسطی' ابوبکر رازی کی 'سر الاسرار' بوعلی سینا کی 'قانون الطب' جابر بن افلاح کی کتاب 'کتاب احیات'، ابوبکر رازی کی 'الطب المنصوری' (10 جلدیں)، الخورازمی اور البتانی کی 'الذیج' یادگار ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ابن ماجہ اور ابن بیطار عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئے۔ ابوبکر رازی کو لاطینی زبان میں سب سے زیادہ قابل توجہ سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ اطالوی مفکر جرارڈ کے تراجم کے بعد بادشاہ وقت چارلس آف آنجو کے حکم خاص سے 13 ویں صدی میں بھی رازی کے افکار کو ترجمہ کیا گیا۔ ان دونوں کی یورپی دنیا میں رازی (Rhaze) کا نام مشہور تھا۔

شاید یہی سبب ہے کہ جرمن مفکر ہمبولٹ نے کہا تھا کہ:

''عربوں کو طبیعاتی سائنسوں کا حقیقی بانی سمجھنا چاہیئے''۔

('نوید فکر' از سبط حسن۔ مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ، کراچی، ص: 91)

19 ویں صدی میں لاطینی امریکہ کی آزادی کے ساتھ وہاں ناول کی صنف نے ظہور پایا لیکن سوائے برازیل کے ناول نگار Machadc Assis اور کولمبیا کے ناول نگار جارج ائیرک کے وہاں کے دیگر اُدبا نے کسی اور زبان کا اثر قبول نہیں کیا۔ جارج ائیرک کا ایک ناول "Mayia" (مطبوعہ: 1867ء) فرانس کے ناول نگار 'برنارڈ ڈی سینٹ پرے' کے ناول 'Poudct Virguic' کے زیر اثر لکھا گیا۔

البتہ 18 ویں صدی کے اختتام تک لاطینی امریکہ کا ادب ہسپانوی، انگریزی اور فرانسیسی ادب کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لاطینی امریکہ کے ممالک میں یا ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے یا انگریزی۔ یہ اس لئے بھی ہوا کہ لاطینی امریکہ کی آبادی سراسر سپین اور برطانیہ کے نوآبادکاروں پر مشتمل ہے۔

19 ویں صدی کا زمانہ لاطینی امریکہ میں بین الاقوامیت کے وسیع تر دائرے سے نکل کر نسبتاً محدود دائرے میں رہتے ہوئے اپنی شناخت کے مراحل طے کرنے کا ہے البتہ اس زمانے میں بھی رومیولو گالیگاز، ماریا نواز ویلا اور سائیر والیکیویا نے انگریزی اور فرانسیسی ادب کے اثرات قبول کیے۔ ان کے ناولوں میں اس چیز کی نشاندہی ممکن ہے۔

آج لاطینی امریکہ کے بارجس، گیو مارتیس روزا، کارپنٹر، گینڈی (نوبل انعام 1981ء) اور گابریل گارشیا مارکیز (نوبل انعام 1982ء) کے ناموں سے ایک دنیا واقف ہے۔ بارجس پہلا ادیب ہے جس نے 20 ویں صدی میں تراجم کی روایت کو سنبھالا دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ لاطینی امریکہ کا ادب گوئٹے اور ولیم شیکسپیئر کے کام سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ لیکن تراجم کے اثرات کے تحت اس سے اُلٹ صورت حال بھی دیکھنے کو ملی۔ پزامالیما نے اپنے ناول 'Paradiso' میں ... جدیدیت کے علمبرداروں نے جاپان کے ساتھ کیا تھا یا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بر جوز وکیسل اور پال مورانڈ نے ایشیا، لاطینی امریکہ (خصوصاً ہسپانوی زبان) اورافریقہ کے ساتھ کیا۔ پڑاما لیما نے قدیم ناموں مارسل شوب اور ہاپری لوئی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جوز وکیسل اور پال مورانڈ کے انداز میں یورپ اور ایشیائی ممالک کی تاریخ، تہذیب اور ادبی سرمائے کو اپنی تصنیف "Paradiso" میں مسخ کر کے رکھ دیا۔ دوسری طرف کارٹازار کے ناولوں نے یورپ کو متاثر کیا اور کارلوفونٹس، مارکیز اور کینڈی نے لاطینی امریکہ کے ادب کو عالمی منظرنامے کے ساتھ جوڑ دیا۔ یہی سبب ہے کہ آج کا یورپی ناقد ایڈمنڈ ولسن کی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ:

اُسے لاطینی امریکہ کے ناول قطعی ناپسند ہیں۔

یورپ میں صنف افسانہ پر نگاہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس کی ابتداء اٹلی کے بوکاچو (Boccaccio) کی تقلید میں ہوئی۔ جب کہ بوکاچو نے 1348_53ء میں سو افسانوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جو بڑی حد تک الف لیلہ کے زیر اثر تھا۔ دیکھیے: ''مختصر افسانہ نویسی کی تاریخ پر ایک نظر'' از ڈاکٹر محمد دین تاثیر مطبوعہ: مخزن افسانہ نمبر اگست۔ ستمبر 1929ء

یہی سبب ہے کہ انگریزی ادب کے ہر دور میں مشرقی داستانوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ خصوصاً انگریزی میں عربی کے اثرات اس دور میں نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ جب اسلامی سلطنت کی سرحدیں مشرق اور مغرب میں بحیرۂ روم تک پہنچ گئیں۔ جزیرہ سسلی میں غالب خاندان کے زوال کے بعد بھی سسلی کی ادبی اور عامی زبان، یونانی اور لاطینی کے دوش بدوش عربی رہی۔ سسلی کے حکمران راجر کے میر منشی رابرٹ سیلی نے انگریز اُدبا کے لئے دربار میں جگہ پیدا کی اور یوں عربی سے انگریزی میں ترجمہ نگاری کی ابتداء ہوئی۔ اس دور میں یوجینی نے عربی زبان سے 'کلیلہ و دمنہ' کو یونانی زبان میں منتقل کیا۔

چاسر نے اٹلی میں رہ کر بوکاچو کے قصے ''ڈی کامرن'' (de cameron) کے انداز میں اپنی مشہور تصنیف 'Canterbury Tales' مکمل کی، جب کہ ''ڈی کامرن'' کے قصے 'الف لیلہ' کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ اسی تسلسل میں شیکسپیئر کا ڈرامہ 'All is Well' that Ends Well' آتا ہے جو ترجمہ در ترجمہ کی تیسری پرت ہے یعنی ''ڈی کامرن'' کا چربہ۔

چاسر نے اصطرلاب پر بھی ایک رسالہ قلمبند کیا جس کا نام 'بچوں کے لئے دودھ اور روٹی' تھا۔ یہ رسالہ یکسر عرب مصنف ماشاءاللہ بن اطہری کی کتاب اصطرلاب (کتاب صناع اصطرلاب وعلمیھا) سے ماخوذ ہے اور چاسر کا قصہ 'The Pardonre' الف لیلہ کا ایک باب محسوس ہوتا ہے۔

راجر بیکن کی علمی تصانیف کی بنیادیں اسلامی فلسفہ اور سائنس پر استوار دکھائی دیتی ہیں۔ فرانس کے علاقہ پروونس (Provence) کے اشعار جو 'Troubadour' سلسلے کے نام سے مشہور ہیں، اسی روایت کی ایک کڑی محسوس ہوتے ہیں، ان اشعار میں اندلسی شعرا کے موضوعات اور عروض کے اوزان کے ساتھ عرب اسلامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصطلاحیں بھی برتی گئیں۔ انگریزی زبان کی ایک نامعلوم رزمیہ نظم' آٹھویں صدی عیسوی' جس کا اساطیری ہیرو Beowulf ہے، کے اشعار کی تقسیم صدر اور عجز کا انداز لیے ہوئے ہے جو عربی ادب سے مستعار ہے۔ اسی نوع کا علمی ترکہ مارکو پولو نے اپنے مشاہدات کی شکل میں چھوڑا ہے۔ بعینہ اسی نوع کے اثرات کا مطالعہ انگریزی سفرنامہ نگار ماندویل کے ہاں کیا جاسکتا ہے۔

انگریزی ادب کے دو مشہور زمانہ قصے 'Flories and Blancher' اور 'seven sages of Rome' بالترتیب لاطینی قصوں اور' الف لیلیٰ' کا چربہ ہیں۔

ولیم شیکسپیئر کا ڈرامہ 'The taming of shrew' الف لیلیٰ کے قصے' صحوۃ النائم' کا چربہ ہے۔ ڈراما Othelo کا سارا پلاٹ' الف لیلیٰ' سے ماخوذ ہے اور ڈراما' میکبتھ' میں عرب داستانوی کردار زرقا کی پرچھائیں توجہ چاہتی ہے۔

کچھ یہی معاملہ شیکسپیئر سے سینئر اور جونیئر ادیبوں کا بھی ہے۔ مثلاً کرسٹوفر مارلو کے ڈرامے' تیمور لنگ' (Tamburlaine the Great) کا سارا منظر نامہ ایران اور ترکستان سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا مشہور ہزلیہ' کیمیا دان' (Alchemist) نہ صرف عرب علاقوں سے متعلق ہے بلکہ عرب تصانیف کا اثر صاف پہنچانا جاتا ہے۔ ڈریسڈن کے ایک ڈرامے کا نام ہی' فتحِ غرناطہ' ہے۔ ڈریسڈن کے ڈرامہ 'Dane Sebastian' کا سارا منظر نامہ مراکش سے متعلق ہے۔ ولیم کونگریو کے ڈرامے 'Mouring Bride' کا منظر نامہ اندلس سے متعلق ہے اور اس میں عرب داستانوی کردار اپنی نمایاں پہچان رکھتے ہیں۔

شیلے کے قصیدہ 'A Translation from tha Arabic' میں عنترہ العبسی کی ویرت کا ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ ٹینی سن کے قصیدے 'Locksley Hall' میں عربی قصائد کی ایک طویل بحر اور مطلع تشبیب مثلاً 'Akbar's Dream' اور 'Recollection of Arabian nights' میں اندلس کی تاریخ اور اسپین کا منظر نامہ توجہ چاہتا ہے۔ اسی طرح سودے، اسکاٹ، ہنٹ، لینڈ ور اور براؤننگ کی تصانیف میں عربی حکایات اور دیگر مشرقی قصوں کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

جرمن ادب نے 19 ویں صدی کے آخری عشرے میں حقیقت پسندی کا مخصوص جرمن چولا اُتار کر ترجمے کے طفیل تاثریت کے اثرات قبول کیے۔ اس زمانے میں خصوصی طور پر گستاؤ فلابیئر، موپاساں، ژابریلے انونیو، آسکر وائلڈ، ارڈی، ایچ۔ لارنس کے ترجمے جرمن زبان میں ہوئے۔ یوں رومانیت کے ایک نئے رجحان کو جرمن ادب میں جگہ ملی اور سماجی برائیوں کا برملا اظہار ہونے لگا۔ گستاؤ فلابیئر کے ترجمے کی معرفت جرمن زبان میں سب سے بڑی عطا ٹامس مان ہے، جس نے پرانی قدروں کا زوال اور نئی قدروں کا عروج خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

20 ویں صدی میں فرانس سے اُبھرنے والی انقلابی تحریک' ماورائیت' نے جرمن ادب پر بہت گہرے اثرات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرتسم کیے۔ یہاں تک کہ جرمنی میں ماورائیت کا ایک اہم نام فرانز کافکا ظاہر ہوا۔

20 ویں صدی کے یورپی اور امریکی ادب میں ایک ایسا دور آیا جو ادبیات کے تراجم کے اثرات کے تحت اسلوبیاتی سطح پر یورپی اور امریکی ادب کو سکڑوں کروٹوں سے ہمکنار کر گیا۔ اسے 19 ویں صدی کے 'جدیدیت' کے فوراً بعد فرانس، روس، جرمنی اور برطانیہ میں زوال پذیر ادیبوں کے اثرات کا نتیجہ بھی کہنا چاہئے اور 20 ویں صدی کی آواں گارتحریک کا اثر بھی۔

'آواں گارا سکول' کے رہنمائی۔ ایس۔ ایلیٹ نے 1922ء میں جس والہانہ انداز میں آئرلینڈ کے جیمز جوائس کی ناول 'Ulysses' کا خیر مقدم کیا اور دنیا بھر کے غیر وابستہ ادیبوں نے جس توجہ سے ایلیٹ کی آواز کو سنا، وہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن یہ جو کچھ ہوا اس میں ادب کے اثر پذیر اور اثر انداز ہونے کی صلاحیت کو دخل ہے۔ جوائس کے 'Ulysses' کے بعد وہی طرز (جسے اپنانے پر ایلیٹ نے زور دیا) روسی ناول نگار بورس پسترناک کے ناول 'برہنہ سال' (The naked year) میں دیکھنے کو ملا۔ پھر برطانیہ کے آلڈس ہکسے نے اپنے ناول 'Point counter point' میں اسی تجربے کو دہرایا 'The naked year' کا اثر جون داس کے ناول '42nd Parallel' پر بھی محسوس کیا جاسکتا ہے، حتیٰ کہ ہاٹمین کے ناول 'Ser Goldene Tope' میں ایک کردار ڈاکٹر ایکلسٹین اُسی راہ پر چل نکلا جس کا اولین سراغ Ulysses میں ملتا ہے۔

یوں مختلف زبانوں سے اثر پذیری اس حد تک بڑھی کہ 20 ویں صدی کی آواں گارتحریک میں نئے ناموں کو یکسر رد کیا جانے لگا اور یہی وہ زمانہ ہے جب ارنسٹ ہیمنگوے کو دریافت کیا گیا۔ ہیمنگوے کے علاوہ اس دھندلے دیگر کئی چہرے منظر عام پر آئے۔ مثلاً امریکہ کے ولیم فاکنر، اسکاٹ، تھامس وولف۔ برطانیہ کے ٹامس ہارڈی اور جان کوپر۔ روس کے پرشون، نیورواور آئی کا تائیو وغیرہ۔

16 ویں صدی عیسوی آخر میں ٹنڈل اور کوورڈیل (Tyndale and Coverdale) نے انجیل مقدس کے تراجم کے ساتھ ترجمے کی تحریک شروع کی تھی۔ فرانس اور برطانیہ میں انہی تراجم کے زیر اثر مذہبی اور قومی موضوعات نے ادب میں جگہ بنائی اور ہر دو زبانوں میں عیسائی مذہب سے متعلق اہم دستاویزات کو بڑی تعداد میں ترجمہ کیا گیا۔ فرانسیسی شاعر دیو بارتاس (Du Bartas) نے اسی زمانے میں طویل مذہبی نظم جوڈتھ (judith) مکمل کی جو 1573ء میں چھ جلدوں میں منظر عام پر آئی۔

18 ویں صدی عیسوی کا فرانس دنیا بھر کی ادبیات کے تراجم کے سبب مختلف اصناف ادب اور فلسفے کی نت نئی موشگافیوں کے باعث یادگار ہے۔ اسی صدی میں روسو، ویدرو، والتیئر، مونٹسکیو اور بیوفوں نے عالمی شہرت پائی۔ روسو نے بطور فلسفی اور والتیئر نے بطور فلسفی، مورخ اور معاشرتی ناقد کے خود ہمارے ہاں کے ادیبوں کو متاثر کیا۔ جب کہ 19 ویں صدی کا فرانسیسی ادب اپنی منفرد حیثیت میں ساری دنیا کے ادب کو متاثر کر گیا۔ لامارتین، وکٹر ہیوگو،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الفرید دی ونی، بودلیئر، ورلن، راں بو اور ملارمے کے اثرات سے کوئی بھی مشرقی یا مغربی زبان نہ بچ سکی۔

20 ویں صدی کے فرانسیسی علامت نگار شاعروں خصوصاً راں بو، ورلن اور ملارمے کے تراجم نے دنیا بھر کے ادب کی کایا پلٹ دی۔ خود ہمارے ہاں ن۔م۔راشد اور میراجی ایک حد تک براہِ راست اور عمومی طور پر ایرانی ادب میں فرانسیسی شعرا کے تراجم کی معرفت علامت نگاری کی اس عالمگیر تحریک سے متاثر ہوئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جب 20 ویں صدی کے نصف آخر تک خود فرانس میں اس تحریک کا زور ٹوٹ گیا تھا تو ہمارے نثر نگار بڑی شدومد کے ساتھ علامت نگاری کی طرف آئے۔ انتظار حسین کا افسانہ 'آخری آدمی' آئنسکو کے ڈرامے 'گینڈے' کے زیر اثر تخلیق ہوا اور جب خالدہ حسین نے افسانہ 'ہزار پایہ' لکھا تو مغربی ادب میں اس قبیل کا کام پختگی کے عروج پر تھا۔

مختصراً یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر یوں محسوس ہوا جیسے دنیا بھر کی زبانوں اور ادبیات کی حد بندیاں ٹوٹ گئیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کو اس وقت کے ادب کی دھڑکنوں میں سنا جاسکتا ہے۔ گو اس حوالے سے جاپانی، جرمن اور روسی ادب نے عالمگیر شہرت پائی لیکن اس خصوص میں فرانس کے لوئی آراگون کو 20 ویں صدی کا عظیم تر شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

پرل ایس بک کی ناول 'Good Earth' اور ولیم سرویاں (Saroyan) کی ناول 'The Human Comedy' جیسی لازوال تخلیقات کے تراجم کی معرفت بننے والی زنجیر نے ادبیات عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ترجمے کا فن اور لفظ 'ترجمہ'

ادبیات عالم میں 'طبع زاد' اور 'ترجمہ' کی اصطلاحیں رائج ہیں۔ یوں ترجمہ بھی ادب کا حصہ ہے، اگرچہ دوسری زبانوں سے ماخوذ ہونے کی بنا پر اسے بالعموم الگ پہچان دی جاتی ہے۔

کسی تحریر، تصنیف یا تصنیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ کسی متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اُس کی تعبیر کرتا ہے یعنی ترجمے کا عمل ایک علمی یا ادبی پیکر میں ڈھالنے کا عمل ہے۔

دوسری زبانوں کی ادبیات سے مستعار/ماخوذ ہونے کے سبب اس میں کچھ کچھ غیریت کا احساس باقی رہ جاتا ہے، اس لئے اس کا مطالعہ بھی مستعار اور بالواسطہ ادب کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں اسے طبع زاد ادب کے مقابلے میں دوسرے درجہ کی چیز شمار کیا جاتا ہے۔

ایک قدیم یونانی مقولہ ہے کہ: 'ترجمہ ایک بھنی ہوئی سٹرابری کی طرح ہے۔' اب جو بھی ترجمے کے فن سے ذرا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی شُد بُد رکھتا ہے اور بھی ہوئی سرابری سے واقف ہے یہ ضرور محسوس کرے گا کہ یہ مقولہ ترجمہ کے فن کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم شیکسپیئر کا ڈراما پڑھیں اور اس کے بعد اس ڈرامے کا ترجمہ دیکھیں (خواہ ترجمہ مولوی عنائت اللہ نے کیا ہو یا عزیز احمد نے) تو یہ محسوس کریں گے کہ بُھوننے کے عمل کے دوران تبدیلیواقع ہوگئی ہے لیکن اس سے مفر نہیں ہے۔

ترجمے کا عمل کیا ہے؟

ہم اس کا کامل تجزیہ کبھی نہیں کر سکتے لیکن یہ ضرور دیکھ سکتے ہیں کہ ارنسٹ فینولوسا اور ایزرا پاؤنڈ جیسے مترجمین نے ماضی کی قدیم مشرقی شاعری کو اپنے حال کی شاعری میں بدل دیا ہے، جبکہ ڈاکٹر سیموئل جانسن نے کہا تھا کہ شاعری ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی۔

کہا جا سکتا ہے ترجمہ کرتے وقت مترجم ایک قسم کی گمنامی کو نباہتا ہے، یعنی اپنے آپ کو درمیان میں سے ہٹا دیتا ہے اور اصل مصنف کو اپنے عہد میں بولنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ لیکن اس سے ہوتا یہ ہے کہ ترجمے کے عمل کے دوران مشہور تراجم میں ماضی کی اُس آواز میں مترجم کے اپنے عہد کی آواز بھی چپکے سے شامل ہو جاتی ہے۔ گمنامی اور ہمعصری کا یہ دوہرا کردار اُن مشہور تراجم میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے جہاں ایک سے زائد مترجمین نے مل کر کام کیا۔ اس کی بہترین مثال ارنسٹ فینولوسا کی کتاب 'Cathy' ہے جسے ایزرا پاؤنڈ نے ترجمہ کیا اور پاؤنڈ کے ان چینی تراجم سے بہت برافروختہ ہو کر امریکہ کے پروفیسر یپ (yep) نے 'Cathy' کی مذمت میں ایک کتاب لکھ ماری۔ اس کتاب میں پروفیسر یپ نے چند قدیم چینی منظومات کا خود ترجمہ کیا اور ایزرا پاؤند کو ایک بد دیانت مترجم ثابت کرنے کی کوشش کی۔

امریکی ناقد ریناٹو پوگیولی (Renato Poggioli) نے اُس نفسیاتی خواہش کے بارے میں تحقیق کی ہے جو ایک مصنف کو مترجم بنا دیتی ہے۔ اُس نے سوال اٹھایا ہے کہ: 'کیا یہ ویسی ہی خواہش ہے جس کے تحت ایک مصور یا مجسمہ تراش اصل کی نقل تیار کرتا ہے؟ جبکہ محرک کے یکساں ہونے کے باوجود نتیجہ یکساں نہیں ہوتا۔ بعینہ اسی طرح ترجمے میں ہوتا آیا ہے۔'

ریناٹو پوگیولی کی طرح ہمارے ذہن میں بھی یہ سوال جنم لیتا ہے کہ: 'کیا یہ فرض کر لیا جائے کہ ترجمے کا عمل ترجمان کارکردگیوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں؟ مثلاً ڈرامے میں اداکاری یا مجمع عام میں نظم پڑھنا۔ اس کلیہ میں فرق کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتا جبکہ فرق کہیں زیادہ ہے۔

اداکاری اور شعر خوانی کا مقصد ایک لکھے ہوئے مضمون کو آواز یا اشارہ فراہم کرنا ہوتا ہے جبکہ لکھا ہوا مضمون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بظاہر خاموش ہوتا ہے لیکن آواز اور اشارے کے سبب وہ قاری سامنے بولتا بھی ہے اور حرکت بھی کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ترجمہ، لکھے ہوئے مضمون کو ایک اجنبی لباس پہناتا ہے، اس کی صورت کو بدلتا اور اُسے ایک نئی روح مہیا کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ فرض کر لینا چاہیے کہ ترجمہ کرنے کا عمل ایسا ہی ہے جیسے موسیقی کی ہدایت کاری اور موسیقی موزوں کرنے کا عمل ہے؟ آخر مترجم بھی تو موسیقار کی طرح ایک دوسرے فنکار (شاعر) کی تخلیق کو نیا لباس پہناتا ہے۔

رینا تو پوگیولی اس بات کی وضاحت میں لکھتا ہے:

> یہ ایک حقیقت ہے کہ ترجمہ کرنا ترجمانی کا فن ہے، لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ مترجم ترجمانی کرنے والا وہ واحد فنکار ہے جس کا کام اصل سے مماثل بھی ہے اور مختلف بھی۔ اس کے علاوہ ترجمانی کرنے والے فنکار یا تو مماثل گروہ سے ہیں یا مختلف گروہ سے۔ اول الذکر 'Performing Artist' ہیں جو خواہ اداکار ہیں یا گلوکار یا موسیقار یہ سب اصل کام کا جمالیاتی مادہ اپنے فن کے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ دوسرا گروپ 'Decorative Artists' کا ہے، جیسے ڈیزائنز، کمپوزر، نقال یا رقاص جو لفظوں اور دھنوں کو حرکات یا جسمانی اشاروں کا لبادہ پہناتے ہیں۔ تاہم نقال یا رقاص ترجمانی کے ساتھ ساتھ تخلیقی کام بھی کرتے ہیں۔

اس اصطلاح کو مزید مختصر کرنے کے لئے اول الذکر فنکاروں کو ترجمان (Interpreters) اور ثانی الذکر کو مترجمین (Translaters) کہا جا سکتا ہے۔ اب جہاں تک ترجمہ کرنے والے فنکار کا تعلق ہے تو وہ اور ہی قسم ہے، جو ان دونوں اقسام سے الگ ہے اس لئے کہ وہ دونوں طریقے برتتا ہے اور بیک وقت مماثل اور مختلف گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔"

(Reuben A. Brower, Harvaord University Press, Cambridge 1959.)

تجریدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترجمہ کرنے والا اور اصل مصنف دونوں ایک ہی جمالیاتی مادے کو تبدیل کرتے ہیں یعنی زبان۔ لیکن زیادہ ٹھوس اور متعین نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ مترجم ایک ایسا لسانی اور ادبی مواد پیش کرتا ہے جو متن سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ علمی اصطلاح میں یہ کہا جائے گا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ متن اور ترجمہ دونوں ایک ہی نفس مضمون سے متعلق ہے۔ لیکن پھر بھی ایک عجیب انداز سے مختلف ہیں۔ یہی وہ عجیب بات ہے جو مترجم کو 'Decorator' کی بجائے تخلیق کار بنا دیتی ہے، بلکہ مصنف یا شاعر ثابت کرتی ہے۔ اس پہلو سے مترجم دیگر فنکاروں خصوصاً موسیقار، گلوکار اور اداکار سے بالکل الگ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

دوسرے گروہ کے اکثر ارکان، مترجم کی نسبت محض 'Transliterators' یعنی دوسرے رسم الخط میں اپنی ہی زبان لکھنے والے نظر آتے ہیں۔ جبکہ پہلے گروہ کے ارکان، نقل نویس (Scribes) دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مترجم کے کام کی نوعیت اسے وہ موقع نہیں فراہم کرتی جو اس کے حریفوں کو حاصل ہے۔ مثلاً مصور، ماڈل کی تصویر بناتے وقت اس میں کچھ اضافہ کر دے یا تکنیکی ترمیم کر دے تو اصل بن جائے گا۔ لیکن مترجم ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کا واسطہ تمثال اور الفاظ سے ہے اور اُن کی مثال اس پیوند کیے ہوئے درخت کی سی ہے جو اگرچہ نئی زندگی شروع کرتا ہے، لیکن پھر بھی اس بیج کا مرہونِ احسان ہے جو کسی اور جگہ بویا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ Artifex Additus Artifici والی کلاسیکی تعریف صرف اُسی پر صادق آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تعریف محض اس کے لئے نہیں تراشی گئی تھی۔ آندرے ژید (Andre Gide) کے مطابق مترجم حیرت انگیز طور پر 'Disponible' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آندرے ژید نے بڑھ چڑھ کر اُس ادبی جذبے کی تعریف کی جو ترجمے کی طرف مائل ہوتی ہے۔

مترجم کا 'Disponible' ہونا بنیادی طور پر ہیئت سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ ایک بیرونی ہیئت کا قضیہ اُس کی جستجو کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ نظریہ ہمیں ترجمے کے نفسیاتی نظریے کی طرف لے جاتا ہے اور سلسلہ در سلسلہ چل کر آخر کار ہماری مٹ بھیڑ سگمنڈ فرائڈ سے ہوتی ہے۔

تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مترجم ایک پابند شخص نہیں ہے بلکہ ایک پابند فنکار ہے، جو صرف اس وقت اطمینان کا سانس لیتا ہے جب دل کی راکھ انڈیلنے کو اسے ایک مناسب برتن مل جاتا ہے۔ یوں کسی حد تک ترجمہ ایک جناتی تسخیر کا عمل بھی ہے، یعنی اپنے اندر کا جن ایک خارجی روح کے ذریعے باہر نکالنا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مترجم ایک ایسا کردار ہے جو خارج کے مصنف کے ساتھ ساتھ داخل کے مصنف کو بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔

ترجمے کا عمل اس حد تک پیچیدہ اور پُراسرار عمل ہے کہ ایک شخصیت دوسری شخصیت میں ڈھلتی ہے اور تنقیدی محاکے کو کھلم کھلا 2+2=4 کی بجائے اشاروں اور کنایوں میں اُس کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔

ترجمے کی دیومالا مترجم کی حالت زار لو اکثر و بیشتر 'سسی فس' (Sisiphus) سے تشبیہ دیتی ہے یعنی انتہائی با اختیار ہونے کے باوجود اس کے کردار کی بے چارگی اور بے بسی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ معروف ناقد Heine نے یہی بات کرتے ہوئے مترجم کی کوشش کو تنکوں میں سے گزرتی ہوئی سورج کی کرنیں ترتیب دینے کا عمل کہا تھا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ یہی کوشش تو شاعر بھی کرتا ہے اور بہت کم کامیاب ہوتا ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مترجم بیک وقت دو آہنگوں کو سامنے لاتا ہے، جن میں سے ایک پہلے ہی ادبی ہیئت میں آ چکا ہے لیکن وہ اپنے منتخب کردہ پیٹرن کو بدل بھی سکتا ہے۔ اس طرح دو قسم کے ترجموں میں فرق بھی کرنا چاہیے۔ ایک وہ جو فنکارانہ ادے کے ساتھ کیا جاتا ہے (بشرطیکہ اس میں کامیابی بھی ہو) اور دوسرا وہ ترجمہ جو محض کسی سخت ضرورت کے تحت کیا گیا ہے مثلاً ان سست نہاد طالب العلموں کے لئے جو اصل زبان نہیں پڑھ سکتے۔ مؤخر الذکر قسم کا ترجمہ صرف اسی وقت مؤثر ہو سکتا ہے جب اصل کے ساتھ مسلسل حوالے مل رہے ہوں ورنہ طالب العلم کا مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔ لیکن فنکارانہ یا ادبی ترجمہ تو اصل کی موجودگی کے ساتھ ساتھ اصل عدم موجودگی بھی فرض کرتا ہے، اسی لئے ایبے گلیانی (Abbe Galiani) نے کہا تھا کہ ایک اچھا ترجمہ وہ ہے جو اصل کے ساتھ موازنہ کئے بغیر پڑھا جا سکے۔

مترجم کا کام دراصل نیاز و ناز کا امتزاج ہے۔ اس کی دو صفات انتہائی قابل تحسین ہیں یعنی ایک تو وہ مصنف کا دل سے احترام کرتا ہے اور دوسرا بطور مترجم وہ انتہائی دیانت داری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یوں مکمل آزادی اور دیانتدارانہ پابندی کا یہ مقام اتصال (ترجمہ) اسے دوسرے کی مصنوعات اپنے ٹریڈ مارک کے ساتھ بیچنے سے باز رکھتا ہے۔ حالانکہ ترجمہ کرتے وقت وہ فن پارے کو اس طرح ڈھالتا ہے کہ کم از کم جزوی طور پر وہ اس کا خالق ضرور کہلا سکتا ہے، لیکن یہ مترجم کی بڑائی ہے کہ وہ ایک عمدہ کاریگر کی طرح کام کرتا ہے، دل اور روح کی صفائی کے ساتھ لیکن اپنا نام تخلیق کار کے طور پر سامنے نہیں لاتا اور ترجمے کی حرمت کی مسلسل پاسبانی کرتا ہے۔

اس باب میں ریناٹو پوگیولی لکھتا ہے:

> ''تمام دیگر 'ترجمان فنکاروں' کی طرح مترجم کا اصل کام بھی ایک جمالیاتی (اجنبی) شخصیت کو اپنی کلید کے مطابق متغیر کرنا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ (مترجم) ایک آئینے میں متن پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے دوسرے کا عکس دکھائی دیتا ہے یا اپنا؟ میرا موقف یہ ہے کہ اصل شاعر (مصنف) کی طرح، مترجم بھی نرگیست زدہ ہے جسے فطرت کی بجائے فن کے تلاب میں اپنی پسندیدی شے نظر آتی ہے۔ اس نظریے کا اطلاق ان مترجمین پر نہیں ہوتا جو زیادہ روایتی کلچر میں پروان چڑھے ہوئے ہیں اور جنہوں نے مقدس مذہبی کتابوں اور قدیم دانش کی ثقہ کتب کو اپنی روزمرہ کی زبان میں ڈھالا ہوتا ہے۔'' 'The Added Artificer': on translation، ہارورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج 1959ء''

شلر (Schiller) نے اس باب میں جو تقسیم روا رکھی ہے (یعنی قدیم شعری دنیا اور جدید) کے مطابق پرانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرز کے مترجمین کو Naive اور موجودہ طرز کے مترجمین کو 'جذباتی' کہا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے بادی النظر میں اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ مترجم اپنے مندرجات کے بغیر کام کرتا ہوں۔ یوں کہیئے کہ ترجمہ کا عمل ایک سیال مادے کو ایک برتن سے دوسرے برتن میں اُنڈیلنا یا ایک پرانی شراب کو نئی بوتل فراہم کرنا ہے۔

اپنی اپنی حدوں میں یہ دونوں امثال ترجمے کے باب میں مناسب معلوم ہوتی ہیں جبکہ عین ممکن ہے کہ پہلی صورت میں سیال مادہ چھلک کر گر جائے اور اس کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے۔ دوسری صورت میں بھی ممکن ہے کہ پرانی شراب نئی بوتل کو توڑ کر رکھ دے۔

اب اس نظریے پر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ مترجم کی ذات محض ایک خالی بوتل کی طرح نہیں ہوتی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مترجم بذات خود ایک زندہ ظرف ہے، ایک بے ہیئت سیال مادے یا موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی شراب سے پُر، جسے وہ مزید اپنے اندر روک نہیں سکتا اور جب یہ سیال چھلکنے لگتا ہے تو وہ اُسے مناسب ترین ظرف میں (جو میسر ہو) انڈیل دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ تو وہ ظرف اس کی ملکیت ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا سانچہ اس نے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہوتا ہے۔

لیکن یہ بات تو اس عام مفروضے کے برعکس ہے کہ مترجم، خالق یا شاعر نہیں ہے بلکہ محض لفظوں کا ماہر (کاریگر) ہے، یعنی وہ خود کچھ نہیں چاہتا۔ تاہم ہمیں اس تصور کی تردید کرنی چاہیے کہ ہمارے فلمی گیت نگاروں کی طرح مترجم کی صدا وہ دھنیں گاتی ہے جو اس کے لئے دوسروں نے موزوں کی ہیں۔ البتہ یہ خیال کہ مترجم ایک کھوکھلا کاریگر ہے، بنیادی طور پر غلط ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قبیل کے مترجم بھی ایک ڈھونڈے ہزار ملتے ہیں۔ لیکن ان کی تعمیر نہیں کی جا سکتی آخر اصل مصنفین میں بھی تو اس قبیل کے 'فنکار' پائے جاتے ہیں۔

محمد حسن عسکری کے لفظوں: 'سچا فن کار ستارے ڈھونڈنے نہیں نکلتا، اس کے لئے اس کا بادبان ہی ستارہ ہے۔' فن کار فن کی تخلیق پر مجبور ہے، یہ اس کی باطنی ضرورت ہے۔

تخلیقی فن کار کی یہ تعریف اچھے مترجم پر بھی صادق آتی ہے۔ اس لئے بھی کہ آرٹ (ART) کی قدیم تعریف میں ترجمہ بھی ایک فن (Art) ہے۔ آج کل آرٹسٹ کے لفظ میں یہ معنی ناپید ہو گئے ہیں لیکن 'Artisan' کے لفظ میں یہ معنی اب بھی محفوظ ہیں۔

ترجمہ کے فن کو آج بھی Craft سمجھنا چاہیے اور ترجمے کے عمل تنقید میں وہ چیز ضرور پس نظر رکھنی چاہیے جسے فرانسیسی زبان میں 'Question de matier' کہتے ہیں۔ اس طرح ترجمے کے تجزیاتی مطالعے میں اصل متن کے ساتھ کوئی متوازی لکیر نہیں کھینچی جائے گی البتہ ترجمے کے تکنیکی مسائل کا تجزیہ کرتے وقت تقابل اور تفاوت کو ضرور مدنظر رکھنا ہوگا۔ یہ تقابل اور تفاوت صرف ترجمے اور متن ہی کے حوالے سے نہیں ہوگا بلکہ ان مخصوص ادبی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایات کے حوالے سے بھی ایک نظر دیکھنا ہوگا جس سے متن اور ترجمے کا تعلق ہے۔ سو ترجمے کے تجزیاتی مطالعے میں بھی اسی درجے کی بصیرت درکار ہے جو تخلیقی فن پاروں کے لئے ناقد برتتا چلا آیا ہے۔

بقول ڈاکٹر سہیل احمد خاں:

> ''ہمارے پاس ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ترجمے کو اپنی زبان کے ادب میں ایک غیر فطری سا اضافی عنصر سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ترجمہ ہمارے ادب کے خمیر میں شامل ہے۔ تخلیق ادب کی کی عظمت کو تسلیم کرنا ضروری ہے مگر یہ کہنے سے تخلیق ادب کی عظمت کی نفی نہیں ہوتی کہ تخلیقی ادب کی بہت سی اعلیٰ شکلوں کے پیچھے ترجمے یا اخذ شدہ چیزوں کی چمک میں بھی موجود ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگ اس حقیقت کا شعوری طور پر احساس رکھتے ہیں کہ کلاسیکی اردو نثر کا بیشتر سرمایہ تراجم یا اخذ شدہ تحریروں کی ذیل میں آتا ہے۔ 'باغ و بہار' ہو یا 'بوستان خیال' کے دائرے کی داستانیں یا 'داستان امیر حمزہ'، 'آرائش محفل'، 'بیتال پچیسی'، 'مذہب عشق'، 'سنگھاسن بتیسی' غرض کہ ہمارا قابل قدر نثری سرمایہ اخذ یا ترجمے کی شکل میں ہے البتہ اس وقت کی تہذیبی فضا میں ترجمہ کرنے والے کے لئے آزادی تھی کہ وہ قصہ بیان کرتے وقت بہت سی چیزوں کا اپنی طرف سے اضافہ کر سکتا تھا۔
>
> (مضمون: 'ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن' ماہنامہ 'کتاب' لاہور جون 1982ء)

مترجم کا کام شاعر، کاریگر، لفظوں کے شعبدہ باز اور مصوری کی 'Mannerest' سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ محض جدید فکر کے پیچھے بھاگے اور جدت کو پسند کرے تب بھی وہ 'انسانیت پرست' ہی رہتا ہے اور یوں روایت کا پرستار اور فنون کی ابدی قدروں کا علمبردار ہی ثابت ہوتا ہے۔ وہ کلاسیکی مزاج کا اس لئے ہے کہ انسانیت پرست ہے۔ اس بات کو Aulus-Gellius نے 'The Attic Nights' میں یوں بیان کیا ہے:

> ''لاطینی زبان پیدا کرنے والوں اور بولنے والوں نے انسانیت پرستی (Humanitas) کو وہ تصور کبھی نہیں دیا جو یونانی لفظ 'Paideia' کے معنی دے دیئے یعنی 'فنونِ لطیفہ کا علم'۔''

تاہم ڈی۔ ایچ۔ روسیٹی (D.H.Rossete) کے کہے کو بھی اہمیت دینا پڑتی ہے۔ اس نے کہا تھا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

'A Translation Remains Perphaps the most direct from of commentary.'

لفظ 'ترجمہ'

مظفر علی سیدّ نے لفظ 'ترجمہ' سے متعلق بڑی فاضلانہ بحث کی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں، 'پار لے جانا' اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں، یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کے نقل مکانی تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے، عربی زبان سے آیا ہے۔ اہلِ لغت اس کے کم سے کم چار معنی درج کرتے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کا بیان، احوال یا تذکرہ شخصی ہے۔

یہ سب معانی باہم مربوط ہیں۔ اس طرح ترجم بھی (ت کی پیش اور ج کی زیر کے ساتھ) جس کے معنے ہیں: التباس کرنا، غلط ملط کرنا اور ترجم (ج کی زیر کے ساتھ) کا معنی ہے، مشکوک اور مخلوط۔ غالباً یہ معنے ان بے اختیار مترجمین کی وجہ سے پیدا ہوئے ہوں گے جن کی کسی زمانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور جو اپنی کثرت کی وجہ سے جملہ مترجمین کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، واضح طور پر سب معانی ثانوی اور مرادی ہیں کہ اُن کا تعلق تاریخ کے نسبتاً متمدن ادوار سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اصلی اور قدیم معنوں کے لئے مادے کو دیکھنا ہوگا اور اس کے دیگر مشتقات کو تاکہ لفظ ترجمہ کے گرداگرد ایک معنویاتی دائرہ کھینچا جا سکے، یا زبان شناسی کی اصطلاح میں اس کو اپنے Semantic Field میں رکھ کر اس کی ماہیت معلوم کی جائے۔

چنانچہ ابن منظور کی مبسوط تصنیف ''لسان العرب'' سے رجوع ناگزیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، جس نے لفظ ترجمہ کو 'ترجمان' کے ساتھ سہ حرفی مادے 'رجم' کے تحت درج کیا ہے (جب کہ بعض جدید لغات جیسے 'الفرائد الدریہ' اس کو چار حرفی مادے 'ترجم' کی ذیل میں لاتی ہیں جو عربی زبان کے اصول اشتقاق کے مطابق نہیں، جب تک اس کی بنیاد کسی دخیل کلمے پر نہ ہو غالباً عربی کے جدید علما لفظ 'ترجمان' کو اساسی کلمہ سمجھتے ہیں۔ یونانی لفظ Dragoman کی تعریف، اس طرح ترجمہ وغیرہ کا اشتقاق معکوس یا Back Formation کہا جا سکتا ہے، ترجمے کو 'رجم' سے منسوب کرنے میں بڑی وقت یہ ہے کہ اس کام کو گناہ کبیرہ کے ساتھ کیوں مربوط کیا جائے اور بچارے مترجمین کو حد شرعی سے کیسے محفوظ کیا جائے؟ ابن منظور نے بھی جو اس مادے کے متعدد مشتقات درج کیے ہیں، ان میں سے چند ایک معنوی رابطہ خود اس کی نظر میں واضح نہیں۔ تاہم قتل اور سنگساری، پتھر، کنکری، سنگ مزار، مزار موضع پہاڑ، اونچی دکان اور مینار وغیرہ کا 'رجم' سے تعلق تو ہے ہی جبکہ 'دوست' اور 'بھائی' اور 'مصاحب' کے معنی، جن پر کلاسیکی لغت نگاروں نے حیرت کا اظہار کیا ہے، رجم سے زیادہ Dragoman کی سمت اشارہ کرتے ہیں۔"

بقول مظفر علی سید:

مشتقات رجم کے ثانوی معنی با آسانی مادے سے مربوط ہو جاتے ہیں، لعن طعن، سب وشتم، قذف بالغیب، الزام وافترا، قیاس وگماں، اتہام اور فہم کلام (کلام مرجم)۔ یہ آخری معنی ایک جگہ قرآن حکیم میں بھی دیکھے گئے ہیں اور ممکن ہے 'ترجمہ' بطور اصطلاح اسی سے مستفاد ہو۔ البتہ ایک سوال یہ ہے کہ شیطان کو کیوں 'رجیم' کہا جاتا ہے، لعنت کی وجہ سے؟ (مرجوم باللعنہ) سب وشتم کی وجہ سے؟ (مشتوم ومسبوب) اُن کنکریوں کی وجہ سے، جو مناسک حج کے دوران جمرات کو ماری جاتی ہیں؟ (مرجوم بالحجارۃ) یا شہاب ثاقب کی وجہ سے، جو اس پر گرتے ہیں (مرجوم بلکاکب۔ وجعلنا ھا رجوما للشیاطین) خود شہاب ثاقب کو رجوم کہا جاتا ہے کہ نجوم وکواکب سے الگ ہو کر کہیں نہ کہیں یا کسی نہ کسی کو جا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لگتے ہیں۔

ترجمے کا تعلق، اصل تصنیف سے تقریباً وہی ہے، جو شہاب ثاقب کا نجوم وکواکب سے ہوتا ہے، یہ بھی اکثر اوقات ایک نہ ایک سیارے سے جدا ہو کر تاریخ کے کسی نہ کسی ریگستان میں گم ہو جاتا ہے یا پھر اپنی اصل کے دائرہ کشش ثقل میں گردش کرتے کرتے خود بھی ایک چھوٹا موٹا سیارہ بن جاتا ہے، جیسا کہ فن ترجمہ کی تاریخ میں کئی بار ہو چکا ہے۔ پھر جس طرح ایک ہی سیارے سے مختلف وقتوں میں ایک سے زیادہ شہاب ثاقب نمودار ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح مختلف ادوار ادب میں ایک ہی کلاسیکی کارنامے سے بار بار نئے ترجمے نمودار ہوتے ہیں۔ بلکہ کلاسیک تو کہتے ہی اس کارنامے کو ہیں، جس کے ترجمے کی بار بار ضرورت پڑے اور جیسے کوئی بھی شہاب ثاقب حتمی اور آخری نہیں ہوتا، اسی طرح ترجمے کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا، ان ترجموں کو بھی نہیں، جن کو اپنی زمانے میں تخلیق تک سے بہتر کہا گیا ہو۔

مارسل پروست نے اپنے عہد آفریں ناول "گم شدہ وقت کی تلاش" کے انگریزی ترجمے کو اصل فرانسیسی سے فزوں تر کہا تھا، لیکن نصف صدی کے بعد اس کا نئے سرے سے ترجمہ کرنا ضروری محسوس ہوا۔ اسی طرح لاطینی امریکہ کے مشہور ادیب گابریئل گارسیا مارکیز نے اپنا زوردار ناول 'ایک صدی، تنہائی کی' انگریزی زبان میں پڑھا تو اسے اصل ہسپانوی زبان کی نسبت قابل ترجیح سمجھا، لیکن خراج تحسین منسکر مزاج مترجم گرگیری باسا کے خیال میں انگریزی زبان کو ملنا چاہئے کہ جملہ تراجم کی طرح ایک نہ ایک دن یہ ترجمہ بھی متروک ہو جائے گا، بالکل ایسے جیسے 'ڈون کیخوتے' کو اصل ہسپانوی زبان میں پڑھا جائے تو تقریباً چار صدیاں پہلے کا یہ قصہ آج بھی نسبتاً جدید محسوس ہوتا ہے لیکن سروانتیس کے معاصرین نے اس کے ترجمے کیے تھے، اب خوفناک حد تک فرسودہ لگتے ہیں۔ اس لئے کہ شہاب ثاقب کی طرح ہر ترجمہ، لوگوں پر ایک نئے سرے سے اثر انداز ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ ترجمے کا کوئی نہ کوئی رابطہ 'رجم' سے قائم کیا جا سکتا ہے، بلکہ اسی وجہ سے ترجمے کا فن بہت سے ظریفانہ اقوال کا ہدف بنتا ہے۔ جیسے من ترجم یرترجم (جس نے ترجمہ کیا، سنگسار ہوا۔")

("فن ترجمہ کے اصولی مباحث"، راز مظفر سید، مشمولہ "سیمینار: اردو زبان میں ترجمے کے مسائل"

(مرتبہ: اعجاز راہی، مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم 1986ء)

ترجمے کا جواز:

ترجمہ کے باب میں پہلا سوال تو یہی بنتا ہے کہ ترجمے کا جواز کیا ہے؟ ترجمہ کیوں؟؟ لیکن اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ پتا چلنا ضروری ہے کہ یہ سوال کس نے پوچھا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر یہ سوال کسی تہذیبی منطقے سے پوچھا گیا ہے تو ترجمے کا لاکھ جواز ڈھونڈتے پھیریں، اس سوال کا جواب نہیں بن پائے گا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سید احمد بریلوی شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے دبستان کی طرف سے پوچھا گیا یہ سوال اس لئے الجھن میں ڈال دے گا (اور ہم بے بس ہو جائیں گے) کہ مشرق اور اسلام سے مربوط تہذیبی منطقہ عیسائی پادریوں کے ہندوستان میں ورود کو نہ صرف دینی بلکہ تہذیبی سطح پر بھی مذہبی اور ثقافتی یلغار خیال کرتا تھا۔ اب اگر ہمیں (اپنے تئیں) سیرام پور میں کئے گئے بائیبل اور اناجیل کے تراجم کا جواز ڈھونڈنا پڑ جائے تو سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے بھی کہ سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل نے اس مذہبی اور ثقافتی یلغار کو روکنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔

دوسری صرف اگر ادبیات سے متعلق کوئی شخص یہ سوال کرتا ہے تو اس کا جواب اتنا ہی آسان ہوگا جتنا کہ پہلی صورت میں مشکل تھا۔ اب ہم جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیشہ سے ادب اور زبان (یا تخلیقی عمل) ایک مسلسل داخلی اور ظاہری جستجو اور چھان پھٹک کا کام سرانجام دیتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نوع کا تخلیقی تسلسل افلاطون اور ارسطو سے چلا اور کولرج تک آتے آتے ادبی فیشن پرستی میں ڈھل گیا۔ اس کتاب میں شامل کی گئی توضیحی کتابیات (Bibliography) پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی ترجمے کا یہ طویل تاریخی سفر اپنی اہمیت ثابت کر دے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُردو میں تا حال 'ترجمے کا فن' اپنے ہمہ وقت ناقدین میں کوئی افلاطون یا کولرج بھی نہیں پیدا کر سکا۔

مختصراً یہ کہ ترجمے کے ذریعے زبان کئی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے۔ ترجمے جہاں الفاظ اور زبان کی نشو ونما کے ذریعے انسانی علوم میں اضافے کا باعث بنتا ہے وہیں ذہنی سرحدوں کو بھی کشادگی بخشتا ہے۔ زبان کی سطح پر ترجمہ خیالات و جذبات کی ہر ہر کروٹ کو سمونے کی خاطر نت نئے اسالیب بیان سے متعارف کرواتا ہے۔

ترجمہ کرتے وقت جہاں نئے الفاظ، استعاروں کے روپ میں جنم لیتے ہیں وہیں پرانے اور برتے گئے الفاظ کو آکسیجن مہیا ہوتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محاکات کے جنم کے ساتھ نئے علوم وفنون سے آشنائی ہوتی ہے۔ ہمیشہ نئی اصناف ادب کا ورود ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ آج اُردو زبان جس منصب پر فائز دکھتی دیتی ہے اس میں بہت کچھ ترجمے کا بھی کیا دھرا ہے۔

ترجمہ تنی سطح پر دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے درمیان پُل بنانے کا کام کرتا ہے اور متن کا اس کی تمام اسلوبی خصوصیات اور تہذیبی بو باس کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل ہو جانا ہی ترجمے کا اصل گن ہے۔ ترجمے کا اس پُل کے ذریعے سوم، خیالات اور تصورات ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک آتے جاتے ہیں۔ یوں درآمد اور برآمد کی دونوں کیفیتیں شامل ہوتی ہیں۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ طبع زاد تحریر کے مقابلے میں ترجمہ اتنی توجہ نہیں حاصل کر پاتا۔ یہ سب تو مترجم کی صلاحیت اور ترجمے کی افادیت پر منحصر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر درجے کی طبع زاد تصنیف یکساں توجہ سے پڑھی جاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ایک اچھے ترجمے کی افادیت اور مقبولیت ہمیشہ رہے گی اور ادب میں اپنی جگہ بنا لے گی۔

یہ ترجمے کی افادیت ہی ہے کہ عالمی سطح پر رابطوں کی بحالی اور مضبوطی کے لئے ترقی یافتہ اقوام میں بڑے پیمانے پر 'ٹرانسلیشن پراجیکٹ' متحرک ہیں۔ جس کی دو نمایاں مثالیں 'یونیسکو' اور انٹرنیشنل فیڈریشن آف ٹرانسلیٹرس' (F.I.T) ہیں۔ ان دو اہم بین الاقوامی اداروں کا اس باب میں اپنا اپنا چارٹر اور ضابطۂ اخلاق ہے۔ F.I.T کے چارٹر میں ترجموں کی رہنمائی کے لئے اہم دفعات شامل ہیں مثلاً:

یہ ادارہ مشکل فقروں کو مختصر کرنے یا خارج کرنے کو غیر اخلاقی حرکت قرار دیتا ہے۔ ادارے کے نزدیک ذو معنی لفظ کا لفظی ترجمہ مناسب نہیں اور نہ ہی نظم کے نثری ترجمے کو مانا جاتا ہے۔

امریکہ کا سب سے بڑا سائنسی ادارہ 'ناسا' اپنے جریدے 'star' میں دنیا بھر کے خلائی تحقیقاتی کام کے تراجم شائع کرتا ہے۔

برطانیہ میں ترجمے کا سب سے بڑا مرکز برٹش لائبریری لینڈنگ ڈویژن ہے، جو فرمائش کرنے پر سماجی، طبعی اور تکنیکی علوم کے تراجم فراہم کرتا ہے۔ اس ادارے کے ماہوار بلٹن 'B.L.L.D' میں برطانوی ترجمہ سے متعلق اداروں کی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔

امریکہ کا قومی مرکز ترجمہ 'نیشنل ٹرانسلیشنز سنٹر، شکاگو' 1953ء میں قائم ہوا۔ یہ ادارہ سماجی اور طبعی علوم کے علاوہ طب اور انجینئری سے متعلق مشرقی اور مغربی زبانوں سے تراجم کا کام کرتا ہے۔ یاد رہے کہ 1957ء سے قبل اس ادارے کا نام 'سپیشل لائبریری ایسوسی ایشن ٹرانسلیشن پول' تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق اس ادارے نے تقریباً پانچ لاکھ تراجم کئے ہیں۔ اس ادارے کے ماہوار جریدے کا نام 'Translation Monthly' ہے۔

امریکہ کا ایک بہت بڑا ادارہ 'American Translation Association' ہے جو 1959ء میں قائم ہوا۔ اس ادارے کے مستقل ملازمین کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ ہزار مترجمین جز وقتی طور پر اس ادارے سے منسلک ہیں۔

لائبریری آف کانگریس کے تحت ہونے والے تراجم کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اس ادارے کے مرکز ترجمہ نے 1957ء سے ماہوار جریدہ 'Translation Register Index' کے نام سے جاری کیا ہے جو ترجمے کے باب میں نت نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔

امریکہ کا ہی ایک نجی دار الترجمہ 'Ralph Mc Elory.Co' کے نام سے قائم ہے۔ کولمبیا یونیورٹی کی 'ٹیوٹرنگ اینڈ ٹرانسلیٹنگ ایجنسی' 1978ء میں قائم ہوئی تھی، جو اب تک لاکھوں تراجم کر چکی ہے۔

دیگر انٹرنیشنل اداروں میں کیلیفورنیا کا ادارہ 'Agenewtech-tran-Inc' امریکہ اور عالمی مرکز ترجمہ ڈیلف، نیدر لینڈ میں قائم ہیں۔ 'عالمی مرکز ترجمہ ڈیلف' کا ایک ماہوار اشاریہ 'World Trans

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Index کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

دنیا بھر سے ترجمہ کے متعلق 982 جریدے شائع ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل برٹش لائبریری لینڈنگ ڈویژن۔ برطانیہ کی شائع کردہ کتاب: 'Journals in Transition' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ سو کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی بہت سی معاشرتی اور ذہنی تحریکیں ترجمہ کرنے والوں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ ترجمے کی تحریکات، عمل اور ردعمل، دونوں اعتبار سے اسلامی علمی دنیا میں حیرت انگیز طور پر نتیجہ خیز رہی ہیں اور یہی حال دنیا کے دوسرے عظیم معاشرے کا ہے۔ آج کل افریقہ اور ایشیاء کے علاوہ دنیا بھر میں بیداری کی جو تحریکیں چل رہی ہیں اُن میں تراجم کا نمایاں حصہ ہے۔

خود ہمارے ہاں ایسے متعدد ادارے وجود میں آئے جن کا مقصد ترجمے کے ذریعے علمی بیداری پیدا کرنا تھا۔ سید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی اور ورنا کیولر سوسائٹی دہلی کالج ایسے ہی ادارے تھے۔

مغرب کی فاتح اقوام نے مفتوح قوموں کے طور طریقوں، مذہب، ادب اور تہذیب کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ ترجمے کا سہارا لیا ہے۔ ترجموں کی محرک توسیع کی خواہش تھی۔ یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ آج بھی دورِ جدید کی بڑی طاقتیں دنیا بھر کے علوم و فنون اور ادبیات کے ترجموں کے لئے اپنا ایک وسیع اور مضبوط نظام رکھتی ہیں، جس کے ذریعے وہ دیگر اقوام کے تحریری سرمائے کو اپنی قومی ضرورتوں کے مطابق اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے علمی اور ادبی اثر و رسوخ اور اپنے قومی نظام فکر اور سیاسی علمداری کا اپنی چیدہ کتب کے (دیگر زبانوں میں) تراجم کے ذریعے چلن عام کرتی ہیں۔ اس کی نمایاں مثالیں دارالاشاعت ترقی ماسکو (روس) اور موسسہ فرینکلن (امریکہ) جیسے ادارے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آزادانہ طور پر کام کرنے والے اشاعتی اداروں نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ یوں یہ نظام ترقی یافتہ اقوام کی قوت کا ایک اہم سرچشمہ ثابت ہوا ہے۔

یہاں قومی محرک کی نشاندہی کر دینا بھی ضروری ہے، جس کے تحت انفرادی سطح پر حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے گئے ہیں، جس بنیادی محرک ہر زبان کے ادیبوں اور مترجمین میں اپنے ادب کی توسیع کا جذبہ ہے۔

تحولہ یا ضروریات سراسر افادی ہیں۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ تراجم نے انسانی تہذیب کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا؟

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ بجائے خود ایک تہذیبی منطقے کا حامل رہا ہے، اور اسی تہذیب کے بل بوتے پہ انسانی تہذیبوں نے آپس میں بہت کچھ لین دین کیا ہے۔ وہ یوں کہ ترجمہ ایک زبان کے علمی اور ادبی سرمائے کو دوسری زبان بولنے والے انسانی گروہوں تک پہنچاتا ہے۔ دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے فراہم کرتا ہے اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور ربط و ضبط کی راہیں کھولتا ہے۔

زبانوں کا فرق ہمیشہ قوموں اور گروہوں کے درمیان اتحاد و یگانگت میں ایک بڑی رکاوٹ رہا ہے، جبکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمے کی تہذیب اس روکاوٹ کو دور کرتی ہے۔

ماضی پر نگاہ ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ ادبیات عالم میں تاریخی ادوار اور انسانی تمدن کی شناخت و بازیافت کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی رہا ہے۔ خود ہمارے ہاں مغلوں کے زوال کے بعد جب فارسی زبان و ادب کا ذوق گھٹتا نظر آیا اور تہذیبی اور ثقافتی روایات مدھم پڑنے لگیں تو ہمارے ہاں کے علماء نے فارسی کی معتبر اور کلاسیکی کتب کو اردو کے قالب میں ڈھالنا ضروری خیال کیا۔ اسی طرح اسرائیل کے نوبل انعام یافتہ ادیب آئزک باشویز سنگر نے عبرانی زبان اور اہلِ یہود کی تہذیب کے گھٹتے ہوئے اثر کی بازیافت اپنی انگریزی تحریروں میں کی ہے۔

انسانی تہذیب کی ترقی کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں۔ اس کی ترقی مجموعی انسانی ترقی ہے اور اس ترقی میں ترجمے کا بڑا ہاتھ ہے۔ یوں ترجمہ محض علوم کے فروغ ہی میں حصہ نہیں لیتا بلکہ انسانی گروہوں کے درمیان ذہنی مفاہمت بھی پیدا کرتا ہے۔ غرض کہ اس کی افادیت مسلم ہے۔

مترجم کی نیک نیتی کو پرکھنے کی ایک کسوٹی بھی ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کس نوع کے تصورات و نظریات اور تکنیک کی درآمد کو ضروری سمجھا اور کس نوع کے اسلوبیاتی نظام کو اپنے ادب کی بالیدگی و بلوغت کے لیے ضروری خیال کیا۔

خود اپنے ہاں خالصتاً بنت کے حوالے سے دیکھیں تو نئے لسانی پیرائے اور نئے اسالیب بیان کی جستجو کا واحد ذریعہ ترقی یافتہ ادبیات سے تراجم کا متواتر عمل ہی ٹھہرتا ہے۔ اردو فکشن میں بیانیہ اور حقیقت نگاری کا جمود توڑنے کا واحد ذریعہ ستاں دال، فلا بیئر، جیمز جوائس، البیر کامیو اور فرانز کافکا وغیرہم کے تراجم ہی رہے ہیں۔

بادی النظر میں ترجمہ اپنے گردوپیش کے حالات سے کچھ ایسا متعلق معلوم نہیں ہوتا، لیکن بغور دیکھا جائے تو کافی حد تک انہیں سے بروئے کار آتا اور اثر پذیر ہوتا ہے۔ ترجمہ درحقیقت اخذ و استفادہ ہی کی ایک شکل ہے اور اس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ہمارے ہاں کسی چیز کا فقدان ہو۔ چنانچہ جب دو قومیں آپس میں ملتی ہیں تو اُن میں خود بخود اخذ و استفادہ کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور جو فریق کم ترقی یافتہ ہو وہ قدرتی طور پر دوسری قوم سے زیادہ فیضان حاصل کرتا ہے۔ محمد حسن عسکری نے اپنے ایک مضمون میں درست لکھا ہے کہ:

> ''دوسروں کے ادب کو پوری طرح سمجھنے کی فکر یا خواہش تو ہم جیسے لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک خلا میں رہتے ہیں۔ مثلاً یورپ نے ہی مشرق کے فلسفوں کو آٹھویں صدی سمجھنا شروع کیا جب مغربی سماج کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔''
>
> (''مگر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے'' مطبوعہ ماہِ نو کراچی۔ فروری ۱۹۵۴ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ لکھنے سے پہلے عسکری صاحب نے اپنے اسی مضمون میں وضاحت کر دی تھی کہ:

''ہمارے یہاں جس قسم کی بھی عظمت ہے، اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ترجموں سے ضرور ہے۔ اُردو ادب میں آغاز سے لے کر غالب کے زمانہ تک ترجمے چاہے زیادہ نہ ہوئے ہوں، لیکن ہمارے شاعر دو قسم کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف تو وہ فارسی کے اسالیب اور تصورات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال رہے تھے، دوسری طرف وہ اپنی زبان کا ایک مزاج اور ایک روح متعین کرنی چاہتے تھے۔ یہ بالکل وہی چیز ہے جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں اٹلی اور انگلستان کے شاعروں نے فرانسیسی کے زیرِ اثر اپنی زبانوں کے لئے کی۔''

عسکری صاحب کی بیان کردہ یہ حقیقت ہمیں اردو تراجم کے مطالعہ کے لئے ایک عمدہ نقطہ سفر مہیا کر دیتی ہے اور ساتھ ہی اس کی نوعیت بھی واضح کر دیتی ہے۔

اب اس مضمون کے اُس حصے کی طرف آیئے جہاں عسکری صاحب ترجمے کی افادیت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اردو والے ترجمے میں بس اتنی ہی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلامت ہے اور پڑھتے ہوئے ایسے لگے جیسے کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے۔ لیکن اس سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچتا ہے''

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اعجاز احمد لکھتے ہیں:

''اگر آپ بنی بنائی نثر میں اضافے کے روادار نہیں بالفظوں کو نئے سانچوں میں ڈھالنا پسند نہیں کرتے تو ترجمے کا فائدہ کیا ہے؟ اگر بلاغت کے مروجہ اصولوں سے انحراف جائز نہیں تو آدمی ترجمہ کیوں کرے۔ اصل سے اخذ کر کے خود اپنی تصنیف کیوں نہ لکھے؟ 'بے ساختہ' ترجموں سے زبان میں کیا وسعت پیدا ہوسکتی ہے؟ ترجمہ کرتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی ضرورت کے مطابق ترکیب وضع کرتا ہے تو اسے پرکھنے کے لئے میرے پاس تو ایک ہی کسوٹی ہے

اگر وہ مروجہ اصولوں کے تحت لکھتا تو فقرے کی شکل کیا بنتی؟ اس کے گیسو دراز ہم وطنوں' کی بجائے اگر ہم کہیں 'اس کے ہم وطن کہ جن کے بال لمبے تھے' تو فقرہ کیا ہوگا؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کا فائدہ دراصل یہی ہے کہ آدمی وقتاً فوقتاً ایسی ایجاد یا باقیافت پہ مجبور ہو جاتا ہے جو اجنبی لگے، تاہم ضروری بھی ہو۔ اور فائدہ بھی ایسے ہی ترجمے سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ باقی رہی بے ساختگی والی بات، سو وہ بے معنی ہے۔'' (تبصرہ: 'جہاں گرد کی واپسی' رسالہ 'سویرا' لاہور شمارہ 35 ص: 203, 204)

لیکن دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں محمد حسن عسکری اور اعجاز احمد سے اختلاف کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر اچھا ترجمہ اپنا جواز خود پیدا کرتا ہے۔ کہیں باہمی شراکت کی سطح پر اور کہیں معانی کے نئے قرینے کی سطح پر۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایک ترجمہ (یا انفرادی کوشش) ایسا ہو جو انفرادی حالت میں (ادبی سطح پر) بہت بڑے تغیر کا باعث بنا ہو۔ کیا 'مادام بواری'، 'سرخ و سیاہ'، 'موبی ڈک' (مترجم: محمد حسن عسکری) یا 'جہاں گرد کی واپسی' مترجم: محمد سلیم الرحمن) جیسے اہم تراجم نے اسلوبیاتی سطح پر کوئی بڑی لہر پیدا کی؟ یقیناً نہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں کیا اردو میں داستانوں کا ادب تراجم یا اخذ و استفادہ کا نتیجہ نہیں؟ اور کیا وہ تمام تراجم محمد حسن عسکری یا اعجاز احمد کے معیارات پر پورے اترتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادب محض اسلوبیاتی فتحیابی کا نام نہیں اور نہ ہی ادب کسی ایک زبان کی میراث ہے۔ یہ انسان کی پیداوار ہے، جملہ انسانوں کے لئے ہے۔ یہ تمدنی سطح پر تہذیبی اختلاط کا عمل ہے اور لسانی سطح پر زبان سازی کا وظیفہ۔ کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی و فکری افق کے وسعت کی خواہش ہو، علمی استفادے کی آرزومندی ہو یا مادی فوائد کا حصول پیش نظر ہو اس سے بہر طور اخذ و استفادہ کے در باز ہوتے ہیں اور ایک تہذیب دوسری تہذیب سے کچھ نہ کچھ استفادہ ضرور کرتی ہے۔ یہ اخذ و استفادہ کی روایت صرف یہیں تک محدود نہیں۔ دنیا کے تمام ادیان و مذاہب اپنے لاتعداد ماننے والوں تک، جو اس زبان سے ناواقف تھے، جن میں ان کی الہامی کتب کا نزول ہوا ترجمے وسیلے سے پہنچے۔

جہاں تک اردو زبان میں ترجمے کی روایت کا تعلق ہے تو سہولت کی خاطر ہم پورے سرمائے کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ صنفی

۲۔ تخلیقی و غیر تخلیقی

۳۔ نثری و شعری

اُردو ترجمے کا یہ قیمتی سرمایہ شخصی پر مختلف افراد، اداروں اور مختلف تحریکات کی صدیوں کی جگر کاری کا ماحصل کہا جا سکتا ہے۔

یوں تو ہمارے مترجمین نے بھی ترجمہ کرتے وقت انتہائی عاجزی کے ساتھ اطاعت اور وفا شعاری کو اپنایا ہے، لیکن کہیں کہیں انہوں نے بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف بھی کیا ہے، حتیٰ کہ فٹز جیرالڈ کی طرح متن روح اور رنگینی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو سلامت رکھنے کے سلسلہ میں وہ ترجمے کے لوازمات سے بغاوت بھی کر بیٹھے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں بھی فٹز جیرالڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جیرالڈ نے تو یہاں تک کیا ہے کہ رُباعیات عمرِ خیام کو ترجمہ کرتے وقت دو رباعیوں کو یکجا کر دیا اور مصرعوں کی ترتیب تو در کنار بعض جگہوں پر اصل متن اور ترجمے کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ سوائے شعری تاثر کے کچھ بھی مماثل نہیں ہے۔ خیر یہ تو ہوئی آزادیوں کی بات، لیکن اردو ادب میں بعض مترجمین (جن کی تعداد سیکڑوں تک جا پہنچتی ہے) نے اپنے متن سے وفادار رہ کر بھی اردو کے اسالیب میں تنوع پیدا کیا ہے اور یہی ترجمے کی معراج ہے۔

یاد رہے کہ ترجم کے ذریعے کسی ادب میں جان صرف اُس صورت میں آ سکتی ہے جب مترجمین کا اپنی تہذیب سے گہرا تعلق ہو۔ یہ تعلق دوستی کا بھی ہو سکتا ہے اور دشمنی کا بھی۔ اس باب میں محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''ہمارے موجودہ ادب میں مجموعی حیثیت سے اور مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے جو اُتھلا پن آ گیا ہے اس کے ازالے کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ ترجموں کا ایک نیا دور شروع ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ تخلیقی کام بھی ساتھ ساتھ جاری رہے لیکن کم سے کم ترجموں کا کام تو اپنے بس کی بات ہے۔ اب تک ہمارے یہاں ایسی مغربی کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں جو ذہنی تجربے اور طریقہء اظہار دونوں کے اعتبار سے نسبتاً سادہ اور سہل تھیں۔ لیکن اگر ہمیں اپنے ادب میں جوہری دور کی پیچیدگیوں کو سمونا ہے تو ہمیں ایسی چیزیں ترجمہ کرنا پڑیں گی جن سے ہم زندگی کو زیادہ وسعت، زیادہ گہرائی اور زیادہ باریکیوں کے ساتھ محسوس کرنا اور 'لکھنا' سیکھیں''۔

(مضمون: 'کچھ ترجمے کے بارے میں' مطبوعہ 'ماہِ نو' لاہور عسکری نمبر مارچ 1978ء)

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ نگاری: چند پہلو

ڈاکٹر احمد سہیل

اردو کے ادبی نظریات کے تاریخی تناظر میں جب بھی مباحث شروع ہوتے ہیں تو ابتدا اردو تراجم سے ہی ہوتی ہے کیوں کہ اردو ابتدائی تراجم اور ان کے ماخذات سے ہی اردو کی ادبی تاریخ کو ایک مکمل ''کل'' کے ساتھ اور ترتیب وار تناظر میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ترجمے کے نظریاتی مباحث بہت الجھے ہوئے ہیں۔ کئی تصوارت کو اس حوالے سے اتنا الجھایا گیا ہے کہ ترجمے کا نظریاتی آفاق ابہام اور پیچیدگیوں سے دوچار ہو گیا۔ ترجمے کو جب بھی مخصوص نظریاتی فریم ورک میں مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات ذہن میں ضرور آتی ہے ترجمے کے آفاق کو آفاقی اصولوں، اصطلاحات اور ضوابط او خصوص ہائے نظام کے تحت شعور میں لا کر اس کی تفہیم و تشریح کی جائے۔ اسے نظریاتی لسانی عملیات کے معروضی وظائف اور اصولوں کی تشریحات بھی تصور کیا گیا ہے۔ ترجمے کے نظریے کا ہی اعجاز ہے کہ یہ غیر ملکی زبان کی ہیئتوں، تشکیلات اور معنویت کو فکری اجتہاد کی مدد سے لا رموز کرتا ہے۔ فکر کے نئے دروازے کھولتے ہوئے ایک تمدن کو دوسرے تمدن کی اقدار و نظریات سے متعارف کرواتا ہے جس میں تین لسانی رویے شناخت کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) زبان کا ماخذ

(۲) زبان کا ہدف

(۳) نفس مضمون

مترجم انھی تین نکات کی بنیاد پر دیے ہوئے متن میں پوشیدہ لسانی معنویت کو آشکار کرتا ہے جو بہت سوں کی نظر میں تخلیق نو ہوتی ہے۔ اس سے زبان کا ہدف اور ماخذات ابھرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ زبان کے ہدف کی ساخت بگڑ گئی ہے۔ دراصل یہ ہدف یافتہ زبان کی تبدیلیوں کو رموزیات کے ساتھ متن میں موجود پیغامات کو ایک ثقافتی فضا سے باہر نکال کر دوسری ثقافتی فضا میں رکھ دیتے ہیں مگر ترجمے کی زبان میں اس وقت تک ''عالمی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معروض'' کی آمیزش نہیں ہوتی جب تک اس کی تفہیم ترجمہ کرنے والی دوسری زبان کی ثقافت کے شعور کا حصہ نہ بنے لیکن ترجمہ زبان کے جبر سے کبھی چھٹکارا حاصل نہیں کرتا مثلاً کسی تحریر کا ایک زبان میں ترجمہ ہو کر دوبارہ پھر اسی زبان میں ترجمہ ہوتا ہے۔ جس کو ترجمہ در ترجمہ کا عمل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال ''قصہ چہار درویش'' ہے جو پہلے میر عطا حسین تحسین نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا لیکن یہ زبان و لسان کی سطح پر زیادہ رواں اور سلیس نہیں تھا کیوں کہ اس میں عربی فارسی کے کئی ایسے غیر مانوس الفاظ کی بھرمار تھی جو تحسین کے اس ترجمے کو قبولیت نہ بخش سکی مگر اس تصنیف کو بعد میں اردو میں میر امن دہلوی نے ''باغ و بہار'' کے نام سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا اور اسے قبولیت حاصل ہوئی۔ اسے مغربی ادبی اصطلاح میں بین اللسان (Intralingual) کہا جاتا ہے۔ ایک اور صورت حال دو زبانوں کے درمیان ترجمے کی ہوتی ہے۔ جو ترجمے کا سب سے عام طریقہ کار ہے اسے انگریزی اصطلاح میں بین اللسان (intralingual) کا نام دیا گیا ہے۔ تیسری قسم نشانیات کا ترجمہ ہوتی ہے اس کے لیے انگریزی میں بین المعنیات (Intersemiotic) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ ایک اور ترجمے کی قسم یہ ہے کہ براہ راست زبان سے ترجمے نہیں کیے جاتے۔ اردو بولنے والے جس غیر ملکی زبان سے سب سے زیادہ قریب ہیں وہ انگریزی زبان ہے لہٰذا عربی، ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن، پرتگالی، جاپانی، چینی ادب سے اردو میں زیادہ تر ترجمے انگریزی کی وساطت سے ہی ہوئے۔ مگر اس صدی سے کوئی دو عشرے قبل اردو میں ایسے مترجم بھی دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے فرانسیسی، جرمن، چینی، عربی، فارسی، ہندی سے براہ راست ترجمے کیے۔ ترجمے کے سلسلے میں ایک دل چسپ بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ جس میں مترجم اصل متن کو پڑھنے سے قاصر ہوتا ہے یا اس کی اتنی استعداد نہیں ہوتی کہ وہ اس سے معاملہ کر سکے مگر اس کو متن کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ کسی سے متن کی قرأت کروالیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہندی شاعری ہے۔ اردو کے بہت سے مترجمین کو ہندی نہیں آتی وہ کسی سے مسودے کی قرأت کروا کے اس کو اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔

جدید ترجمے کے نظریات میں مخصوص قسم کے موضوعات پر زور دیا جاتا ہے۔ ان موضوعات پر عمیق مطالعہ ہی مترجم کے لیے بہتر تصور کیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ ترجمے کے آفاق کا احاطہ کرتے ہوئے ایک روشن خیال عملی، عملی تناظر کے علاوہ منہجیات کی نت نئی صورتیں تشکیل دیتے ہیں۔

(۱) لسانی نظریہ (۲) نحو (۳) نشانیات (۴) تاریخ لسان اور تقابلی لسانیات (۵) ترجمے کے نظریات (۶) تاریخ اور زبان کی لسانیات (۷) تجرباتی لسانیات (۸) معاشرتی لسانیات (۹) نظریاتی لسانیات (۱۰) قواعدیات (۱۱) تفہیمات و تشریحات (۱۲) مشینی و برقیاتی خودکار تراجم۔

تراجم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے، ترجمہ ہی ادب کی تہذیب و تمدن کے ارتقا اور رسائیوں کا کھوج لگانے میں مدد دیتا ہے اور تراجم کے نظریاتی منہاجیاتی اور مابعد احاطے میں لاتے ہوئے ترسیلی، تسلیماتی،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تفہیماتی، تفتیشی (Heuristic) اشتقاقی، اسطوری اور علمیاتی کی اضاف وغیرہ کی تشریح کرتی ہے۔ انورزم کی اصطلاح کے تحت تراجم کے متن کو مکمل نفس مضمون کے ساتھ چند سطروں میں منتقل کرنا بھی ہنر مندی ہے۔

ترجمہ بنیادی طور پر لسانی فن ہے، اس کی ابتدا بھی لسان سے ہی ہوتی، زبان کے ساتھ ہی وسعت بھی پاتی اور زبان کے ساتھ ہی اپنا اختتامیہ بھی کرتی ہے۔ ترجمے میں زبان کا ہدف زبان ہی ہوتا ہے۔ ترسیل، تفہیمات، تشریحات واشتقاق وغیرہ کے مسائل بعد میں آتے ہیں لیکن ادب کو ترجمے کے حوالے سے پڑھتے ہوئے قاری اور ادیب کے درمیان معنیات کی گنجلک صورت حال ابھرتی ہے مگر تفہیماتی تراجم میں معنی میں معنویت کشید کی جاتی ہے اور مفہوم ومعنیات کو نئے انسلاکات کے ساتھ پرکھا جاتا ہے۔ اسے حتمی ''نظریہ تشریح'' کی سعی بھی کہا گیا ہے۔

تراجم کے نظریات میں تین عناصر اہم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہی عناصر تراجم میں اپنی موجودگی کا حاوی طور پر احساس دلواتے ہیں مگر پھر بھی تراجم کے میدان میں یہ مسئلہ ہمیشہ رہتا ہے کہ اس میں ابہام اور تشکیک کا تناسب بھی اچھا خاصا ہوتا ہے جو اصل تخلیقی معروض سے انکار کا سبب بھی بن جاتا ہے کیوں کہ جب سے ترجمہ قدیم زبان سے تحریری طور پر نہیں مگر زبانی طور پر ابلاغ ہو رہا ہے۔ جب فرد کے پاس الفاظ نہیں تھے اور الفاظ کی ترتیب دینے کی اہلیت ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتی تھی۔

لفظ بولتا ہے، مکالمہ کرتا ہے، سوالات اٹھاتا ہے، تشریح کرتا ہے اور تفہیم کی راہیں کھولتا ہے۔ ارسطو زبان کو ''ذہنی پیکر'' کہتا ہے۔ لکھے ہوئے الفاظ کی علامتوں کے سبب ہی کی مدد سے تکلمی زبان وجود میں آتی ہے اور لسانی حوالے سے متن اور تراجم کا مخاطبہ (Discourse) معروضی و دستاویزی ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ معاشرتی عمل کا حصہ ہوتا ہے۔ گڈامر نے اس سلسلے میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ لسانیات بنیادی طور پر زبان اور لسانی وجود کے مابین اتصال کا سبب ہوتی ہے۔ تشریح کبھی بھی معروضیت کے بغیر تسخیر نہیں ہو پاتی۔ فرد اس لیے زبان استعمال کرتا ہے کہ اس وسیلے سے وہ معنویت، معنیات، مفاہیم کو دریافت کرنا چاہتا ہے مگر معنویت کے اس کھیل میں جب بھی تشریح وتفہیم کی ضرورت ہوتی ہے تو بعض دفعہ الفاظ غیر متعصب ہوتے ہوئے بھی متعصب ہو جاتے ہیں۔ انسانی افعال کی ترسیل ہوتی ہے مگر اس سے مکمل طور پر انسانی صداقتوں وحقائق کی تفہیم نہیں ہو پاتی۔ اس عمل کے دوران یہ ضرور ہوتا ہے کہ لسانی نظام میں چھپے ہوئے رموز کو کئی بار لارموز کیا جاتا ہے جس میں قواعدیاتی، بشریاتی، عمرانیاتی تعلقات کو معنویت کے ادراک میں ایک تکنیکی پیمانے کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے اور اسی عمل کے درمیان کئی معروضات بھی ابھرتے ہیں۔ جو مترجم یا قاری کو تذبذب میں ہی نہیں ڈالتے بل کہ تراجم کی روانی میں رخنے بھی ڈالتے ہیں۔ پھر علومیاتی انسلاک سے مبادلیاتی رویے ابھرتے ہیں اور مختلف تناظرات میں تقابل کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

ترجمے کا اصل مسئلہ ابلاغ کا بھی ہے جس میں لسان وزبان کی منتقلی سے ترجمے کا عمل شروع ہوتا ہے یعنی ترجمے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اصل ہدف تو ایک طرف اقدار کی منتقلی بھی دکھائی دیتی ہے اور قاری اپنی حسیت سے نئی جمالیات بھی تشکیل دیتا ہے اور اصل لکھاری کے تخلیقی متن کو نئی تاثراتی فضا میں بھی لے جاتا ہے۔ مترجم کا متن سے قلبی اور ذہنی لگاؤ ہونا لازمی ہے۔ اسلوب کو خلق کرنا اس کا کام نہیں۔ مراد یہ کہ ترجمہ اس طرح کا "سرگرم ابلاغ" ہے تو دوسری جانب متن کا لسانی چربہ بھی معلوم ہوتا ہے، ساتھ ہی مترجم کو اس ذمہ داری کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ وہ متن کی اصل حرکیات، جمالیات اور ماخذات سے شعوری تعلق رکھے۔ یہ تمام عوامل ادبی تراجم میں زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور ابلاغ اور اظہاریت کی ہنرمندی سے ہی اصل ترجمہ ممکن ہو پاتا ہے، ساتھ ہی ترجمہ کرنے والے متن سے معاملہ بندی کرنا بھی آنا چاہیے۔

ترجمے کے آفاق میں دو فکری تناظر اہم ہیں جن میں ایک نسبتیت اور دوسرا اضافیت جس کا تعلق فلسفیانہ ادراک سے ہوتا ہے جو کہ طرز فکر سے منسلک ہو کر عمومی نوعیت سے حیاتیاتی اور جنسیاتی عناصر سے جا ملتے ہیں جو مترجم کے ذہن میں ہیئت کی آگہی کا پتا دیتے ہیں۔ یوں تنقید ذات اور ذات کے ارتقا کا تقابل ہو جاتا ہے اور یہ ترجمے کے معروضی احوال یا اہمیت قرار پاتے ہیں کیوں کہ مترجم ایک ثقافت کو خلق کرتا ہے اور دوسری قسم یعنی اضافیت میں ردعمل کا تناظر اہمیت کا حامل ہوتا ہے آفاقی اضافیت کا طریقہ عمل سے نفسیاتی حیاتیاتی اور متعین قسم کی ترجماتی ہیئت ابھرتی ہے اور آفاقی عقلیت پسندی سے ترجمہ ہونے والے متن کا "نحو" ایک سا لگتا ہے لیکن صوتی اور لسانی آہنگ میں تفاوت ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان ہی ترجمے کے ذریعے "دوسرے" قاری کو در - کرتی ہے۔ یہ سب عقلیت کا آفاقی نظام و تناظر ہے۔

مترجم متن میں صداقت کا سراغ بھی لگاتا ہے اور ثقافتی تقابل کے بعد لسانی نظام میں تفاوت اور تجربات کا تصادم ہے۔ وہ بھی اپنے ترجمے کو ہدف میں شامل کرتا ہے مگر اصل متن کو متنی سطح پر معروضیت عطا نہیں کرتا ہے کیوں کہ ترجمے کے متن کا قاری اپنی مخصوص حسیت سے وہ باتیں بھی خلق کر لیتا ہے جو کہ اصل مصنف اور مترجم کے ادراک میں بھی نہیں آتیں اور پھر مترجم ہدف متن سے اخلاقی اور تکنیکی طور پر وابستہ بھی ہوتا ہے اور یہی وابستگی مختلف نوع کے ثقافتی نتائج کے ادراک کی متعلقات سے باہم ہو کر ترجمے کا "کل" حاصل کرتے ہیں۔ یہی تمام عوامل اور اصل اسلوب کو ممکن طور پر تزئین کر کے نئے نظریاتی اور عملی رموز کو تسخیر بھی کرتے ہیں۔ موضوع اور معروض کو ترجمے کے عمل میں دو اہم جہات تسلیم کیا گیا ہے۔ موضوع سے مراد "قاری" اور "مترجم" ہوتا ہے اور معروض "اصل متن" کو تسلیم کیا گیا ہے لہٰذا مترجم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ قاری سے مطابقت پیدا کرے۔ مگر ترجمے کے عمل میں تفہیمی سطح پر مصنف، متن اور قاری کی تلون کے ترجمے کی "تخلیق" ممکن ہوتی ہے۔ اُردو میں تراجم کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو زبان کی تاریخ و روایت ہے۔ اردو ترجمہ کے سبب ہی اردو لسان و زبان کی نشو ونما ہوئی اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں پروان چڑھی۔ اُردو ترجمہ کا سلسلہ سترھویں صدی کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ ملا وجہی نے ۱۶۳۵ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ''سب رس'' لکھی جو دکنی زبان سے ترجمہ کی گئی تھی۔ محققین کا خیال ہے کہ ''سب رس'' شاہ جی نیشاپوری کی فارسی کتاب ''دستور عشاق'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کو اردو زبان کی پہلی رزمیہ تحریر بھی کہا جاتا ہے۔ نصیرالدین کی تحقیق کے مطابق ملا وجہی نے وجیہ الدین کی گجراتی کتاب کو ''سب رس'' کے نام سے ترجمہ ہے ایک اور تحقیق کے مطابق اپنے زمانے کے صوفی اور شاعر شاہ جی (۱۴۹۶۔۱۵۶۱) کی کتاب خدا نما (دکن) اردو میں ترجمہ کی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ میران جی کا تعلق قطب شاہی زمانے سے تھا۔ حامد حسن قادری صاحب، شاہ میران جی کے اس ترجمے کو مشہور عربی مصنف ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیدات ہمدانی'' کا ترجمہ بتاتے ہیں ۱۶۰۳ میں رقم ہوا۔ ۱۶۷۳ میں ایک کتاب جس نے اردو کے ترجمے کے آفاق میں نیا اضافہ کیا۔ اس کے مترجم کا نام میراں یعقوب ہے۔ انھوں نے دکن کے عمادالدین زبیری کی کتاب ''شمائل الاتقیا'' کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اس ترجمے میں تصوف کے مباحث تھے۔

اٹھارھویں صدی (مغلیہ دور) میں شاہ ولی اللہ قادری نے ۱۷۰۴ء میں شیخ محمود کی فارسی کتاب ''معرفت السلوک'' کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد عربی فارسی سے اردو سے اردو ترجموں کا سلسلہ چل نکلا۔ طوطی نامہ کربل کتھا، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر کا قرآن حکیم کا اردو ترجمہ، تحسین کی نوطرز مرصع جیسے تراجم کے بعد جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو میرامن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، نہال چند لاہوری، مرزا علی لطف، مولوی امانت اللہ شہید، شیخ حفیظ الدین، مظہر علی خان ولا، خلیل علی خان اشک، للولال جی، میر بہادر علی حسنی، اکرام علی اور بنی نرائن کے نام اردو کے چند اہم مترجمین کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے باہر محمد حسین کلیم دہلوی، حکیم شریف خان دہلوی، رجب علی بیگ سرور، کپتان ٹامس رو بک، جان پارکس لیڈک، نظام الدین چستی، ہرچند ہوش، فقیر محمد گویا نے اردو تراجم میں بڑا نام کمایا۔ اسی زمانے میں اردو میں بہترین تراجم کا سفر جاری رہا۔ مغرب مشرق کے تقریباً ہر اہم کلاسیک کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے (فہرست طویل ہے)

ترجمے کو معاشرتی جبرے سے بھی منسلک کیا گیا ہے۔ معاشرتی احوال سے بے چینی، بے اطمینانی، انسانوں کے ہاتھ انسانوں کا استحصال، نوآبادیات، سرخ، سفید اور نیلے سامراج کا پھیلاؤ، لاطینی امریکا میں سامراجیت کی ہٹ دھری، کمیونزم کا شور، امریکا اور افریقا میں نسلی تعصبات، ہندوستان پاکستان میں ایمرجنسی، مذہبی جنونیت، پاکستان میں وقفے وقفے سے مارشل لا کا نفاذ، شخصی آزادی کی سلبی، نئے ورلڈ آرڈر کا نقارہ، نائن الیون کے بعد کی عالمی صورت حال نے ترجمے کے آفاق کو وسیع کیا۔

موجودہ نیا اختصاص کی دنیا ہے۔ ترجمے کو بھی اب تکنیکی عمل تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ برقیاتی اور انٹرنیٹ ترقی نے ترجمے پر اپنے مثبت تکنیکی اثرات ڈالے ہیں۔ اب مشینی طریقے سے سیکنڈوں میں ایک متن کو دوسرے لسانی متن میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اسی کی مثال ابھی چند سال قبل ہونے والی برقی اور مشینی ترجمے سے دی جا سکتی ہے۔ مجھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے ایک ایکوڈور (جنوبی امریکا) کے دوست کو مبارک باد کے لیے ''کارڈ'' بھجوانا تھا۔ اس کو انگریزی بہت کم آتی ہے۔ ہسپانوی زبان لکھنا میرے لیے ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ میں نے پہلے کمپیوٹر سے مبارک باد کا کاڈ منتخب کیا۔ انگریزی میں مبارک باد کے کلمات لکھے پھر ہسپانوی زبان میں ایک سیکنڈ میں اس کا ترجمہ ہوگیا۔ کمپیوٹر کی اسکرین (مانیٹر) پر مختلف زبانوں کے نام درج تھے اس میں زان کا انتخاب کر کے keyboard پر صرف Enter کا بٹن دبایا اور پلک جھپکتے ہی پورا متن انگریزی سے ہسپانوی زبان میں منتقل ہوگیا۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہوا کہ دنیا کی تقریباً ہر زبان ترجمے کے لیے موجود تھی مگر اردو کا نام کہیں نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بازار میں اب تو تراجم کے لیے ''ڈش'' بھی مل جاتی ہے۔

شروع کے دنوں میں جب اُردو ترجمہ کا زور ہوا تو لگتا تھا کہ ادبی سطح پر مترجم کی جگہ ادب میں اس طرح نہیں بن پائی جیسے شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس اور نقاد وغیرہ کو قدرے منفرد حیثیت سے دیکھا گیا لیکن ایک عرصے تک اردو میں مترجم ''منشی'' سے آگے نہ بڑھ سکا مگر بیسویں صدی میں اور اس کے بعد اردو ترجمے کی دنیا میں پڑھے لکھے اور مستحکم ذہن کے معروف ادیب وشعر نظر آتے ان لوگوں نے اردو میں بہترین ترجمے کیے۔ بعض نے منہ کا ذائقہ بدلنے یا کاروباری نقطہ نظر سے بھی تراجم کیے اور تراجم میں یہ لوگ زیادہ سنجیدہ نہیں تھے اور ترجمے کے فن کو ''دل لگی'' تصور کرتے تھے مگر بعد میں ترجمے کی اہمیت کو اردو میں جلد ہی سمجھ لیا گیا اور وقت نے دیکھا کہ یہ ترجمے اردو کا سرمایہ بنے۔ خاص طور پر پچھلی صدی میں مغرب و مشرق سے اردو میں بہترین ترجمے ہوئے یہ تمام ترجمے کے مشہور اور معروف ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ قدرے کم معروف لکھنے والوں نے کیے جن میں محمد حسین آزاد، سر عبدالقادر، عبدالحلیم شرر، ہادی رسوا، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، حسرت موہانی، ظفر علی خان، رتن ناتھ سرشار، مولوی عبد الحق، عزیز لکھنوی، ضامن کنستوری، غلام بھیک نیرنگ، تلوک چند محروم، منشی عنایت اللہ، نادر کوروی، حافظ محمود شیرانی، مخمور جالندھری، میراجی، منٹو، ن م راشد، علی سردار جعفری، احمد علی، فیض، اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، جمیل جالبی، مجنوں گورکھپوری، محمد احسن فاروقی، انتظار حسین، محمد ہادی حسین، محمد سلیم الرحمان، ابن انشا، فہیم اعظمی، رضیہ سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، کشور ناہید، انور زاہدی، منیر الدین احمد، اجمل کمال، ضمیر احمد، سید کاشف رضا، آصف فرخی، نگہت رضوی، محسن بھوپالی، حسن عابدی، حیدر جعفری سید، آشا پربھارت، ارمان نجمی کے نام ذہن میں آتے ہیں۔

اردو ادبی رسائل نے بھی ترجمے کے رجحان کو مستحکم بنانے میں مؤثر حصہ لیا۔ ایک زمانے میں ''دلگداز'' اور ''مخزن'' میں بڑے پائے کے تراجم شائع ہوتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی رسائل ماہ نو (لاہور)، ادب لطیف (لاہور) اور پھر ۸۰ء کے عشرے میں کراچی سے ''آج'' اور اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی کراچی کے ہی ایک کتابی سلسلے ''دنیا زاد'' میں بہترین ترجمے پڑھنے کو ملے جو کہ جدید ترین عالمی حسیت سے اردو سے روشناس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرواتے ہیں۔

یہ بات ہم جانتے ہیں کہ ترجمہ تحریری اور زبانی سطح پر ایک قدیم ترین انسانی مشق ہے اور ترجمہ ہی قاری کے لیے ممکنہ طور پر دیگر ثقافتوں کے بین ابلاغ کر پاتا ہے۔ جس میں قاری مرکوز طور پر ہیئتی متن کے سیاق کو پائے ہوئے سیاق کی تمام کی تمام وظائفیت مزاج (بیوپار) کی حرکیت کو اپنے اندر سمو لیتا ہے لہٰذا یہ نہ تصور کرلیا جائے کہ تمام تراجم کا سیاق معروضی ہوتا ہے مگر ترجمے کا فن اختصاصی نوعیت کا ہوتا ہے لیکن ترجمے کے مخاطبے (ڈسکورس) میں تصویر کچھ یوں بن جاتی ہے جو ترجمے کے ابلاغ کے تناظر میں پوشیدہ متنی ہیئت بھی ثابت ہوتی ہے۔

تشریح دعویٰ

متن کا اصل مقولہ

اظہار بیانیہ

بنیادی طور پر ترجمے کے نظریے کی چار سطحیں دریافت کی گئی ہیں۔

(۱) متن لسانی: (ہدف متن، دیگر متعلقہ متن)

(۲) ادراک کی سطح: مترجم کا فیصلہ اور منہاجیات)

(۳) عمرانیاتی سطح: (ترجمے کے عمل، ترجمے کے مقاصد، قاری سے انسلاک، اختتامیہ)

(۴) ثقافتی سطح: (نظریاتی عناصر، ثقافتی ارتقا، مضبوط (بہ قوت) انسلاکات)

در اختتامیہ

ہر زمانے میں ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے کیوں کہ نئے انکشاف، دریافتیں اور جدتِ حیات انھی کے سبب ممکن ہوتی ہے۔ اگر ادب زندگی کی صداقت پر یقین رکھتا ہے اور ادب کو ہی تنقید ذات اور نقدِ معاشرت گردانتا ہے تو ترجمہ بھی ادب کا ایسا نقد فراہم کرتا ہے جو دو تہذیبوں کا تقابل کر کے نئی حسیت کو جنم دے کر فرد کے شعور میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ ترجمہ تہذیب و تمدن کی علامت ہے۔ ادبی تراجم کے سہارے سے قاری اپنی تنگ و تاریک دنیا سے نکل کر دوسری فضا میں سانسیں لیتا ہے اور نئی جمالیات، حسیت، نئی معاشرتی اقدار اور تجربات سے اس کو شناسا بندی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنا پڑتی ہے۔ترجمے کا انسلاک ذہنی مزاج (رویّوں) سے متعلق ہوتا ہے۔مترجم ہی کا نہیں بل کہ قاری کے لیے بھی یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف تو ایک زبان کو خوش آمدید کہ رہا ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نئی زبان کے "غلبے" کو اپنے اوپر حاوی کر رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی مقامی زبان پر "قل" پڑھ رہا ہوتا ہے۔یوں زبان کی تقسیم کا احتمال بھی ہوتا ہے مگر ترجمے کے حوالے سے فرد کی جمالیات، حسیّت اور انسانی جذبات کو حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ترجمہ بعض دفعہ اسٹیبلشمنٹ کے لیے ناپسندیدہ بھی ہوتا ہے کیوں کہ ترجمہ فکری و ذہنی کشادگی سے عبارت ہوتا ہے۔ترجمہ ہو جانے کے بعد ترجمے کی تفہیم اور تشریح متن وقت کے ساتھ ساتھ نئی معنیات اور مفاہیم کے نئے گوشوں کی دریافت کا عمل بھی جاری رہتا ہے، جب ترجمہ معنیاتی دائرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی معنیاتی ہیئت، ہیئت اور نفس مضمون بھی اصل ترجمہ شدہ متن سے مختلف ہوتا ہے۔

اس مضمون میں آگہی کی آبلہ فریبی کو ادبی مخاطبے کی روشنی میں ادراک میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں تین عناصر اولین نوعیت کے ہوتے ہیں جو کہ ترجمے کی تفہیم کرتے ہیں۔

(۱) مصنف

(۲) متن

(۳) قاری

اور یہی تینوں عوامل ترجمے کی معنویت، معنیات اور نفس مضمون کی ماہیت کو متعین بھی کرتے ہیں۔

☆☆☆

(مشمولہ "سمبل"، راولپنڈی، جلد نمبر۲، شمارہ نمبر۳ تا۴، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کے بارے میں مختلف نظریے

(Theories of Translation)

خالد اقبال

ترجمہ زبانی اور تحریری انداز سے بہت قدیم فن چلا آ رہا ہے۔ ماضی سے اب تک فن ترجمہ نگاری کے طریقوں پر اختلاف کی وجہ سے مباحث جاری ہیں ان مباحث نے ترجمہ نگاری کے بارے میں مختلف نظریات کو جنم دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن ترجمہ نگاری کے حوالے سے کوئی ایک نظریہ قطعی نہیں ہے اور ہر جگہ کارآمد بھی نہیں۔

ابتدا میں ترجمہ نگاری کو غیر اہم، کم درجے کا کام تصور کیا گیا۔ اس لیے کہ اس کے بارے خیالات و نظریات بھی روایتی تھے جس طرح تہذیبیں اور اقوام عروج زوال کی منزلوں سے گزرتی ہیں اسی طرح علوم وفنون کا ورثہ بھی منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یونانی تہذیب جب عروج پر تھی تو یونانی علم، فلسفہ، حکمت دنیا کی دوسرے اقوام تک ترجمے کے وسیلے سے پہنچا اہل عرب کو جب ترقی نصیب ہوئی تو انہوں نے یونانی علوم سے استفادہ کیا بعینہٖ جب یورپین اقوام نے ترقی کی عربی زبان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کی زبانوں کے علوم، انگریزی، فرانسیسی، جرمن زبانوں میں ترجمہ کیے گئے۔

عہد بہ عہد ترجمے کا عمل جاری رہا مگر ترجمے کی کبھی تخلیقی اور کبھی "میکانکی" عمل کہا جاتا رہا۔ بیسویں صدی میں فن ترجمہ نگاری کے حوالے سے نیک فال ثابت ہوئی ہے اس صدی میں زندگی کے دیگر شعبوں، علوم وفنون میں تبدیلی، نظریات خیالات میں تبدیلی کے عمل نے فن ترجمہ نگاری کو ایک اہم اور قابل ذکر کام میں شمار کیا اس کی وجہ لسانیات کے بدلتے اور ترقی کرتے متنوع نظریات، ادبی تنقید میں تبدیلی، فلسفیانہ غور وفکر کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی نفسیاتی، ثقافتی محرکات بھی ہیں جنکی وجہ سے ترجمہ نگاری کے بارے میں تربیت، زبانوں کا مطالعہ، تخلیقی جوہر کی تلاش جیسے نکات پر زور دیا جانے لگا اور تراجم کا تجزیاتی مطالعہ کیا جانے لگا، تاہم فن ترجمہ نگاری کے حوالے سے ناقدین کی آراء میں اختلافی پہلو کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں اتفاقی خیالات و نظریات بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے فن ترجمہ کو جاننے سمجھنے میں قدرے آسانی بھی پیدا ہوتی ہے۔

محمد حسین آزاد کے خیال میں:

"ترجمہ اور تصانیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بنا جاتا ہے سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے اوصاف ولوازمات کا اس ایک لفظ سے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے وہ ہماری سطر بھر پورا نہیں ہوتا"(۱)

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ فی الحقیقت مشکل عمل ہے کیونکہ دوسری زبان کا لفظ کی تہہ تک پہنچنا از حد اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ ہر زبان کے الفاظ ہی اس کا سرمایہ ہوتے ہیں جو کہ اپنا مخصوص لسانی وثقافتی پس منظر رکھتے ہیں جن سے مکمل ادراک کے بغیر کامیاب ترجمہ ممکن نہیں ہوتا۔

انگریزی زبان میں ترجمہ نگاری اور اس کی عملی صورت کے حوالے سے سرد (Cicero) اور ہوریس (Horace) کے نام بہت اہم ہیں اگرچہ ترجمہ نگاری اور عملی پہلوؤں سے بحث بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہو چکی تھی لیکن بحیثیت مضمون یہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف (1950-2000) میں سامنے آیا۔ اس سے پہلے نفس زبان سیکھنے کے سلیبس کا ایک معمولی جز وتھا۔ اٹھارھویں صدی سے بیسویں صدی کے نصف تک گرائمر کی رو سے ترجمہ نگاری کا طریقہ کار، غالب رجحان رہا اور انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو یہ طریقہ یعنی (Translation Grammar) کا طریقہ کلاسیکل سنسکرت، فارسی، عربی اور اردو زبانوں کے لیے استعمال کیا۔ اس طریقہ کار میں گرائمر کے اصولوں اور دوسری زبان کی ساخت کو سمجھنے پر زور دیا گیا۔ اس سے بھی بیشتر لفظ بہ لفظ اور مفہوم سے مفہوم ترجمہ پر زور دیا جاتا رہا ہے مگر لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم بہ مفہوم (Sense to Sense) کے طریقہ کار کو فروغ ملا۔ 1950ء اور 1970ء میں انگریزی زبان کی تدریس میں ترجمہ نگاری کے لیے براہ راست (Direct method) یا ابلاغی طریقہ (Communicative Approach) متعارف ہوا۔ جس میں نئی زبان سیکھنے اور اس زبان کے ماحول اس کی صلاحیت کو جاننے کے لیے ہو بہو ترجمے کی ضرورت پر زور دیا جاتا رہا۔ ترجمہ نگاری کے ضمن میں امتیازی جائزہ (Contrastive Analysis) کا مضمون بعد میں متعارف کرایا گیا جس میں دوزبانوں کے مابین امتیازات کا مطالعہ کیا جاتا رہا ہے تاکہ ترجمے کے عمومی اور مخصوص اختلافات کی نشاندہی کی جاسکے(۲)

سترہویں صدی میں انگلستان میں "Dehnahm"، کاؤلے (Cowley) اور ڈرائیڈن نے ترجمہ نگاری کے نظریے بارے اہم پیش قدمی کی۔ ڈرائیڈن (Dryden) نے ترجمے کو تین درجوں میں تقسیم کیا جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارے میں بی۔ جے کمار لکھتے ہیں۔

It was John Dryden, who in his prefece of Ovid's Epistress (1680) underlined three basic types of translation .

i. Metaphrase, or turning and author word by word and line by line, from one lanjuage in to another.

ii. Paraphrase, or translation with latitude, the caceronian, sense-for sense, view of translation.

iii. Imitation, where the translator can abandon the text of the original as he sees fit.

(۱)۔Metaphrase

یعنی ایسا ترجمہ جو لفظ بہ لفظ ہو یا عبارت کے اعتبار سے مطابقت رکھتا ہو۔ یعنی اس کا تعلق ہو بہو ترجمہ سے بنتا ہے۔

(۲) Paraphrase

یعنی الفاظ میں ترجمہ کرنے کا عمل جس میں مترجم، مصنف کو ذہن میں رکھ کر ترجمہ کرے، گویا الفاظ اپنے ہوں مگر مفہوم تبدیل نہ ہو۔

(۳) Imitation

ترجمہ کی ایسی کوشش جس میں لفظ اور مفہوم دونوں کو چھوڑ کر ترجمہ کیا جائے۔

برطانیہ میں انیسویں اور بیسویں صدی میں T.Language کی صورت (Form) اور S.Language کی تحریر کے درجہ (Status) پر توجہ مرکوز کی گئی اس حوالے سے ہومر (Homer) کے ترجمے پر میتھیو آرنلڈ (Mathew Arnold) اور Francis Newman کے درمیان اختلاف بھی رہا۔ نیومین (Newman) نے فرسودہ ترجمہ کے ذریعے کام کی اجنبیت Foreigness پر زور دیا ہے۔ جس کی Mathew Arnold نے شدید مخالفت کی۔

مترجم میتھیو آرنلڈ نے ہومر کے ترجمہ کے حوالے سے ایک لیکچر میں کہا ہے (1822-1888)

let not the translator, then trust his notions of what the accient Greeks would have thought of him, he will lose

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

himself in the vgue. Let him not trust to what the ordinory Englishh reader thinks of him. He will be taking the blind for the guide. Let hin not trust to his own judgement of his own work. He may be missed by individual capsties. Let who both know Greek and can apreciate poetry. (3)

میتھیو آرنلڈ شفاف ترجمہ کے طریقہ کار کی حمایت کرتا اور ایسے مترجم پر اعتماد کرنے پر زور دیتا ہے جو T.T Target Translation کا Source Translation پر اثرات کے موازنے کی قابلیت رکھتا ہو۔

فن ترجمہ نگاری کے حوالے سے لسانیات کا رشتہ 1950ء اور 1960ء میں جڑتا دکھائی دیتا ہے اور اس دوران ترجمہ نگاری کے نظریات اور اصول وضع ہوئے۔

Peter, Newmark, J.C Catfor, Teodor Savory George Stener, Eugene Nida اس ضمن میں اہم نظریہ سازوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

Savory (1957ء) میں اپنی کتاب "The Art of Translation" میں لکھتے ہیں:

"Translation should be able to pass itself of as an original and show all the freshness of an orginal composition " (4)

گویا ترجمہ کچھ اس طرح سے ہونا چاہیے کہ وہ اصل متن کے قریب قریب اور اس میں اصل متن کی سی تازگی برقرار رہنی چاہیے۔

Savory نے ترجمہ نگاری کے سلسلے میں مختلف نظریات رکھنے والے نظریہ سازوں (Theoritcians) کے حوالے سے رائے کچھ یوں اخذ کی ہے۔

o- A Translation must give the words of the original.

ترجمے میں اصل کا سا انداز ہونا چاہیے۔

o. A Translation must give the ideas of the original.

ترجمے میں اصل زبان کے نظریات کی مکمل ترسیل ہو

o- A Translation should read like an original work.

ترجمہ ایسا لگے کہ گویا طبع زاد تحریر ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

o- A Translation should like a Translation

ترجمہ ترجمہ ہی ہونا چاہیے

o- A Translation should reflect the style of the original

ترجمے میں اصل متن کا اسلوب نگارش بھی ہونا چاہیے

o- A Translation should prosess the style of the translator

ترجمے میں مترجم کا انداز بھی جھلکنا چاہیے

o- A Translation should read as a contemporary of the original

ترجمہ ایسا ہو کہ وہ لگے کہ وہ اسی دور میں ہوا ہے جس دور میں اصل کتاب لکھی گئی

o- A Translation never read as contemporary of the translator

ترجمے کو ایسا نہیں لگنا چاہیے کہ ترجمہ نگار کے دور کے اثرات نظر آئیں۔

o- A Translation of verse should be in prose

شعر کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔

o- A Translation of verse should be in verse

شعر کا ترجمہ شعر میں ہی ہونا چاہیے۔

فن ترجمہ کے حوالے سے مختلف آراء میں جس بات پر زیادہ اتفاق ہے وہ ہے متن (Text) کی اصلیت کا بہر طور برقرار رہنا۔ یا یہ کہ ترجمہ طبع زاد ہو، ترجمے میں اصل زبان کے نظریات کی ترسیل بھی ضروری عمل ہے۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ ترجمہ شعر کا شعر کی صورت میں ہو یا نثری پیرائیہ اظہار ہو۔

اگرچہ ترجمہ نگاری کے موضوع پر مبنی تحریروں میں بڑا مسئلہ "Judgement" یعنی معیار کا رہا ہے جو کہ مبہم، ذاتی اور انفرادی ہے۔ انہی وجوہات کے ردعمل میں بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں فن ترجمہ میں لفظ بہ لفظ اور آزاد ترجمہ کے اصولوں کو از سر نو واضح کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔

رومن جیکوبسن Roman Jakobson کا مضمون On linguistic aspects of Translation نے ترجمہ نگاری کو لسانیات کی روشنی میں دیکھتے ہوئے تین بنیادی نکات واضح کیے ہیں: (۵)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

o- Intralingual translation

جس کا مطلب ہے لفظی علامتوں کو لفظی علامتوں کے متبادل کے طور پر ترجمہ ہونے والی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

o- Interlingual Translation

جس کے معنی ایک زبان کے مطلب کو دوسری زبان میں تشریح یا آزاد ترجمہ کی صورت کیا جائے۔

o- Interremiotic Translation

یعنی کسی زبان کے لفظی مطالب کو دوسری زبان کے غیر لفظی یا علامتی طور پر مطالب بیان کرنا۔

رومن جیکبسن معنی اور مساوات(Meaning & Equivalence) کے ساتھ ساتھ زبان کے فطری لسانی مفہوم(Nature of Linguistic) کو بھی اہم سمجھتا ہے۔

چامسکی (Chomsky) نے ترجمہ نگاری اور جدید لسانیات کی رو سے اپنا نظریہ پیش کیا جسے "Translation Genrative Theory" کہا جاتا ہے۔ جس نے لسانیات اور ترجمے کے لسانی نظریئے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

> "Kernel sentences; which are simple activce, declaration sedntences that require the minimum of transformation,' Kernel sentences' are the level at which the message is transfered into the recepter language before being transformed into the surface structure in three stages; Literal transfer; Minimal transfer and literary transfer; (6)

ان کے پیش کردہ نظریئے کے تین اہم نکات کچھ یوں ہیں۔

(۱) Pharase ساختیاتی اصول(Structure rule) اندرونی (Deep Structure) کو جنم دیتا ہے۔

(۲)۔ جب Deep Structure یعنی اندرونی ساخت ٹرانسفارمیشنل قوانین کے ذریعے تبدیل ہوتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔اصل الفاظ سادہ میں پیش کیے جانے چاہیے۔جو اصل کہا گیا ہو اس کی اساس بنا کر ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ترجمے کے تین درجے ہوتے ہیں لفظی ترجمہ،کم سے کم ترسیل یا ادبی ترسیل۔

(۳)۔ حتمی (Final Surface structure) جو بذات خود صوتی Phonological اور Morphemic اصول سے متعلق ہے۔چامسکی نے جو نظریہ متعارف کرایا ہے اس میں ساختیاتی تعلقات (Structure Relation) بتائے گئے ہیں انہیں چامسکی نے انسانی زبان کا عالمی خاصہ (Universal Feature) کہا ہے۔

چامسکی کے خیال کے مطابق (Structure) کی بنیاد (Kernel Sentences) جنی بنیادی ضرورتیں ہیں جو سادہ،متحرک اور بیانیہ جملے ہیں جنھیں کم سے کم تبدیلی (Transforomation) کی ضرورت ہوتی ہے۔چامسکی کے مطابق Kernal یعنی ضروری جملے وہ درجہ ہیں۔جس پر پیغام کو ظاہری یا سطحی ساخت (Structurel) کے تین درجوں یعنی

(۱) مفہوم کی ہو بہو تبدیلی (Leteral transfer)

(۲) معمولی تبدیلی (Miimal Transfer)

(۳) ادبی تبدیلی (Literary Transfer) میں تبدیل ہونے سے پہلے (Recepter) یعنی پیغام وصول کرنے والے کی زبان میں تبدیل ہونا ہوتا ہے۔

ندا کی Translation theory اس کے اپنے عملی کام سے واضح ہوئی جب وہ بائبل کا ترجمہ کر رہا تھا اس کی منظم اپروچ میں نظریاتی پہلو اور اصطلاحات کے ساتھ ساتھ نیوم چامسکی کے نظریئے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔

ندا نے بہت سی سائنسی توجیہات کو بھی بیان کیا ہے جس کو فن ترجمہ نگاری کے نظریہ سازوں نے Semantics (معنویات) اور Pragmatics (زبان کا گرائمر سے تعلق) میں عملی طور پر استعمال کیا ہے۔اس نے چامسکی کی ماڈل کے اہم فیچرز کو اپنے نظریئے کی سائنس میں ضم کیا ہے ندا ئے ترجمہ نگاری کے ضمن میں تین نکات بیان کیے ہیں۔

1. The source text reduced to its kernels.

یعنی اصل متن کی روح

2. The meaning of the S. Language gets transfered to the. T Language and.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ اس انداز کا ہو کہ ترجمہ ہونے زبان میں اس کے مطالب بیان ہو جائیں۔

3. The generation of the stylistically and semantically equivalent expression in the T. Language takes place.

جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہو اس کا انداز خوبصورت اور بلیغ ہو جبکہ ندائے ترجمہ نگاری کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

رسمی مساویت/ترجمہ 1.Formal

2. Dynamic (روان ترجمہ)

Equivalence

Fromal Equivalenc سے Gloss Translation بھی کہا جاتا ہے جس میں مترجم کوشش کرتا ہے کہ (Literally) یعنی ہو بہو اور بامعنی ضرورت ہو۔ گویا مترجم، متن (Text) کی ہیئت Form اور (Contant) کا ہر صورت میں خیال رکھے۔

جبکہ Dynamic Equivalence کے سلسلے میں متن (Text) کا حقیقی تاثر (Complete Naturalness) اہم مقصد ہوتا ہے اس حوالے سے ندا نے اپنے نظریہ ترجمہ نگاری کے ضمن چار اہم باتیں بیان کی ہیں۔

1. Making Sense تفہیم

2. Having a Natural and easy form of expression.

3. Conveying the spirit and manner of the original

اصل روح اور اسلوب کی ترسیل

4. Producing a similar response in T. Language.

جس زبان میں ترجمہ ہو رہا ہو اس میں مطلب واضح ہو۔

ندا نے ترجمہ نگاری میں Receptor based یعنی پیغام وصول کرنے والے کی دلچسپی کو بھی متعارف کرایا ہے۔ ندا کے پیش کردہ ماڈل کا خاکہ ملاحظہ ہو: (۷)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Source Language	Recepto Language
Text	Translation
Anaylsis	Restructuring
Transfer	

نیو مارک(New Mark) 1981ء

نیو مارک کے فن ترجمہ نگاری کے مطابق S. Language اور Target Tanguage کے مابین ہمیشہ خلا رہے گا جو ترجمہ نگاری کے عملی پہلو کے حوالے سے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ نیو مارک Semantic یعنی معنویات اور Communivcative یعنی ابلاغی ترجمہ کے ساتھ پرانی اصطلاح کو Replace مطلب ختم کرکے اس خلا کو کم کرنے کی تجویز دیتا ہے۔

> "Communicative translation attempts to produce on its reader's an effect as close as possible to that obtained on the reader's of the original, Sementic translation attempts to sender, as closely as the sementic and syntac structures of the second language allow the exact contextual meaning of the original" . (8)

ابلاغی ترجمہ وہ ہوگا کہ قارئین مکمل طور پر مفاہیم کا ادراک کر سکیں۔ Communivative ابلاغی ترجے کا مقصد قارئین پر تقریباً ہو بہو یا ملتے جلتے اثرات مرتب کرنا ہے جتنا کہ اصل تحریر کے قارئین پر ہوتا ہے۔ نیو مارک اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ Semantic ترجمہ نگاری ہو بہو ترجے سے مختلف ہے کیونکہ اس میں Context Situation یعنی حالات کا خیال رکھا جاتا ہے اور وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ تلمیح اور استعارہ کی بھی تشریح کی جاتی ہے جبکہ ہو بہو ترجمہ یعنی لفظ بہ لفظ تشریح میں لفظوں اور ان کی ترتیب پر زور دیا جاتا ہے۔

ہو بہو ترجمہ Leteral Translation کو "Semantic" اور Communicative (ابلاغی) ترجے کے لیے بہترین نظریہ سمجھا گیا ہے نیو مارک کے مطابق لفظ بہ لفظ ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ صرف بہتر بلکہ ترجمہ کا جائز طریقہ ہے۔

پیٹر نیو مارک (Petter Newmark) نے اپنی کتاب 'Approaches to Translation" میں بتایا ہے کہ ادبی ترجمے کی اہمیت اس کی رسمی عناصر میں ہے اور غیر ادبی ترجمے کی اہمیت اس کے حقیقی، واقعاتی Content میں ہے۔ بیسویں صدی کے نصف میں ہی فن ترجمہ نگاری میں تبدیل عمل (Shift Approach) کا نظریہ متعارف کرایا گیا۔ جسے دو فرانسیسی نظریہ سازوں اور ماہرین لسانیات نے واضح کیا۔ جن کے نام ونی (Viny) اور ڈاربلنٹ Darblnet ہیں۔ جسے وہ براہ راست ترجمہ یعنی Direct Translation اور مبہم ترجمہ (Oblque Translation) کا نام دیتے ہیں ان دونوں حکمت عملیوں کے لیے انہوں نے سات طریق کار جتلائے ہیں جن میں تین براہ راست Direct Translation کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ سات طریقہ ہائے کار حسب ذیل ہیں: (۹)

۱۔	Borrowing	مستعار
۲۔	Calque	الفاظ مستعار کرنے کی خاص قسم
۳۔	Literal Translation	لفظ بہ لفظ ترجمہ
۴۔	Transposition	متبادل لفظ کی ترسیل
۵۔	Modulation	ترجمہ کرتے وقت پیغام میں ترمیم
۶۔	Equivalence	مساوی یا ہم پلہ
۷۔	Adaptation	حالات کے مطابق ڈھالنا

جرمن فلاسفر، مترجم، کیٹ فورڈ (Catford) (1744-1803) نے ترجمہ نگاری کے ضمن میں اپنے نظریے کی بنیاد تقابلی لسانیات پر رکھی ہے اس کتاب "A-Linguistic Theory of Translation" ترجمہ نگاری کے عمل میں تجزیے اور بیانیہ سے متعلق ہے۔ کیٹ فورڈ لکھتے ہیں:

> "It is necessary for translation theory
> to draw upon a theory of meaning
> without such a theory certain aspects
> of translation forcess cannot be

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

discussed" (10)

ترجمہ کے تصور کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ مطالب کو بھی سامنے رکھا جائے اور اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو ترجمے کے کچھ پہلو تشنہ رہ جائیں گے۔

کیٹ فورڈ نے ترجمہ کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا ہے مثلاً

Full Translation

Partial Translation

Total Translation

Restricted Translation

Rank-bound Translation

Rank free Translation

کیٹ فورڈ کے مطابق:

> "Translation is replacement of textual material in the source language by and equivalent textual material in the target language. What happens in translation is not the transference of S.D meaning into T.L, But a sustitution T.L meaning for S.L meaning" (11)

جدید ترجمہ نگاری کے ضمن میں 1970ء، 1980ء اور 1990ء کی دہائیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں جن میں کسی زبان کا لسانی مطالعہ اور بعد میں متن کی اہمیت کو جاننے کے لیے زبان کی ساخت، ثقافتی بنیادوں تک رسائی کے علاوہ دیگر کئی محرکات شامل ہو گئے۔

Itamar Even Zohar نے 1970ء میں "Poly system theory" کی بنیاد رکھی جسے کے بارے کرتے ہیں:

> " Register, or context of situation as it

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

is formally termd, is the set of meanings, the configuration of semantic Patterns that are typically drawn upon under the specific conditions, along with the words and structures that are used in the realization of these meanings" (14)

Halliday, 1978.

ہالیڈے کے نظریہ ترجمہ کے مطابق سب سے پہلی چیز سانچا ہے جو تین معتدل (Veriable) میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ذیل میں دیے گئے اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۱) Field: یعنی جو کچھ کسی کے بارے میں لکھا گیا ہو مثلاً ادائیگی (Deliver)

(۲) Jenor: جس کا مطلب ہے جو بات کہی جا رہی ہے یا جو بات کو آگے ابلاغی سطح پر پہنچائے جس طرح ایک دکاندار اپنے گاہک سے بات کرتا ہے۔

(۳) Mode: جس کا مطلب ہے ذریعہ اصوت، جس سے ابلاغ کیا جائے مثلاً تحریر ہر سانچے کے تغیر (Veriable) اپنے معنی (Meaning) کے سلسلے سے جڑا ہوتا ہے کسی تحریر کے معیار کے یہ اجزاء باہم ملکر Discourse Semantics کو واضح کرتے ہیں۔ جس کی تین Meta-Functions ہیں۔

(i) Additional Meanings یعنی ایک تحریر کے Field کا تعلق Additional meaning سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔

(ii) Interpersonal Meanings یعنی ایک تحریر کے Tenor کا تعلق Interpersonal Meaning کہلاتا ہے۔

(iii) Textual Meanings کسی تحریر کے Mode کا تعلق معنی متن کہلاتا ہے۔

کرسٹوفر نورس (Cristopher Norris) نے اپنی کتاب "Deconstruction" میں ترجمہ نگاری کے عملی نظریے کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

" Deconstruction works at..... giddy limit suspending all that we take for granted about language experience

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

and the normal Possibilities of human Communication". (15)

De-Construction کے معنی کچھ یوں بنتے ہیں کہ لٹریچر یا فلاسفی کی زبان کا خاص طور پر اس لیے جائزہ لیا جائے کہ اس کے اجزاء کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی نہیں۔ یوں ڈی کنسٹرکشن نے لسانیات کی اہم حدود میں سے کچھ کو تقسیم کر کے ٹکڑوں میں دیکھنا شروع کیا ہے۔

آندرے لیفیور Andre Lefever نے فن ترجمہ نگاری میں تاریخی اور ثقافتی نظریئے کو اجاگر کیا ہے ۔ترجمہ بہ طرز تخلیق نو کا احیاء ایک طرح سے عمل ضابطہ بندی (System theory) کے طور پر روشناس کرایا گیا جس کا سہرا آندرلیفیور (Andre Lefever) کے سر ہے۔ جبکہ انہوں نے فن ترجمہ نگاری میں لسانیاتی پہلوؤں کو رد کیا ہے۔ وہ لفظ سے متن (Text) کے تناظر میں اپنی بات پر زور دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس بات کو بھی رد کرتے ہیں کہ زبان کے عمل میں پس پردہ کیا ہے؟ نہ صرف یہ بلکہ وہ اصل (Original) اور ترجمہ (Translation) کے مابین موازنے کے عمل کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ فن ترجمہ نگاری میں ثقافتی جہتوں کو سامنے لانے کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ (Culture) ثقافت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ادب کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔

آندرے لیفیور (Andre-Lefevere) جنہوں نے ادب کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں یونیورسٹی آف ٹیکساس (آسٹن) امریکہ میں کام کیا ہے۔ ان کا نظریہ (Polysystem theory) سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ تاہم اس کے نظریات فن ترجمہ نگاری کے سلسلے میں ثقافتی جہتوں کی عمدہ نمائندگی کرتے ہیں۔ جو کہ اس کتاب "Translation, Rewriting and the manipulation of literary fame" (1992) میں سامنے آئے ہیں۔

آندرے لیفیور Andre Lefeverre کا کہنا ہے کہ ٹھوس حقائق کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ جن کا تعلق ادبی متن (Literery Text) کی مقبولیت یا اس کو رد کر دینے سے ہے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ادبی ترجمے کا اثر عام قاری پر کیسا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں وہ Edward Fitzerald کی مثال دیتا ہے۔ جس نے انیسویں صدی میں عمر خیام کی فارسی شاعری کا ترجمہ یا "تخلیق نو" کا کام کیا۔ Fitzerlad نے ترجمے میں جس طرح سے آزادانہ انداز اختیار کیا ہے۔ آندرے لیفیور کے خیال میں ترجمہ کرتے وقت اس سے کہیں زیادہ آزادی لینی چاہیے تا کہ اصل (Original) کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔ آندرے لیفیور (Andre Lefevere) اس بات پر زور دیتا ہے کہ ترجمہ تخلیق نو کا عمل ہے۔ اور ترجمے کا یہی پہلو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس سے ایک مصنف کا تاثر بہتر بنتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"The Heuristic model a system approach to literature makes use of, rests on the following assumptions (a) Literature is a system, embedded in the environment of a Culture or society. It is a contrived system, i.e, it consists of both objects (texts) and people who write, relact, distribute, read those texts. It is as stochastiv system, i.e, one that is relatively iterminte and only dmits of predictions that have a certain degree of probability, without being absolute. It is possible (and general system theory has don this) as have some others who have been trying to apply a system in an abstract. (16)

آندرے لیفور (Andre lefevere) نے (Literary system) کو تین بڑے عناصر میں تقسیم کیا ہے

۔

1. Professional within the literary system
2. Patronage outside the literary System
3. The Prominant poetics

o۔ پہلے عنصر (Facotr) سے مراد ترجے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے والے تبصرہ نگار، مترجمین اور اساتذہ ہوتے ہیں جس کی مثال Fizgerald کے عمر خیام کے تراجم ہیں جن کے اندر شعریت بھی اور حقیقت پسندی بھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

o- Prominant outside the literary system سے مراد ایسی خارجی طاقتیں یا عناصر ہیں (لوگ، افراد، رسالے، پبلشرز) جو ترجمے کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں کہ ترجمہ کیسا ہو؟

o- Prominant Poctics اس عنصر (Factor) سے مراد ادب / شاعری معاشرے کیساتھ تعلق ہے۔ اور مختلف زبانوں کے ادب کے تقابلی مطالعہ (Poly system) کہلاتا ہے۔ جس میں شاعری کو پرکھنے جانچنے کے لیے مختلف کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بعض ادبی کتابیں Classic کلاسک کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں جنہیں بار بار خرید اپڑھا جاتا ہے۔ کیونکہ شعریت ہر حال میں شعریت رہتی ہے۔ اس کا تعلق جغرافیے کے ساتھ ساتھ نظریات سے بھی ہوتا ہے۔

حوالے

۱۔ آزاد، محمد حسین "آب حیات" آزاد بک ڈپو، لاہور، ۱۹۲۹ء ص:۱۶

2. Bijay Kumar Das, " A Hand book of Translation, Atlantic, Publishers, & Distributors, B-2, Vishal Enclave, Opp Raousi Garrden, New Dehli, P- 104.

3. Arnold Mathew, Extract, "On Translating Hooner, " Translation History/culture, Edited by Andre, Lefevere, Published 1992, by Routledge, 11 New Fetter Lane, London, Page: 68.

4. Teore, Savaory, the Art of Translation Londoe Cape, 1957, P: 156.

5. Roman Jokobson, " Onl Linguistic Aspects of Translation," Ed. R.A Drovert (New York, oxford University press, 1968, P: 233.

6. Mohammad Ahmed, (Quoted), "Translation theory and Practic, M.Phil Thesis, Department of English B.Z.U Multan, 2004, P: 28.

7. Nida, Eugen, "A Toward a Science of Translating Leiden: E.J. Brill, 1969, P-68.

8. New-mark, Peter, "Approches to Translation, Pregamon Press, Ltd Hedington, Hill Hall, oxford, OX3 Obw, England,

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

P-7.

9. Jean-Paul Vinay & Jean Dabelnet, A Methodology of Translation, Published 1992 by Routledge 11 New Fetter Land London page: 84 to 93.

10. J.C. Catford, "A Linguistic theory of Translation, London, Oxford University Press 1965 P-7.

11. Ibid.

12. Intmar-Even-Zohar, "The position of translated literature within the literary polysystem, poetics today (1990) 45-51, Reprinted by the permission of the Author in the Translation studies Reder, Edited by Lawrence venuti, London & New York by Routiedge, 200 P P-193.

13. Ezra Pound, www Nitro PDF com P.87

14. Halliday, WIP: 11 www.google.com

15. Mohammad Ahmed, (Qouted), "Translation theory and Practic, M.Phil thesis, Department of English B.Z.U Multan, 2004, P: 45-46.

16. Andre Lefevere, "Mother Courage's Cucumbers Tex, system and refraction in a

theory of literature. Publised" The translation studies reader, Edited by lawsence venuti, 2000, New Fetter lame, London, P: 235.

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منظوم ترجمے کا عمل

ڈاکٹر عنوان چشتی

ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیل خیال اور انتقال فکر کا عمل ہے۔ اس عمل کے چار واضح مدارج ہیں جنہیں:

۱۔ انتخاب متن

۲۔ ابلاغ کی منزل

۳۔ ترسیل کا فن.... اور

۴۔ نئی مگر "پرانی تخلیق"

کا نام دیا جا سکتا ہے۔

انتخاب متن کی منزل میں مترجم آزاد ہوتا ہے اور بہت سی کتابوں میں سے اپنی پسند کی ایک کتاب کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس انتخاب میں شعور اور ذوق اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انتخاب متن کے بعد مترجم پابند ہو جاتا ہے۔ یہ پابندی اس سے دہری وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ پہلی وفاداری متن کے ابلاغ سے اور دوسری اس کی ترسیل سے ہوتی ہے۔ انتخاب متن سے پہلے مترجم کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس کی ادبی فنی، سماجی اور جمالیاتی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ ہو جائے کسی فن پارہ کی قدر و قیمت کا عرفان مترجم میں ذمہ داری، دیانت، خلوص اور محبت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

انتخاب متن کے بعد فن پارہ کے مطالعہ اور اس کے ابلاغ (Comprehension) کی منزل آتی ہے۔ ابلاغ کا نقطۂ آغاز وہ لمحہ ہے جب مترجم قاری کی حیثیت سے اس کا مطالعہ شروع کرتا ہے اور عمل کا لمحۂ آخر وہ لمحہ ہے جب قاری زیر مطالعہ فن پارے کے مفہوم یا مفاہیم کو پوری طرح سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ مصنف کی مجرد آگہی، خیال، فکر، جذبہ یا نقطۂ نظر کو الفاظ کے ذریعہ قاری کے ذہن میں جلوہ گر ہونے کو ابلاغ کہتے ہیں۔ مختصراً یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ مصنف کے مرکزی خیال کو قاری کے ذہن میں جلوہ گر ہونے کو ابلاغ کہتے ہیں۔اس طرح یہ وہ عمل ہے جو کسی فن پارہ کو پڑھ کر یا مخاطب کی بات یا شعر سن کر قاری یا سامع کے ذہن میں واقع ہوتا ہے اس عمل کی دو سطحیں ہیں۔پہلی نفسیاتی اور دوسری لسانیاتی ،نفسیاتی سطح وہ سطح ہے جس پر شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی قوتیں فطری اصولوں کے مطابق سرگرم ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے پُر اسرار اشتراک عمل کرتی ہیں۔لسانیاتی سطح وہ سطح ہے جہاں الفاظ اور ان کی مختلف شکلیں اپنی گرہیں کھولتی اور معانی کا انکشاف کرتی ہیں۔یہ دونوں عمل ایک ساتھ رونما ہوتے ہیں اور ایک دوسرے میں پیوست بلکہ تحلیل ہوتے ہیں۔ابلاغ کی دونوں سطحوں کا سچا تال میل قاری کو مصنف کے اصل اور بنیادی خیال تک پہنچاتا ہے۔

ابلاغ ایک فطری عمل ہے۔دوسرے فطری کاموں کی طرح یہ عمل بیک وقت وہبی بھی ہے اور اکتسابی بھی اس کا انحصار ایک طرف عمر، تعلیم اور تجربہ پر اور دوسری طرف محنت، ذہانت اور مزاجی کیفیت پر ہے۔چونکہ انسان کا ذہن ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتا، اس لیے ایک ہی فن پارے کا ابلاغ ایک ہی شخص کو مختلف اوقات میں مختلف ہوتا ہے۔ایک ہی وقت میں مختلف لوگوں کو مختلف ابلاغ بھی ہوتا ہے۔چونکہ تمام افراد کی ذہنی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی اس لیے ابلاغ بھی یکساں نہیں ہوتا۔ابلاغ، زماں و مکان اور افراد کے تعلق سے اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے اشعار کا مفہوم تمام قارئین کے ذہن میں یکساں نہیں ہے۔منظوم ترجموں کے دائرہ میں ابلاغ کے اختلاف کی مثال لارڈ لٹن کی نظم "نابینا پھول والی" کے ترجمے ہیں مولانا محمد حسین آزاد کے ترجمے "نابینا پھول والی کا گیت" سید محمد ابراہیم اشکؔ کے "اندھی پھول والی کا گیت" سرور جہاں آبادی کے منظوم ترجمے۔"اندھی پھول والی کے گیت"۔

سید مہدی حسن لکھنوی کے "اندھی پھول والی کے گیت" رشک بلند شہری کے "اندھی پھول والی کا گیت" اور سائل دہلوی کے ترجمے۔"پھولوں کی تعریف میں" نمایاں اختلافات ہیں۔مثال کے طور پر ان منظوم ترجموں کا ایک ایک ابتدائی شعر پیش کیا جاتا ہے:۔

لوگو میرے پھول خریدو۔کہتی ہوں عجز سے پھول خریدو (آزاد)

میں پھول بیچنے لائی ہوں پری زادو (سید محمد ابراہیم اشکؔ)
بن آنکھوں والی سے ان کو نجات دلوادو

لوگو چلو مرے دل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو (سرور جہاں آبادی)

گود میں مالن کے ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول (احسن لکھنوی)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خریدو پھول میرے لینے والو

ذرا ان کی بہاروں کا مزہ لو (اشکؔ بلند شہری)

باغباں کی جائے جس کے دونوں دیدے ہیں چشم

گھر سے نکلی پھول لے کر بیچنے بازار میں (سائلؔ دہلوی)

ان اشعار میں ابلاغ کے اختلاف سے شعری زبان، تکنیک، اسلوب اور بحر و وزن کی تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں۔ آزادؔ عجز سے پھول خریدو کی صدا لگاتے ہیں۔ سید محمد ابراہیم اشکؔ پری زادوں کو مخاطب کر کے بن آنکھوں والی سے پھولوں کی نجات دلوانے کی گذارش کرتے ہیں سرورؔ جہاں آبادی پھولوں کے سودے کو گلِ رعنا قرار دے کر گاہکوں کو متوجہ کرتے ہیں احسنؔ لکھنوی اندھی بیچنے والی کے دامن ڈالی کے ٹوٹے ہوئے تازہ پھولوں کو دکھا کر للچاتے ہیں۔ اشکؔ بلند شہری پھولوں سے بہاروں کا مزہ لوٹنے کی خوشخبری سناتے ہیں اور سائلؔ دہلوی محض کوسنے لگتے ہیں۔ بظاہر ان تمام شعروں میں اندھی پھول والی پھول بیچنے کی صدا لگاتی ہے مگر ہر شاعر کے صدا لگانے کا انداز الگ ہے۔ یہ اختلاف بے وجہ نہیں ہے بلکہ ابلاغ کے اختلاف سے وابستہ ہے اس لیے ابلاغ کی مختلف سطحیں اور پرتیں ہوتی ہیں۔

ابلاغ کی بعض بنیادی ضرورتوں کو پورا کر کے اس کے مسائل کو بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے ان میں پہلی ضرورت مصنف کے بارے میں باخبری ہے مترجم کے لیے مصنف کے فلسفۂ حیات، طرزِ احساس، علمی لیاقت، نفسیاتی کیفیت اور اس کے فنی طریقۂ کار سے واقفیت ضروری ہے۔ چونکہ ہر مصنف موضوع اور مواد کو اپنے طور پر برتنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے اس کی تصنیف کے الفاظ، تراکیب، محاورات، استعاروں، پیکروں، علامتوں اور اساطیر وغیرہ کو مصنف کے فکر و فن کی روشنی میں سمجھنا چاہیے دوسری ضرورت مصنف کے عہد کا رازداں ہونا ہے۔ ہر تخلیق خواہ کتنی ہی ذاتی اور انفرادی ہو، اپنے عہد کی معاشی، تہذیبی، سیاسی، ادبی، تعلیمی اور فنی عمل اور ردِ عمل سے وابستہ ہوتی اور اس سے نمو پاتی ہے اس میں رُوحِ عصر یا تاریخیت کی کسی نہ کسی حد تک جلوہ گری ہوتی ہے اس لیے مصنف کی شخصیت کے ساتھ اس کے عہد کی روایات، تحریکات، اقدار اور سماجی پس منظر سے آگاہی ضرور ہے۔ تیسری ضرورت اس زبان کی تاریخ سے واقفیت ہے جس سے ترجمہ کرتا ہے اور جس میں ترجمہ کرنا ہے۔ ہر لفظ کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ اس کا املا، تلفظ، محلِ استعمال اور معانی و تلازمات بدلتے رہتے ہیں اس لیے ان تمام تبدیلیوں کا رمز شناس ہونا ضروری ہے۔ چونکہ ابلاغ کا عمل زبان شناسی کے لمحۂ اوّل سے شروع ہوتا ہے اس لیے اصل فن پارے کی زبان پر قدرت ہونی چاہیے اس کی گرامر، ساخت اور صوتیات سے واقفیت ہونی چاہیے۔ اس زبان کی نمایاں تکنیکوں، ہئیتوں اور اسالیب کا شعور ہونا بھی لازم ہے۔ مترجم کے لیے اس طرح کے تمام اسرار و رموز سے واقفیت ضروری ہے۔ جن کا تعلق زبان اور علم سے ہوتا ہے۔ چوتھی ضرورت مترجم کے ذہنی افق کا وسیع ہونا ہے۔ مترجم کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری ہے کہ وہ جس کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے اس کے موضوع پر حاوی ہو اور موضوع سے متعلق ثانوی چیزوں کا علم رکھتا ہو ان ضرورتوں کو پورا کیے بغیر مترجم کے ذہن میں مصنف کے اصل خیال کا مکمل ابلاغ نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ابتدائی ترجموں نے ان ضرورتوں کا پوری طرح لحاظ نہیں کیا اس لیے ان کے اکثر منظوم ترجمے بے رُوح اور اصل سے دور ہیں۔ ان میں مصنف کے بنیادی خیال نے شعری پیکر اختیار نہیں بلکہ وہ جداگانہ نظمیں معلوم ہوتی ہیں محمد حسین آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبرالہ آبادی، دتاتریہ کیفی اور دوسرے بہت سے شاعروں کے منظوم ترجمے ناقص یا نامکمل ابلاغ ہونے کی وجہ سے مکمل ترجمہ نہیں ہیں۔ نظم طباطبائی کی ''گورغریباں'' گرے کی ''ایلیجی ان دی چرچ یارڈ'' کا بہترین ترجمہ مانا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعض بند ابلاغ کے نامکمل رہنے کی وجہ سے گرے کے بنیادی مفہوم سے بہت دور ہو گئے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل بند دیکھیے۔

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک و عنبر کی

اب گرؔے کے مذکورہ بند کا نثری ترجمہ بھی پڑھیے۔

بہت سے گہر ہائے تابدار تاریک اور بیکراں سمندر کی تہوں (غاروں) میں پوشیدہ ہیں۔ بہت سے ایسے پھول کھلتے ہیں جن کی رعنائی کو کوئی نہیں پاتا اور وہ ریگستانی ہواؤں میں اپنا رنگ و بو (مٹھاس) کھو دیتے ہیں۔

نظم کے منظوم ترجمے میں ''گوہر شہوار'' باقی ہیں کہہ کر گرؔے کے خیال سے انحراف کیا گیا ہے۔ گرؔے انہیں سمندر کی تہ میں پوشیدہ خیال کرتا ہے مگر نظم نے گرؔے کے آخری دو مصرعوں کا ترجمہ بالکل مختلف کر دیا ہے یہاں نظم کو گرؔے کے بند کا صحیح اور بھرپور ابلاغ نہیں ہوا ہے۔ گرؔے ایسے پھولوں پر اظہار افسوس کرتا ہے جنہیں کوئی نہیں دیکھ پایا اور جن کا رنگ و بو ریگستانی ہواؤں میں ضائع ہو گیا۔ مگر نظم دشت و در کے ایسے پھولوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے مسکرانے سے مشک و عنبر کی خوشبو پھیلتی ہے۔ گرؔے کا لہجہ حزنیہ ہے اور نظم کا طربیہ گرؔے نے اس بند میں الیہ اور یاس انگیز فضا کی تخلیق کی ہے جب کہ نظم نے نشاطیہ اور کیف افزا ذہنی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

ابلاغ کا نقطۂ عروج وہ منزل ہے جہاں قاری کے ذہن پر ایک سے زیادہ معانی کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کو ایک شعر میں بہت سے جلوہ ہائے معانی نظر آتے ہیں۔ مثلاً غالبؔ کے بہت سے شعر معانی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ امکانات کے حامل ہیں۔ یہ امکانات کبھی ایک ہی مفہوم کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے متضاد ہوتے ہیں۔ معانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا مترجم کا نہیں تشریح نگار کا کام ہے۔ ایسے موقعوں پر مترجم ہجوم معانی سے ایک کا انتخاب کر کے دوسرے معانی کو چھوڑ دیتا ہے۔ انتخاب و اجتناب کا یہ عمل ایک شعوری عمل اور مصنف کے فلسفۂ زندگی، اندازِ نگارش موضوع کی مناسبت اور عبارت کے سیاق و سباق کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ مفہوم کے انتخاب کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ کل مفہوم کے ایک جز کی حیثیت سے کل سے کتنا قریب ہے۔ یعنی وہ منتخب مفہوم کل کا لازمی، منطقی اور فطری حصہ ہے یا نہیں۔ دراصل انتخاب مفہوم کا مسئلہ کلیتہً مترجم پر منحصر ہے کہ وہ آئینہ کس رخ سے پکڑتا اور شاہد معنی کا کون سا جلوہ دیکھتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں جب پیکر نگاروں، علامت پسندوں اور داخلیت کے علمبرداروں کی تخلیقات کے تراجم پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے تو بعض تراجم میں اصل کی رمق بھی نظر نہیں آتی ہے۔

مترجم کے لیے ابلاغ کے مسائل اس وقت زیادہ پریشان کن ہوتے ہیں جب وہ مصنف کے کسی نازک اور نادر خیال، نیم محسوس حقیقت، خالی خیال آرائی، ذاتی اور اچھوتے تجربے، دوررس افکار اور وجدانی کیفیتوں کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات شاعری میں ایسے نازک مقام آجاتے ہیں جہاں اصل خیال سطور میں نہیں بلکہ بین السطور یا ماورائے سطور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی الفاظ محض ایسے پلیٹ فارم کا کام کرتے ہیں جہاں سے معانی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ شعری ترجموں کی انہیں دقتوں کے پیش نظر انگریزی کے شاعروں نے کہا تھا کہ شاعری کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور اس دور کے نااہل مترجمین کے ناقص ترجموں نے معترضین کی رائے مہر تصدیق ثبت کردی تھی۔ ایذرا پاؤنڈ (Ezra Pound) نے شاعری کو ترجمہ کرنے کے نقطۂ نظر سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) فوناپوئیا (Phona Poeia)

(۲) میلوپوئیا (Melo Poeia)

(۳) لوگوپوئیا (Logo Poeia)

فونوپوئیا ایسی شاعری ہے جس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے، میلوپوئیا ایسی شاعری ہے جس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ لوگوپوئیا ایسی شاعری ہے جس کا من وعن ترجمہ تو نہیں کیا جاسکتا لیکن شاعر کے اصل خیال کی جھلک ترجمے میں آسکتی ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ترجمے کا سنگ بنیاد "ابلاغ مفہوم" ہے اور اسی پر ترجمہ کی خوبی کا انحصار ہے۔

ابلاغ کے بعد ترسیل (Communication) کی منزل آتی ہے۔ ترسیل کا لمحہ اوّل وہ لمحہ ہے جب مترجم اصل فن پارے کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے اور آخری وہ لمحہ ہے جب وہ اپنی نئی مگر پرانی تخلیق کو حتمی طور پر پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس طرح ترسیل وہ عمل ہے جس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مترجم مصنف کی مجرد آگہی یا فن پارے کے اصل مفہوم کو قابل فہم علامتوں یعنی ترجمے کی زبان کے ذریعے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ عمل گذشتہ دونوں منزلوں سے زیادہ پیچیدہ اور دقت طلب ہے۔ ترجمہ کے عام قارئین کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ اصل تصنیف میں کیا تھا یا اس کا انداز بیان کیا تھا۔ وہ ترجمے کو اصل کے نعم البدل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہی ان کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔

ترسیل کے عمل کے دو مدارج ہیں۔ پہلا وہ ہے جہاں ذہن کے آئینہ خانہ میں لفظ اور خیال ایک دوسرے میں تحلیل ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر مترجم کی مجرد آگہی الفاظ کا مرئی پیکر اختیار کرتی ہے۔ ترسیل کا عمل مجرد سے غیر مجرد کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے ترسیل کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مترجم نے شاعر کی آگہی کو (جو ابلاغ ہونے پر اس کے ذہن کا لازمی حصہ ہوتی ہے) کس حد تک ترجمے کی زبان میں سمویا ہے۔ دوسری منزل وہ ہے جب مترجم مصنف یا شاعر کی مجرد آگہی کو ایک نئی زبان میں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ منزل مترجم کی تخلیقی اور فنی صلاحیت کی آزمائش کی منزل ہے۔ اس منزل سے آسانی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مترجم کے پاس کافی ذخیرہ الفاظ ہو، وہ مترادفات کے مہین اور نازک امتیازات سے واقف ہو، الفاظ کے لغوی، مجازی اور تخلیقی استعمال سے آگاہ ہو۔ اگر موقع کی مناسبت سے لغت میں کوئی لفظ موجود نہ ہو تو وہ نیا لفظ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہو، حسب موقع نئے استعاروں اور پیکروں کی تخلیق کر سکتا ہو۔ اور انہیں فنکارانہ طور پر برتنے کا فن بھی جانتا ہو۔ چونکہ خیال کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا عمل فنی، ادبی اور تخلیقی نوعیت کا ہے اس لیے دوسری زبانوں سے اُردو میں منظوم ترجمہ کرتے وقت علم بدیع و بیان پر نظر رکھنا ضروری ہے، اور عروض و قوافی، معائب و محاسن سخن اور شعری اسالیب کا عرفان بھی ضروری ہے۔

ترسیل کے عمل پر ترجمے کے بہت سے طریقے کار منحصر ہیں۔ مثلاً (۱) کسی فن پارے کا لفظی ترجمہ۔ (۲) خارجی یا داخلی کیفیات کا ترجمہ۔ (۳)۔ فن پارے کی تلخیص یا تشریح۔ (۴) مصنف کے بنیادی خیال کا اپنی زبان میں اظہار۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے طریقہ کار ہو سکتے ہیں۔ لفظی ترجمے میں لغت کی مدد سے لفظوں یا جملوں اور فقروں کا ترجمہ کیا جاتا ہے یہ صورت حال نثر میں تو کسی حد تک گوارا ہو سکتی ہے مگر نظموں کے منظوم ترجم میں کام باقی ہے۔ شاعری میں الفاظ، استعارات، پیکروں اور علامتوں کے مجازی اور تخلیقی معانی ہوتے ہیں، اس لیے محض لغوی معانی لکھنے سے شاعر کے اصل خیال کی عکاسی نہیں ہو سکتی۔ لفظی ترجموں کی دو صورتیں ہیں:

(الف) ادبی: لغت کی مدد سے لفظ کا ترجمہ لفظ کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ یہ ٹیکنک بہت ناقص ہے۔ اس میں ترجمہ غیر دلکش، بے جان اور اصل سے دور ہوتا ہے۔

(ب) دوسری: لغت کی مدد سے سامنے کا مفہوم قلم بند کر دیا جاتا ہے۔ عظمت اللہ خاں نے ورڈ سورتھ کی نظم دی ککو (The Cuckoo) کا ترجمہ ''کوئل'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوشا مست آواز والے پرندے   تری کوک خوشیوں کا اک راز ہے
پرندہ کہوں یا تو بچپن کی میرے   بھٹکتی ہوئی سی اک آواز ہے

عظمت اللہ خاں نے اس ترجمے میں الفاظ کی کفایت کے اصول کو مدنظر رکھا ہے اور انگریزی کے چار مصرعوں کا ترجمہ اُردو کے چار مصرعوں میں کیا ہے۔ یہ محتاط لفظی ترجمے کی اچھی مثال ہے۔ البتہ عظمت اللہ خاں نے ترجمے میں ''بچپن کی میرے'' الفاظ کا اضافہ کرکے ورڈسورتھ کے خیال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ تخلیق کا ابہام ترجمے میں وضاحت بن کر ترجمے کا تخلیقی حسن کم کردیتا ہے۔ زیرِ نظر ترجمہ بھی اسی وضاحتِ خیال کا شکار ہے۔

بعض مترجم کسی فن پارے کی خصوصیات یعنی الفاظ کی موسیقی، لب ولہجہ کے زیر و بم، بحر و وزان کی نغمگی کے ترجمے میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوّل تو کسی فن پارے کی خارجی خصوصیات کی دوسرے فن میں منتقلی کو ترجمہ نہیں کہتے، دوسرے ایک زبان کی خارجی خصوصیات کو دوسری زبان اور فن میں منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ترجمے میں مصنف کے بنیادی خیال کی ترسیل ہی مقصود بالذات ہوتی ہے۔ خارجی خصوصیات کی منتقلی کی ناکامی کی نمایاں مثال اُردو کی آزاد نظم ہے۔ انگریزی میں ''فیری ورس'' لکھنے والوں نے اوزان، بحور کو خیر باد کہہ کر آہنگ کا سہارا لیا تھا۔ اُردو میں انگریزی آہنگ کا نعم البدل موجود نہیں ہے۔ مجبوراً اردو شاعروں نے آزاد نظم میں مروجہ اوزان و بحور ہی کا سہارا لیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے ایک نظم کے مختلف مصرعوں میں ایک ہی بحر کے مختلف ارکان کو برتا مگر مکمل طور پر عروضی آہنگ سے نجات حاصل نہیں کی۔ یہی حال اُردو میں معرّیٰ نظم کا ہے انگریزی ''بلینک ورس'' ایک بحر یعنی آئمبک پنٹامیٹر میں لکھی جاتی ہے مگر اُردو میں اس کے لیے کوئی بحر مخصوص نہیں ہے اس کی دوسری روشن مثال جاپانی شاعری کا اُردو ترجمہ ہے۔ جاپانی زبان کی ساخت اُردو زبان کی ساخت سے مختلف ہے، اس کی اصناف اور شعری ہیتوں کی ایک مخصوص عروضی تنظیم ہے۔ جاپانی شاعری میں رکن کا وہ تصور نہیں جو اُردو یا انگریزی میں ہے۔ اس لیے جنہوں نے جاپانی شاعری کا جاپانی ہیکوں کی خارجی خصوصیات کے ساتھ اُردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے انہیں ناکامی ہوئی۔ منصور احمد کا خیال ہے کہ:۔

> ''ہیکو نظموں کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ حسین اجمال کی تفصیل اسے حسن سے معرّیٰ کردیتی ہے۔ ہیکو نظم گھاس کی پتی کے ساتھ لٹکتا ہوا شبنم کا وہ قطرہ ہے جو مختلف اطراف سے دیکھنے پر کبھی نیلا کبھی سرخ اور کبھی ارغوانی شعاعیں پیدا کرتا ہے۔''

منصور احمد نے ہائیکو کی دشواری کا ذکر کیا ہے وہ محض ہائیکو کی بلاغت.... کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ اس کی عروض، ساخت اور خارجی خصوصیات کی وجہ سے بھی ہے جو اُردو میں منتقل نہیں کی جاسکتیں۔ ہائیکو تین مصرع کی ایک مختصر مگر بلیغ نظم ہوتی ہے جس کے پہلے اور تیسرے مصرع میں 5-5 اور دوسرے میں 7 رکن ہوتے ہیں۔ اُردو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ہائیکو کے تمام ترجموں میں اس کی خارجی خصوصیات کی منتقلی کی ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ فضل حق نے جاپانی ہائیکو کے چند نثری ترجمے دیئے ہیں مثلاً

"چاول کے ایک پودے کی بال
جھک گئی بوجھ سے کیونکہ
ایک مکوڑا اس پر آ بیٹھا۔"

اس ترجمے میں خارجی خصوصیات تو کجا بعض دوسری خصوصیات بھی موجود نہیں ہیں۔ اس ترجمے میں نظم کے پس منظر کے طور پر موسم، منظر اور فطرت نہیں ہے کوئی ایک مخصوص لفظ بھی نہیں ہے جب کہ ہائیکو میں یہ تمام چیزیں ضروری ہیں۔

داخلی خصوصیات میں مصنف کا اسلوب اور اس فن پارے کی داخلی منطق تنظیم شامل ہے۔ ترجمے میں اس اسلوب یا داخلی منطق کی تلاش اور ترسیل بھی کارلا حاصل ہے اگر مترجم ان خصوصیات سے مرعوب ہو جائے تو مترجم کے ذہن کے گرد مرعوبیت کا ایک ایسا ہالہ بن جاتا ہے جو مصنف کے مرکزی خیال کی روشنی کو ذہن میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔

ہر مصنف یا شاعر کا اسلوب اس کے اپنے تخلیقی تجربے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک زبان کے فن پارے کے اسلوب کو دوسری زبان کے ترجمے میں منتقل کرنا ناممکن ہے۔ یہی حال فن پارے کی داخلی تنظیم کا ہے۔ جو تخلیقی تجربے سے ابھر کر فن کی شریانوں میں لہو کی طرح دوڑتی ہے۔ ترجمے میں اس داخلی منطق تنظیم کو بھی سمویا نہیں جاسکتا۔ اس طرح ایک فن پارے کی داخلی اور خارجی خصوصیات کا ترجمہ محال ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ بالفرض اگر کسی طرح خارجی خصوصیات کو دوسری زبان میں منتقل کر بھی دیا جائے تو اس کو ترجمہ نہیں کہہ سکتے۔

کبھی بھی کسی فن پارے کی تلخیص یا تشریح کو بھی ترجمہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی اپنی افادیت ہے مگر تلخیص یا تشریح بھی ترجمہ نہیں ہے۔ تلخیص و تشریح میں حذف و اضافہ کا عمل ہوتا ہے جو الفاظ اور معانی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ ترجمے کے لیے یہ عمل غیر ضروری ہے۔ البتہ ترجمہ کرنے میں حذف و اضافہ سے اس وقت کام لیا جاسکتا ہے، جب مصنف ژولیدہ بیانی، اطناب یا ابہام کا شکار ہو۔ تلخیص کرنے میں مفہوم کی بعض کڑیاں غائب ہو جاتی ہیں جس سے بے ربطی اور ابہام پیدا ہونے کے علاوہ مصنف کے متن اور خیال میں خیانت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں قارئین تک مصنف یا شاعر کا کل مفہوم نہیں پہنچتا۔ اس کے برعکس تشریح میں غیر ضروری چیزیں شامل ہو جاتی ہیں جو مصنف یا شاعر کے اصل جذبہ یا خیال میں غیر ضروری چیزوں کو ملا دیتی ہے اور قارئین کی توجہ اصل بات سے ہٹا کر فروعات میں الجھا دیتی ہے۔ شعری تراجم میں حذف و اضافہ کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں جو کبھی ابلاغ کی کمی، کبھی بدنیتی اور کبھی محض تن آسانی سے رونما ہوتے ہیں۔ ابتدائی شعری تراجم میں حذف و اضافہ کی اکثر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مثالیں ملتی ہیں۔ یہ صورت حال بعض ایسے تراجم میں بھی نظر آتی ہے جنہیں نقادوں نے اعلیٰ درجہ کا ترجمہ تسلیم کیا ہے نادر کاکوروی نے مور کی نظم ''دی لائٹ آف دی اَدر ڈیز'' کا ترجمہ ''گذرے زمانے کی یاد'' کے عنوان سے کیا ہے اس ترجے کے بارے میں ممتاز حسن لکھتے ہیں کہ

> ''گذرے زمانے کی یاد'' نہ صرف نادر کا بہترین ترجمہ ہے بلکہ اسے اُردو شاعری کا بہترین ترجمہ کہنا چاہیے اس کی ادبی اہمیت اصل اور ترجے کو ساتھ ساتھ دیکھنے سے ہی واضح ہوسکتی ہے۔''

اب ممتاز حسن کے مشورہ کے مطابق اصل کو اور ترجے کو ساتھ ساتھ پڑھیے۔

اکثر شب تنہائی میں — کچھ دیر پہلے نیند سے
گذری ہوئی دلچسپیاں — بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی — اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دل صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی — وہ رونا، وہ ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے — وہ دل لگی، وہ قہقہے!
وہ عشق، وہ عہدِ وفا — وہ وعدہ اور وہ شکریا
وہ لذّتِ بزمِ طرب — یاد آتی ہے ایک ایک سب
دل کا کنول جب روز وشب — رہتا شگفتہ تھا سو اب
اس کا یہ ابتر حال ہے — اک سبزۂ پامال ہے
اک پھول کملایا ہوا — سوکھا ہوا بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر

نادر کاکوروی کے منظوم ترجے کے بعد مور کی انگریزی نظم کا نثری ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

خاموش رات میں
اس سے پہلے کہ نیند اپنی باہیں میری گردن میں حائل کردے
میری پسندیدہ یادداشت
ماضی کے ان دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے جو میرے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں مسکراہٹیں اور آنسو
بچپن کے ایام
پیار بھری باتیں جو زیرِ لب دہرائی گئی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور وہ آنکھیں جن میں چمک تھی

اور جواب ماند ہیں اور بجھ چکی ہیں

اور حسرت سے لبریز دل جواب ٹوٹ چکا ہے

اس طرح اس رات کی خاموشی میں (ایک ایک کر کے یاد آتی ہے)

اس سے پہلے کہ نیند اپنی باہیں میری گردن میں حائل کر دے

میرا ماضی مجھے محصور کر سکا ہے

مور کی نظم کا اصل ٹکڑا، نادر کا منظوم ترجمہ اور نثری ترجمہ، پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نادر نے 13 مصرعوں کا ترجمہ 22 مصرعوں میں کیا ہے۔ جن میں تین مصرع:

بیتے ہوئے دن عیش کے

بجھتے ہیں شمع زندگی

میرے دل صد چاک پر

اضافہ ہیں۔ یہ تینوں بحر کی پابندی اور رعایت لفظی کی وجہ سے شامل ہوئے ہیں اسی طرح باقی ترجمے بھی بھرتی کے مصرعے شامل ہیں۔ جن میں:

پھر وہ جوانی کے مزے

وہ لذت بزم طرب

اک پھول کملایا ہوا

سوکھا ہوا بکھرا ہوا

روندا پڑا ہے خاک پر!

حشو ہیں۔ چونکہ شاعری تاثرات کا اظہار ہے اس لیے ترجمے میں بھی اسی اصول کو سامنے رکھنا چاہیے۔ نادر کا کوروی کا یہ ترجمہ جس کو ممتاز حسن نے اُردو کا بہترین ترجمہ کہا ہے ایک طرف اعلیٰ شعری محاسن سے محروم ہے۔ اور دوسری طرف اطناب اور اضافہ الفاظ و خیال کا شکار ہے۔

اعلیٰ ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من وعن پیش کرتے ہیں۔ اس میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، ترجمے کو حذف و اضافہ سے پاک رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بلیغ اشاروں، حکیمانہ لفظوں، فلسفیانہ خیالات، جذبے کی رو اور تاثر کو پوری شادابی اور شدت کے ساتھ ترجمے میں سمویا جاتا ہے۔ اس میں بنیادی خیال، جذبہ یا فکر کے ساتھ زبان، تکنیک اور اسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی عناصر کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔ اس طرح کا ایک کامیاب ترجمہ عظمت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ خاں کا ''ننھا غاصب'' ہے جو میریڈتھ (Meridith) کی نظم دی ینگ یزرپر (The Young usurper) کا منظوم ترجمہ ہے۔ ترجمہ نیچے نقل کیا جاتا ہے۔

ننھا غاصب

مرے گھر کی دیوی کے بالائے سینہ — کھلا ہے محبت کا تازہ کنول

درخشندہ جیسے سرِ شام زہرہ — افق پر سمندر کے آئے نکل!

وہ ہاتھوں پہ اپنے کھلاتی ہے اس کو — وہ پیروں پہ اپنے جھلاتی ہے اس کو

وہ رکھتی ہے آنکھوں میں پتلی بنا کے — وہ سوتے میں روتا جو اُٹھ بیٹھتا ہے

تو بوسوں، سے موتی سے آنسو وہ پونچھے — وہ سو جان سے ہر ادا پر فدا ہے

وہ ہے لال دونوں جہاں جس پہ صدقے — یہ ننھی سی جان اور غاصب کے ڈھب ے

مرا تختِ زریں ہے تیرے حوالے — ترے دست و بازو فرشتوں کے سے

تو ہے وہ زبردست جیتے پہ جیتے

اس ترجمے میں اصل کی رُوح جلوہ گر ہے۔ حذف واضافے کا اثر کم سے کم ہے اس میں لفظی اور معنوی ترجمے کی بعض خوبیوں کا امتزاج ہے۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ترسیل کے عمل پر ترجمے سے مختلف طریقہ ہائے کار کا دارومدار ہے۔ ہر قسم کے ترجمے کا الگ الگ رنگ و آہنگ اور اپنی جداگانہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ مگر بہرطور معنوی ترجمے کو لفظی اور آزاد ترجمے پر فوقیت حاصل ہے۔

ترسیل کے عمل سے گذر کر مترجم قاری کے سامنے نئی مگر پرانی تخلیق پیش کرتا ہے اس لیے قاری اور نقاد سب سے پہلے اس کی زبان سے متعارف ہوتا ہے اس کے بعد تکنیک، اسلوب اور مکمل ہیئت اس کے سامنے آتی ہے۔ نثر میں چونکہ زبان کا بنیادی مقصد ترسیل خیال ہے شاعری میں اس کا منصب اظہار جذبات کیفیات ہے اس لیے ترجمے کی زبان قابل فہم ہونی چاہیے۔ اس میں ژولیدہ بیانی اطناب، تنافر حروف، تکرار اور ابہام نہیں ہونی چاہیے اور اس زبان سے قاری کو وہی ابلاغ ہونا چاہیے جو مصنف یا شاعر کا اصل منشا، مقصد، خیال یا تاثر تھا۔ تکنیک اور اسلوب بھی ابلاغ اور ترسیل کے دوران ذہنی عمل سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ترجمے میں تکنیک اور اسلوب کا کام آرائش نہیں بلکہ مرکزی خیال کی ترسیل یا اظہار ہے۔ مترجم کو جان بوجھ کر کوئی نئی تکنیک یا اچھوتا اسلوب نہ اختیار کرنا چاہیے بلکہ ترجمے کے مکمل عمل کے دوران، اس کے موضوع، مواد اور مزاج کی مناسبت سے ایسی تکنیک اور اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو ہر طرح سے اس تصنیف کے بنیادی خیال یا تاثر کے اظہار میں مدد ثابت ہو۔ یہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاملہ ہیئت کا ہے مترجم کو ہیئت بھی عجیب وغریب نہ اختیار کرنی چاہیے بلکہ جو موضوع اور مواد کا تقاضہ ہو اس کے مطابق اختیار کرنی چاہیے یہ ضروری نہیں کہ انگریزی آزاد نظم ہی میں ہو۔ اگر آزاد نظم میں ترجمہ کرنے سے نظم کا حسن قائم نہ رہتا ہو تو پھر کوئی ایسی ہیئت اختیار کرنی چاہیے جس میں اصل فن پارے کا حسن تاثر اور توانائی باقی رہے۔ اس طرح ترجمے میں وہ تمام خصوصیات ہونی چاہئیں، جن کی توقع ہم ایک اعلیٰ تخلیق سے کرتے ہیں۔

ایک اعلیٰ درجے کا ترجمہ شاعر یا مصنف کے مرکزی خیال یا جذبے کا امین اور عکاس ہوتا ہے۔ اس کی زبان، تکنیک، اسلوب اور ہیئت موضوع و مواد کے مطابق ہوتا ہے ترجمے کی زبان نئی اور دلکش ہوتی ہے، نیز ادبی سرمائے میں اضافہ کرتی ہے۔ اس میں قارئین کی توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ منظوم ترجمے میں جمالیاتی کیفیت اور شعریت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترسیل خیال یا انتقال فکر کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی بہت پیچیدہ اور محنت طلب علم ہے۔ جس کے لیے تحقیقی دیانت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے مترجم اگر ان اوصاف سے محروم رہے۔ اور وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہتا ہے تو اٹلی کی ضرب الامثال کے مصداق ایسا ٹرانسلیٹر (Translator) ٹریٹر (Traitor) ہوتا ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی ترجمہ

ڈاکٹر فاخرہ نورین

تراجم میں سب سے مشکل قسم مذہبی متن کا ترجمہ ہے۔ اردو میں فنِ ترجمہ کے مسائل اور مشکلات کی اہمیت کے پیش نظر جہاں فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث پر کتب کی شدید کمی ہے وہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مذہبی ترجمے کو سرے سے نظرانداز کردیا گیا ہے۔ ایک دو مضمون نگاروں نے اگر مذہبی ترجمے کا ذکر کیا بھی تو اس کی تاریخ، غرض و غایت پر چند سطور لکھ کر گویا اپنا فریضہ ادا کردیا۔ عموماً مذہبی متون کے ترجمے کو علمی ترجمے کے ذیل تصور کر کے سرسری تذکرے کے بعد ان پر بات نہیں کی جاتی۔ شاید اس کی سب سے بنیادی وجہ وہ عمومی عقیدہ ہے کہ چونکہ مذہبی کتب کا متن الہامی ہے لہٰذا خدا کا کلام ہونے کی بناء پر انسان اس کو اپنے الفاظ میں منتقل نہیں کرسکتا۔ دنیا کے بڑے الہامی مذاہب کی کتب نہ صرف ماخذ قانون ہوتی ہیں بلکہ ان کو پڑھنا بھی کارِ ثواب شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے ترجمے کی انفرادی حیثیت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر قرآن پاک کے ایک حرف کو پڑھنے پر دس نیکیاں عطا کرنے کا وعدہ ہے لہٰذا ترجمے کی وہ اہمیت اور ضرورت نہیں رہتی بلکہ ہر مسلمان اس کے اصل متن ہی کو پڑھنا پسند کرتا ہے۔

کلام الٰہی ہونے کے سبب، نیز پیغمبر خدا پر وحی کی صورت نازل ہونے کی بدولت متن کو جو تقدس حاصل ہوتا ہے نیز فصاحت اور بلاغت کی جس طرح پر کلامِ الٰہی ہوسکتا ہے اس کے پیشِ نظر کسی انسان کے علم اور ذہن میں یہ صلاحیت نہیں سمجھی جاتی کہ وہ اس کو کاملیت کے ساتھ ترجمہ کرسکتا ہے۔ تاہم اس ترجمے کی افادیت اپنی جگہ ہے یہی وجہ ہے کوئی مذہب ایسا نہیں جس کی کتب ترجمہ کی گئی ہوں۔

مذہبی ترجمے کی مختصر تاریخ سے قبل یہ تذکرہ ضروری ہے کہ مذہبی متون کا ترجمہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے علمی ہے مگر چونکہ ان متون کا خالق خود خالق کائنات ہے، نیز یہ احسن الکتب ہونے کی بناء پر تمام تر لسانی و ادبی خصوصیات سے مملو ہوتے ہیں۔ ان کی بلاغت اور فصاحت نیز بعض مقامات پر تمثیلی انداز کی بدولت ان کو ادبی ترجمے کے ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ مترجم کی طرف سے حذف و اضافہ کی قطعی ممانعت ہے کیونکہ یہ گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کی یہ مشکل مذہبی ترجمے کو ترجمے کی مشکل ترین اور علمی، ادبی اور صحافتی ترجمے سے الگ ایک مستقل قسم بنا دیتی ہے۔ لہٰذا مذہبی اہمیت کے حامل متون کے ترجمے کو اس کی اہمیت اور نزاکت کے پیشِ نظر ایک الگ قسم ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ اس کے ترجمے میں درپیش مسائل کی نوعیت اور اہمیت دیگر اقسامِ ترجمہ سے بہت حد تک الگ ہوتی ہے۔

مذہبی ترجمے کی ضرورت اور اہمیت زیادہ تر تبلیغ و نشرِ مذہب کی بدولت ہے۔ عموماً تو یہ تصور رائج ہے کہ کلامِ الٰہی کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے خود اس زبان کو سمجھا جائے جس میں کلامِ الٰہی نازل ہوا ہے۔ توریت اور انجیل کے سلسلے میں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ رہا کہ ان کی اصل زبانیں ادق اور متروک ہونے کی بناء پر انھیں ترجمہ کرنا مجبوری بن گیا۔ ویدوں کے پیدا کار ایک مخصوص خطۂ زمین میں ہونے کی بدولت ان کے ترجمے کی اتنی خاص ضرورت پیش نہیں آئی نیز ہندومت میں مذہب خاص طور پر خواص اور ایک خاص طبقے کی میراث سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ترجمے کی وہ عمومی اہمیت اور ضرورت نہیں تھی۔ قرآن جو آخری الہامی کتاب ہے، کے اصل متن کو اتنی اہمیت دی گئی کہ صرف حرف پڑھنے یعنی تلاوت کرنے کا ثواب بھی رکھا گیا۔ لیکن چونکہ یہ مخصوص مذہبی کتاب نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے ضابطہ حیات بھی ہے یعنی اسلامی شریعت اور طرزِ زندگی کے اصول وضوابط بھی اسی میں تحریر ہیں لہٰذا مسلمان عربی زبان سیکھتے ہیں تاکہ اس زبان میں لکھے قرآنی متن کو سمجھ سکیں۔ مسلم عقیدے کے مطابق چونکہ یہ کتاب انسانی رشد و ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ہدایت اور بہتری کے لیے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کریں اور عربی زبان سیکھیں۔ قرآنی زبان کے تقدس کی بناء پر اس کو ناقابلِ توجہ ہی خیال کیا جاتا رہا ہے لیکن جب بھی مسلمانوں نے اس کو ترجمہ کیا اسے عموماً تفہیم و توضیح کے مقصد کے تحت ہی ترجمہ کیا۔ کسی غیر مسلم کا قرآن کو ترجمہ کرنا نامناسب خیال کیا جاتا رہا تاہم غیر مسلموں نے بھی اس کو ترجمہ کیا ہے تو ان کا مقصد بھی علمی یا ادبی سے زیادہ مناظرہ رہا ہے۔

انجیل مقدس کے ترجمے میں مذہبی اور علمی غایت کے علاوہ سیاسی مقاصد بھی کارفرما رہے ہیں۔ انگریز جب استعماری عزائم لے کر ایشیاء و افریقہ کو نکلے تو مشنری پادری ان کے اہم کارندوں کے طور پر ان کے ہمراہ تھے۔ انجیل مقدس کے ذریعے مقامی باشندوں کو عیسائی بنا کر ان کی روحوں کو بچانے کا مقدس عمل مذہبی جنون کے علاوہ سیاسی حربہ بھی تھا۔ انجیل مقدس کے ترجمے کی اہمیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ "نیا صحیفہ" ترجمے کے تنوع کے سبب وجود میں آیا۔ انجیل کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا رہا اور اس کی ایک وجہ نوآبادیاتی استعمار تھا۔ انگریز جہاں بھی گئے وہاں کی مقامی زبانوں میں بھی انجیل کا ترجمہ کرتے تھے چنانچہ انھی تراجم کی بناء پر بعض قومی زبانوں اور شناختوں کا وجود ممکن ہوا۔ اس کی ایک مثال جرمن زبان اور مارٹن لوتھر بطور مترجم ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی حوالے سے بھی ترجمے کی اہمیت نے عیسائی دنیا میں ترجمے کے ذریعے اخذ و اکتساب کے عمل کی روایت مستحکم کر دی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی کتب کے ترجمے کا ایک مقصد قدیم اور مروج تراجم میں وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ تبدیلی کر کے اسے جدید بنانا بھی ہے۔ چونکہ مذہبی کتب پر عموماً مذہب کے سربرآوردہ اشخاص ہی کی اجارہ داری ہوتی ہے اور کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ کتنا بھی صاحب علم کیوں نہ ہو، ترجمے یا تفسیر کی اجازت نہیں ہوتی لہٰذا اس اجارہ داری کے خلاف بغاوت کے علم بھی اکثر بلند ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بڑی بلند ہمت اور استقلال کے متقاضی اقدام ہوتے ہیں کیونکہ یہ تراجم اکثریت کی ناخوشی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ایڈپ یکسل اور دیگر رفقاء کا رکا ترجمہ قرآن ہے جس کی مثال آگے آئے گی۔

مقدس متون کے ترجمے کا ایک مقصد جو بہت کمیاب ہے وہ فن کا مظاہرہ بھی ہے۔ قرآن کے ترجمے میں اس کی مثال پاکستان کے ڈاکٹر طاہر مصطفیٰ ہیں جنھوں نے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قرآن کا غیر منقوط ترجمہ کیا۔ یہ نہ صرف مصنف بلکہ اردو زبان کی خلاقی اور مہارت کی ایک مثال ہے۔ کلامِ الٰہی کو غیر منقوط اسی طرح ترجمہ کرنا کہ نہ تو متن کے تقدس اور مقصود پر کوئی سمجھوتہ ہو اور نہ ہی زبان کے صرفی ونحوی تقاضے مجروح ہوں اور زبان ادق یا بے معنی ہو جائے، یہ مہارت اور فن کا اعلیٰ مظاہرہ ہے جس کا تمام تر کریڈٹ ڈاکٹر طاہر مصطفیٰ کو جاتا ہے۔

ترجمے کی اس انفرادیت کے پیش نظر ان کی ترجمہ کردہ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الاخلاص درج ذیل ہیں۔(۱)

ترجمہ سورۃ الفاتحہ:

اس کے اسم سے، رحم والا اور لامحدود رحم والا ہے۔

ہر طرح کی حمد اللہ ہی واسطے کہ وہ مولا ہے کل عوالم کا۔ رحم والا اور کمال رحم والا ہے۔ مالک ہے عدل کے دہاڑ کا۔ ہمارا عملِ اطاع اللہ ہی کے واسطے اور اسی سے سوال ہے مدد کا۔ (اے اللہ) دکھا دے ہم کو محمود اور مسعود راہ۔ اس طرح کے لوگوں کی کہ مکرم ہوئے در الٰہی کے، سوائے وہ لوگ کہ گمراہ ہوئے اور رسوا ہوئے۔

اے اللہ اسی طرح ہی ہو۔

ترجمہ سورۃ اخلاص:

کہہ دو کہ اللہ احد ہے۔ اللہ ارحام کے سارے واسطوں سے ماورا ہے۔ سوال ہی معدوم کہ اس کی کوئی اولاد ہو کہ وہ کسی کی اولاد ہو۔ سوال ہی معدوم کہ اس کا کوئی ہمسر ہو۔

ایسے تراجم کی مذہبی حیثیت شاید اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ ان میں سارا زور اپنے فن کے مظاہرے اور قرآنی الفاظ کے غیر منقوط متبادلات کی تلاش پر ہوتا ہے مگر پھر بھی یہ قابلِ قدر اور قابلِ تحسین کوشش ہے۔

مذہبی متون میں بنیادی الہامی یا مقدس کتب کے علاوہ متون بھی شامل ہیں۔ اس کی واضح مثال اسلام میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کا بھی بطور مستند ذریعہ علم تصور کیا جاتا ہے۔ جتنی احتیاط قرآن کے متن کو ترجمہ کرتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے کی جائے گی کم وبیش وہی احتیاط ترجمہ احادیث میں روا رکھی جائے گی۔

چونکہ دیگر مذاہب کی کتب میں محض متن کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو اسلام میں قرآن سے وابستہ ہے۔ لہٰذا مذہبی ترجمے میں تبلیغ اور تفسیر پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اگر چہ مذہبی اہمیت کے حامل متون کے ترجمے میں درپیش مسائل علمی بھی ہیں اور ادبی بھی، لیکن ان کی ایک اپنی الگ نوعیت بھی ہے جن میں سے زیادہ تر کا اطلاق ترجمۂ قرآن پر ہوتا ہے۔ ان مسائل کا ایک مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

لغوی ترجمہ:

علمی متن کے ترجمے کی طرح مذہبی متون میں اہمیت پیغام یا بات کو حاصل ہوتی ہے لہٰذا اس کی ترسیل اور ابلاغ میں خاص اہتمام روا رکھا جانا ضروری ہوتا ہے۔ عموماً ایسے تراجم لغوی ہوتے ہیں۔ یعنی لفظی ترجمہ۔ ماخذ زبان کے لفظ کے لیے ہدفی زبان میں متبادل لفظ ڈھونڈا جاتا ہے تاکہ پیغام کم وبیش انھی الفاظ اور اسی اسلوب میں ہدفی زبان کے قاری تک منتقل ہو سکے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک زبان کے کسی لفظ کے لیے دوسری زبان میں محض ایک ہی لفظ موجود ہوتا ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہے۔ ایک سے زیادہ الفاظ کی موجودگی میں یہ کیسے طے کیا جائے گا کہ کون سا لفظ مناسب اور موزوں متبادل ثابت ہوگا؟ ماخذ زبان کے ایک لفظ کے لیے ہدفی زبان میں موجود کئی الفاظ میں سے ہر لفظ کے ساتھ ترجمہ کیا جا سکتا ہے لہٰذا ان معانی کی موجودگی میں ہر ترجمہ درست بھی قرار پائے گا مگر چونکہ مذہبی متن محض ادب پارہ نہیں ہے کہ اس کے اس معنوی تنوع سے حظ اٹھایا جائے گا۔ لفظ کے معانی میں ذرا سے رنگ ہلکے یا گہرے ہو جانے سے بعض اوقات پورے کا پورا ترجمہ ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ مذہبی متون میں سے اکثر کی حیثیت ایک ضابطے اور دستور کی سی ہوتی ہے لہٰذا ترجمے میں مترجم ایک مستقل بے یقینی کی کیفیت کا شکار رہتا ہے کیونکہ وہ یہ بات تسلیم کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے کہ کلامِ الٰہی کو مکمل طور پر سمجھنا اور اس کی ترجمانی کا حق ادا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر کوشش انسان پر فرض ہے۔ ایل سوانسن کے مطابق (۲) مذہبی اور فلسفیانہ متن کے ترجمے میں دلچسپ صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ترجمہ کس حد تک درست ہے یہ تو اندازہ ہو جاتا ہے مگر یہ کس حد تک غلط ہے یہ پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ ایک لفظ کے کئی ترجمے درست ہو سکتے ہیں اور غلط یا نامکمل بھی۔ مثال کے طور پر قرآنی آیت ''الرجال قوامون علی النساء'' کے انگریزی میں چار ترجمے پیش خدمت ہیں: (۳)

Yusuf Ali

Men are the protectors and maintainers of women,

Pickthal

Men are in charge of women,

Shakir

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Men are the maintainers of women.

Re[illegible]st

The men are to support the women.

ایک ہی لفظ کے متبادل الفاظ جو کبھی درست ہیں مگر ان مختلف الفاظ میں سے ایک لفظ کی بناء پر ایک پورا نظامِ زندگی تبدیل ہو کر رہ سکتا ہے۔ زبان کی سماجی اور سیاسی سطح پر ہر ترجمہ اپنے سیاق و سباق یا قارئین کے طرزِ زندگی کی بدولت یا تو مکمل قبولیت کی سند پا سکتا ہے اور یا پھر قطعی طور پر رد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآنی آیت کے ترجمے کو اگر کسی ایشیائی یا عربی ملک میں پیش کیا جائے تو پہلے تین ترجمے مسندِ قبولیت پائیں گے کیونکہ مروجہ تصورات کے مطابق عورت کو ثانوی یا ایک ملکیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جبکہ چوتھا ترجمہ یورپ یا کسی ایسے ترقی یافتہ ملک کے لیے زیادہ قابلِ قبول ہوگا جہاں قانوناً عورتوں کو برابر کا درجہ حاصل ہے اور وہاں کی سماجی و معاشی زندگی میں عورت بطور فرد اپنی شناخت رکھتی ہے۔ ترجمے میں آنے والا یہ تنوع چونکہ محض لفظی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک پورے معاشرے کے بنیادی اعتقادات اور سماجی ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا یہ ترجمہ علمی سطح تک نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک ترجمہ ہر دور اور دوسرا متن ہی کی سطح حرفِ آخر اور ناقابلِ تبدیل ہو جائے گا۔ چنانچہ مذہبی ترجمہ بعض صورتوں میں متن ہی طرح مقدس اور مستند قرار پاجاتا ہے اور خود مترجم بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک مثال یوجین اے نیڈا نے ''تراجم کی تقدیس'' کے عنوان سے یوں دی ہے کہ قریباً ۱۴۰۰ سال تک (Latin vulgat Bible) رومن کیتھولک کے ماننے والوں کے لیے شرعی حیثیت رکھتی تھی۔ (۴)

انگریزی بولنے والے پروٹسٹنٹ طبقے کے لیے کنگ جیمز کا ترجمہ اور برما کے پروٹسٹنٹ طبقے کے لیے ایڈونی رم جڈسن (Adoniram Judson) کا ترجمہ بائبل آئینی اور شرعی تقدس کا حامل رہا۔ بعض تراجم کو یہ پایۂ تقدیس راتوں رات حاصل ہو جاتا ہے۔ یوجین اس کی مثال کے طور پر مغربی افریقہ کے ایک مترجم کا احوال بیان کرتے ہیں جس نے اپنے علاقے کی ایک اہم زبان میں بائبل کا ترجمہ کیا۔ بعدازاں وہ انگلستان کی کسی بڑی یونیورسٹی سے لسانیات پڑھ کر آیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کے ترجمے میں کتنی غلطیاں ہوئی تھیں چنانچہ جب اس نے اپنے ترجمے میں تبدیلیاں کرنی چاہیں تو اسے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ اس ''کلامِ الٰہی'' میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔

مذہبی متون کی عموماً قرات کی جاتی ہے۔ یعنی مذہبی علماء عوام کے سامنے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کے علاوہ دیگر مذہبی کتب خاص طور پر عوام کی پہنچ میں نہیں ہوتیں ان کے کرتا دھرتا اور شارح مذہبی عالم یا پادری وغیرہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ترجمے میں قرأت اور تلاوت کا پہلو ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ مذہبی کتب چونکہ زیادہ ترسنی جاتی ہیں لہٰذا یہ عموماً اعلیٰ ترین ادبی شاہکار بھی ہوتی ہیں۔ ابہام، تلخیص اور تہہ داری مذہبی متن کا خاصہ ہوتی ہے۔ یہ کوزے میں دریا کو بند کرنے کے مترادف ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس تمام خصوصیت اور شان کو ترجمے میں منتقل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسئلہ یہ آن پڑتا ہے کہ مترجم ترجمے کی کون سی تکنیک اپنائے۔ مذہبی متون کے ترجمے میں عموماً مترجم کو تین سطحوں پر اپنی حکمتِ عملی ترتیب دینی پڑتی ہے۔

اولاً مخصوص الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت اسے بے حد محتاط ہونا پڑتا ہے کیونکہ وہ الفاظ و اصطلاحات نہ صرف ماخذ زبان میں مخصوص معانی اور اہمیت کی حامل ہوتی ہیں بلکہ اپنے اندر لسانی و تاریخی ارتقا کی کئی تہیں بھی سمیٹے ہوتی ہیں۔ اصل متن کے قاری کے لیے وہ اتنی مشکل نہیں ہوتیں کیونکہ اس کے معانی کی مختلف پرتیں قاری کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ اس کی مثال مختلف احادیث میں قیمتی متاع کے طور پر سرخ اونٹ کا ذکر کرنا ہے۔ سرخ اونٹ کی جو اہمیت عرب کے باشندے کے لیے ہے وہ اس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں لیکن جب یہ متن غیر عرب باشندوں کے لیے ترجمہ کیا جائے گا تو حواشی لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کے بغیر متن کا پیغام نہیں سمجھا جاسکے گا۔

ثانیاً عمومی تصورات اور خیالات کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو خیال رکھنا پڑے گا کہ خیال یا تصور ترجمے میں یوں منتقل ہو کہ قاری اس کو سمجھ سکے اور مطلوبہ تاثر بھی پیدا ہو سکے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ ایک ہی خیال کو دو زبانوں میں یکساں تاثر اور اثر کے ساتھ پیش نہیں کیا جاسکتا نیز قارئین کے سماجی و تہذیبی سیاق وسباق کے مطابق اس کی تفہیم کی سطح بھی بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر الہامی مذاہب کے پیروکاروں کے لیے لفظ ''ایمان'' ''خالق'' یا ''مالک'' وغیرہ سے لامحالہ ذہن ایک خدا یا اللہ کی ذات کی طرف جاتا ہے، کیونکہ یہ تمام خصوصیات اسی کی ذات سے وابستہ کی جاتی ہیں لیکن دہریہ اور بت پرست یا بدھ مت کے پیروکار قارئین کا ذہن اس طرف نہیں جائے گا۔ ایسی صورت حال میں مترجم کو خیال رکھنا پڑے گا کہ وہ لغوی اور توضیحی معانی میں توازن رکھے یا حواشی میں توضیح کرے کیونکہ قارئین اور سامعین کی ضروریات اور تفہیم کی مختلف سطحوں کے فرق کو سمجھنا اور ان کے مطابق مناسب حکمت عملی اختیار کرنا مترجم کی ذمہ داری ہے۔

تیسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ مذہبی اور دیگر تمام اقسام کے تراجم پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں قارئین کا بہت اہم مقام ہے۔ کیونکہ یہ وہ محرک ہے جو پبلشنگ انڈسٹری اور خود مترجمین کو ترجمے پر اکساتا ہے اور یہ محرک ترجمے کا ہدف بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلی دونوں سطحوں یعنی لفظ اور تصور دونوں کو باندھنے والی ڈور قارئین ہوتے ہیں۔ لفظوں کے معانی اور ان کے مختلف رنگوں سے لے کر تصورات تک قارئین کی ذہنی، علمی، سماجی معاشی اور مذہبی سطح کے مطابق ترجمے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً انجیل کا ترجمہ ایک عام مسلمان اور ایک عالم دونوں کے لیے یکساں اہمیت کا حامل نہیں ہوگا نہ دونوں پر یکساں تاثر قائم کرے گا۔ اصل قارئین کا متن کی زبان میں موجود حوالوں اور تلمیحات سے واقفیت تو مسلم ہے کیونکہ مذہبی کتب کے متن کو سمجھنے میں مشکلات دوسری زبان کے قارئین کے لیے ہیں۔ پہلے اور براہِ راست مخاطب قارئین کے لیے متن آئینے کی طرح شفاف اور واضح ہوتا ہے۔ اس کی ایک بڑی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دلیل متن میں موجود کنائے اور تلمیحات ہیں۔ کنائے اور تلمیحات کی کسی کلام میں موجودگی کا محض ایک جواز ہے کہ ان کی مدد سے قاری کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے کیونکہ یہ قاری کے دائرہ علم میں سے ہی کوئی مثال دے کر چیزیں زیادہ آسان اور قابلِ فہم بنانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ متن کو فہم بناتے ہیں نیز چلمن کی اوٹ سے کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے، کی علمی تفسیر بھی بن جاتے ہیں۔ اس تلمیح کی اقسام میں مذہبی تلمیح، ادبی حوالہ، کوئی اساطیری یا تاریخی واقعہ شامل ہیں۔ چونکہ تلمیح ایک ادبی اور ثقافتی سیاق وسباق کی حامل ہوتی ہے لہٰذا ترجمے میں اس کو مختلف طریقوں سے تفہیم کی آسانی کے لیے بدل دیا جاتا ہے یا اس کو سرے سے متن سے غائب کر دیتے ہیں۔ مگر مذہبی صحیفوں خصوصاً قرآن کے ترجمے میں یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ تحریف کا مطلب کفر اور کلام الٰہی کو تبدیل کرنے کی کوشش سمجھا جائے گا۔ قرآن کریم میں تلمیحات کی ضد کی مثالوں میں ہاروت، وماروت کا قصہ، عام الفیل کا ذکر، قصہ ابراہیم و اسمٰعیل اور سورۃ القریش شامل ہیں۔ عربوں کے لیے یہ پہلے سے معلوم واقعات اور اشارات تھے لہٰذا انھوں نے ان کے سرسری ذکر سے واقعے کے تمام تر پہلو سمجھ لیے، غیر عرب یا عجمی اقوام کی زبانوں میں ترجمے کی صورت میں مترجم حواشی میں اس کے معانی اور تفسیر وتوضیح کرے گا۔

مذہبی تراجم کا فارمیٹ کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال مترجمین کو پریشان کرتا رہا ہے۔ ترجمہ چونکہ قارئین کو مدنظر رکھ کر کیا جا رہا ہوتا ہے تو انجیل کے سلسلے میں بحث بھی رہی کہ کیا اس کے پیراگراف بنا کر اور مختلف سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کے طور پر اس کا ترجمہ کیا جائے۔ ایسا کرنے میں قباحت یہ تھی کہ ترجمہ بادی النظر میں مذہبی کتاب کی سی تقدیس کے بجائے کوئی ادب پارہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ مذہبی صحیفوں کی زبان کو روزمرہ زبان میں عام فہم اور سہل انداز میں ترجمہ کرنا اگرچہ تفہیم اور تبلیغ کو آسان بنا دیتا ہے مگر مذہبی صحیفوں کے معاملے میں اخباری زبان کو وہ لوگ بھی عموماً ناپسند کرتے ہیں جو اپنی روزمرہ زندگی میں اس زبان کے حامی ہیں۔ خود قرآن حکیم چونکہ لسانی اور بیانیہ اعتبار سے عربی زبان کا ایک شاہکار ہے اور عربوں نے قرآنی زبان کے سامنے عجزِ بیان کا اظہار کیا اور ''ماھذا کلام البشر'' کہ کر خراجِ تحسین پیش کیا لہٰذا اس کے ترجمے میں بھی زبان وبیان کی وہ تمام خوبیاں مدنظر رکھنی چاہییں جو اس کے شایانِ شان ہوں۔

ترجمہ قرآن کے فارمیٹ کے سلسلے میں جیسا کہ ذکر ہو چکا کہ متن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے لہٰذا اس کو ترجمے کے ساتھ ہی لکھا جانا ضروری ہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۶ء کے عرصے میں مصر میں قرآنی ترجمے کا فارمیٹ زیرِ بحث رہا کیونکہ کمال اتاترک نے روشن خیالی کے عرب اور عربی سے نجات کے لیے قرآن کو ترکی زبان میں اس طرح ترجمہ کرنا چاہا کہ محض ترکی ترجمہ شائع کیا جائے اور عربی متن کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ ۱۹۳۶ء میں جامعہ ازہر نے قرآن کے ترجمے کے فارمیٹ پر فتویٰ دیا جس کی رو سے ترجمہ کے ساتھ متن کی اشاعت ناگزیر قرار دی گئی نیز قرآن کی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی ترجمہ کرنے کو مناسب قرار دیا گیا۔ لائیتھ صالح الشیبان (Layth Saleh

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Al-Shajban البتہ ایڈپ یکسل (Edip Yuksel) اور مارتھا شلٹے نافع (Martha Schulte Nafeh) کے Qura; A Reformist Translation کا فارمیٹ اس فتوے کا قطعی برعکس ہے۔ یہ قرآنی سورتوں کی ترتیب توقیفی کے مطابق ہی ترجمہ شدہ ہے مگر اس انگریزی ترجمے میں عربی متن شامل نہیں کیا گیا اور آیات کا ترجمہ نمبروار کیا گیا ہے۔ نیز صفحے پر دو کالم بنا کر ان میں ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کی ایک اور خصوصیت آیات کو ایک عنوان یا سرخی دینا ہے۔ گویا نئے موضوع پر آیات سے قبل وہ موضوع Italic میں لکھ کر نمایاں کر دیا گیا ہے۔

یوجین اے نیڈا نے متن کے ساتھ بطور ضمیمہ جات بہت کچھ شامل کرنے کو مستحسن قرار دیا ہے۔(۵) ریفارمسٹ ترجمہ قرآن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ضمیمہ جات اور وضاحتوں کی شکل میں مترجمین کا تعارف، چند بنیادی اصطلاحات کا مطلب، مترجمین کی خصوصی توجہ کا مرکز چند اختلافی نکات اور قرآن پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش بھی ترجمے کے ساتھ شاملِ کتاب ہیں۔ مذہبی علماء کے نقطہ نظر اور فتاویٰ سے قطع نظر اگر اس کوشش کو محض [illegible]ی سطح پر اور بطور مترجم پیشہ ورانہ ذمہ داری کے طور پر دیکھا جائے تو یہ قابلِ تحسین ہے۔ راقمہ کے ذاتی مشاہدے اور دائرہ علم میں اس طرح کی ایک اور کوشش ہے جسے راقمہ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ایک احسن کوشش قرار دیا ہے۔ اگرچہ وہ مثال ایک ادبی فن پارے کی ہے یعنی روسی زبان میں لیوٹالسٹائی کا ناول ''جنگ اور امن'' جسے شاہد حمید نے ترجمہ کیا۔ مترجم نے مصنف کا تعارف، اپنے منتخب متن کا تعارف اور وجوہات، اہم کرداروں کے نام اور تلفظ، اہم الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ وغیرہ شامل کیا کیونکہ ناول نہ صرف اجنبی زبان بلکہ بالکل برعکس ثقافت کا آئینہ دار تھا لہٰذا ان وضاحتوں کے بغیر تفہیم ممکن نہیں تھی یوں ترجمے کا مقصد پورا نہ ہو پاتا۔

مذکورالصدر ترجمۂ قرآن میں بھی چونکہ مترجمین محض ترجمہ قرآن نہیں بلکہ ایک ''اصلاحی'' ترجمہ قرآن پیش کر رہے تھے لہٰذا ان تمام ضمیمہ جات کا ہمراہ ہونا ضروری تھا۔ مذہبی بحث اور اختلافی مسائل سے ہٹ کر متن کی تفہیم میں یہ سعی قابلِ قدر ہے۔ کیونکہ یہ بات اسی مضمون میں پہلے مذکور ہے کہ ترجمہ لفظی ہو تب بھی ایک لفظ کے کئی معانی ہو سکتے ہیں اور ہر ترجمہ جزوی طور پر یا کلی طور پر درست بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔ ترجمے میں ابلاغ کی یہ کوشش ترجمے کے عمل میں خوبصورتی ہے کیونکہ ترجمے میں اور خصوصاً مذہبی کتب کے ترجمے میں تکمیلیت محض ایک خواب ہے اور مترجم اپنی جدوجہد کا آغاز ہی اس سوچ سے کرتا ہے کہ وہ مکمل تفہیم یا مکمل ابلاغ نہیں کر پائے گا۔ لہٰذا مقدس کتب کی قدامت کے باوجود بہت سے اہم مذہبی متون عدم تفہیم کا شکار رہتے ہیں۔ کئی مشکل الفاظ، تراکیب اور خیالات وضاحت کے طلبگار رہتے ہیں۔ یہ خزینے مدفون پڑے اپنے دریافت کیے جانے کے منتظر رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال حروف مقطعات ہیں۔ لہٰذا مذہبی تراجم ضروری ہیں چاہے ان کی اجازت ہو یا نہیں کیونکہ یہ ضروری بھی ہیں اور مشکل بھی۔ مذہبی ترجمے سے سب کبھی خوش نہیں ہوں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر مارک سٹراس نے اپنے مضمون "Four Key Principals of exegesis"(٦) میں مذہبی متون کے ترجمے کے چار بنیادی اصول پر روشنی ڈالی ہے۔موضوع کی مناسبت اور مطابقت کی بنیاد پر ضروری ہے کہ ان کے مضمون کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے۔exegesis سے مراد متن میں مصنف کے مقصود معانی کو سمجھنا ہے۔ترجمہ ایک پل ہے جو مصنف اور قاری کے زمانے اور زبان کے درمیان تفہیم آسان کرتا ہے یعنی کسی بھی عہد کا قاری/مترجم متن میں مصنف کے مقصود معانی کو اپنی زبان اور ثقافت کی مدد سے سمجھتا ہے۔چونکہ مذہبی متون میں اکثریت صدیوں سے موجود ہیں اور آئندہ آنے والی صدیوں تک ان کے رہنے کے امکانات یا بشارتیں بھی ہیں لہٰذا ہر دور کے قاری اور اصل مصنف یعنی خود خدا کے مقصود معانی کے درمیان خلیج حائل رہے گی۔ ترجمہ اسی خلیج کو پاٹنے کا عمل ہے۔ڈاکٹر مارک سٹراس نے اس خلا کو پر کرنے اور خلیج پاٹنے کے چار اصول بیان کیے ہیں۔

١۔ سٹراس کے پہلے اصول کے مطابق مصنف کا مقصود معنی ایک ہے اور بطور قارئین ہم نے اسی کو دریافت کرنا ہوتا ہے۔چونکہ ترجمے کے محرکات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ہر مترجم ایک ہی مقصد کے لیے مذہبی متن کا ترجمہ کر رہا ہو لہٰذا ان محرکات کے زیر اثر پہلے سے سوچے سمجھے اور طے شدہ معانی متن پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ا۔گویا ”ہمارا ہدف اصل مصنف کو اصل مصنف کے اصل سیاق وسباق میں سننا اور وہاں سے متن کے معانی طے کرنا ہے۔“ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ہر لفظ کے لیے متبادل زبان میں کئی الفاظ ہوتے ہیں لیکن ان کے معانی میں بہت معمولی سا اختلاف ہوتا ہے اور بعض اوقات مثبت یا منفی انداز میں مستعمل ہوتے ہیں۔یہ مترجم کا کام ہے کہ وہ معانی کی اس نازک اور دقیق تفریق کو اپنے سامنے رکھے اور سیاق وسباق کے مطابق مصنف کے مقصود معانی کو ترجمے میں تحریر کرے۔

٢۔ ڈاکٹر سٹراس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ متن کے معانی اس کی ”صنف“ (genre) پر منحصر ہیں۔مثلاً جو بھی ادبی صورت متن میں اختیار کی گئی ہو ترجمہ اس کے مطابق کیا جائے گا۔چونکہ کلام ربانی زبان و بیان کی اعلیٰ خوبیوں سے متصف ہوتے ہیں اور انسانوں کے لیے تفہیم سہل کرنے کی خاطر اس میں مختلف ادبی ذرائع اظہار اور تکنیک استعمال کی گئی ہوتی ہیں مثلاً مناجات، ضرب الامثال، حکایتیں، خطوط، قانونی مواد یا آئین، پیشن گوئیاں، تاریخ اور تاریخی بیانیے، ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو ایک ذہین اور خلاق قاری کی طرح متن اور اس میں موجود تمام فنی حربوں کی شناخت کرنی چاہیے۔ان کے متن کی مجموعی ساخت اور مفہوم کی تفہیم میں مقام و وظیفہ متعین کرے تاکہ ترجمہ کرتے ہوئے وہ ایک ایک فنی تکنیک کی اہمیت سے واقف ہو اور اسے ترجمے میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔کیونکہ دراصل متن میں اختیار کردہ ہر فنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرف اور ذریعہ اظہار ایک اکائی ہوتا ہے مگر وہ اس کل کو مکمل کرتا ہے جو پورے متن کی ساخت میں شامل ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا اصول یہ کہتا ہے کہ ترجمے کی کنجی اس کے سیاق و سباق میں ہے۔ یہ اصول دراصل پہلے دونوں اصولوں کا مجموعہ ہے۔ متن کے دو سیاق و سباق ہوتے ہیں، تاریخی اور ادبی۔ تاریخی سیاق و سباق میں تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور ثقافتی گویا براہ راست مخاطب قارئین کی پوری زندگی کے تار و پود شامل ہیں۔ ادبی سیاق و سباق کو بعض اوقات ''معاون متن'' بھی کہتے ہیں۔ یہ اصل متن کے گرد گرد پایا جانے والا متن ہے۔ یعنی وہ ذریعہ اظہار جسے تاریخی حوالے کو سمجھانے کے لیے اختیار کیا گیا۔ لہٰذا متن میں ایک لفظ کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ لفظ متن کی بنیادی اکائی ہوتا ہے جو جملوں کی تشکیل کرتا ہے یہ جملے پیراگراف بناتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ قیمتی اور قابل توجہ ہے۔ عربی سے ترجمہ کرنے کی صورت میں تو ایک ایک حرکت یعنی زیر زبر پیش تک کا خیال رکھنا ضروری ہے بصورت دیگر معنی میں زمانے اور جنس کی تبدیلی تک آ سکتی ہے۔

۴۔ مذہبی متون کے ترجمے میں مصنف کے مقصود معانی تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر سٹراس کا چوتھا اور آخری اصول یہ ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے محض متن کو اہمیت دی جانی چاہیے۔ متن اپنی ذات کے اندر ایک مکمل دستاویز ہوتا ہے۔ اس کے ترجمے میں کسی بیرونی دستاویز یا تحریر کو شامل نہیں کرنا چاہیے نہ ہی اس سے دلیل لینی چاہیے۔

مترجم یا قاری مذہبی متن کی عمودی تفہیم کرتا ہے یا افقی؟ دراصل یہ مرغولے دار تفہیم ہوتی ہے۔ کیونکہ متن کو سمجھنے کے لیے ہم اپنے نقطہ نظر، اپنی دنیا، اپنے تعصبات، اور ثقافتی سیاق و سباق کی مدد لیتے ہیں مگر ہم ان تمام عوامل کی بنیاد پر بننے والے معانی کی مدد سے متن کو نہیں سمجھتے نہ ہی متن میں اپنے معانی ڈھونڈتے ہیں۔ دراصل متن کے معانی کو ہم اپنی دنیا کے مطابق سمجھتے ہیں۔ یوں یہ ایک مرغولے کی شکل کا عمل ہوتا ہے۔

مختصراً یہ کہ مذہبی متون کے ترجمے کو ایک مشکل عمل قرار دیتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تفسیر و توضیح کے بغیر ان کو ترجمہ کرنا محض ایک خواب ہے کیونکہ ان میں ہر چیز قابل ترجمہ نہیں ہوتی۔ یعنی مترجم میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ متن کے مدعا و منتہا کو مکمل طور پر منتقل کر سکے۔

گویا مذہبی متن ایک مکمل سچ ہے جس کو ہم میں سے ہر کوئی اپنی اپنی ثقافتی اور عقائد کی وابستگیوں کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجتاً ہر ایک کے حصے میں سچ آتا ہے مگر مکمل سچ کی تفہیم اتنا آسان کام نہیں ہے۔ انسانوں کو اپنی یہ کوشش جاری رکھنی ہوگی کیونکہ سچ کی مکمل تفہیم اور تشریح ہی الہامی متون کا مقصد ہے اس سلسلے میں کوئی بھی رکاوٹ کھڑی کرنا تمام بنی نوع انسان کے ساتھ ظلم کے مترادف ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات

1-www.zemtv.com?2013?07?12?hasb-e-haal

(راقمہ کو یہ ترجمہ کتابی شکل میں دستیاب نہیں ہوسکا لہٰذا ٹی وی پروگرام کا حوالہ دیا گیا ہے)

2-Swanson,PL,"What is going on here? Chih-i's use(and abuse) of Scripture" Journol of the International Association of Buddist Studies, 1997, p 1-30

3-Edip Yuksel,Layth Saleh Al-shaiban, Martha Schulte Nafeh,"Quran: A Reformist Translation" p 17.www.prograssivemuslims.org

4-Nida Eugene.A "The Sociolinguistics of Translating Canonical Religious Texts" p.195, http//:id.erudit.org

5-Nida Eugene A. p.196

6-Strauss Mark,Dr, "Four Key Principals of Exegesis" biblicaltraining.org/library

☆☆☆

(مشمولہ "ترجمہ کاری"، ڈاکٹر فاخرہ نورین، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اردو، ۲۰۱۴ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غدار ترجمہ نگار

خالد محمود خان

کسی ریاست، قوم، اس کے عوام، افواج، قانون اور آئین کے خلاف اعمال کو عام طور پر "غداری" سمجھا جاتا ہے۔ غداری، حب الوطنی کا متضاد ہے۔ جب کوئی محب وطن نہیں ہوتا تو غدار کہلاتا ہے۔ ریاست کے ہر شہری سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی قوم، عوام، افواج، قانون اور آئین کی پاسداری کرے۔ محب وطن لوگوں کے لئے عزت یا انعامات و اکرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس غدار کے لیے ذلت، رسوائی کے علاوہ قید و بند کی صعوبتوں، اذیتوں سے لے کر سزائے موت تک کی قانونی گنجائش ہوتی ہے۔ غداری کا تصور ریاست کے رشتہ یا حوالہ سے نکل کر ترجمہ "Translation" کے علم تک میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں اطالوی نقاد بینی ڈیٹو کروچے Benedetto Croce نے ترجمہ کا تصور بے حد دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ ترجمہ کی شرائط یا اقدار میں الجھنے کی بجائے بڑے سپاٹ انداز میں ترجمہ نگار کو "غدار" کہہ کر ترجمہ سے متعلق اپنا نظریہ پیش کر دیتا ہے۔ وہ متن کو تحفظ اور دیانت دارانہ انداز میں پیش کاری کے انداز کو بالواسطہ طور پر حب الوطنی کے متضاد تصور میں پیش کر دیتا ہے۔ کروچے اپنے ترجمہ کے تصور کو بڑے شگفتہ انداز میں یوں پیش کرتا ہے۔

"Traddutore-traditore: The Translator is a traitor a falsifier of the original" [1]

"ترجمہ نگار ایک غدار ہوتا ہے۔ اصل کا باطل"

کروچے کا ترجمہ کا تصور بہت ہی جامع ہے، مگر بالواسطہ۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اسے براہ راست کہنے کی بجائے تمثیل کے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اسے کے تصور کی تشریح بھی براہ راست انداز اور بالواسطہ انداز میں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاسکتی ہے۔ وہ اپنے تصور میں اصل متن اور اس کے ترجمہ کی شرائط یا اقدار کی بجائے ترجمہ نگار اپنی توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ وہ ذریعہ کی زبان (Source Language (SL یا ترجمہ کی زبان (Target Language (TL کا کوئی حوالہ نہیں دیتا۔ متن یا ذریعہ کی زبان کسی تحریر کی اصل زبان ہوتی ہے۔ ترجمہ نگار اسے کسی دوسری یعنی ترجمہ کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ متن میں اصل مفہوم ترجمے تک کا سفر کرتا ہے۔ متن میں اصل مصنف متن کے مفہوم کو براہ راست بیان کرتا ہے۔ ترجمہ میں مصنف کے متن میں مفہوم کو ترجمہ نگار پیش کرتا ہے۔ ترجمہ کے عمل میں ایک ذہن کے خیالات دوسرا آدمی بیان کرتا ہے۔ خیالات ایک زبان سے اخذ کیے جاتے ہیں اور دوسری زبان میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سے نہ صرف لغت بدل جاتی ہے بلکہ لغت کی ثقافت بھی۔ مثال کے طور پر "ہنڈیا" کی لغتی ثقافت Lexican Culture دیگچہ، پین Pain، فرائنگ پین Frying Pain وغیرہ سے مختلف ہیں۔ اگر چہ ان تمام اشیاء کا نتیجہ ایک ہی ہے یعنی " کچھ پکانے کا برتن " مگر ہنڈیا" کی لغت کی ثقافت دیگر بالا اشیاء سے یکسر مختلف ہے۔ "ہنڈیا" کی لغت کی ثقافت میں مٹی، مٹی کا برتن بنانے والا، برتن کی خاص شکل، چولہا، آگ اور بہت سے اجزا شامل ہیں جو کہ "ہنڈیا" کی متبادل لغت میں نظر نہیں آتے، دیگچہ میں Pain، فرائنگ پین Frying Pain دھات سے بنے ہوتے ہیں اور ان کی لغت کی ثقافت "ہنڈیا" سے یکسر مختلف ہے۔ کروچے ذریعہ کی زبان SL اور ترجمہ کی زبان TL کے فرق میں اختلاف تلاش کرتا ہے۔ یہ معنوی فرق یا خلاء کروچے کے خیال میں "غداری Traitory" سے مشابہ ہے۔ ترجمہ نگار کی غداری ریاستی غدار سے بہت مختلف بلکہ بے حد مہذب ہوتی ہے۔ جو سزائیں ریاستی غداروں کو دی جاسکتی ہے وہ ترجمہ نگاروں کو نہیں دی جاسکتیں۔ بلکہ انہیں تو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ کروچے کا غداری کے تصور سے ذریعہ کی زبان SL سے ترجمہ کی زبان TL کے سفر میں فرق، خلاء وغیرہ مراد ہے جو کہ بہت ہی فطری عمل ہے۔ کروچے کے خیال میں ترجمہ اور متن میں اس کی بنیادی قدریں مشترک ہوتی ہیں۔ اس کے ترجمہ سے متعلق بالواسطہ تصور کو براہ راست انداز میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

ترجمہ نگار اور اس کی غداری کے ماحول میں اصل متن SL کے علاوہ ترجمہ کی زبان TL شامل ہوتی ہے۔ متن، اصل، اور ترجمہ متبادل ہوتا ہے۔ ترجمہ نگار متن کا اصل مفہوم، متبادل متن میں پیش کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران متبادل متن کا اصل متن مختلف نقوش اختیار کرسکتا ہے۔ یہی امکان کروچے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ترجمہ کے عمل میں مصروف ترجمہ نگار کو اپنے ممکنہ امکان کے تناظر میں غدار کہہ دے۔ دراصل کروچے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ذریعہ کی زبان SL میں متن کو ترجمہ کی زبان TL میں اس طرح پیش کیا جائے کہ اصل متن کے مفہوم میں کوئی کمی بیشی وقوع پذیر نہ ہوسکے۔ اس کے استعمال کو کم از کم کیا جائے بلکہ نا معلوم حد تک کم کر دیا جائے تاکہ کسی غداری کا ارتکاب نہ ہوسکے۔ متن کے ساتھ وفاداری Faithfulness، دیانتداری Fidelity کی اقدار کا اہتمام کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے۔ترجمہ نگاری کو غداری کے ادبی ارتکاب سے باہر نکالنے کے لئے جان ڈرائیڈن John Dryden کہتے ہیں:

"For translating poetry, the Translator should be a poet, should be a master of both the languages and should comprehend the "Spirit" of the original writter and confirm to the aesthetic laws of his own age" [2]

"شاعری کے ترجمہ کیلئے،ترجمہ نگارکوشاعر ہونا چاہیے۔اسے اصل مصنف کی روح کی تشریح کرنا چاہیے اوراپنے عصر کی جمالیات سے مطابقت پیدا کرنا چاہیے"

ڈرائیڈن شاعری کے ترجمہ نگار پر شاعر ہونے کی قدغن اس لیے لگاتا ہے کہ ایک شاعر ترجمہ نگار ہی دوسرے اصل شعری متن کے شاعر کی روح کو سمجھ محسوس اور پیش کرسکتا ہے۔چونکہ ڈرائیڈن شاعری کے سیاق وسباق میں خیال آرائی کرر ہاتھا اس لیے اس نے ذریعہ کی زبان اور ترجمہ کی زبان میں مکمل آہنگی پیدا کرنے کے لیے شاعر کو ترجمہ نگار تجویز کیا ہے۔مگر ڈرائیڈن اس حقیقت سے ہرگز بے پرواہ نہیں کہ ترجمہ کن لوگوں کے لیے کیا جارہا ہوتا ہے۔وہ اس امر پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور تجویز بلکہ تقاضا کرتا ہے کہ ترجمہ نگار نہ صرف ذریعہ کی زبان میں متن سے مطابقت میں ترجمہ کرے بلکہ اپنے عہد کی جمالیات کا بھی خیال رکھے۔یہ تقاضا ذریعہ کی زبان میں متن اور ترجمہ کی زبان میں متن کے مابین مضبوط ترین رشتہ ہے۔جس کے بغیر کسی کو کسی متن کے ترجمہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوسکتی۔ڈرائیڈن اپنے اس خیال کی مزید وضاحت اس مثال سے کرتا ہے جس میں وہ ترجمہ نگار کو مصور سے تشبیہ دیتا ہے۔

"The duty of Painter is to make his portrait, is to be resemble the original" [3]

"مصور کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی تصویر کو اصل سے ملتی جلتی بنائے"۔

ڈرائیڈن کے خیال میں مصور کی تصویر میں اس سے جو مشابہت یا جمالیاتی اشتراک ہے وہی دراصل ترجمہ نگار کا فن ہے یا فن کی معراج۔ہم ترجمہ نگاری کی اس ارفع ترین پیشکاری کو کروچے کے نظریہ "غداری" سے نجات کا باعث بھی ثابت کر سکتے ہیں۔کروچے نے اپنے نظریہ کو اس متضاد انداز میں پیش کیا جس کی اقدار کی وہ آرزو کرتا تھا۔اس نے وفاداری Faithfullness اور دیانتداری Fidelity کے متضاد غداری کے تصور پر ترجمہ کا خیال پیش کیا۔اس کا ترجمہ اور ترجمہ نگار کے متعلق فکری سنجیدگی میں شگفتگی بلکہ بے حد نفیس ظرافت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ میں غداری کا دوسرا اور متضاد پہلو ترجمہ کے عمل میں دانستہ بد دیانتی، خیانت یا سازش ہوسکتا ہے ۔فن کے خالص پن سے انحراف اور وہ بھی دانستہ، کسی سازش سے کیا کم رویہ ہوگا۔اس کا امکان دنیا میں مختلف مذاہب میں فرقہ پرستی کی زبان Sectarianism بھی ہوسکتا ہے۔مخالف فرقوں کو جھوٹا اور حقیر ثابت کرنے کیلئے مقدس تحریروں اور احکامات کو بگاڑ بگاڑ کر پیش کرنا علمی غداری ہی سے مترادف ہے۔اس طرح کے بدنیتی کے اقدامات سے فرقہ پرستی کو نہ صرف فروغ ملتا ہے بلکہ ہر فرقہ کے اندر Instrasect عصبیت Asbia کا عنصر بھی توانا ہوتا جاتا ہے۔بین فرقہ جات Intrasect تعصبات Prejudces کو ہوا ملتی ہے۔اس طرح تراجم میں سازش کی وساطت سے فرقہ واریت میں معاشیات سے زرسرمایہ Capital، سیاست سے اقتدار، سماج سے طبقہ اور ثقافت سے گروہی توانائی حاصل کرنے کے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔عیسائیت میں کم وبیش درج ذیل فرقے اپنی خاص شناخت رکھتے ہیں۔

Catholics:	Quakers
Protestans	Congregationalists
Protestant Episcopals	Presbytarians
Puritans	Methodist
Baptists	The Fundamentals
Euangelical	

انجیل مقدس کے ابتدائی تراجم یہودیوں کے لئے تھے، وہ یہودیت کو عیسائیت سے زیادہ مقدس، معتبر اور مستند ثابت کرتے تھے۔اسی وجہ سے تاج برطانیہ نے یہودیوں کے برطانیہ میں داخلے پر صدیوں پابندی عائد رکھی۔بعد میں عیسائی مترجمین بھی اس کام لگ گئے۔انہیں اس گناہ کی پاداش میں وطن بدری سے لے کر جان سے جانے تک کی سزائیں بھگتنا پڑیں۔ایذا رسانی اور سزائے موت کا اہتمام کلیسائی سازش کے ذریعے بادشاہ اور ملکہ کا دربار سرانجام دیتا تھا۔اس سارے متنازعہ اور عمرانی عمل کا عظیم الشان نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے تراجم کے متنازعہ اور متضاد ہونے کی خاصیت نے لوگوں کو تعقلیت Rationalism کی طرف راغب کیا۔عیسائیوں نے مذہب کی متفرق اور مختلف تشریحات کو مختلف فرقوں میں قبول کرلیا اور فرقہ واریت کی لعنت سے نجات حاصل کرگئے۔تاہم اکا دکا اور انفرادی اختلاف کی مثالیں فرقہ واریت سے متعلق ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔مگر وہ اس قدر کم ہوتی ہیں کہ کسی نقطہ نظر کا حصہ نہیں بن سکتیں۔اس طرح نظریہ سازی اب عیسائی دنیا میں کبھی ممکن نہ ہوسکے گی۔عیسائیت کے برعکس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں میں فرقہ واریت زیادہ سخت گیری Rigidity کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔ ہر فرقہ کے پیروکار اپنے فرقہ کو "مذہب "Religion سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ ایک ہی معاشرہ، ملک یا ریاست میں مختلف فرقے آپس میں متصادم نظر آتے ہیں۔ پوری کی پوری ریاستیں بھی کسی ایک فرقہ کی نمائندہ ہیں۔ سعودی عرب سنی فرقہ کی مکمل نمائندہ ریاست ہے۔ ایران اور شام شیعہ فرقہ کی نمائندہ ممالک ہیں۔ مسلمان فرقہ پرستوں کو چونکہ معاشیات کا سرمایہ اور سیاست کا اقتدار حاصل ہے اس لیے کسی قسم کی روشن خیالی کو گمراہی تصور کیا جاتا ہے۔

ترجمہ کے سازشی تصور اور اس پر عمل کرنے سے قبائلیت، گروہ پرستی، ذات پات اور نسل پرستی جیسی قبیح اقدار اور نظام جنم لیتے ہیں۔ اس طرح کے خائن ترجمہ نگار کو غدار کہنا ہی بنتا ہے۔ مگر عہد جدید میں اس طرح کی سازش کو بے نقاب ہونے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا اور جلد ہی کسی علمی ذریعہ سے نہ صرف اس کی تغلیط ممکن ہے بلکہ حقیقت بھی طشت ازبام ہو جاتی ہے۔ کروچے کا نظریہ "غداری" اپنی وسعت نظر Scope سے سازش کے ترجمہ کو کوئی استثناء فراہم نہیں کرتا۔

کروچے کے لفظوں میں ترجمہ کی قباحتیں اور بالواسطہ اظہار کردہ استحسانات، سب شامل ہیں نظریہ "غداری" ترجمہ کے متعلق خاص قسم کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ یہ خاص قواعد، اصول یا ضابطوں کا مجموعہ پیش کرنے کی بجائے واضح، صاف ستھرا اور نہایت جامع تصور کا مرقع ہے۔ ترجمہ کا یہ تصور اطلاقی یا عملی کی بجائے وضاحتی اقدار سے بھرا پڑا ہے۔

لانگ فیلو Long Fellow کی نظم طلوع صبح Dybreak انگریزی ادب کا شاہکار اثاثہ ہے۔ ترجمہ میں تحریف کی مثال کے لیے اس نظم کے متن اور علامہ اقبال کے ترجمہ کا موازنہ درکار ہے۔ لانگ فیلو کی نظم کا متن سادہ ترین مفہوم پر مبنی سطر بہ سطر ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا:

DAYBREAK

" A wind came up out of the sea, and said, "O mists, make room for me." It hailed the ships, and cried, "Sail on, Ye mariners, the night is gone." And hurried landward far away Crying, " A wake! it is the day" It said unto the

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

forest, "Shout! Hang all your lofty banners ourt!" It touched the wood-birds folded wing, And said, "bird, awake and sing." And said, "bird, awake and sing." And o'er the farms. " O Chanticleer, your clarion blow, the day is near." It whispered to the fields of corn, "Bow down, and hail the coming morn." It shouted through the belfry-tower, " A wak O bell! proclaim the hour." It crossed the churchyard with a sign, And said, " Not yet! in quiet lie." [4] Longfellow

اس نظم کو علامہ محمد اقبال نے اس انداز میں ترجمہ کیا ہے:

پیامِ صبح

اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا
جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کو
طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ "والنور" سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا
پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برہمن کو دیا پیغام خورشید درخشاں کا
ہوئی بام حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے
نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہر تاباں کا ؟
پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہوکر
چٹک اور غنچہ گل! تو مؤذن ہے گلستاں کا
دیا یہ حکم صحرا میں ،چلو اے قافلے والو!
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
تو یوں بولی نظارہ دیکھ کر شہر خموشاں کا
"ابھی آرام سے لیٹے رہو، میں پھر بھی آؤں گی
سلادوں گی جہاں کو ،خواب سے تم کو جگاؤں گی"

(اقبال)[5]

لانگ فیلو کے متن کا نثری ترجمہ سطر بہ سطر درج بالا متن میں موجود ہے۔ لانگ فیلو کے متن، نثری ترجمہ اور علامہ محمد اقبال کے ترجمہ کا سطر بہ سطر جملہ بہ جملہ موزانہ کیا جائے تو بظاہر یوں لگتا ہے کہ علامہ اقبال نے لانگ فیلو کی اس خوبصورت نظم کے ترجمہ میں تحریف وتصریح کی ہے۔ اقبال کا ترجمہ سے یہ تاثر نمایاں ہوتا ہے کہ لانگ فیلو نے اپنی نظم ہندوستان کی اسلامی ثقافت، ماحول کی لغت میں تخلیق کی۔ لانگ فیلو کی نظم تو بے حد سادہ سپاٹ انداز میں لوگوں کو بیداری کی صدا دیتی ہے۔ آخری چند سطروں میں کلیسائی لفظیات Imagery بھی ان کی ثقافت کا حتمی اثر ہے۔ علامہ اقبال کے ترجمہ کے تصورات میں عیسائی لفظیات کی بجاہ ہندوستانی اسلامی لفظیات کا استعمال کیا گیا ہے ۔خاص طور سے سورۃ "النور"، "موذن، برہمن کا تصور۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ علامہ اقبال نظم کے متن کا مفہوم ابلاغ کرنے کے لیے قاری یا پیغام کو وصول کنندہ کی ثقافت کی لفظیات Immagery استعمال کی ہے تا کہ کلی مفہوم Theme ابلاغ کرنے میں نہ تحریف ہو یا تصریح۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات

[1] Benedetto Croce: Quoted by Bijay Kumar Das-1- A Handbook of Translation Stuudies, New Delhi, 2005.

[2] John Dryden. Quoted by Abijay Kumar Das. Page 17 A Handbook of Translation studies, New Delhi, 2005.

[3] John Dryden, Quoted by A Hand book of Translation Studies P. 17, New Delhi, 2005.

[4] Longfellow, "Daybreak" مشمولہ "دو آتشہ"، مرتب: لیفٹیننٹ کرنل (ر) منظور احسن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، صفحہ نمبر ۱۱۔

[5] علامہ محمد اقبال، "پیغام صبح"، مشمولہ "دو آتشہ"، مرتب: لیفٹیننٹ کرنل (ر) منظور احسن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، صفحہ نمبر ۱۱۔

☆☆☆

(مشمولہ: ''فن ترجمہ نگاری''، خالد محمود خان، لاہور، بیکن بکس، ۲۰۱۴ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ: مسائل اور مشکلات کے مباحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کے بنیادی مسائل

ڈاکٹر ظ انصاری

ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں ہوئے ہیں جو لکھی اور بولی جاتی ہیں۔ مگر کسی قابل ذکر مصنف نے کوئی واضح کتاب یا ایسی مفصل تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی جو ترجمے کے بنیادی مسائل کو، ساری دشواریوں اور سہولتوں کو سامنے رکھ کر ان کا حل بتا سکے۔ اور جس سے ترجمہ کرنے والے کو آگے چل کر اپنی ڈگر صاف نظر آئے اپنی حدود اور اپنی ذمہ داریوں کا علم ہو اور جسے وہ اپنی تربیت کے لیے استعمال کر سکیں۔

زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لغت، صرف ونحو، معانی و بیان اور اصطلاحات پر ہر زمانے میں کافی توجہ کی گئی اور لسانیات کے ایک سے ایک لائق صاحب قلم نے الفاظ ولغات کو ایک ایک پہلو سے پرکھا۔ انہیں زیادہ مکمل اور مفید بنانے کی کوشش کی مگر ترجموں پر صرف رائے زنی کر کے سوالوں اور اصولوں کو ترجمہ کرنے والے کے ضمیر اور اس کی صلاحیت پر چھوڑ دیا۔ جو لوگ زبانوں اور ادبوں پر حاوی تھے وہ بھی محض اپنی کاوشوں کو نشان راہ کے طور پر چھوڑ کر چلے گئے۔ ڈاکٹر کیبل اور الکو نڈر ٹلر جنھوں نے اس مسئلے پر انیسویں صدی کے وسط میں دو اہم مضمون لکھے ہیں ان کا بیان ہے کہ لاطینی، عبرانی، یونانی، فرانسیسی اور انگریزی جیسی وسیع اور دولت مند زبانوں میں بھی اس موضوع پر کوئی کتاب یا مستقل تصنیف نظر نہیں آتی۔

ترجمہ کے مسائل پر کوئی بنیادی اصول وضع نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے مانے ہوئے مترجم ڈرائڈن کے بیان کے مطابق بہت کم ترجمے ہیں جو قابل برداشت ہیں کیونکہ ترجمہ کرنے کے لیے جس درجے کی ذہانت، سنجیدگی علم اور مشق کی ضرورت ہے وہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ترجمہ کرنے کے معاملے میں ہر شخص بے لگام ہے۔ جیسا اور جس کے جی میں آتا ہے ترجمہ کر ڈالتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجموں کی اہمیت

نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں، اور قدیم و جدید زبانیں اپنی ہم عصر زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں یہ عمل تاریخ تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔

ترجمے ہی کے ذریعے ایک مخصوص ملک، ایک جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات، اس کے علوم وفنون تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں اس لحاظ سے ترجمہ کی ذمہ داری کم از کم اتنی اہم ہے جتنی کسی کیمیاوی یا معدنی قوت کو ایک روپ سے دوسرے روپ میں ڈھالنے کی ہوتی ہے۔ تیل، کوئلے اور سونے کی کانیں جب تک زمین کے سینے میں دبی رہیں اس وقت تک وہ قومی دولت نہیں سمجھی جاتیں لیکن جب اس ذخیرے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے لگے۔ تو یہی عمل دولت کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور یہ دولت تمام عالم انسانی کی مجموعی دولت میں اضافہ کر دیتی ہے۔

سقراط، دی مقراطیس، اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئی تھیں، اگر عربی زبان کے ذی علم مترجم انہیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے۔ بوعلی سینا، ابن رشد، ابونصر فارابی کے کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انہیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ وفلسفے کے اگلے ورق کے لیے محفوظ نہ کر لیا ہوتا۔

ترجمہ بجائے خود ایک مستقل فن ہے اور اس علم یا فن میں اضافہ بھی ہے۔ جس کی تصنیف کا ترجمہ کیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ ترجمے کی بدولت اور اس کی خاطر اکثر اضافے کیے گئے ہیں۔ ہر زبان میں ترجموں کے ذریعے نئے الفاظ، اصطلاحات محاوروں اور کہاوتوں کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اول اول اکھڑے معلوم ہوتے ہیں، رفتہ رفتہ زبانوں پر رواں ہونے لگتے ہیں۔ کہیں اصل تصنیف کے الفاظ و عبارت کو، اس کے خاص لہجے کو ترجمے میں برقرار رکھنے کی کوشش میں یہ اضافہ خود بخود ہو جاتا ہے اور اسی ترجمے کی راہ سے اس زبان کی لغت اور طرز ادا میں نئے شگوفے پھوٹتے ہیں، نئے استعارے نمودار ہو جاتے ہیں جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ترجمے کے ذریعے علم انسانی میں اضافہ کرنے والوں کا قافلہ بڑا شاندار ہے اور بہت طویل ہے اس میں بڑے بڑے حلقے ہیں۔ اگلے سرے پر بوعلی سینا، درمیان میں والیٹر موجود ہیں تو پچھلے سرے پر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پسترناک، عرب وعجم کے علماء نے یونانی، ہندوستانی، فلسفہ، طب، ہیئت و نجوم اور داستانوں کا عربی میں ترجمے کر کے ان پر اپنی معلومات کے حاشیے بڑھا کر علمی دنیا سے خراج پایا۔ لاطینی و رومی کے ذریعے مشرق کو اور سنسکرت کے تراجم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذریعے مغرب کو اپنے زمانے تک کی تحقیقات سے باخبر کردیا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی k والیٹر نے شیکسپیر کا ترجمہ کرکے فرانسیسی زبان کے ذخیرے ہیں اور پسترناک نے روسی زبان کے ادب میں بیش بہا اضافے کیے، خود اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ علمائے مستشرقین نے مشرق کے کلاسیکی ادب اور علمی کتابوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔ اس دوطرفہ نے مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ دیں، باہمی خیر خبر کی گنگا دونوں سمتوں میں بہنے لگی۔

ترجے کی اس اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ جاگیرداری حکومتوں کے طویل زمانے میں ہم جابجا دیکھتے ہیں کہ دوسری زبانوں سے مختلف علوم و فنون کے ترجے کرانے کے لیے بڑے پیمانے پر انتظامات کیے جاتے تھے، چن چن کر علوم و فنون اور زبانوں کے علما بلائے جاتے تھے، زیادہ سے زیادہ ترجموں کی اشاعت کا سرکاری سطح پر انتظام کیا جاتا تھا۔ ترجموں کے کمیاب مخطوطے شاہانہ تحفوں اور ہدیوں میں بھیجے جاتے تھے۔ اشوک اعظم کے پاٹلی پترا میں، بنی عباس کے بغداد میں بنو فاطمہ کے قاہرہ اور اسکندریہ میں، عہد اکبری کے آگرہ میں اور بالآخر نظام کے حیدرآباد میں دارالترجمہ ملتے ہیں پھر ان مقامات سے جو ترجے نکلے ان کا اثر خود ان زبانوں کی ساخت پر پڑا، جن میں وہ ترجے کیے گئے تھے نہایت قریبی مثال کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کے ذریعے دور دراز کی زبانوں نے ایک دوسرے سے مل کر سنگم بنائے ہیں چھوٹے چھوٹے دھاروں کے پاٹ چوڑے کیے ہیں اور ان سے زیادہ گہرائی اور روانی پیدا کی ہے۔

اُردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت، ورنہ جب تک وہ کھڑی بولی کے رُوپ میں تھی اسے کسی بڑے قلمکار نے ادبی تصنیف کے قابل نہ سمجھا۔ بولی سے زبان تک کا طویل فاصلہ ایک صدی کے اندر طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ کہیں یہ ترجے کتابی صورت میں ہوئے اور کہیں محض خیال، استعارے اور اصطلاحوں کی صورت میں۔ تاریخ دہرانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ بہرحال یہ مسلمہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ بھاشاؤں کے ترجے اور ترجمانی کو اُردو زبان کی تعمیر اور تربیت میں بڑا دخل ہے۔

لیکن چونکہ ہماری زبان کو منظم علمی و لسانی کام کا ایک پرسکون زمانہ نصیب نہیں ہوا۔ اور با اقتدار طبقے کی سرپرستی میں پروان چڑھنے کی عمر طبعی اسے نہیں ملی۔ اس لیے ترجموں میں خاص طور سے غیر ذمہ داری برتی گئی ہے کہیں کہیں غیر زبانوں کا دخل، دخل بے جا بھی ہو گیا ہے۔ اور ایسے ترجے ہوئے ہیں جو زبان کو عوام سے قریب لانے کی بجائے اسے اور دور لے جاتے ہیں، ترجموں کو قابل فہم بنا دیتے ہیں۔

احتساب بڑی اہم چیز ہے۔ خاص طور سے زبان و ادب کے معاملے میں، کیونکہ یہ وہ میدان ہے جہاں بے اعتدالی کرنے پر کوئی قانونی گرفت نہیں ہوتی۔ ادب کے لیے سو طریقے احتساب کے مقرر ہیں علم معانی، علم بیان، عروض یہ سب پیمانے ہیں اور ان پیمانوں سے ناپ ناپ کر نثر و نظم کو دیکھا جاتا ہے۔ پھر تنقید کے ذریعے احتساب ہوتا ہے اور اس کے بعد خود تنقیدی اصول ہیں جو تنقید کا بھی احتساب کرتے ہیں۔ لیکن ترجمہ اگر کامیاب ہو تو بجائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے اس کے احتساب کا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا۔ اور نہ ایسے پیمانے بنا کر ترجمے کرنے والوں کے سامنے رکھے گئے جو احتساب کے کام آسکیں۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں سے قطع نظر خاص طور پر سے ہماری زبان میں ایسے ترجموں کی کوئی کمی نہیں جو زبان وادب میں اضافہ کرنے کے بجائے اسے اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ لب ولہجہ پر برا اثر ڈالتے ہیں، اصل تصنیف کی طرف رغبت پیدا کرنے کے بجائے اس سے نفرت دلاتے ہیں اور اُردو کے مزاج کو۔

زبان کا مزاج

ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہ مزاج پالینا ترجموں کے معاملے میں بہت اہم چیز ہے یہاں میں اس تفصیل میں نہیں پڑونگا کہ یہ مزاج کیونکر بنتا ہے لیکن مزاج کے لفظ سے غلط فہمی دور کرنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ زبان تقریباً ویسی ہی حقیقت ہے جیسے کسی قبیلے یا کسی خاص قوم کا مزاج (جسے ذرا بدل کر قومی تہذیبی روایت بھی کہتے ہیں) یہ مزاج تاریخی، جغرافیائی، سماجی اور معاشی اخلاط سے بنتا ہے اور کسی ایک خلط کی کمی بیشی اسی مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مشترکہ مزاج کے اندر رہتے ہوئے کوئی خاندان یا فرد اپنا الگ مزاج بھی رکھتا ہے اسی طرح ہر زبان کے اندر الگ الگ زبانیں بھی ہوتی ہیں۔ مشترکہ زبان پورے ایک سماج کی ہوتی ہے اور تاریخ کے ایک دور کی ہوتی ہے لیکن اسی ایک مشترکہ قومی زبان کے اندر الگ الگ لہجے ہوتے ہیں الگ الگ موضوعات کے، جداگانہ حلقوں یا گروہوں کے لہجے خطوں کی بولیاں طبقوں یا ایک ہی طبقے کی جداگانہ پرتوں کے رہن سہن اور حالات زندگی کے مطابق ان کی اپنی اصطلاحیں اور محاورے قبیلوں اور فرقوں کی تاریخی روایات کے مطابق تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے اور پھر ان سب کے بعد ایک مخصوص سماجی دور کی اصطلاحیں، ان سے ایک زبان کے اندر کئی زبانیں پیدا ہوتی ہیں اور اس وقت تک قائم رہتی رہیں جب تک سماج متفرق رہتا ہے۔

زبان کے مزاج کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے دو مثالیں کافی ہوں گی۔ فارسی زبان ایک ایشیائی زبان ہے جس کا تعلق آریائی زبانوں کے خاندان سے ہے۔ پہلوی زبان کے قدیم ترین جاگیرداری عہد کی اعلیٰ تہذیب کے بنیادی عناصر اس میں شامل ہوئے۔ بعد میں کیانی خاندان کی زبردست ایشیائی سلطنت کے شان وشکوہ نے نفوذ کیا۔ اور اپنی عظمت اور خوش حالی کے نشان چھوڑے۔ مرکزی ایران کی زرخیز وادی کی آب وہوا نے اسے لوچ بخشا۔ عربوں کے غلبے نے اس میں عربی الفاظ واصطلاحات کی کثرت اور سطوت پیدا کی۔ منگول، تاتار حملوں نے اور بعد میں طوائف الملوکی نے اس میں سوز وگداز کی کیفیت اور انفعالی اثرات پیدا کیے۔ قاچاری عہد میں انگریزی اور فرانسیسی تہذیب کے اثرات داخل ہوئے اور اب قومی آزادی کا عام شعور اور جمہوری تحریک اسے اپنے رُخ پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈھال رہی ہے۔

فارسی زبان وادب کو پچھلے ڈھائی ہزار برس میں کئی قوموں سے سابقہ پڑا ہے اور کئی زبانوں کے اثرات اس پر حاوی یا منتشر ہوتے رہے ہیں لیکن ان میں پائیدار اثرات وہی نکلے اور وہی زیادہ سے زیادہ مقبول رہے جو اس زبان کے مزاج کو راس آئے۔ اور جو اوپر سے تھوپے گئے تھے بیرونی دباؤ ہٹ جانے کے بعد وہ اثرات بھی زائل ہو گئے۔ آج عربی زبان کی ان مشکل اصطلاحوں کا گذر فارسی میں نہیں ہے جن کے لیے خود فارسی زبان کے الفاظ پہلے سے موجود تھے یا آسانی سے زبان پر رواں ہو سکتے تھے۔ البتہ کوشش کے باوجود ان عربی لفظوں اور اصطلاحوں کو زبان سے خارج نہیں کیا جا سکا جنہیں فارسی نے اپنا جزو بدن بنا لیا تھا۔

سیاسی اعتبار سے ایران پر فرانس کے مقابلے میں برطانیہ اور روس کا زیادہ اثر رہا لیکن دو سو برس برطانوی اثر کے باوجود فارسی زبان کا مزاج انگریزی کو اتنا قبول نہیں کر سکا جتنا اس نے فرانسیسی کو قبول کیا۔ جس طرح حروف تہجی اور آوازوں کی ادائیگی میں اپنی بہن سنسکرت کے ٹ۔ ڈ۔ اور ڑ کو قبول نہ کر سکی۔ اسی طرح اس نے انگریزی کی اصطلاحوں محاوروں اور الفاظ کے مقابلے میں فرانسیسی کو زیادہ قریب پایا اور اس کو اپنے اندر کھپا یا ایک حرف ژ کا نہیں بلکہ مزاجی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ جدید ترین فارسی میں ہمیں فرانسیسی بلکہ روسی کے بھی درجنوں الفاظ ملتے ہیں اور فارسی زبان وادب کا مغربی ادب سے جو رشتہ قائم ہوا ہے وہ فرانسیسی کے ذریعے سے ہوا ہے۔

اب جو لوگ فارسی میں انگریزی، روسی یا اُردو زبان سے ترجمہ کرنا چاہیں انہیں صرف لغت کا نہیں بلکہ فارسی زبان کی پچھلی تاریخ کا، اس کے ارتقاء کا اور اس کے مزاج کا بھی پورا احساس ہونا چاہیے تاکہ ان کا ترجمہ فارسی زبان وادب کو کچھ دے سکے اور اس کا جزو بدن بن سکے۔

مصری اخبارات بلکہ ناولوں تک میں اس قسم کے محاورے ملنے لگے ہیں۔ لعب بدور خطیر خطیر۔ یہ محاورہ [1] عربی زبان کے لیے بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ یہ محاورہ صرف لکھا جاتا ہے، بولا نہیں جاتا کم از کم گفتگو کی سلیس زبان میں اس کا رواج نہیں۔ انگریزی سے جو ترجمے عربی میں ہوئے ان میں ترجمہ کرنے والوں نے یہ پوری ترکیب یونہی اٹھا کر رکھ لی۔ اب ترجموں میں یہ جوں کی توں لکھ دی جاتی ہے لیکن عربی زبان کے مزاج میں حل نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ عربی زبان میں یہی مفہوم ادا کرنے کے لیے دوسری گنجائشیں موجود ہیں۔ ان گنجائشوں سے کام لیا جاتا تو انگریزی محاورے کا یہ مفہوم عربی زبان میں اضافہ کرتا اور اسی کا ایک حصہ بن جاتا۔ لیکن اب یہ محض کورانہ تقلید کا ایک نمونہ یا حصہ ہے اور بیان کے بھدے پن میں اضافہ کرتا ہے۔

[1] عربی میں یہ بالکل ایسا ہے جیسے ہم اپنی زبان میں کہیں ''وہ ایک بڑے گھیرے سے کھیلا۔'' جو ترجمہ ہے انگریزی کے He played great role کا۔ اور مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس نے زبردست خدمات انجام دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ایسی بات ہے جیسے ہمارے ترجمہ کرنے والے عموماً "It is going to be" کو لکھتے ہیں ''یہ ہونے جارہا ہے۔'' حالانکہ اُردو کی عام گفتگو میں اس کے لیے ''یہ ہونے والا ہے۔'' موجود ہے۔ کسی شعر میں ''ہونے والا ہے'' کی جگہ ''ہونے جارہا ہے۔'' رکھ کر دیکھا جائے یا مثلاً ''وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے۔'' کو ''مصیبت آنے جارہی ہے۔'' لکھیے تو معلوم ہوگا کہ منہ کا مزا خراب ہوگیا۔ یوں اگر دیکھیے تو ''ہونے جارہا ہے کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہیں جو ''ہونے والا ہے'' کا مفہوم ہے لیکن ''ہونے والا'' دراصل ہماری زبان کے مزاج کو راس آچکا ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ یہی حال ''میں دلچسپی لینے'' اور ''میں یقین رکھنے'' کا ہے جو لفظی ترجمہ ہے Taking Interest in اور Have faith in کا۔ حالانکہ ہمارے ہاں پہلے سے موجود تھا۔ ''سے دلچسپی ہونا'' پر ایمان لانا'' پر یقین کرنا'' اور یہی بہتر بھی ہے۔

یہ محض ایک لفظ کی تبدیلی کا حال ہے۔ پورے پورے جملوں کی ساخت اور اصطلاحوں کے استعمال میں زبان کے مزاج کا اور زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ اوپری معلوم ہوتے ہیں اور کسی طرح کھپتے نہیں۔

ایک زبان میں کئی کئی زبانیں

یہیں وہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتیں ہیں، اور یہ زبانیں صرف طبقوں یا فرقوں یا ملتوں یا قبیلوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے پر منحصر نہیں بلکہ ایک ایک فرد سے کردار اور ماحول کے مطابق ان میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ ایک ہی طبقے یا ایک ہی قومیت کے مختلف افراد ایک جگہ بیٹھتے ہیں۔ ایک شخص چوہدری یا صاحب اثر ہے۔ اور دوسرا ایک عام آدمی۔ تیسرا وہ شخص جس کی بات بات میں مزاح اور چاشنی ہے، چُلبلا پن ہے۔ چوتھا عالم فاضل قسم کی طبیعت رکھتا ہے۔ اور پانچواں خانہ زاد ملازم ہے کسی ناول میں ان کی ضیافت کا تذکرہ آجاتا ہے۔ وہ سب اپنی اپنی بات کہتے ہیں۔ اور ان کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو ظاہر ہے کہ صاحب نظر ادیب یا مصنف نے اپنی زبان میں وہاں جو جملے ان پانچوں کی زبان سے ادا کیے ہوں گے وہ پانچ الگ الگ جھلکیاں رکھتے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ بظاہر ان پانچ قسم کی گفتگوؤں کے الفاظ میں نمایاں فرق نہ ہو لیکن ان الفاظ کا پس منظر ان کے الفاظ کا لہجہ ان کی ادائیگی اور تلفظ اور پھر جملوں کی ساخت ایسی ہوگی جو ہلکے سے اشارے میں ہر ایک فرد کے اپنے مزاج اور اپنی سماجی حیثیت کا پتہ دے گی۔ یوں نہ تو ترجمے میں اصل کی تصویر دھندلا جائے۔

اگر ترجمہ کرنے والا ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کے راز سے ناواقف ہے تو وہ لفظ بہ لفظ لغوی ترجمہ کرتا چلا جائے گا۔ اور وہ جو مفہوم اور اشارے ان الفاظ کی پشت سے جھانک رہے ہیں ترجمے میں غائب ہوجائیں گے۔ اُردو کے اکثر ترجمے میں نے ایسے دیکھے ہیں جن میں یہ نقص ناقابل برداشت حد تک پایا جاتا ہے۔ نام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لینا ضروری نہیں لیکن جن لوگوں نے ناولوں کے قلم برداشتہ اور سب سے زیادہ ترجمے کیے ہیں ان کے یہاں یہ خامی خصوصیت سے پائی جاتی ہے۔ اور ترجمے کے وقار کو گرادیتی ہے۔

زبان کے اندر زبان کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ زبان ایک ہی ہے لیکن مختلف پیشوں، طبقوں اور مختلف زبانوں میں الفاظ و محاورات کا استعمال اور ان کی ادائیگی بدلتی رہتی ہے۔ بائبل (انجیل) کے کئی مستند انگریزی ترجمے ہوئے ہیں اور ترجمے لاطینی، یونانی، طبرانی اور انگریزی کے بڑے بڑے ماہرین نے مل کر کیے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ آسان انگریزی استعمال کرنے کے باوجود ان میں خاص خیال اس بات کا رکھا گیا ہے کہ کلام ربانی کی شان باقی رہے اور آج تک برابر اسی کی پابندی ہو رہی ہے۔ پروٹسٹنٹ تحریک جو بائبل کو علاقائی یا رائج دیسی زبان میں منتقل کرنے پر کفر کے فتوؤں کا سامنا کر رہی تھی اس نے بھی بائبل کا ترجمہ کرتے وقت اس نکتے کو ملحوظ رکھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جب عام انگریزی میں کسی کیریکٹر کی زبان سے ایسا جملہ ادا کرنا ہوتا ہے جس میں کلام ربانی کی سی شان ہو تو اسے انجیل کے انداز بیان سے ملا دیا جاتا ہے اگر کوئی شخص اس طرح حتمی یا آخری بات کرتا ہے گویا وہ ہر راز سے ہر معاملے سے اتنا واقف ہے کہ اس سے زیادہ باخبر ہونا ممکن نہیں۔ یا کوئی شخص اپنی گفتگو اور اپنے احکام میں مذہبی تقدس کی چاشنی یا اس کا سا رنگ ابھارنا چاہتا ہے۔ تو اس کی زبان سے ایسے جملے لکھے جاتے ہیں جو سادہ انگریزی میں ہونے کے باوجود اپنے گرد تقدس کا ہالہ رکھتے ہیں۔ اور انجیل کے جملوں، استعاروں، کہاوتوں اور ہدایتوں سے مشابہت پیدا کر لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص انگریزی سے انکا ترجمہ کرے تو اسے یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ کہاں سے اصل عبارت کا انداز انجیل کی زبان سے مشابہت رکھتا ہے اور جہاں سے جملوں میں یہ صورت پیدا ہوئی ہے۔ وہیں سے ترجمے کی عبارت میں بھی تبدیلی کرنی ہوگی۔ اور جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اسی زبان میں بھی اسی لب و لہجہ کے مقدس پر شکوہ، پُر تکلف الفاظ و محاورات تلاش کرنے ہوں گے۔ جن سے کلام ربانی کی جھلک ملے۔ مثلاً ایک شخص جوتشی ہے وہ کسی کا ہاتھ دیکھ رہا ہے اور اپنے معمول کو بتاتا ہے کہ یا تو تم فلاں فلاں پر ایمان لاؤ۔ ورنہ or less ye forever be condemned اب اگر ایمان کے بجائے انگریزی لفظ "Confidence" کا ترجمہ یقین بھروسہ یا اعتماد لکھ دیا گیا اور اس کے بعد والے جملے کا ترجمہ سیدھا سادہ کر دیا گیا کہ ''ورنہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو گے'' یا ''ہمیشہ تم دھتکارے جاؤ گے۔'' تو اصل عبارت کی غرض اور فضا غارت ہو جائے گی۔ کیونکہ انگریزی کا جملہ خاص انجیل کی عبارت کا حصہ ہے اور اسے ترجمے میں ایسے آنا چاہیے جیسے کوئی مقدس برگزیدہ ہستی ارشاد فرما رہی ہے اور ربانی احکام پہنچا رہی ہے۔ اس جملے کا بہتر ترجمہ یہ ہوگا ''ورنہ ابد تک معتوب رہو گے۔''

اسی طرح زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں مثلاً ایک زبان جدید ہے ایک قدیم ہے اور دونوں ایک ہی زبان کا حصہ ہیں۔ فرق صرف ماننے کا ہوتا ہے۔ میر انیس کی زبان آج بھی سند مانی جاتی ہے لیکن وہ گفتگو میں جو زبان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بولتے ہوں گے اور آج کی گفتگو کی زبان میں فرق نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ مثلاً وہ اپنے یہاں مجلس میں آنے والوں کی تواضع کرتے ہوئے کہا کرتے تھے "صاحبو جاگہ ادھر ہے۔" اب اگر اس زمانے کے شرفائے لکھنؤ کے جیسے کسی کردار کی گفتگو کا ترجمہ کرنا ہو "ہمیں حضرات ادھر تشریف رکھیے" نہیں بلکہ وہی لکھنا چاہیے۔ "صاحبو جاگہ ادھر ہے" تبھی ترجمے میں اصل عبارت کی چاشنی پڑے گی۔ قدیم وضع کے کرداروں کی زبان میں اور جدید انداز کی بات چیت اور گفتگو میں جو فرق ہمارے یہاں ہے ترجمے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑے گا ایک زبان کے اندر کئی زبانوں کی تیسری صورت یہ ہے کہ بودوباش اور معاشی حالات کا بھی زبان سے گہرا تعلق ہے۔ ایک شخص جس کا پیشہ کاشتکاری ہے چوپال میں تقریر کرنے کھڑا ہوگا تو چاہے اس کا موضوع بھی گرام سدھار سے متعلق کیوں نہ ہو لیکن اس کی زبان میں اور شہر سے آئے ہوئے گرام سدھار افسر کی زبان میں فرق ضرور ہوگا۔ دونوں کی اگر اصطلاحیں بھی ایک مان لی جائیں تب بھی جملوں کی ساخت میں پیچیدگی کے سبب انتر پڑے گا، ترجمے میں ان الگ دھاریوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے اول تو اصل عبارت ہی اس فرق کو ظاہر کرے دی گی۔ تاہم ممکن ہے یہ فرق بظاہر نہیں بلکہ زیادہ غور کرنے سے ہاتھ آئے تو ایسے موقعوں پر زیادہ غور کرنے اور دونوں کی تقریر کو الگ الگ الفاظ اور جملوں سے واضح کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ کچھ لوگ آسانی اور اختصار کے خیال سے یا بے پروائی سے اسی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ گرام سدھار کا افسر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے وہ بھی انہیں مسائل کو چھیڑتا ہے۔ زبان کی قواعد اور الفاظ کی صحیح ادائیگی کا اتنا ہی خیال رکھتا ہے اور ایک عام کھیت مزدور یا نیم خواندہ کسان بھی انہی الفاظ، عبارتوں اور جملوں کو بے تکلفی سے ادا کرتا ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ترجمے میں مصنوعی پن (یہ لفظ میں نے تصنّع کی جگہ لکھا ہے) پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل زندگی میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔

مثال لیتے ہیں: ایک معمولی کسان اجنبی شکاری کو اپنا مہمان بناتا ہے اور اس سے کہتا ہے "تشریف لے چلیے۔ نان شبینہ تناول فرمالیجیے۔" تو یہ اصل عبارت (Come in and have your dinner) کا صحیح ترجمہ ہوتے ہوئے بھی غلط ہے کیونکہ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ "ڈنر" کا لفظ ایک معمولی کسان کی زبان سے ادا ہوگا۔ تو اُردو میں کیا ہوگا اور کسی پڑھے لکھے جاگیردار کی زبان سے ادا ہو تو کیا ہوگا۔ تو اُردو میں کیا ہوگا اور کسی کو متوجہ کرنے کے لیے کئی قسم کے جملے موجود ہیں۔ اور یہ کئی قسم کے لوگ الگ الگ بولتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے غریب کھیت مزدور کے یہاں رات کا کھانا میز پر نہیں چنا جاتا ہے۔ لیکن برطانیہ کے دیہاتی کاشت کار سے یہ توقع کی جا سکتی ہے اور ہمارے جاگیردار اور کھاتے پیتے زمیندار گھرانوں میں "دسترخوان چنا جا چکا ہے۔" یا "تھال لگ گیا ہے" یا "ما حضر تیار ہے" یا "نان شبینہ حاضر ہے۔" ایسے جملے ہیں جو مختلف معاشرت کے لوگوں میں علاحدہ علاحدہ بولے جاتے ہیں۔ ان کئی زبانوں کا امتیاز سمجھنا اور انہیں حسب موقع ترجمے میں استعمال کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ اصل کا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔ ایسا ہی "کرکرا پن" وہاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدا ہوا ہے جہاں روس کے شاعر اعظم ''پوشکن'' کے ایک مشہور افسانے کا عنوان انگریزی میں ''اسٹیشن ماسٹر'' دیا گیا ہے۔ اور اُردو میں جوں کا توں لے لیا گیا۔ روس میں وہ کردار اس چوکی کے غریب، تباہ حال اور بے بس، تھکے ہارے منشی کی نمائندگی کرتا ہے جو ریلوں کا وسیع جال بچھنے سے پہلے کسی گاؤں یا کارواں سرائے کے تانگے پر بدلی کے گھوڑے مہیا کیا کرتا تھا۔ کوئی افسر اسے ڈانٹتا ہے۔ کوئی مالدار بیوپاری اسے ذلیل کرتا ہے۔ کسی کو اچھے گھوڑے درکار ہیں اور وہ مہیا نہیں کرسکتا۔ آخر ایک جوان افسر چالاکی سے اس کی بیٹی اغوا کر کے چل دیتا ہے۔ یہ آدمی شروع 19 ویں صدی کے روس میں تو تھا، انگلستان میں نہیں تھا، وہاں اسٹیشن ماسٹر تھا۔ (ریلوے اسٹیشن کا بڑا افسر) ہندوستان کا اسٹیشن ماسٹر تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے خوشحال، بااثر اور افسرانہ شان کا آدمی ہوتا تھا۔ اب اگر ''پوشکن'' کے اس کردار کو ہم انگریزی کی تقلید میں اسٹیشن ماسٹر لکھ دیں تو افسانے کی رُوح فنا ہو جائے گی۔ وہ ہمارے یہاں ڈاک چوکی کا منشی ہے اور یہی نام دیا جانا چاہیے تھا۔

یہاں ایک نقل کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قرآن کا ترجمہ مختلف مفسرین نے کیا ہے۔ ان میں سب سے آسان اور روزمرہ کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا سمجھا جاتا ہے۔ موصوف شستہ اور بامحاورہ زبان لکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ ''امہات الامۃ'' لکھتے وقت بھی اسی صفت کو برت گئے اور بُرے پھنسے۔

رسول اللہ ﷺ کے راتوں رات مکہ سے باہر تشریف لے جانے کا تذکرہ یوں کیا کہ ''وہ راتوں رات ''سٹک گئے'' یہ ''سٹک'' کا لفظ اگرچہ عوام کی بول چال میں استعمال ہوتا ہے لیکن پیغمبر کی شان میں یہی لفظ ایک گستاخی سمجھا گیا۔ اور اسی طرح کے الفاظ کی بنا پر ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کے خلاف عام جلوس میں تجویز پاس ہوئیں اور بہت شور مچا۔

''سٹک گئے'' یا ''سرک گئے'' ''کھسک گئے'' کی جگہ ''نکل گئے'' یا ''باہر تشریف لے گئے'' یا ''چلے گئے'' یا ''روپوش'' ہو گئے بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ اور ان میں آخری لفظ اگرچہ اتنا عام فہم نہیں تھا پھر بھی اس شخصیت اور خاص حالات کے بارے میں یہی لفظ زیادہ مناسب رہتا۔

نقل اور آرٹ

ترجمہ بھی اسی طرح اصل کی ایک نقل ہے جیسے ''بیلے کا رقص یا مصوری یا اداکاری، بیلے میں بدن کے لوچ سے مصوری میں مو قلم سے، اداکاری میں جسم اور آواز کی حرکات و سکنات سے اصل خیال کا ہوبہو ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور ترجمے میں زبان دانی کی صلاحیت سے یہی کام لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کی کوئی نقالی مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نقل کرنے والے کا ''جذبۂ اندروں'' شامل نہ ہو وہ اداکاری بے رُوح ہوگی جو اصل کردار کو اپنے اندر جذب کر کے اور خوب رچا کر پھر سے ایک نئے وجود کو جنم نہیں دیتی جس میں اصلیت اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے اور نقل کا یا نقل کرنے والے کا اپنا وجود نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

عربی داستانوں میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ ایک شخص کی تصویر کو بے مثل قرار دیا گیا اور وہ تصویر شاہی دربار کے دروازے پر لٹکا دی گئی کہ اگر کسی کو اس کے بے مثل ہونے میں شبہ ہو تو وہ دلیل پیش کرے۔ تصویر یوں تھی کہ ایک انسانی ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے۔ کچھ انگور پکے ہیں کچھ کچے، تصویر کا آویزاں ہونا تھا کہ طوطوں اور چڑیوں نے اس پر ٹھونگیں مارنی شروع کر دیں لوگوں نے اسے مصوری کا کمال جانا کہ جانور بھی دھوکا کھا گئے اور سچ مچ کا انگور سمجھے، لیکن ایک شخص دربار میں حاضر ہوا اور اس نے مصور کے کمال کو چیلنج کر دیا۔ اس نے کہا کہ انگور کے خوشے تو واقعی انگور نظر آتے ہیں لیکن انسانی ہاتھ کی مصوری میں ضرور کوئی نقص رہ گیا ہے ورنہ چڑیوں کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس پر ٹھونگیں ماریں یعنی تصویر کے ایک حصے پر مصور کی توجہ اتنی زیادہ رہی کہ دوسرا حصہ نظر انداز ہو گیا۔ اور نقل اتارنے میں فرق آ گیا۔ یہ دلیل مان لی گئی، اور تصویر اتار دی گئی۔

نقل وہی بے عیب اور اعلیٰ ہے جو اصل کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو من وعن نظر کے سامنے کر دے اور وہ بھی اس طرح کہ جو امکانات اصل میں موجود ہیں بظاہر نظر نہیں آتے وہ بھی نظر آنے لگیں۔

ترجمہ کرنے والے کو اصل کی نقل میں ایک مصنف اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے اس کے ساتھ تالیاں بجانا، قہقہے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے۔ اور یہ سب کر لینے کے باوجود یوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا پڑتا ہے جیسے طوطا ادوان پر چلتا ہے، تب جا کر ترجمہ ایک آرٹ بنتا ہے اور تخلیقی درجہ حاصل کرنے کے قریب پہنچتا ہے۔

مگر دوسرے فنون لطیفہ میں اور اس ترجمے میں جو آرٹ اور تخلیق کا درجہ رکھتا ہے ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ شاعری اور مصوری میں مبالغہ ایک حسن ہے۔ حقیقت کو لفظوں اور تصویروں میں اصل سے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور جس پہلو پر دیکھنے یا سننے کی توجہ مرکوز کرنی ہے اسے خوب ابھار دینا یا اسے اصلیت سے بالکل مختلف شکل میں اس طرح رکھنا.... کہ اصل تصویر یا اصل واقعے پر نظر جانے کے بجائے اس کے امکانات اس کے اثرات، اس کی تاثیر پر نظر جائے۔ یا ایسا باریک نقاب ڈال دینا کہ مخصوص گوشوں کی حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ جو بات اصل کی محض نقل نہیں ہو سکتی تھی وہ آرٹ کی اس تخلیق میں حاصل ہو جاتی ہے کہ اس میں اصل کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نئے وجود کو یا نئی تصویر یا واقع کو جنم دینا ہوتا ہے جو اصل سے تعلق بھی رکھتا ہے۔ اور بے تعلق بھی۔ فنی تخلیق کے اس مقصد کی خاطر ہر ایک فنکار کو اپنے اپنے میدان میں کافی آزادیاں ملی ہوئی ہیں۔ وہ ''ناز وغمزہ'' کی بجائے۔ ''دشنہ و خنجر'' کہہ سکتا ہے اور علم ودانش کے مفہوم کے لیے الّو کی محض دو گول آنکھیں بنا سکتا ہے۔ ذرات کو آفتاب سے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موٹے کوشاہیں سے بھڑا سکتا ہے۔لیکن ترجمہ کرنے والے کواصل کی نقل اوراصل کے سارے امکانات پیش کرنے کے لیے یہ تمام آزادیاں میسر نہیں ہوتیں۔وہ اپنی طرف سے نہ مبالغہ کرسکتا ہے نہ الفاظ کی رنگ آمیزی۔اس کا فرض ''کج دارومریز'' میں ہے کہ دوڑ اور پیالہ چھلکنے نہ پائے۔

یہ فرض ادا ہونے کے معنیٰ ہیں کہ ترجمہ محض ایک بے رُوح نقالی نہیں رہ گیا بلکہ اصل کی ایسی نقل بن گیا جو اصل کے سارے امکانات بے کم وبیش اپنے اندر رکھتی ہے۔لیکن یہ ہو کیوں کر؟

اس کے لیے ضروری ہے کہ ترجمے میں اصل کا پوراخیال اور مفہوم، اسی لوچ یا نرمی، اسی سختی یا درشتی۔اسی جاذبیت یا دلکشی اوراسی بے کیفی یا بے رنگی کے ساتھ اسی احتیاط کے ساتھ آئے اور ویسا ہی معیارزبان وبیان کا بھی ہو۔

خیال ومفہوم اوراسکا جامہ

دراصل ترجمے کا بنیادی منشا ہی اصل کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہےاوراسی منشا کو پوراکرنے کے لیے زبان اور بیان کا پوراپوراعلم اور مکمل اندازہ ضروری ہوتا ہے۔

اس کی کم ازکم تین شرطیں ہیں:

ا۔جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہےاس زبان کی لغت سے،اصطلاحات اور محاوروں سے،کسی قدرادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھراہواذوق ضروری ہے۔یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر بھی ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو،یاوہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اسی طرح بے تکلف اور بے تکان لکھ سکتا یا بول سکتا ہو۔بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے۔اگر کتابی علم بھی نہ ہوا تو خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔اصل عبارت کونوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا۔اوروہ اس ترجمے میں منتقل کرنے کی وجہ سے غافل رہے گا۔

اصل تصنیف یا اصل عبارت کی زبان کا علم صرف کتابی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہوتواوراچھا ہے۔جتنازیادہ ہواتناہی اچھا۔لیکن کم ازکم اتناضرورہو کہ اصل عبارت سے سیاق وسباق کوسمجھ سکے۔یہ پاسکے کہ فلاں قسم کا لفظ نظرانداز کرکے فلاں مصنف نے یہ لفظ خاص اس مقصد سے رکھا ہے۔یہ مقصد اگر سمجھ میں آجاتا ہےتو پھراس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔اس مقصد کوکسی ہم پلّہ لفظ سے پوراکیاجاسکے گاورنہ نہیں۔

لفظ اورلغت:

ہم پلّہ لفظ کے سلسلے میں ایک نکتہ بے حداہم ہے وہ یہ کہ کسی ایک زبان کے الفاظ کے ہم پلّہ لفظ دوسری زبان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے چھ سات فیصدی سے زیادہ نہ ہوتے ہوں وہ بھی اسماء اور افعال میں سینکڑوں الفاظ جو ہم روزمرہ بولتے اور لکھتے ہیں۔ اور جو عام لوگوں کو زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اگر غور کیجیے تو ان کے مراوف لفظ بالکل اسی قدو قامت، اسی مفہوم اسی کیفیت اور اسی چاشنی کے لفظ انگریزی جیسی وسیع اور مالا مال زبان میں نہیں ملیں گے۔ مثلاً عیب، ہنر، سلیقہ رچاؤ، چاٹ، الاؤنشہ، جوڑتوڑ، آنکھ کا پانی، آڑ، یہ سب معمولی استعمال کے لفظ ہیں اور لغت میں ان سب کے ہم معنی الفاظ بھی دیئے ہوئے ہیں مگر بعض خاص پہلو ایسے سینکڑوں الفاظ میں ہیں جو ان کے ہم معنی انگریزی لفظوں میں نہیں ہوں گے۔ اور اسی طرح ہم معنی انگریزی لفظوں کے اور پہلو ایسے ہوں گے جو ان ہندوستانی لفظوں سے سروکار نہیں رکھتے اس لیے ہر ایک ہم معنی لفظ لازمی طور سے ہم پلہ لفظ نہیں ہوتا۔ یہ نہ تو اردو کی کوتاہی کا ثبوت ہے نہ انگریزی کی وسعت کا مثلاً چاٹ، چٹخارا، چسکا اور ٹھرک قریب قریب ہم معنی الفاظ ہیں، لیکن ہر ایک میں کتنی برابر فرق پڑتا ہے۔ کمپرومائز (Compromise)۔ عام استعمال کا ایک انگریزی لفظ ہے جسے ہم اپنے روزمرہ میں شمار کرنے لگے ہیں۔ لیکن انگریزی میں اس کا مفہوم سمجھوتے کے علاوہ بھی ہے یعنی.... پر آنچ آنے دینا یا جوکھم لغت سے مدد لے کر بھی ہم اس کا کوئی ہم پلہ یا برابر کا لفظ نہیں چن سکتے۔ چنانچہ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی زبان دوسری زبان کی لغت پیش نظر رکھ کر نہیں بنائی گئی اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر زبان کے بیانیہ الفاظ، محاورات، روزمرہ اور صفات (اسی نہیں) خود وہیں کے سماجی حالات، تاریخی دور یا تہذیبی ارتقاسے پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے معنی میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ دو یا کئی زبانوں کے لفظ کا ہم معنی ہونا مگر ہم پلہ نہ ہونا ایک تو یہ جتاتا ہے کہ لفظ کے مفہوم لفظ سے ادا کرنا اکثر اوقات غلط ہے اور دوسری طرف کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ایک خاص مفہوم جسے ایک ترقی یافتہ زبان میں یوں ادا کیا گیا ہے۔ وہ دوسری ترقی یافتہ زبان میں کسی طرح ادا کیا ہی نہیں جا سکتا ہر ایک ترقی یافتہ زبان میں نازک سے نازک مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔

پھر وہ کیا شے ہے جو نازک سے نازک مفہوم کو ادا کر سکتی ہے؟ وہ ہے ترتیب الفاظ اسی بات کو ایک جملے میں کہا جا سکتا ہے کہ اہمیت لفظ کی نہیں ہوتی اہمیت لفظوں کے تال میل کی ہوتی ہے، یہاں بھی فرد بے جماعت یوسف بے کارواں ہے۔ جو منصب کسی لفظ کو جملے یا عبارت میں حاصل ہے۔ وہی منصب اس کے معنیٰ اور اس کی حیثیت طے کرتا ہے۔ لفظ کا ہم پلہ ہونا ترجمے کی خرابی نہیں بلکہ ترجمے کی خوبی ہے الفاظ کی ترتیب اور اس ترتیب سے پیدا ہونے والے خاص مفہوم کا ہم پلہ ہونا اس لیے ترجموں کو لفظوں کے تال میل، ان کی بندش اور جملے کے مفہوم کی کسوٹی پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو آوازوں کے اتار چڑھاؤ یا کھٹکے کی کیفیت بھی ترجمے میں اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کا مشہور افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' ایک دیوانے کی بڑ ہے۔ مگر بامعنی بڑ ہے اپنی آواز کی بدولت وہ پنجاب کے بٹوارے کے خلاف ایک ہولناک چیخ بن گئی کسی بھی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو ''مونگ کی دال، اور گالیوں کے الفاظ کا ترجمہ نہیں۔ ان لفظوں کی صوتی کیفیت کا بعینہ کسی صورت سے ریکارڈ کرنا لازم ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں اچھے ترجموں کو لغت سے صحیح یا عمدہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو عام طور سے لغتوں کی ترتیب ان غیر ملکیوں کے ہاتھوں ہوتی ہے جو دونوں یا تینوں زبانوں میں کوئی ایک مادری زبان رکھتے تھے اور دوسری یا تیسری سے محض کتابی مگر گہری واقفیت، مادری زبان اور علمی زبان کی آگاہی میں یوں بھی بڑا بل ہے۔ اُردو اور انگریزی کے الفاظ سے متعلق جتنے درجنوں لغت ہمارے پاس موجود ہیں ان میں مولوی عبدالحق اور پلاٹس (Plates) کا لغت سب سے مستند سمجھے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو ان دونوں لغات سے اکثر واسطہ پڑتا ہے وہ بے بسی سے بار بار دوچار ہوئے ہوں گے۔

لغت کا کام اگر ترجمے میں مدد دیتا ہے تو ایک زبان سے دوسری یا تیسری زبان کا کوئی ایسا لغت مکمل اور مستند اور بے عیب نہیں ہو سکتا جسے صرف ہم زبان لوگوں نے مل کر تیار کر دیا ہو۔ مثلاً اگر روسی یا اُردو روسی ترجمہ کرنا ہو تو صرف اسی لغت پر تکیہ کرنا چاہیے جسے دونوں اہل زبان فریقوں نے باہمی کوشش سے ترتیب دیا ہو۔ اور یوں بھی ایک سے زیادہ زبانوں کا لغت اسی صورت سے ترتیب دیا جانا چاہیے۔

مختصر یہ کہ لغت کام تو دیتا ہے مگر کم۔ جو چیز لغت سے زیادہ کار آمد ہے وہ ہے اس زبان کے ادب کا وسیع اور عام مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر میرے سامنے اُردو کا ایک تازہ ترین ترجمہ رکھا ہوا ہے جس کا موضوع سیاسی بحث ہے۔ اس کے مترجم خود ایک سیاسی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ اپنی زبان پر انہیں کافی قدرت حاصل ہے اور وہ اپنی زبان میں بے عیب لکھ اور بول سکتے ہیں لیکن ترجمے میں کئی گوشے خالی پڑے ہیں اصل کتاب روسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ وہاں سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ انگریزی سے اُردو میں لائی گئی۔ انگریزی عبارت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے (Equilibrium) پر قائم ہے اب اگر لغت کھول کر دیکھا جائے تو ''آ کویلی بریم'' کے معنی ملیں گے۔ ''توازن'' غیر جانبدارانہ حالت وغیرہ۔ ذی علم ترجمہ کرنے والے نے یہی لفظ وہاں اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ حالاں کہ اگر مفہوم محض توازن یا غیر جانب دارانہ ہوتا تو Balance یا State of neutrality لکھا جا سکتا تھا۔ اصل مصنف نے ان الفاظ کو رد کر کے خصوصیت سے Equilibrium لکھا تو اس کے پورے مفہوم میں کچھ اور بھی شامل ہے۔ کیا شامل ہے؟ یہ بات پوری عبارت سے اور اس لفظ کے سارے امکانات کو جاننے سے یہی معلوم ہوتی ہے اس میں غیر جانب داری اور توازن کے ساتھ برادرانہ تعلقات اور ہم آہنگی کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ایسے موقعے پر ''اکوی لی بریم'' کا ترجمہ اگر جذب یا باہم اور ہم آہنگی کیا جائے تو ترجمہ مصنف کے مفہوم کو پوری طرح ادا کر سکے گا۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے۔ اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔ تصنیف کی زبان سے کہیں زیادہ قدرت اس زبان میں ہونی چاہیے، جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ یہاں تک کہ اس زبان میں خود لکھ لینے کی اچھی خاصی مشق اور اس زبان کا پہلو دار علم ہونا چاہیے۔ پہلو دار علم سے مراد یہ ہے کہ اس کے ماخذ کا جہاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں سے وہ سیراب ہوئی ہے ان سرچشموں کا، اس کے نشیب وفراز کا علم ہو، الفاظ کہاں سے آئے، کیوں کر آئے، ان کے لغوی معنے کیا تھے اصطلاحی معنی کیا ہو گئے اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے روزمرہ اور محاورے کیونکر بنے، انہیں مختلف موقعوں پر کیسے کیسے استعمال کیا گیا۔ اور آئندہ کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان میں مختلف اوقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اور ان تبدیلیوں کی بنیاد پر اور کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ ان کی مدد سے اور نئے سانچے کیسے بن سکتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کتنے مفہوم اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اور ایک ہی مفہوم کو جب مختلف نسبتوں سے ادا کیا جائے تو اس کے لیے کتنے کتنے مختلف وزن کے الفاظ موجود ہیں۔

ارتقائی عمل:

یہ باتیں جاننے کے لیے عمر نوح کی ضرورت نہیں اور نہ یہ کہ پہلے ایک زبان کو آخری تہ تک کھنگال ڈالنے اور غوطے لگانے سے فراغت حاصل کر لی جائے تب جا کے آدمی ترجمے کے لیے قلم اٹھائے۔

کسی زبان کا اس درجہ علم ہونا دراصل ایک ارتقائی عمل ہے۔ یہ دھیرے دھیرے ہوتا رہتا ہے اور اگر توجہ رکھی جائے تو ترجمہ کے دوران ہی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ خود ترجمہ اس سلسلے میں تربیت گاہ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اس بوجھ کو غیر ضروری سمجھ کر ڈال دیا جائے تو کبھی نہیں اُٹھتا۔ لوگوں کی عمریں گزر گئیں ترجمے کرتے کرتے لیکن اب تک اس قابل نہیں ہوئے کہ جس زبان میں روزانہ ترجمہ کرتے ہیں۔ اسی زبان کے الفاظ، محاورات، ترکیبوں، استعاروں اور تلمیحوں کا پورا مفہوم سمجھ سکیں، خود لکھنا تو در کنار۔

اس ارتقائی عمل کی پہلی منزل یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس زبان کے ادب سے بنیادی واقفیت ہو اور برد جاری رہے جتنا ممکن ہو قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ بڑھایا جائے۔ ادب ایسا وسیع میدان ہے کہ اس میں مختلف موضوعات کسی نہ کسی سمت سے آ ہی نکلتے ہیں اور اس طرح مختلف موضوعات اور شعبوں سے مثلاً معاشیات تاریخ، فلسفہ، عمرانیات، جغرافیہ اور مذہبیات، سیاست وغیرہ کی اصطلاحوں اور ترکیبوں سے جان پہچان بڑھتی ہے، بیان کی نئی نئی صورتیں، نئے نئے اسلوب معلوم ہوتے ہیں اور پھر آسانی ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کا رجحان جدھر زیادہ ہو وہ اسی طرف رُخ کرے۔ اور اسی موضوع کی کتابوں کا اور مباحث کا مطالعہ اختیار کر لے جب یہ صورت ہو جاتی ہے تو اس خاص شعبے یا موضوع کی کتابوں کا ترجمہ آسان نظر آنے لگتا ہے۔ اور پھر جب اس موضوع پر مستقل تصانیف یا مضامین کا ترجمہ کوئی کرنے بیٹھے تو اسے یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ جن جن الفاظ کی خاص طور سے اس کو ضرورت پڑتی ہے یا جن سے پہلا واسطہ پڑتا ہے اگر ان کے مترادفات رواں نہیں ہوئے ہیں تو ساتھ ساتھ ان کی تخلیق کرتا جائے، ان کی ایک فہرست تیار کر لے جس پر بار بار رندا پھیرتا رہے تو خود ہی اگلی منزلیں آسان ہوتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چلی جائیں گی۔ ورنہ روزمرہ استعمال کے لفظوں کی طرف سے بھی غفلت برتنے کی عادت ہو جائے گی۔ یہ عادت ترجمے کے کام پر برا اثر ڈالتی ہیں اور ادنیٰ غلطیوں سے بھرے ہوئے کڈھب ترجمے ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً ابھی چندروزہ ہوئے کئی زبانوں سے باخبر ایک ترجمہ کرنے والے نے ٹیگور کے ڈرامے ''اچلیاتن'' کا ترجمہ لکھا ہے ''لڑکھڑاتا ہوا گھر'' ظاہر ہے کہ یہ بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ یہ بے پروائی مستقل ہو جائے تو نادانی اور بے خبری بن جاتی ہے۔ ''اچلیاتن'' بنگالی لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ گھر جس کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی ہوں، بہت بیٹھ چکی ہو۔ اگرچہ بظاہر در و دیوار سے محروم نہ ہوا ہو لیکن جلد ہی کھنڈر بننے والا ہو۔ لہٰذا ''اچلیاتن'' کا ترجمہ اگر ایک نئی ترکیب یا دو لفظوں میں کرنا تھا تو اسے ''ڈھیتا ہوا گھر'' یا ''گرتا مکان'' کہہ سکتے تھے۔ ''لڑکھڑاتا'' وہ جو چلتا ہے۔ لڑکھڑانا، ڈگمگانا، ڈانواں ڈول ہونا اور ڈھینا یا بیٹھنا اپنے ساتھ الگ الگ نسبتیں رکھتے ہیں۔ کسی لفظ کی نسبت شرابی اور مدہوش سے ہے کسی کی نسبت کمزور اور ناتواں ہے، کسی لفظ کی چول ٹھیک بیٹھتی ہے۔ کشتی یا جہاز کے ساتھ اور کسی کا رشتہ مکان یا دیوار سے ہے یہ الگ الگ نسبتیں ترجمہ کرتے وقت ذہن میں رہنی ضروری ہیں شاعر کہتا ہے۔

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائے گی

'جھونک کھانا'، اور جھونکا کھانا، دونوں ہم معنی فعل مرکب ہیں۔ شعر میں گلستاں اور شاخ گل کی نسبت سے جھونکا کھا گیا۔ اب ہم کسی ناز پروردہ نوجوان کو بگڑتا دیکھ کر بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''اک روز وہ جھونکا کھائے گا'' (گی) ترجمے میں اس فعل کے استعمال سے پہلے داہنے بائیں اس کی نسبتیں دیکھ لی جائیں کہ کس نے کو خطاب کرکے کہا۔ ورنہ ایک خوبصورت استعارہ عبارت کا کوڑ بن جائے گا۔ یہ مشق بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر لوگوں کی بولی پر، ادب کی رنگارنگی پر، زبان و بیان کے اچھے نمونوں پر صاحب طرز ادیبوں کے طرز پر اور اپنے کام کی ذمہ داری پر نظر رکھی جائے۔ ورنہ بالکل ممکن ہے کہ ترجمہ کرنے میں مترجم قدم قدم پر خود بخود لڑکھڑاتا رہے۔

یہیں سے ایک سوال کا حل اور ملتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے ممکن ہے اس میں اصل عبارت جیسے تُلے بندھے الفاظ یا مستقل اصطلاحیں اور محاورات یا ترکیبیں موجود نہ ہوں۔ اگر زبان کا دامن ایسے اجزاء سے خالی ہے تو ترجمہ کرنے والے کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے یہ ذمہ داری ادا ہو جائے تو ترجمے کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ترجمہ کرنے والے کی صلاحیت بھی بڑھتی ہے۔ یہ ذمہ داری ہے اس بات کی کہ پرانی ترکیبوں کی مدد سے نئی ترکیبیں اور پرانے الفاظ کے سہارے سے نئے نئے الفاظ تراشے جائیں۔

مثال کے طور پر 1944ء کے اختتام پر انگریزی اخبارات میں ایک لفظ استعمال ہونا شروع ہوا ہے (War Monger) نہ اس کا ترجمہ ''جنگ جو'' صحیح ہو سکتا ہے نہ ''لڑائی پھیلانے والا'' دونوں لفظوں کے مفہوم War

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Monger کے سوا بھی ہے لیکن وہ لوگ جو ''وار مونگر'' کے مفہوم سے تو واقف تھے مگر اپنے یہاں کے ''وار مونگروں کے روزمرہ اور محاورے سے ناواقف، وہ اسے کبھی آدھے آدھے جملوں میں اور کبھی غلط سلط لفظوں میں ادا کرتے رہے۔ ہندی اور گجراتی زبانوں میں جنگ خور'' اور ''میدھ خور'' رہ گیا یہ ''خور'' کی ترکیب کہاں سے آئی (بجائے خود دلچسپ بات ہے) لیکن اردو میں ایک باری نے اسے ''جنگ باز'' لکھنے کی جرأت کی۔ یہ ترکیب ہماری زبان کے لیے بالکل نئی تھی مگر بے جوڑ یا اجنبی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے جتنی گندی عادتوں کی ''بازیاں'' ہیں۔ سب کی غلاظت چھپی ہوئی تھی۔ اور مفہوم قطعاً وہی جو ''وار مونگر'' کا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ چل پڑا۔ اسی طرح اُردو زبان میں ترجمے کے ذریعے ہزاروں لفظ آئے اور کھپے ہیں، دوسری زبانوں کے اسموں نے افعال کا بھی ذخیرہ بڑھایا ہے ''شرمانا'' سے لے کر ''فلمانا'' ''قبولنا'' برقانا اور ''تومیانا'' تک کی اصطلاحات اس ضمن میں آتی ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور مثال ہے۔ عربی میں ایک ترکیب ہے ''معرض الی الشاقۃ'' یا ''شائق'' ''الصعب'' یعنی وہ شخص جو مصائب اور مشکلات کی طرف لپکتا ہو۔ اتنے بڑے مفہوم کے لیے اگر اُردو سے واقفیت ہو تو غالب کی استعمال کی ہوئی محض ایک ترکیب کافی ہے ''دشوار'' پسند۔'' اب اس سے ہٹ کر وہ شخص جس کی پسندیدگی حاصل کرنا بہت مشکل ہو یا وہ جس کا ذوق نظر اتنا بلند اور اتنا بلند اور اتنا انوکھا ہو کہ کہیں ٹھہرتا نہ ہو یا جس کی پسند یا نگاہ انتخاب میں بڑی مشکل سے کوئی چیز جچتی ہو (Fastidious) یا Squesmish اس کے لیے عموماً اب تک ایک ترکیب ''تنک مزاج'' یا ''نازک مزاج'' استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس ترکیب میں وہ خوبی اور جامعیت نہیں جو دشوار پسند میں ہے اب اگر اُردو ادب کا رچا ہوا ذوق ہے اور الفاظ کی ساخت اور ترکیبوں کی بناوٹ پر نظر ہے تو ترجمہ کرنے والا ایسے موقع کے لیے ''پسند دشوار'' کا لفظ ایجاد کرے گا اور ایسے ڈھب استعمال کرے گا کہ مفہوم بھی واضح ہو جائے اور زبان میں ایک اچھی ترکیب کا اضافہ ہو جو خود اسی کے ادبی لہجے کی دین ہے پھر اسی ترکیب ''پسند دشوار'' سے ''پسند دشواری'' صفت بنائی جاسکتی ہے۔

مگر ترجمے کی اس شرط کو پورا کرنے کے لیے پھر میں دہراؤں گا کہ اس زبان کا گہرا علم اور اچھا سلجھا ہوا ذوق رکھنا ضروری ہے جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

۴۔ تیسری شرط خیال اور مفہوم کی پوری ادائیگی کے یہ ہے کہ جس موضوع کی اصل ہے اس موضوع سے مناسب حد تک واقفیت ہو۔ کیونکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی اصطلاح یا ایک ہی ترکیب یا ایک ہی لفظ ادب میں کچھ اور معنی رکھتا ہے معاشیات میں اس کے معنی کچھ اور ہو جاتے ہیں اور نفسیات میں اس کا الگ مستقل مفہوم ہے اور تاریخ میں وہ محض لغت کے ایک عام لفظ کی طرح استعمال ہوا ہے۔ اب اگر ترجمہ کرنے والے کو یہ معلوم نہیں کہ فلاں فلاں ترکیب اس موضوع کی خاص اصطلاحیں ہیں اور ان کا اس شعبے یا اس علم میں الگ ایک مفہوم ہے تو وہ لغت کی مدد سے ترجمہ کردے گا اور عبارت کا سارا مفہوم غارت ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر خود اس سے کہا جائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ تم اپنا ترجمہ پڑھ کر اس کا مطلب سمجھاؤ تو وہ نہیں سمجھا سکے گا۔ مثال کے طور پر Surplus Value کی ترکیب میں (Surplus) اور (Value) الگ الگ دونوں الفاظ انگریزی میں عام استعمال ہوتے ہیں اور اگر کسی عام عبارت میں آئیں تو پہلے کا ترجمہ ''فالتو'' یا ''فاضل'' یا ''ضرورت سے زیادہ'' لکھ دینا مناسب ہوگا اور دوسرے کا ''قدر و قیمت، درجہ حیثیت، وقت'' وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن اب اگر یہی الفاظ پولیٹیکل اکانومی سیاسی معاشیات کی کسی کتاب میں آئے ہیں اور مترجم معاشیات سے بالکل بے بہرہ ہے تو ان کی اصطلاحی اہمیت پر اس کی نظر نہیں جائے گی۔ اور وہ ترجمے میں فالتو حیثیت'' یا ضرورت سے زیادہ وقعت'' لکھ دیا جائے گا۔ حالانکہ یہ اصطلاح مارکسی نظریہ معاشیات کی لخت جگر ہے۔ اور اب اُردو میں اس کے لیے ''قدر زائد'' لکھا جاتا ہے (ایک جملے میں اس کا مفہوم یہ کہ پیداوار میں لگی ہوئی محنت کی وہ قدر (ویلیو) جس کا معاوضہ مار لیا جاتا ہے۔

اُردو زبان کے کسی پروفیسر نے ایک تنقیدی کتاب پر انگریزی میں مضمون لکھا۔ اُردو کی اس تنقیدی کتاب میں جابجا ادبی تنقید کی اصطلاحیں مثلاً واقعیت نگاری اور حقیقت نگاری استعمال ہوئی تھیں۔ انہوں نے ترجمہ کرتے وقت دونوں اصطلاحوں کا صرف لغوی مفہوم ٹٹول کر دونوں کو ہم معنی سمجھا اور ان کے لیے اپنے انگریزی تبصرے میں Fact finding اور Fact writing کی ترکیبیں استعمال کر ڈالیں جو در اصل کسی سرکاری رپورٹ یا کسی کالج کی ریسرچ سوسائٹی کے معاملات میں استعمال ہونا چاہیے تھی۔ ''حقیقت نگاری'' اور ''واقعیت نگاری'' کا فرق تو ترجمے کی عبارت سے غائب ہوا ہی تھا اب یہ دونوں جو تنقیدی اصطلاحیں اور ادبی رجحان رہے ہیں ان کا مفہوم بھی رخصت ہوگیا۔ کیوں کہ (Realism) اور (Naturalism) کو ''فیکٹ فائنڈنگ'' سے دور کی بھی نسبت نہیں اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے پروفیسر انگریزی پر اچھا خاص عبور رکھتے ہیں، اُردو کی تعلیم دیتے ہیں، لسانیات کی سائنس سے مناسب حد تک واقف ہیں۔ پھر بھی جس موضوع کی اصل عبارت تھی چونکہ وہ اس موضوع سے غافل تھے، بھٹک گئے۔

یہ تو بہت معمولی مثالیں ہیں۔ ترجموں کے معاملے میں اصل تصنیف کے موضوع سے بیخبری نے بڑے عبرت ناک نتیجے پیش کیے ہیں اور ان موضوعات پر اپنی زبانوں میں اضافہ کرنے کے بجائے ان کی طرف سے بیزاری پھیلائی۔

ایک شخص ادب سے عموماً واقف ہے اور فلسفہ نہیں جانتا یا فلسفے کے موٹے موٹے اصولوں سے بے خبر ہے تو وہ برٹرنڈرسل کی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت برٹرنڈرسل کی صورت تو مسخ کرلے گا ہی لیکن خود اس زبان میں فلسفے کے مضامین سے لوگوں کو نفرت دلائے گا جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے۔ ایک شخص سیاست کے میدان کا کھلاڑی ہے لیکن ادب کی چاشنی سے بہت کم واسطہ رکھتا ہے تو وہ میخائل شولوخوف کے ناول ''ڈان بہتا رہا'' کی ادبی نزاکتوں پر پانی پھیر دے گا یا جہاں ترجمے میں اٹکاؤ آئے گا وہاں سے چھلانگ لگا جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو لوگ کسی خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے گہری دلچسپی یا اس کے متعلق بنیادی معلومات نہ رکھتے ہوں، انہیں صرف زبان دانی کے بل پر اس موضوع کے ترجمے سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے ایسے موضوعات کی تصانیف کا ترجمہ کرنے پر مجبور ہو جائیں تو انہیں ایک ایک لفظ خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں ان الفاظ وتراکیب سے اس موضوع کا کوئی خاص رشتہ تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو پھر اس موضوع کے لغت یا ماہرین سے مشورہ لے لینا چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ مختلف ترجمہ کرنے والے اپنی دلچسپی اور اپنی قابل غور کے مضامین چھانٹ لیں اور اس قسم کی تصانیف یا مضامین کا ترجمہ اپنے لیے مخصوص کر لیں۔ اس میں ترجمہ کرنے والے کا بھی فائدہ ہے ترجمے پڑھنے والوں کو بھی سہولت ہے اور جس کا ترجمہ کیا جائے گا اسے بھی سود وزیاں کا اندیشہ نہیں رہتا۔

ایک اور نکتہ

یہیں سے ایک نکتہ اور پیدا ہوتا ہے کہ موضوع اور اصل عبارت کے مضمون سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اگر عبارت معاشیات کی ہے تو معاشیات کی چند اصطلاحیں جان لی جائیں یا اگر ادبی موضوع ہے تو پہلے سے تھوڑی بہت ادبی سوجھ بوجھ پیدا کی جائے۔ بلکہ اصل موضوع سے واقفیت کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ اگر کسی صاحب طرز ادیب یا مخصوص رجحان اور خاص ذہنیت کے مصنف کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے تو اس ادیب یا مصنف کے طرز فکر سے رجحان اور ذہنیت سے آگاہی ہو۔ ضروری نہیں کہ پہلے سے اس کی تمام تصانیف کا ورد کیا جائے بلکہ یہ کافی ہے کہ اس کی سوانح عمری یا زندگی کے خاص خاص حالات اور اس کے طرز بیان سے متعلق دوسروں کی رائیں معلوم کر لی جائیں۔ یہ بھی اگر ممکن نہ ہو یا بہت مشکل ہو تو آسان صورت یا کم از کم شرط یہ ہے کہ جس تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اسے خوب غور سے ایک بار اول تا آخر پڑھ لیا جائے۔ اور اگر ویسی ہی دو ایک تصانیف اور ہاتھ آ سکیں تو ان کا بھی مطالعہ کر لیا جائے اور اگر زیر ترجمہ تصنیف پر دوسروں کی رائیں، تبصرے یا تنقیدیں یا تعارف مل سکیں تو ان پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس کے بعد ترجمہ شروع کیا جائے۔

بعض ذمہ دار لوگ بھی اس شرط کی اہمیت کو نہیں مانتے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اصل تصنیف کے ان اشاروں، کنایوں اور نکتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن سے پوری تصنیف کا لطف یا اہمیت قائم ہے۔

برنارڈ شا کا ایک شہرۂ آفاق ڈراما ہے "Man and Superman" اس ڈرامے کا ترجمہ ہوا ہے، نکتہ چین ہے غم دل..... '' کے نام سے مترجم اس سے پہلے کئی اچھے ترجمے کر چکے ہیں اور انہیں انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر عبور بھی ہو گا لیکن ڈرامے کے اصل موضوع کو پہلے سے جاننے اور خوب ذہن نشین کر لینے کو شاید اہمیت نہیں دیتے اور اصل موضوع کو ذہن نشین کر لینے کے سلسلے میں جو پہلو نکلتا ہے کہ مصنف کے طرز بیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رجحان اور ذہنیت سے واقفیت حاصل کرلی جائے اسے اپنے اکثر ہمعصروں کی طرح انہوں نے بھی بالکل نظرانداز کیا ہے۔ چنانچہ جب وہ شا کے اس زبردست ڈرامے کا ترجمہ کرنے بیٹھتے ہیں تو پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر انگریزی ناموں کو بدل کران کی جگہ ہندوستانی اور وہ بھی متوسط طبقے کے مسلم نام رکھ دیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اصل اور ترجمہ کے پورے ماحول اور تاثر میں اتنا فرق ہوگیا ہے جتنا اس انگریزی میں ہوسکتا تھا۔ جو لندن چھوڑ کر نظام شاہی حیدرآباد میں چلا آتا اور درمیانی درجے کے کھاتے پیتے مسلم گھرانے کی معاشرت اختیار کرلیتا۔

برنارڈ شا خود آئرلینڈ کا باشندہ ہے۔ آئرلینڈ اور انگلینڈ میں رقابت اور چشمک بہت پرانی ہے۔ لہٰذا اس کا آئرش ہونا کہیں نہ کہیں شوشہ چھوڑتا ہے۔ کبھی وہ انگریز کی زبان سے آئرش کے خلاف کوئی احمقانہ جملہ کہلواتا ہے کہیں کسی آئرش کی زبان سے انگریز پر جملہ کہتا ہے۔ کہیں آئرش کی برتری دکھاتا ہے اور کہیں ان کے بود و باش اور مزاج پر طنز کردیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص شا کے اس ڈرامے کا ترجمہ کرتے وقت انگریز ناموں کی جگہ ہندوستانی مسلمان نام رکھ دے تو لامحالہ اسے شہروں کے نام، فرنیچر کے نام اور دوسری ضروریات کے نام بھی بدلنے پڑیں گے "پڈنگ" کو کھیر بنانا ہوگا اور (Pork) کو معلوم نہیں کیا کرنا ہوگا۔ اور جب یہ صورت ہوگی تو ظاہر ہے کہ انگلش کو ہندوستانی اور آئرش کو مصری یا قبطی یا چینی لکھنا پڑے گا۔ مثلاً اگر شا نے جملہ یوں لکھا ہے کہ "جی ہاں یہ آئرش لوگ ہوتے ہی ہیں بہت ضدی" اور یہ جملہ انگریز کہہ رہا ہے تو انگریزی کی جگہ ہندوستانی اور آئرش کی جگہ تبتی لکھ کر ترجمے کی جو تباہی ہوگی، ہر خوش مذاق آدمی اس کا اندازہ کرسکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ شا کو سمجھنے کے لیے ایسا ترجمہ کتنا مفید ہوسکتا ہے۔

ترجمے کا یہ نقص پیدا اسی لیے ہوتا ہے کہ ترجمے کرنے والے کا اصل موضوع سے باخبر ہونا اور پھر اصل عبارت کے مصنف کے رجحان، مزاج اور طرز بیان کے نکتے معلوم کرنا کچھ ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ یہ بھی تقریباً اتنا ہی اہم ہے جتنا اس زبان کا علم ہونا جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو اُردو زبان کے بعض پیشہ ور ترجمہ کرنے والے ہماری مبارکباد کے مستحق اور تقلید کے قابل ہیں جن میں آخری دور عنایت اللہ دہلوی، ڈاکٹر عبدالحق، قاضی عبدالغفار، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے ہوتا ہوا عزیز احمد اور حسن عسکری تک پہنچتا ہے۔

ترجمے کی بندشیں

ترجمے میں اصل کے خیال اور مفہوم کو پوری طرح ادا کرنے کے سلسلے میں جن شرائط کا ذکر آیا ہے اگر وہ تمام پوری ہوں تب بھی ترجمہ کرنے والے کو جگہ جگہ بعض اور سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مثلاً ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کافی اہم سوال ہے کہ جہاں اصل عبارت کا مفہوم صاف نہ ہو اور خود اصل کی عبارت ذرا الجھی ہوئی یا اس طرح لکھی گئی ہو کہ ایک کی بجائے کئی معنی نکلتے ہوں وہاں اپنے پڑھنے والوں تک بات پہنچانے کے لیے ترجمہ کرنے والے کا کیا فرض ہے؟

کیا اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے اضافہ کر کے مطلب واضح کر دے یا وہ جو کئی مفہوم نکلتے ہیں ان سب کو ویسے کے ویسے ہی لکھ دے؟ یا ترجمے میں بھی عبارت کو اتنا ہی گنجلک اور کثیر المعانی رہنے دے؟ یا سامنے کا ترجمہ دے کر حاشیے میں اس کے اور پہلوؤں یا اضافوں سے پڑھنے والوں کو باخبر کر دے۔

یہ تمام مشکلیں ترجمہ کرنے والوں نے اپنے اپنے طور پر آزمائی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک صورت مسئلے کا آخری حل نہیں ہے۔

ایسی صورتوں کا حل بڑی حد تک اس موضوع کے اس حصے پر مصنف کی قوت بیان پر اور مصنف کے منشا پر منحصر ہے۔

(۱) ممکن ہے عبارت کا اصل مفہوم اس لیے صاف نہ ہو کہ مصنف کی قدرت بیان کے کارن وہ الجھا رہ گیا۔ اگر مصنف کو قدرت ہوتی یا اسے معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ اس کی عبارت گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت اور سلاست کے ساتھ بیان کرتا۔ اگر یہ صورت نظر آئے تو ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا اضافہ یا انداز بیان میں کچھ تبدیلی کر کے انہیں ایسے لکھے کہ عبارت سلجھ جائے۔

(۲) ممکن ہے اس مقام پر عبارت کو گنجلک رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہو۔ بعض موقعوں پر یہی بات ضروری ہوتی ہے۔ خاص طور سے شاعری میں ایسے مقامات آتے ہیں جہاں نکتے کو سلجھانا ضروری نہیں ہوتا۔ آرٹ میں بعض جگہ تاریک گوشے اصل مقصود کو نمایاں کرنے کی نیت سے رکھے جاتے ہیں یا بعض جگہ ہلکے سے پردے کسی غیر ادبی مجبوری کی وجہ سے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ صاف بات کہی جائے تو کہیں اسے پڑھنے والے کی سوجھ بوجھ برداشت نہ کر سکے یا حکومت وقت برداشت نہ کرے یا مذہبی یا اخلاقی ادارے چراغ پا ہو جائیں یا بیان کے حسن میں فرق آ جائے، مزا جاتا رہے۔ شاید ایسی کسی وجہ سے اصل مصنف نے اپنی عبارت کو ڈھکا چھپا رہنے دیا ہو ایسے مقامات کا اور مصنف کے اس مقصد کا اندازہ لگا لینا ترجمہ کرنے والے کی نکتہ دانی اور اچھی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اگر وہ اسے پالیتا ہے کہ یہاں عبارت کو اور زیادہ واضح کر دینے اور عام فہم بنا دینے سے اصل عبارت کی وہ ادائے حجاب جاتی رہے گی۔ جو مصنف کا منشا یا ہنر ہوتا ہے مصنف کی منشا کی پابندی کرنی چاہیے اور عبارت کو جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔ جیسے دلہن کو ایک ڈولی سے دوسری ڈولی میں پہنچاتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو ترجمہ ترجمہ نہ رہے گا بلکہ اصل عبارت کی تفسیر بن جائے گا۔ ترجمہ اور تفسیر میں جو بنیادی فرق ہے وہ ظاہر ہے تفسیر مصنف کے منشا کو اپنے طور پر کھول کر بیان کرنا ہوتا ہے۔ مفسّر کو مترجم کے مقابلے میں آزادی میسر ہے۔ اسی سبب سے مفسّر کے ساتھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختلاف کی گنجائش مترجم کے بہ نسبت زیادہ رہتی ہے۔

خیام کی رباعیات کا منظوم انگریزی ترجمہ کرنے میں فٹز جیرلڈ سے اکثر یہی کمال سرزد ہوا ہے کہ وہ مترجم سے زیادہ مفسر نظر آتا ہے اور خیام کی شاعری (ترجمہ کرنے؟) کی آڑ میں وہ اپنی افتادِ طبع اور اپنے شاعرانہ جوہر کا لوہا منوالیتا ہے۔

(۳) اب اگر مترجم دیکھتا ہے کہ اصل عبارت میں فلاں حصہ ایسا ہے کہ اس کے کئی معانی نکل رہے ہیں یا نکل سکتے ہیں تو اسے سوچنا ہوگا کہ مصنف خود اس مقام پر کئی معانی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش رکھنا چاہتا تھا۔ یا اس کے ذہن میں اپنا ایک مفہوم تھا اور وہ لفظ یا جملہ ایسا لکھ گیا جس سے بہ یک وقت کئی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اور بیان کی یک رنگی یا وضاحت میں حائل ہوتی یا اسے بڑھاتی ہیں۔ یہاں پھر مصنف کی منشا کی پابندی کرنی ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اسے زبان میں ترجمے کے لیے ویسا ہی لفظ، ویسا ہی محاورہ ڈھونڈنا ہوگا جو کئی معانی کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اسے اصل عبارت کی حدود سے آگے بڑھ کر ایسا لفظ تراشنا ہوگا جو چاہے لفظی ترجمہ ہو یا نہ ہو لیکن اس ایک مفہوم کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مانع وہی ٹھہرے اسے اپنے ترجمے میں اصل کی عبارت یا جملے سے باقی تمام مفہوموں کو ہٹانا ہوگا اور صرف ایک کو آگے بڑھانا ہوگا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس پر اعتراض کریں اور اسے ترجمہ کرنے والے کی دیانت داری کے خلاف سمجھیں لیکن ترجمے کی دیانتداری کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مترجم بے غرض ہو کر اصل کے لفظ کی جگہ لفظ لکھتا چلا جائے اور مکھی پر مکھی مارتا رہے۔

جن لوگوں نے مکھی پر مکھی مارنے کو ترجمے کی دیانت داری سمجھا ہے ان کی مثال ایک ایسے روکھے سخت گیر آدمی سے دی جاسکتی ہے جس نے بہتر کردار بنانے کی خاطر کچھ اصول بنائے ہوں اور وہ اصولوں کا ایسا پابند ہو چکا ہو کہ ان کی انسانیت دوستی کے عام تقاضوں کو ٹھکراتا چلے۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصول پرستی نیکی کے لباس میں ایک مردم بیزار بدی بن جائے گی کہ ذریعہ تو مقصد کی جگہ تھما لے اور مقصد ذریعے کی نفی کرے۔

ترجمے میں مصنف کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ مقصد تو مفہوم اور لطف بیان کی ادائیگی ہے۔ اگر الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اسی وصف کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو کثر لوگوں کا ہر ایک الزام سہہ کر اصل کے الفاظ ان کی تقدیم و تاخیر، ان کے جوڑ اور جملوں کی ساخت بدل کر یہ مقصد پورا کرنا ہوگا۔ یہی ترجمے کا مقصود ہے۔ اور اسی مقصود کی تعمیل خاص اس فن کی دیانتداری ہے۔

مثال کے طور پر کارل مارکس کی تصنیف Das Capital (کی جلد اول و دوم) جب جرمن زبان میں تیار ہوگئی تو اس کے چند سال بعد فرانسیسی، جرمن، انگریزی زبانوں کے ماہر اور معاشیات کے فاضل T.Ray نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ فرنچ ترجمہ مکمل ہو چکا تو مارکس نے اس پر نظر ڈالی۔ یہاں مارکس نے اس مترجم کے متعلق لکھا ہے۔

"اس نے خوب جی لگا کر احتیاط کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا لیکن احتیاط اور توجہ میں اتنی شدت برتی کہ جو ترجمہ تیار ہوا وہ حد سے زیادہ لفظ بلفظ ہو گیا۔"

حد سے زیادہ لفظ بہ لفظ (Too literal) ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس نے اسے قبول نہیں کیا، خود جم کر نظر ثانی کی اور اصل سے ہٹ کر اپنی ہی عبارت کے ترجمے میں جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کر دی۔

بین السطور کا معاملہ

ترجمہ کرنے والے کو لازمی طور سے اصل عبارت کے الفاظ ہی نہیں بلکہ اس کے بین السطور کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اور بین السطور (جو مفہوم الفاظ کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے) کو راہ گیر کی ٹارچ کے بطور استعمال کرنا چاہیے کہ جہاں ضرورت پڑی بٹن دبا کر روشنی حاصل کر لی۔

ہو سکتا ہے کہ ترجمہ کرنے والے کا اپنا بھی طرز بیان ہو۔ ممکن ہے اوریجنل مصنف ہونے کے رشتے سے وہ اپنا ایک طرز ادا بنا چکا ہو۔ وہ طرز ادا کافی پختہ ہو چکا ہو۔ ایسی صورت میں جب وہ ترجمہ کرنے بیٹھے گا اور اصل عبارت کے بین السطور پر بھی نظر رکھے گا، تو ممکن ہے کہ وہ مصنف کے منشا کی تو پابندی کرتا چلے لیکن طرز بیان اپنا ڈال دے یا مترجم کی ہستی ترجمے کی عبارت پر حاوی ہو جائے۔ یہ ترجمے کا وہ عیب ہوگا جس کا کوئی سدھار نہیں، کوئی توڑ نہیں۔ اس سے نقصان یہ ہے کہ ترجمے پر اصل مصنف سے زیادہ مترجم پر توجہ رہے گی۔ اور اصل مصنف کا طرز بیان جو ترجمے میں جوں کا توں منتقل ہونا چاہیے تھا۔ گم ہو جائے گا یہ ایک طرح کی منجھائی یا پالش ہے جو ترجمے کو مقبولیت بخشنے کے باوجود اصل مصنف کا آدھا وجود اور پورا وصف مٹی میں ملا دیتی ہے۔ پختہ کار اہل قلم کو خصوصاً ادھر سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

ترجمہ کی تین راہیں ہیں ایک لفظی ترجمہ، دوسرا آزاد ترجمہ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان کا ترجمہ اس تیسرے یا اعتدال کے ترجمے کو ہم تخلیقی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جب ترجمے کی تمام شرائط پوری ہوتی ہیں تو وہ صرف تقلید بالکل نہیں رہ جاتی۔ بلکہ اس میں ایک فنی حسن ابھرتا ہے۔ وہ اصل کو پوری طرح ہضم کر کے اسے نئے وجود کے ساتھ زیب و زینت بخشنے کے برابر ہے۔ اور اسی طرح بجائے خود تخلیق کے ہم وزن شمار ہونے کے قابل ہے۔

ترجمے کی ذمہ داری کے سلسلے میں سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا اپنے وجود، خیال، جذبے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے سپرد کر دے اور یہ سوچ لے کہ اگر فلاں بات، فلاں جملہ، تصنیف، عبارت، یا محاورہ مصنف کو خود ہماری اسی زبان میں لکھنا ہوتا تو وہ کسی طرح لکھتا۔ اپنی بساط بھر جو بھی تصور قائم ہو کہ یوں لکھتا، بس ویسے ہی لکھ دینا چاہیے۔

اگر ترجمہ اس حیثیت سے کامیاب ہے تو ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور لفظ بہ لفظ یا انتہائی دیانت دارانہ (Faithful) نہ ہونے کے باوجود ہر اعتبار سے مکمل ہے ورنہ اور خوبیوں کی باوجود ناکام رہے گا۔

ختم کلام

یہاں تک ترجمے کے لیے جن شرطوں کی نشاندہی کی گئی۔ ان پر نظر ڈالنے کے بعد ایک مبتدی ٹھٹکے، یا ترجمے کو ایسا بھاری پتھر سمجھ بیٹھنا بجا نہ ہوگا۔ جسے صرف چوم کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہے نہیں۔

زندگی کے کام جتنے پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں، اتنا ہی خاص کاری (Specialisation) بڑھتی جاتی ہے۔ ترجمہ ایک خاص ہنر یا فن ہے اور دوسرے پیشوں یا ہنروں کی طرح یہ بھی تربیت اور ریاض طلب کرتا ہے کلاسیکی موسیقی یا قدرتی سائنسوں کے مقابلے میں یہاں ریاض (یا ریاضت) کا تقاضہ ہلکا ہے بلکہ اگر کوئی شخص ترجمے کو روزگار یا مستقل ذہنی مشغلے کے طور پر اپنانا چاہے اور ایک دو موضوعات کو اپنی طبیعت یا بساط کے مطابق چن لے تو کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ چند سال کا مطالعہ اور دو تین سال کی لگاتار مشق مل کر رواں ترجمے کا میاب راہبر ہیں۔

ترجمے کی ایک شاخ وہ ہے جو محض مشق اور حافظے کے بل پر پھیلتی ہے۔ یعنی ترجمانی (دو بھاشیہ کا کام) تقریری زبان کو ایک سے دوسری میں ڈھالنا محض مشاقی ہے اور ایک لفظ کے لیے دوسرے نپے تلے مقررہ لفظ کی یادداشت۔ یہ نسبتاً سہل ہے۔

ترجمے کی دوسری شاخ کلاسیکی ادب یا جدید تخلیقی ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام ہے۔ جو پہلی سے زیادہ دشوار مگر پائیدار ہے۔ اور ہم نے اب تک اسی سے بحث کی ہے۔

لیکن ترجمے کی وہ شاخ جسے چھوتے ہوئے اہل علم کی انگلیاں جلتی ہیں، شعر کا شعر میں ترجمہ ہے۔ ہر زمانے میں اس کام کو نہایت دشوار سمجھا گیا۔ سر جان ڈینہم (John Deniham) نے تو اسے محض حماقت قرار دیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ شاعرانہ زبان ایسی اسپرٹ رکھتی ہے کہ ایک زبان (کی بوتل) سے دوسری میں ڈھالتے وقت اڑ جاتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ حماقت دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں ڈیڑھ سو برس سے کی جا رہی ہے۔ نتیجے بھی برے نہیں نکلے۔ کالی داس، فردوسی، نظامی، جامی، حافظ و سعدی، خیام، شیکسپیئر، ملٹن، گوئٹے، بائرن، شیلے، پوشکن،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مایا کوفسکی، ٹیگور اور درجنوں بڑے بڑے شعرا اپنی ملکی سرحدوں سے نکل کر دنیا کے شہری اور عالمی تہذیب کے میراث بن گئے اور بنتے جا رہے ہیں۔

منظوم ترجموں کا رواج مشرق میں بھی تھا لیکن اسے عروج ملا۔ مغرب میں خصوصاً فرنچ، جرمن، انگریزی اور روسی زبانوں میں صف اول کے شعرا نے اس کام کو ہاتھ میں لیا تو ایک چلن ہو گیا کہ مشق کی پختگی اور قدرت کلام کے بلند مقام کو پہنچنے کے بعد مغربی شعرا دوسری زبانوں کے کلاسیکی یا ہم عصر شاعروں کا کلام منظوم ترجمے کے لیے چنتے ہیں اور اس میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں۔ منظوم ترجمہ کرنے والے میں شاعرانہ جوہری وہ عنصر ہے جو ترجمے کی باقی تمام شرطوں کے علاوہ اوپر سے کام آتا ہے۔ جو شخص خود اچھا شعر نہ کہہ سکے' نہ کہہ چکا ہو جسے اپنی زبان میں اساتذہ کے ہزاروں اشعار از بر نہ ہوں، جو دوسری زبان کے مصرعو میں (بلکہ نثر میں بھی) باطنی آہنگ اور ظاہری ترنم سے لطف اندوز نہ ہو سکے، اسے منظوم ترجمے کی اوکھلی میں سر نہ دینا چاہیے۔ اور جو لوگ اس کام کے اہل ہیں انہیں بھی لازم ہے کہ ہر ایک دور اور کسی بھی رنگ کے شاعر پر ہاتھ صاف نہ کریں۔ ایک مخصوص دور یا مخصوص فکر یا طرز کے شاعر کے ہاں الفاظ کے جوڑ اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ کا رنگ بھی الگ ہوتا ہے۔ فضا اور ہوتی ہے ایسے شاعر زمین نے اب تک کہاں پیدا کیے ہیں جو کسی رنگ میں بند نہ ہوں اور وہ جو ہر ایک رنگ کی نقل اتار کر رکھ دیں۔ بڑے بے رنگ ہوتے ہیں بدآہنگ بھی۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کے چند پہلو

(مذاکرہ)

سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالمجید سالک، ممتاز حسین

کسی نئی تصنیف یا جامع تالیف کا علمی رتبہ ترجمے پر فائق ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اچھا مترجم ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ اچھا انشاء پرداز بھی ہو بجائے کہ انشاء پرداز کے لیے ضروری نہیں کہ دوسری زبان سے عمدہ واقفیت رکھتا ہو۔

انشاپردازی کے سلسلے میں خیال آیا کہ بعض اعلیٰ درجے کے مترجم ترجمے میں اپنا اسلوب نگارش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثال مولانا ظفر علی خاں کے تراجم ہیں کہ ہیگرڈ کے مترجمہ ناولوں میں بھی ان کی عبارت آرائی کا وہی رنگ جھلکتا ہے جو ''معرکۂ مذہب و سائنس'' میں نظر آتا ہے۔ لیکن عام طور پر مترجم کو اصل مصنف کی طرز تحریر کا اثر قبول کرنا پڑتا ہے۔ زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جبکہ اصل عبارت (خصوصاً انگریزی) شاعرانہ یا خاص ادیبانہ ڈھنگ میں لکھی گئی ہو۔ کسی دوسری زبان کے صنائع، تلمیحات، نازک استعارے اپنی زبان میں اسی حسن وخوبی سے ادا کر دینا خود مترجم کی انشاپردازی کا کمال سمجھنا چاہیے جو حضرات اپنی زبان میں رنگین عبارت آرائی کی مشق و مہارت نہیں رکھتے، ان کے لیے سلامتی کی راہ یہی ہے کہ ان موقعوں پر صاف اور سادہ زبان میں ادائے مطلب پر قناعت کریں۔

ایسے مرحلوں میں دونوں زبانوں کی قوت بیان، فصاحت اور معنویت کا بھی توازن واضح ہو جاتا ہے۔ ہمیں زیادہ تر انگریزی سے سابقہ پڑتا ہے اس کے متقدم انشاپرداز کارلائل اور رسکن سے قطع نظر زمانہ قریب کے کسی مورلے یا چرچل ہی کی کتاب کا ایک ورق ترجمہ کیجیے تو عام طور پر اردو تحریر ذرا ہلکی معلوم ہوگی۔ مگر اس میں زبان کا اتنا قصور نہیں جتنا اہل زبان کے ذہنی اور تعلیمی معیار کی پستی کو دخل ہے۔ گزشتہ پچاس برس میں اردو نے حیرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگیز ترقی کی ور ہزاروں کتابیں تالیف و ترجمہ ہو کر ملک میں شائع ہوئیں۔ ان میں ہر صنف اور ہر درجے کی مطبوعات مل جائیں گی لیکن چونکہ عام اور اعلیٰ تعلیم یورپ کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے اس لیے ادبی پیداوار میں وہ معنوی گہرائی نہیں پائی جاتی۔ بارہ تیرہ سال کا ذکر ہے خالدہ خانم ادیب کی انگریزی کتاب ''ان سائڈ ان ڈیا'' چھپی تو سراکبری حیدری مرحوم نے جناب مولوی عبدالحق صاحب سے فرمائش بلکہ تاکید کی کہ بہت جلد اس کا اردو ترجمہ تیار کر دیا جائے۔ فرمائش کی تعمیل ہوئی۔ ترجمہ چھپ گیا اور اہل نظر نے پسند بھی کیا لیکن جیسا کہ مترجم نے دیباچے میں اشارہ کر دیا ہے۔ اس طرز عبارت کو قبول عام پانے کے لیے غالباً ایک مدت درکار ہو گی۔ اصل یہ ہے کہ فاضل مصنفہ بہت گہری اور کارگر تنقید کرتی ہے مگر اس پر باریک ریشم کے ایسے پردے اُڑھا دیتی ہیں کہ علم د ذہانت کی عینک کے بغیر تہ کی بات نظر نہیں آتی اور جس شخص پر تنقید ہوئی ہے وہ چوٹ کھا کر بھی مسکراتا ہے۔

اردو ترجمے میں ابتری اور اس کی بدولت خود زبان کی فصاحت میں خرابی کا ایک سبب اردو روزنامے ہوئے، جن میں زیادہ تر انگریزی سے اطلاعات اور تار کی خبریں بہت جلدی میں ترجمہ کی جاتی ہیں۔ ان کی زبان (اور طباعت بھی) سخت اصلاح کی محتاج ہے، صاف اور بامحاورہ زبان میں ترجمہ کرنے والے مشاق مترجم بھی تعداد میں کم اور معدودے چند ہیں۔ اردو انشا پردازی کی طرح ترجمے میں ہمارے رسائل نے ضرور ترقی کی ہے۔

انگریزی سے سلیس اردو میں ترجمہ کرنے کا ایک یہ گر مترجم کو سیکھنا لازم ہے کہ جو، جس، جن، سے فقرے کو پیچیدہ نہ بنائے۔ ان کی انگریزی میں بڑی کثرت ہوتی ہے۔ ہماری زبان میں عطف و ربط کی دوسری تدبیریں کام میں لائی جاتی ہیں۔ بیان کے متین و شگفتہ اور متعدد پیرائے اردو میں موجود ہیں۔ سوائے فنی اصطلاحات کے بلیغ اور پرمعنی الفاظ کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ البتہ انہیں برتنے کے لیے مترجم کی علمی استعداد بلند اور اپنے معیاری ادب سے اسے خوب واقفیت ہونی چاہیے۔

عبدالمجید سالک

کسی علمی مضمون یا کتاب کا ترجمہ وہی کر سکتا ہے جسے اس کے موضوع سے شغف ہو۔ مثلاً کسی ادیب یا شاعر کو فلسفے کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ نہ اقتصادیات کے کسی طالب علم کو طبیعات کا ترجمہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ترجمہ ''سمجھ لینے اور سمجھا دینے'' کا نام ہے۔ جو شخص کسی متن کو خود نہیں سمجھتا، وہ کسی کو سمجھانے میں کب کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مترجم کے لیے دونوں زبانوں سے خاصی واقفیت ضروری ہے۔ نہ صرف لفظی واقفیت بلکہ انشائی استعداد ضروری ہے۔ ورنہ اصل کی روح ترجمے میں کبھی منتقل نہ ہو سکے گی۔ علمی تراجم میں سب سے بڑی مشکل مصطلحات سے متعلق ہے۔ جب تک علم کی اس شاخ سے جس سے کتاب متعلق ہے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصطلاحاتی شناسائی نہ ہو، صحیح ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ ایسے دماغ شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ جو اگرچہ دونوں زبانوں میں سے کسی ایک سے زیادہ شغف رکھتے ہیں اور دوسری سے کم، لیکن اس کے باوجود اعلیٰ درجے کا ترجمہ کر لیتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کسی نے پوچھا۔ آپ انگریزی میں تو محض شدید ہی رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے تعزیرات ہند کا اتنا اچھا ترجمہ کیونکر کر لیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ بلاشبہ انگریزی میں میری استعداد انٹرنس کے معیار سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن اردو، فارسی اور عربی کی قابلیت کے باعث میں موزوں الفاظ و مصطلحات نہایت آسانی سے تجویز کر دیتا تھا۔ لیکن ہر شخص ڈپٹی نذیر احمد نہیں ہو سکتا۔ جب تک دونوں زبانوں سے یکساں واقفیت نہ ہو کوئی شخص اچھا ترجمہ نہیں کر سکتا۔

''ادبی ترجمے'' چونکہ ان کتابوں، افسانوں یا ادب پاروں کے ہوتے ہیں۔ جن کے لکھنے والے زبان و ادب کے فنکار مانے جاتے ہیں اس لیے ان کا مترجم بھی فن کار ہونا چاہیے۔ یونہی اٹھا کر سیدھے سبھاؤ ادبی شہ پاروں کا ترجمہ کر دینا اس فن لطیف پر ظلم ہوگا۔ میں جب کبھی ڈاکٹر ٹیگور کی بعض چیزوں کا ترجمہ کیا کرتا تھا تو مجھے ایک ایک لفظ کے ترجمے پر خاص طور سے غور کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ ساری کتاب میں ایک بھی ایسا لفظ نہ ہوتا جس کے معنی مجھے معلوم نہ ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود میں ہر ضروری لفظ کے لیے ڈکشنری دیکھتا جس میں اس لفظ کے چھ سات معنی لکھے ہوتے۔ اب میں متن کی روح کے مطابق کوئی ایک لفظ چن لیتا اور فقرے میں نگینے کی طرح جڑ دیتا اور بعض اوقات تو الفاظ اور اجزائے جملہ کے ایسے ترجمے ہو جاتے۔ جو نہ صرف اصل کا ہو بہو چربہ ہوتے، بلکہ اس میں بھی خاص رونق اور آرائش پیدا کر دیتے۔ مثلاً:

Patter of Rainfall on the dry leaves.

کا ترجمہ ہوا۔ ''سوکھے پتوں پر بارش پڑاپڑ'' Patter میں تو ٹیگور نے صرف صوتی اعتبار مدنظر رکھا تھا۔ میں نے صوتی اعتبار کو بھی ترجمے میں محفوظ رکھا اور لفظی رعایت سے ''پڑتے'' کا مفہوم بھی شامل کر دیا۔ ایک فقرہ تھا:

I am the god who was born of the Mind of the Creator.

میں ترجمہ کیا۔ ''میں وہ دیوتا ہوں جو کرتار کے من سے پیدا ہوا''۔ ایک تو Mind کا ترجمہ ''من'' سے بہتر نہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر Creator کا مفہوم دل، دماغ، ذہن سے ادا نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے ''کرتار'' ہی موزوں تھا۔ خصوصاً ایک ایسے ادب پارے کے ترجمے میں جو ہندو علم الاصنام کی بعض ہستیوں کے متعلق لکھا گیا ہو۔ اور جس کا ترجمہ لازماً ہندی آمیز ہونا چاہیے تھا۔ ورنہ اس کی روح غائب ہو جاتی۔

طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں بیسیوں مثالیں دے دیتا۔ میرا مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ ادبی چیزوں کا ترجمہ کرنے میں انتہائی احتیاط اور پابندی ملحوظ رکھنی چاہیے تاکہ اصل فن کار کی تخلیق کی کوئی صوری یا معنوی خصوصیت مسخ نہ ہونے پائے۔ اصل کے الفاظ کی پیروی اس کے فقروں کے بانکپن کی حفاظت اور اس کے بیان کی روح، غرض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر چیز ترجمے میں منعکس ہونی چاہیے۔

اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تا کہ عام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ ایک انگریزی اخبار میں یہ فقرہ نظر پڑا۔

He was conveyed to his place of residence in an intoxicated condition.

اگرچہ انگریزی زبان کے اعتبار سے بھی یہ فقرہ لغو تھا۔ اور اصل میں یوں ہونا چاہیے تھا۔ He was carried home drunk لیکن ایک مبتدی مترجم نے اس کا ترجمہ یوں کیا۔

"وہ بحالت مخموری اپنے مقام سکونت کو لے جایا گیا۔"

اب آپ انصاف فرمائیے۔ کیا ترجمہ اس کو کہتے ہیں؟ کیا یہ اردو ہے؟ کیا ذیل کا فقرہ بالکل صحیح مفہوم ادا نہ کر سکتا تھا:۔

"وہ نشے میں تھا۔ اسے گھر لے گئے۔"

ایک مترجم صاحب نے جو اپنی عربی فارسی کی قابلیت کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی کے اس فقرے کا کہ:۔

There was an explosion in a coal mine resulting in the death of five persons.

یوں ترجمہ کیا کہ "ایک معدن زغال میں دھماکا ہوا۔ نتیجے کے طور پر پانچ نفوس کی ہلاکت وقوع پذیر ہوئی۔" میں نے مترجم صاحب کو جا کر کہا کہ اس فقرے پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔ کہ "کوئلے کی ایک کان پھٹ گئی۔ پانچ آدمی مر گئے"۔ کیا آپ کے نزدیک یہ غلط اردو ہے یا اصل خبر کا یہ ترجمہ غلط ہے؟ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ میں نے کہا ایک تو "نتیجے کے طور پر" نہایت بیہودہ جزو جملہ ہے۔ اس کو عمر بھر نہ لکھے گا۔ دوسرے، کسی آدمی کی "ہلاکت وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی"۔ وہ صرف مر جاتا ہے۔ اور یہی کہنا چاہیے۔

ایک فقرہ تھا۔

Adverse climatic conditions prevented the progressive writers from holding their meeting.

ترجمہ یا گیا کہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''مخالف موسمی حالات نے ترقی پسند ادیبوں کو جلسہ منعقد کرنے سے روک دیا''۔

حالانکہ سیدھا سادہ ترجمہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ۔

موسم خراب تھا اس لیے ترقی پسند ادیبوں کا جلسہ نہیں ہوسکا'' یا ''موسم کی خرابی کی وجہ سے ترقی پسند ادیب اپنا جلسہ منعقد نہیں کر سکے''۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورہ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ اُلجھیں۔ ان کو چاہیے کہ جہاں انگریزی فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں، وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں۔ Complex فقرے کو چند Simple فقروں میں تقسیم کر دیں۔ اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل کا مطلب ادا ہو گیا۔ اگر ہر پہلو سے مطلب ادا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ ورنہ اِدھر اُدھر کی بیشی کر کے اس کو پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کو ہر وقت حرز جان بنا کر رکھنا چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی اور بڑے اردو خواں ہیں۔ کیونکہ ممکن ہے۔ وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے کوئی ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔

ممتاز حسین

ترجمے کا میدان بہت ہی وسیع ہے۔ فلسفے اور مضامین سے لیکر شعر و ادب کے نازک ترین اصناف سخن تک کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی ہیئت دوسرے سے مختلف ہو گی۔ بظاہر ترجمے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ جن کے اظہار میں احساسات کو التزاماً ذریعہ نہ بنایا گیا ہو بلکہ حتی الوسع احساسات سے آزاد ہو کر خیالات کی ترجمانی کی گئی اور زبان کی تمام صلاحیتیں، منطق واستدلال میں اس پر صرف کی گئی ہوں نہ کہ حسیہ تصویروں کے ذریعہ خیالات وجذبات کے مرکبات کو ابھارنے اور احساسات کے ذریعے خیالات کو پہونچانے میں۔ فلسفہ اور سائنس وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔

دوسری صورت ایسے افکار و خیالات کا ترجمہ ہے جن کا التزاماً احساسات کے ذریعہ کیا گیا ہو اور زبان کی دولت مجرد تصورات کی ترسیل اور منطق واستدلال پر نہیں بلکہ تجربات کی مصوری اور خیالات کو محسوس کرانے کی کوشش میں صرف کی گئی ہو۔ شعر و ادب کی صنفیں اس زمرے میں آتی ہیں۔

ترجمے کے یہ دونوں میدان ایک دوسرے سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح فلسفہ اور شعر، گو یہ صحیح ہے کہ ان کی سرحدیں آپس میں ٹکراتی بھی ہیں لیکن یہ سنگم ایسا نہیں کہ آپ ان کی علیحدہ حیثیتوں کو محسوس نہ کر سکیں۔ جب تک ہم ترجمہ کرتے وقت اس امتیاز کو اپنے سامنے نہ رکھیں گے کامیاب مترجم نہیں بن سکتے۔ ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زبان کی ساخت اور صلاحیت کو بھی سمجھیں۔ کسی زبان میں دوسری زبان کا علم وادب اس وقت منتقل ہو سکتا ہے جبکہ اس میں مطلوبہ خیالات کے اظہار کی صلاحیت ہو۔ اردو کی ایک علیحدہ ساخت ہے جو دوسری زبانوں کی ساخت سے مختلف ہے۔ ترجمہ کرتے وقت لامحالہ اس بات کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

یوں تو تاریخ اور تمدن کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہوا ہے لیکن جو صحت خیال، شگفتگی بیان اور سلامت وروانی سید علی بلگرامی کی کتاب ''تمدن عرب'' میں ہے وہ مشکل ہی سے اس قبیل کی دوسری کتابوں میں ہوگی۔ حال ہی میں کانٹ کی کتاب (Critique of Pure Reason) کا ترجمہ اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مترجم کی نظر فلسفے کے مطالعے میں کافی عمیق ہے اور انہوں نے کتاب کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ بھی کیا ہے لیکن اردو ترجمہ بہ نسبت انگریزی ترجمے کے زیادہ ٹھس ہے۔ ممکن ہے اردو فلسفیانہ حقائق کے اظہار کرنے سے معذور ہو یا کانٹ کا فلسفہ بذات خود بہت پیچیدہ ہو لیکن مترجم اس الزام سے سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ اس نے کانٹ کی کتاب کو ہمارے لیے کسی طرح آسان نہیں بنایا۔

اس کتاب کے مقابلے میں ایک دوسری کتاب ''بقول زرتشت'' لیجیے۔ یہ نیٹشے کی کتاب ''یوں زرتشت نے کہا'' کا ترجمہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نہ تو نیٹشے کے فلسفے میں وہ فلسفیانہ عمق، موشگافیاں اور پیچیدگیاں ہیں جو کانٹ کے فلسفے میں ہیں اور نہ اس تصنیف کو خالصتاً فلسفیانہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں روایتی فلسفے کی بجائے وجدانی فلسفہ پیش کیا گیا ہے جس میں فلسفے سے زیادہ شاعری کا مزا ہے، پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے۔ غالباً اس کا ترجمہ بھی براہ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے پھر بھی جو لوگ جرمن زبان سے واقف نہیں اور اردو کے علاوہ صرف انگریزی زبان ہی جانتے ہیں اسے انگریزی کے بجائے اردو ہی میں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اسلوب بیان بہت شاعرانہ ہے جس سے مصنف کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے۔ ویسے بھی اصل عبارت میں غالباً کوئی تصرف نہیں کیا گیا۔ علمی تراجم میں تو صحت خیال کے ساتھ قوت استدلال کا اظہار لازمی ہے لیکن ادبی تراجم میں ان کے بجائے ان احساسات کا اظہار زیادہ اہم ہے جن کے ذریعہ خیالات ادا کیے گئے ہیں۔ گو قوت استدلال کا اظہار یہاں بھی درکار رہتا ہے لیکن اس کی اپیل مختلف ہوتی ہے۔ یہ صرف دماغ ہی کو اپیل نہیں کرتی بلکہ انسان کے تمام نوازے احساس کو اپیل کرتی ہے جن میں احساس جمال، احساس صورت اور صورت ونغمہ بھی شامل ہیں۔ اسی لیے شاعری میں جو ادب کی ایک مخصوص صنف ہے الفاظ کی اہمیت صرف معنوی نہیں ہوتی بلکہ صوتی بھی ہوتی ہے۔ اس میں اظہار خیال ہمیشہ احساس کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک زبان کے شعر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شعر کا ترجمہ صرف ایک شاعر ہی کر سکتا ہے وہ بھی اس وقت جب کہ وہ اصل خیال کو اپنے احساسات سے گزارے اور یہ طریقہ کار تقریباً نیم تخلیقی ہو جاتا ہے کیونکہ احساسات داخلی ہوتے ہیں۔ اور تمام وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ دوسرے کے جسد میں منتقل نہیں ہو سکتے۔ دوسروں کے احساسات پر اتنا قابو نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جاسکتا جتنا ان کے خیالات پر اس حسن وخوبی کے ساتھ فارسی کے بہت سے اشعار کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے۔ یہ خوبی انگریزی نظموں کے تراجم میں بہت کم نظر آتی ہے۔ شاید اس لیے کہ انگریزی کے برعکس اردو وفارسی میں نہ صرف بہت سے الفاظ بلکہ بحریں بھی مشترک ہیں۔ اگر اردو اس دشواری کو ایک عذر بنا لے تو وہ بجز فارسی کے اور کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ کرنے سے قاصر رہے گی۔ اس لیے میں کچھ ایسی مثالیں پیش کروں گا جہاں یہ مشکل سد راہ نہیں رہی اور نہایت خوبی کے ساتھ انگریزی نظم اردو زبان میں منتقل ہوئی ہے۔ ان میں ایک طباطبائی کی ''شام غریباں'' ہے جو ولیم گرے کے مرثیے (Elegy in a Churchyard) کا ترجمہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ شاعر کے خیالات میں کہیں بھی تصرف نہیں کیا گیا اور انہیں کم وبیش ان تمام تاثرات اور احساسات کی گہرائیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو اصل نظم میں ملتی ہیں۔ طباطبائی نے یہ کام کسی محیر العقول ذہنی صفائی سے نہیں بلکہ مناسب بحر کی تلاش اور ردیف وقافیے کے انتخاب سے انجام دیا ہے۔ عنایت اللہ مرحوم نے شیکسپیئر کے متعدد ڈراموں کے ترجمے کیے لیکن اس بات پر غور کیے بغیر کہ یہ ڈرامے نظم میں ہیں۔ اس لیے شیکسپیئر کی روح تو در کنار وہ ''چوڑی پیشانی والا'' شیکسپیئر بھی ان ترجموں میں نہیں ہے جو تصویروں میں نظر آ جاتا ہے۔

یہی خامی ''فاؤسٹ'' کے واحد اردو ترجمے میں نظر آتی ہے۔ شعر کا ترجمہ شعر ہی ہوسکتا ہے ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ ''راہ صاحب! شیکسپیئر کے ڈراموں کا ترجمہ نثر میں کیوں نہیں ہوسکتا؟'' اس کا جواب یہ ہے کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کا حسن متنازعہ فیہ مسائل کے حل میں نہیں بلکہ عقل وجذبات، انسانیت اور سوداگری کی اس [illegible] رقابت اور تصادم میں ہے جس کا شعور صرف کنار ذہن نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔ اس شعور کی ترجمانی عنایت اللہ کے کسی ڈرامے میں نہیں اس کے لیے شاعرانہ نثر درکار ہے جو ان کے یہاں مفقود ہے۔ افسوس ہے کہ اردو کی شعری زبان کافی گرانمایہ ہونے کے باوجود اس میں مغربی نظموں اور ڈراموں کے ترجمے اچھے نہیں ہوئے۔ اس کام کی طرف وہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں جنہیں شعری زبان پر خاطر خواہ دسترس نہیں ہوتی۔ حال ہی میں رلکے کے چند مرثیوں کا ترجمہ کیا گیا ہے ان میں شاعری تو ایک طرف رہی خیال محض بھی صحت کے ساتھ منتقل نہیں ہوسکا۔ اگر علامہ اقبال کی ان نظموں کو سامنے رکھا جائے جن کو انہوں نے انگریزی زبان سے منتقل کیا ہے تو یہ بات کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کا ترجمہ صحیح معنوں میں ایک شاعر ہی کرسکتا ہے۔ یہ نظمیں سب کی سب اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں اور بعض تو اتنی مقبول ہو چکی ہیں کہ ان پر ترجمہ ہونے کا شبہ ہی نہیں گزرتا۔ ایمرسن کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ جسے علامہ اقبال نے ''رخصت اے بزم جہاں'' کے عنوان سے پیش کیا ہے اتنا حسین ہے کہ اسے مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ مترجم نے نہ صرف شاعر کے خیالات بلکہ احساسات بھی پیش کیا ہے اور اس کے لیے نہ صرف مناسب بحر تلاش کی ہے بلکہ حسب ضرورت انگریزی کی تلمیحات اور استعاروں کو اردو کی تلمیحات اور استعاروں میں بدل دیا ہے۔ نظم میں ترجمے [illegible] کا یہی مفہوم ہے۔ خیالات کے ساتھ صحیح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احساسات کو بھی منتقل کرنا نہ کہ لفظی ترجمہ کرنا اور ایسے غیر مانوس الفاظ کو دیانتداری کے ماتحت جگہ دینا جن سے احساسات کی ترسیل بالکل ختم ہو جائے لیکن یہ سمجھنا کہ اس کام کا نباہ صرف علامہ اقبال جیسے بڑے شاعر ہی سے ہوسکتا ہے۔ صحیح نہیں ہر وہ شخص یہ کام سرانجام دے سکتا ہے جو مناسب ذوق شعری سے بہرہ ور ہو۔ جسے الفاظ کے انتخاب پر دسترس ہو اور جس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ دوسروں کے احساسات کو اپنے نفس پر اس طرح وارد کرے کہ انہیں اپنی زبان میں گنگنانے پر مجبور ہو جائے۔ مخدوم محی الدین نے قازقستانی شاعر جابر جمبول کی نظم ''استالین'' کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ اور وہ بھی اصل کے بجائے انگریزی ترجمہ سے پھر بھی یہ اصلی نظم کے حسن سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی خوبی الفاظ اور تراکیب کے مرادفات تلاش کرنے میں نہیں بلکہ نظم کی روح، جذباتی اور نغماتی اتار چڑھاؤ اور دیگر عناصر کا صحیح عکس پیش کرنے میں ہے۔ ترجمہ ایک سالماتی فکر ایک نہ ٹوٹنے والے جذباتی گھیرے سے اسی طرح ابھرا ہے جس طرح بیج سے پودا، یہ حسن اس لیے بھی پیدا ہوا کہ مترجم اصل مصنف کے خیالات اور احساسات میں بدرجہ اتم شریک ہو گیا۔

گذشتہ پندرہ بیس سال کے عرصے میں اردو زبان میں بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں جن میں سے کچھ درحقیقت ترجمہ ہیں۔ مترجمہ افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا ایک ترجمہ ''آخری سبق'' خاص لطف رکھتا ہے یہ موپساں کے ایک افسانے کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ میں اردو زبان اصل کے تاثر کو منتقل کرنے میں کہیں حائل نہیں ہوئی بلکہ اس کی قوت کو لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ کے بجائے ایک مخصوص جذبہ کی ترجمانی پر صرف کیا گیا ہے۔

ناول کا کینوس اتنا وسیع ہوتا ہے اور صفحات اتنے زیادہ کہ مترجم کے لیے جذبات کو ایک ہی سطح پر اپنے سینے میں تھامے رکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناولوں کے اچھے ترجمے ہماری زبان میں کم ہیں۔ ایک تو معیاری ناولوں کے ترجمے ہی کم ہوئے اور جو ہوئے بھی ہیں ان میں سے بہت کم معیاری ہیں اختر حسین رائے پوری کے ترجمے ''پیاری زمین'' میں ایک خاص خوبی ہے۔ مترجم نے پرل بک کے خیالات اور احساسات کو اپنی زبان می اس طرح منتقل کیا ہے جیسے وہ خود لکھ رہے ہوں نہ اس طرح جیسے کسی قانونی مسودے یا مقدس کتاب کا ترجمہ کیا جاتا ہے گذشتہ سالوں میں ''اور ڈان بہتا رہا''۔ ''ماں'' ''آزادی کی راہ'' ''شیکسپیئر کے قصے'' ''آخری سلام'' اور ''مادام بوویری'' بھی سامنے آئے ہیں۔ ان میں سید مطلبی، سردار جعفری اور حسن عسکری کے ترجمے کافی اچھے ہیں۔ سید صاحب کے ترجمے میں روانی اور بہاؤ نہیں۔ ''مادام بوویری'' کے ابتدائی صفحات بہت ناقص ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انگریزی یا فرانسیسی صرف ونحو کو بدلنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے

محمد حسن عسکری

ایزرا پاؤنڈ نے کہا ہے کہ جو دور تخلیقی ادب کے لحاظ سے عظیم ہوتا ہے وہ ترجموں کے لحاظ سے بھی عظیم ہوتا ہے یا تخلیق کا دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی میں ایلزبتھ کا زمانہ۔ پاؤنڈ کی رائے میں اووڈ کا مترجم گولڈنگ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس کا مقابلہ ملٹن سے کیا جا سکتا ہے پھر انگریزی میں دو ایک ترجمے ایسے ہوئے ہیں جو بعض اعتبار سے اصل کتاب سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً سترھویں صدی میں رابلے کا ترجمہ جو سرٹامس ارکرٹ نے کیا تھا۔ یا ہمارے زمانہ میں پروست کا ترجمہ جو اسکاٹ مونکریف نے کیا ہے اور خود مصنف کی رائے میں اصل سے بہتر ہے۔

ترجموں کے متعلق پاؤنڈ کی رائے کا اطلاق ہمارے ادب پر بھی ہوتا ہے۔ جب ساری دنیائے ادب کا ذکر ہو تو اردو ادب کے کسی دور یا کسی شاعر کے متعلق "عظیم" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ بہرحال ہمارے یہاں جس قسم کی بھی عظمت ہو۔ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ترجموں سے ضرور ہے، اردو ادب کے آغاز سے لے کر غالب کے زمانے تک ترجمے چاہے زیادہ نہ ہوئے ہوں لیکن ہمارے شاعر دو قسم کی کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف تو وہ فارسی کے اسالیب اور تصورات کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال رہے تھے دوسری طرف خود اپنی زبان کا ایک مزاج اور ایک روح متعین کرنی چاہتے تھے۔ یہ بالکل وہی چیز ہے جو تیرھویں اور چودھویں صدی میں اٹلی اور انگلستان کے شاعروں نے فرانسیسی کے زیر اثر اپنی اپنی زبانوں کے لیے کی۔

پھر جب مغرب کا اثر پڑنا شروع ہوا تو سرشار جیسے ناول نگار نے "ڈان کوئکزوٹ" کا ترجمہ کیا۔ سروانٹیز کے طفیل اُردو میں کم سے کم دو ناول موجود میں آئے۔ ایک تو "فسانۂ آزاد" دوسرے "حاجی بغلول" خیر اتنا تو صاف ظاہر ہے کہ سرشار کی تخلیق اور ان کے ترجمے میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "خدائی فوجدار" ترجمے کے لحاظ سے کیسا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ سرشار نے ترجمہ کیا ہی نہیں۔ بلکہ اصل کہانی کو دیسی لباس پہنایا ہے۔ اس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہیں کھینچ تان بھی کرنی پڑی ہے اور ٹھونس ٹھانس بھی۔ اس طرح کتاب کے بعض حصے بالکل مہمل ہو کے رہ گئے ہیں۔ پھر انہوں نے سروانٹیز کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ غالباً انہیں پوری طرح سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ سرشار کے زمانے میں معاشرتی تبدیلیاں شروع تو ہوگئی تھیں لیکن صدیوں کے عرصے میں اس معاشرے نے جو شکل اختیار کرلی تھی، وہ کم سے کم ظاہری طور پر باقی تھی اور میرا خیال ہے کہ ایک مربوط معاشرے میں رہنے والا آدمی کسی دوسرے معاشرے کے ادب کو پوری طرح نہیں سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے اعصاب ہی اجنبی تجربات کو قبول نہیں کرتے۔ دوسروں کے ادب کو پوری طرح سمجھنے کی فکر یا خواہش تو ہم جیسے لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک خلا میں رہتے ہوں۔ مثلاً یورپ ہی نے مشرق کے فلسفوں کو انیسویں صدی میں سمجھنا شروع کیا جب مغربی سماج کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ اس لیے اگر سرشار نے ایک مغربی شاہکار کو ترجمہ یا اخذ کرتے ہوئے بگاڑ کے رکھ دیا تو اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں اتنا ہی پڑھا جتنا ان کے معاشرے نے پڑھوایا۔ چلیے ترجمے کے لحاظ سے ایک خرابی تو ''خدائی فوجدار'' میں یہ ہوئی۔ اس سے بھی بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ اس کی عبارت ناہموار ہے۔ چار جملے بے ڈھنگے، آدھا صفحہ مزے لے لے کے لکھا ہے تو آدھے صفحے میں گھاس کاٹی ہے۔ اس پر جتنے بھی اعتراض کیے جاسکتے ہیں وہ مجھے قبول ہیں اور میں اُسے اردو کی بڑی کتابوں میں بھی نہیں شمار کرتا۔ لیکن میں اس کے متعلق وہی بات کہنے کو تیار ہوں، جو ایزرا پاؤنڈ نے ہومر کے پوپ والے ترجمے کے بارے میں کہی ہے۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پوپ کے ترجمے میں ہومر وہ نہیں رہا جو اصل یونانی میں ہے۔ پاؤنڈ کی رائے ہے کہ پوپ نے ہومر کو چاہے کچھ کا کچھ بنا دیا ہو، لیکن کم سے کم ''کچھ تو بنایا ہے'' سرشار نے بھی سروانٹیز کا ترجمہ کرتے ہوئے ''کچھ تو بنایا ہے'' یہ ایسی بات ہے جو سرشار کے بعد آنے والے ایک مترجم کے بارے میں بھی نہیں کی جاسکتی۔ کم سے کم یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا نام آپ اردو نثر کی وقیع کتابوں میں سے خارج نہیں کرسکتے۔ اس میں کچھ بھی نہ سہی اتنا ہے کہ اس کا تیس چالیس فیصدی حصہ دلچسپی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ اردو میں مغربی ادب کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان کی کیفیت نظر میں رکھیں تو اتنی بات بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔

نیاز فتح پوری والے دور میں براہ راست ترجموں کی تعداد چاہے کم ہو لیکن جس قسم کی لجلجی رومانیت اور جمال زدگی ان لوگوں نے پیدا کرنی چاہی وہ بھی اخذ اور ترجمے کرنے والی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ میں نے ان لوگوں کی تحریریں کہیں لڑکپن میں پڑھی تھیں۔ اس کے بعد پھر ہمت نہیں پڑی۔ ''کچھ غم دوراں کچھ غم جاناں'' ہی کیا کم ہے جو اوپر سے بکری پالی جائے۔ اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے کن مغربی ادیبوں سے اثر لیا، اور کن افسانوں کے ترجمے کیے۔ ایک آسکر وائلڈ کا اثر تو مسلم ہے۔ کیونکہ ان کی تحریروں میں جابجا آسکر وائلڈ کے خیالات بری طرح ترجمے کیے ہوئے بکھرے پڑے ہیں۔ دوسرا اثر شاید گیٹے کے ''ورتر'' کا ہے۔ بہرحال انہوں نے آسکر وائلڈ کی چستی پیدا کرنے کے لیے ایک تجربہ یہ ضرور کیا کہ بغیر فعل کے جملے لکھے جائیں۔ ایسے جملوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُردو نثر کو کیا نقصان پہنچا۔ یہ تو میں پہلے کئی دفعہ بتا چکا ہوں، لیکن کبھی کبھی دم کٹے جملوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ اردو میں جملہ فعل پر ختم ہوتا ہے اور ''تا تھا''، ''تے تھے'' وغیرہ کی تکرار نثر کے آہنگ کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ پھر ذرا جملہ لمبا ہو جائے تو اس میں چار پانچ دفعہ ''کا'' ''کی'' ''کے'' ''کہ'' آ تا نے۔ یہ ایک مستقل دردِ سر ہے۔ میں تو بعض دفعہ جھنجلا کے یہ کہنے لگتا ہوں کہ ایسی زبان میں اچھی نثر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ بہر حال مریل جمال پرستوں نے اس مسئلے کا ایک حل ضرور پیش کیا تھا جو کبھی کبھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اور یہ چیز بھی آسکر وائلڈ کے خیالات کا ترجمہ کرنے کے سلسلہ میں ہاتھ آئی۔

۱۹۳۶ء کے آس پاس جو ترجمے فرانسیسی اور روسی افسانوں کے ہوئے ان سے اردو نثر نے غیر جذباتی بیان اور ایک ہی جملہ میں کسی چیز کے مختلف اجزاء کے نام گنوانے کا طریقہ سیکھا۔ آج اردو افسانوں میں عام طور پر جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ انہیں ترجموں کی بدولت وجود میں آئی ہے۔ اس زمانے میں ترجمے تو بیسیوں لوگوں نے کیے۔ لیکن اگر کسی ایک آدمی کو مثال کے طور پر پیش کرنا ہو تو منٹو کا نام لیا جا سکتا ہے آج کل کی افسانوی زبان کے تعین میں منٹو کے ترجموں کو جو دخل ہے اُسے نہیں بھولنا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور کے ترجموں نے ان دو باتوں کے علاوہ ہماری نثر کو اور کچھ بھی نہیں سکھایا۔ نثر نگاری کے سلسلہ میں روسی افسانے کیا سکھاتے ہیں، اس سوال کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں ایسی کتابیں نہیں پڑھ سکتا جن میں روح کو مادی چیزوں سے الگ کر لیا گیا ہو۔ لیکن اس ذاتی تعصب سے قطع نظر ویسے بھی مجھے شبہ یہ ہے کہ دوستوئفکی کے ناول پڑھنے سے روح میں تلاطم چاہے جتنا ہو، لیکن آدمی کی نثر خراب ہو جاتی ہے۔ پھر دوستوئفکی چاہے جتنا بڑا ادیب ہو لیکن عموماً یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جس نے اس سے اثر لیا وہ عمر بھر لڑکا ہی بنا رہا۔ اردو افسانے پر تو خیر اس کا اثر ہی کتنا ہے۔ لیکن ہندی کے دو ایک افسانہ نگار میں نے ایسے دیکھے ہیں جنہیں دوستوئفکی نے خراب کیا۔ ممکن ہے ہندی کے افسانوں کی خرابیاں بھی اسی اثر کا نتیجہ ہوں۔ بہر حال مجھے نہیں معلوم کہ روسی افسانے پڑھ کے آدمی معقول نثر لکھنا سیکھ سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں موپاساں کے افسانے اتنے پڑھے گئے اور ہم نے اس سے موضوع کے انتخاب کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سیکھا۔

خیر، اب اپنے زمانے کی طرف آیئے۔ آج کل ترجموں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے، اور کچھ برے بھلے ترجمے ہو بھی رہے ہیں۔ لیکن ترجموں کا ہونا یا نہ ہونا ایسی اہم بات نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان سے ہمارے تخلیقی ادب پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ابھی تک تو ہمارے یہاں ترجمے اس نقطہ نظر سے کیے اور پڑھے جاتے ہیں کہ اردو پڑھنے کو بھی اصل کتاب کی کہانی معلوم ہو جائے۔ ترجموں سے زیادہ سے زیادہ اثر ہم لوگ یہ لیتے ہیں کہ ہمارے ادیب بھی ویسے ہی موضوعات پر لکھنے لگتے ہیں۔ لیکن ترجمے کی بدولت ہمیں ایسا تخلیقی جذبہ نہیں ملتا جیسا سرشار کو مل گیا تھا، نہ ان کے ذریعے ہماری نثر کے اسالیب میں کوئی اضافہ یا تغیر ہوتا ہے۔ میں نے دو کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسا ترجمہ نہیں کیا جس پر میں فخر کرسکوں، لیکن ایزرا پاؤنڈ کی تقلید کرتے ہوئے میں تو اچھا ترجمہ اسی کو سمجھتا ہوں جس میں چاہے اصل کتاب کی روح برقرار نہ رہے لیکن وہ کچھ نہ کچھ بن ضرور جائے۔ خرابی یہ ہے کہ ترجموں کے معاملے کو ہم نے ابھی تک ادبی مسئلہ نہیں سمجھا۔ اسی لیے تو ہمارا ادب، خصوصاً ہماری نثر روز بروز مضمحل ہوتی جا رہی ہے۔

اس مسئلے کی اہمیت ہم نے اب تک اس وجہ سے محسوس نہیں کی کہ ہمیں اپنی زبان کے متعلق خوش فہمیاں بہت زیادہ ہیں۔ یہ خود اطمینانی غالباً ایک حد تک اردو ہندی کے جھگڑے کا نتیجہ ہے اور کچھ اردو کے نقادوں کا کرشمہ۔ ہمیں بار بار بتایا جاتا ہے کہ ہماری زبان دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ہے اور اردو میں ہر خیال ادا ہوسکتا ہے۔ خیال ویال تو میں جانتا نہیں شاید اردو میں کانٹ کا ہر خیال پوری پوری صحت کے ساتھ منتقل ہو جائے لیکن اگر کوئی صاحب پروست کا ایک جملہ اردو میں ٹھیک ترجمہ کر کے دکھائیں تو میں اردو کو دنیا کی سب سے بڑی زبان مان لوں گا۔ چلیے اسے بھی چھوڑیے۔ آپ کہیں گے کہ اردو میں ابھی اتنے پیچیدہ اور گنجلک جملوں کو سہارنے کی اہلیت نہیں پیدا ہوئی۔ سیدھے سادے جملوں ہی کا معاملہ لیجیے۔ یوں کرنے کو تو میں نے ''مادام بواری'' کا ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن اس ناول میں ایک ٹکڑا ہے، جس میں ہیروئن کی چھتری پر برف گرنے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اگر اردو کے سارے ادیب مل کر ان آٹھ دس سطروں کو اس طرح ترجمہ کر دیں کہ اصل کا حسن ویسا کا ویسا ہی رہے تو اس دن سے میں اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ یہ میں اردو زبان کی برائی نہیں کر رہا ہوں۔ خامیاں تو ہر زبان میں ہوتی ہیں، لیکن ہم لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زبان میں اب کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ادیب کو اپنی زبان سے محبت اور اس پر یقین تو ضرور ہونا چاہیے لیکن تخلیقی کام کرنے والوں کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری زبان کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے یا نہیں۔ ہماری زبان اچھی ہو یا بری۔ ہمارے لیے تو یہ پیرتسمہ پا کی طرح ہے۔ ہم اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہمارا سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ ہم اپنی موجودہ زبان کی صلاحیتیں دیکھیں، پھر یہ غور کریں کہ اب اس میں اظہار کے اور کون کون سے طریقے ایجاد کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ہمارے نقاد بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ مغربی ادب میں جتنی اچھی باتیں تھیں وہ سب ہم نے سیکھ لیں اور ہمارا ادب مغربی ادب کے برابر ہوگیا۔ لیکن آپ کسی مغربی کتاب کا ترجمہ کرنے بیٹھیں تو پانچ منٹ میں سب حقیقت کھل جاتی ہے۔ بشرطیکہ آپ یہ جانتے ہوں کہ مصنف لکھتا کس طرح ہے۔ پھر اوپر سے مشکل یہ ہے کہ اگر آپ ترجمہ کے مسائل سمجھ بھی لیں، اور ان کا کوئی نہ کوئی حل بھی تلاش کرنا چاہیں تو اردو تنقید راستہ روک لیتی ہے، وہ اس طرح کہ اردو میں ترجموں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پبلشر صرف وہی کتاب چھاپتے ہیں جو بک سکیں۔ ادھر کتابیں خریدنے والوں کے ذہن کو اردو تنقید نے کمزور کر رکھا ہے۔ اب اگر آپ ترجمے کو تخلیق بنانا چاہیں تو یہ کیسے ممکن ہے؟

اس ضمن میں اگر میں اپنے ترجموں کا ذکر کروں تو آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں اپنی کتابوں کا اشتہار دے رہا ہوں میں تو صرف یہ بتاؤں گا کہ میرے ترجمے ناکام کیوں رہے۔ مجھے مسائل کیا پیش آئے، اور میں انہیں حل کیوں نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرسکا۔

میرے بعض کرم فرما مجھ سے کہتے ہیں کہ میرا سب سے اچھا ترجمہ ''آخری سلام'' ہے۔اس رائے سے میری ہمت افزائی تو بہت ہوتی ہے لیکن میں اسے اپنا کوئی کارنامہ نہیں سمجھتا۔اشروڈ کی یہ کتاب حقیقت نگاری کی روایت سے متعلق ہے۔لیکن اس کی نثر موپاساں کی نثر نہیں ہے۔اس کی زیادہ تر دلچسپی واقعات یا کردار نگاری میں ہے۔اس کی نثر بس کام چلاؤ قسم کی ہے۔ایسی عبارت کو اردو میں کس طرح منتقل کیا جائے اس کا طریقہ منٹو نے ۳۶ء کے قریب اپنے ترجموں میں بتا دیا تھا۔اب اگر آپ کو تھوڑے بہت محاورے آتے ہوں اور آپ نثر کو گفتگو کے لب ولہجہ سے قریب لا سکیں تو اس کتاب کا اچھا خاصا ترجمہ ہو سکتا ہے۔میرا خیال ہے کہ اپنے ترجمے میں چاہے میں اشروڈ کی برابری نہ کرسکا ہوں۔لیکن ترجمہ پڑھنے کے بعد اصل کتاب پڑھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔جس قسم کی نثر اس کتاب کے ترجمے کے لیے چاہیے اس کا ڈھانچہ بنا بنایا تھا۔اردو والے ترجمے میں بس اتنی بات دیکھتے ہیں کہ روانی اور سلاست ہو اور پڑھتے ہوئے ایسا لگے جیسے کتاب اردو ہی میں لکھی گئی ہے۔تعلّی معاف۔یہ کام تو میں سوتے ہوئے بھی کرسکتا ہوں لیکن اس سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس سے ترجمے کا کام بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔لیکن ہماری زبان وہیں کی وہیں رہتی ہے، جہاں تھی۔نثر کی اسی تعریف نے ہمارے ادب کو مار رکھا ہے۔خصوصاً ترجمے کو۔اگر ہمارے نقاد پڑھنے والوں کو یہ راز بتا دیتے کہ پڑھتے وقت دماغ پر زور پڑے تو کوئی ہرج نہیں تو شاید اردو نثر میں ترجمے ہی کے ذریعے کچھ تجربے ہو سکتے۔لیکن اب تو ایک لفظ کو دھر سے اُدھر کرتے ڈر لگتا ہے کہ ایسی کتاب پڑھے گا کون۔اگر آپ کی اردو زبان میں بہت سے اسالیب بیان ہوتے تب تو یہ مطالبہ بجا تھا کہ ترجمہ ایسا لگنا چاہیے جیسے اصل ہو۔لیکن اس بے بضاعتی کے عالم میں یہ شرط لگانا کہ اردو کے اسالیب میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہونے پائے، ایک عجیب سی بات ہے۔اگر یہ ذہنیت ہمارے ادب پر اسی طرح حاوی رہی تو رابلے یا جوئیس کی طرح کے لوگوں کے ترجمے تو قیامت تک نہ ہو سکیں گے۔اب سے آٹھ سال پہلے مجھے یہ خبط تھا کہ ترجمہ کرتے ہوئے اردو کے اسالیب کا خیال نہ رکھوں لیکن اب اردو کے نقادوں سے ڈر گیا ہوں اور اتنی ہمت نہیں رہی۔وہ تو میرے پبلشر ہمت والے ہیں کہ میں اردو کو توڑ مروڑ ڈالوں تو بھی میری کتاب چھاپ دیتے ہیں۔

میرے جس ترجمے کو غور سے پڑھا جانا چاہیے تھا وہ ہے ''مادام بواری'' یعنی ایک ناکامیاب ترجمے کی حیثیت سے۔اول تو اس کتاب کا صحیح ترجمہ آج تک ہوا ہی دنیا کی کون سی زبان میں ہے۔اردو تو بچاری پھر بھی بچی ہے۔یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ اردو کے آٹھ دس ادیب مل کر اُسے ترجمہ کرتے۔اور اس پر تین چار سال لگاتے، تب کہیں جا کر کچھ بات بنتی۔میں یہ دعوے نہیں کرسکتا کہ اس کتاب میں نثری اسلوب کے جتنے مسائل سامنے آتے ہیں۔میں نے ان سب کو سمجھ لیا۔اس کام کے لیے بھی سال بھر چاہیے۔بہرحال جو دو چار باتیں میرے پلے پڑیں وہ میں نے اردو میں پیدا کرنی چاہیں مثلاً ایک تو میں نے یہ کوشش کی کہ فلوبیئر نے علامات اوقاف کے ذریعے جو معنی پیدا کیے ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ویسے ہی میں بھی کروں۔ لیکن کاتب صاحب نے سب گڈمڈ کر کے رکھ دیا۔ پھر فلوبیئر نے بار بار مختلف قسم کے خیالات کو تقابل یا تضاد کے لیے ایک ہی جملے میں بند کیا ہے۔ میں نے ایسے جملوں کا مطلب لکھنے کے بجائے انہیں ویسے کے ویسے ہی اردو میں منتقل کر دیا۔ اردو والوں نے شکایت کی کہ ترجمے میں روانی اور سلاست نہیں ہے۔ مثلاً "مادام بواری" کے پہلے صفحہ پر شارل کی ٹوپی کا بیان لیجیے۔ اگر محض روانی اور سلاست کا معاملہ ہوتا تو میں "حاجی بغلول" کے انداز میں اس ٹوپی کا مزے دار سے مزے دار بیان لکھ سکتا تھا۔ لیکن میرے سامنے تو سوال یہ تھا کہ فلوبیئر کے ایک جملے کا ترجمہ کیا جائے، چاہے اردو زبان چیں بول جائے یہی میں نے کیا۔ لوگوں نے شکایت کی کہ ترجمے کے پہلے صفحے کی عبارت گنجلک ہے۔ مجھے خوشی تو جب ہوتی کہ کوئی صاحب اس جملے کا اور اچھا ترجمہ کر کے مجھے بھیجتے جسے میں کسی رسالے میں شائع کراتا کہ اردو نثر کے ایک مسئلے کا کچھ تو حل نظر آیا۔ یہ تو فلوبیئر کی کتاب کے چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں۔ اور بڑے مسئلوں سے الجھنے کی تو مجھ میں ہمت ہی نہیں تھی۔ مثلاً جملوں کے آہنگ یا پیراگراف کی تعمیر کا معاملہ تو اتنا سخت تھا کہ میں نے بھاری پتھر سمجھا اور چوم کے چھوڑ دیا۔ بہر حال اردو والوں نے ناول پڑھ لیا اور یہ صرف دو ڈھائی لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ترجمے میں میری کامیابی کیا تھی اور ناکامیابی کیا۔

پچھلے سال میں نے استاں دال کے ناول "سرخ و سیاہ" کا ترجمہ کیا اس ناول نے مجھے رلا رلا دیا۔ اگر سلاست اور روانی کی بات ہوتی تو میں لیٹے لیٹے ترجمے کے پچاس صفحے روز لکھوا سکتا تھا۔ لیکن استاں دال، تو کمبخت وہ آدمی ہے جو نثر کے فن کو نظم کے فن سے بڑا سمجھتا ہے اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ اردو سے غداری کروں یا استاں دال سے مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنے پبلشر کے مفاد کا احترام کرتے ہوئے استاں دال سے غداری کی۔ کیونکہ پبلشر بچارے کی یہی ہمت کیا کم ہے کہ اتنا لمبا چوڑا ناول چھاپا۔ لیکن ایک لحاظ سے اردو زبان نے بھی میرے ہاتھ باندھ دیے تھے۔ استاں دال جذبات کا تجزیہ فکر محض کی زبان میں کرتا ہے۔ اردو میں اس کی صلاحیت نہیں۔ اگر میں اس کے لیے کوئی نیا اسلوب بنانے کی کوشش کرتا تو ڈر یہ تھا کہ اردو کے نقاد پوچھیں گے، یہ ناول ہے یا مقالہ۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے استاں دال کی روح سے معافی مانگ کے اس کی خشک عبارت کو تھوڑا سا جذباتی رنگ دیا۔ یا یوں کہیے کہ اردو کے نقادوں کو رشوت دی۔ اب ایک اور مشکل پیش آئی۔ پہلی نظر میں تو استاں دال کے جملے بڑے خشک اور بے رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا غور سے پڑھیے تو ایک کرارا پن، اور ایک ایسی چستی ملے گی جو طنز کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو انگریزی ترجمے میں بھی نہیں آنے پائی۔ حالانکہ یہ ترجمہ اسکاٹ مونکریف جیسے بڑے مترجم نے کیا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ استاں دال کی نثر کے پیچھے ڈیڑھ سو سال کی وہ فرانسیسی روایت ہے۔ جو (Maximes) لکھنے والوں نے پیدا کی تھی، استاں دال کی نثر کے پیچھے سے جگہ جگہ روش فو کو بول اٹھتا ہے۔ اب بتایئے اس خوبی کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے میں ایسی روایت کہاں سے لاتا؟ نیاز فتحپوری کی زبان میں اس کا ترجمہ کرتا۔ یا میر امن کی زبان میں؟ اردو ادب بہت عظیم سہی۔ لیکن کوئی صاحب مجھے چار سطریں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استاں دال کی ترجمہ کر کے دکھا دیں۔

آج کل میں شورورلوولا کا وکا ناول ترجمہ کر رہا ہوں۔ اس میں ایک نئی مصیبت ہے۔ مصنف کا لب ولہجہ اردو میں کیسے پیدا کروں یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پھکڑ پن کا نمونہ تو مجھے سرشار یا سجاد حسین کے یہاں مل سکتا ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے فرانسیسی استہزا میں جو رکھ رکھاؤ اور نفاست تھی وہ کہاں سے لاؤں؟ لیکن اس ناول کے متعلق اتنی بات ضرور کہوں گا۔ استاں دال کا ترجمہ سرشار مجھ سے اچھا نہیں کر سکتے تھے لیکن اس ناول کا ترجمہ کر کے وہ کچھ نہ کچھ ضرور بنا سکتے تھے اور میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ اردو نثر میں جو بات تھی آج وہ بھی نہیں رہی۔

اپنے ترجموں کا اتنا لمبا چوڑا اشتہار میں نے اس لیے دیا کہ اپنے اس کام کے سلسلے میں مجھے جن ادبی مسائل سے الجھنا پڑا میں انہیں حل نہیں کر سکا۔ میں نے دو چار بڑی کتابوں کے ترجمے تو کر ڈالے ہیں لیکن میں نے اردو کے اسالیب میں رتی بھر بھی اضافہ نہیں کیا۔ اسی کی شکایت مجھے اردو پڑھنے والوں اور اردو کے نقادوں سے ہے۔ اول تو میری بساط ہی کیا ہے۔ لیکن میں چاہوں بھی تو اسلوب کا کوئی نیا تجربہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ مجھے اپنے آپ سے بار بار یہ سوال پوچھنا پڑتا ہے کہ جن ترجموں سے تخلیقی ادب پر کوئی اثر نہ پڑے ان کا جواز کیا ہے۔ ترجمے کا تو مقصد ہی یہ ہونا چاہیے کہ خواہ ترجمہ ناکام ہو، مگر ادیبوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ذرائع اظہار کے نئے مسائل آئیں، خواہ کوئی ادبی مسئلہ حل نہ ہو مگر ترجمے کے ذریعے کوئی ادبی مسئلہ پیدا تو ہو۔ لیکن جب تک اردو تنقید زندہ ہے خدا نے چاہا تو ہمارے ذہن میں کوئی ادبی مسئلہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کے مسائل

جمیل جالبی

> ''ادبی تخلیق کا ایک عظیم دور ہمیشہ ترجمہ کا بھی عظیم دور ہوتا ہے یا پھر نتیجہ کے طور پر فوراً بعد پیدا ہوتا ہے۔ وکٹورین عہد میں ذرا کمتر درجہ پر فنٹز جیرالڈ پیدا ہوا اور سوئن برن کے دور میں وِلن اور روزیٹی۔ وہ اہمیت جو ہسپانوی شاعری کے مورخوں نے بوسکن کو دی ہے اس پر ہم ذرا دیر کو حیرت تو ضرور کرتے ہیں لیکن ہمارے مورخین اپنے مترجمین کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ (ایذرا پاؤنڈ)

عام طور پر کسی ترجمہ کو اچھا سمجھ کر جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں بڑی روانی ہے زبان بامحاورہ سلیس ہے اور مضمون واضح ہے۔ لیکن اس بات پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ صرف روانی و سلاست ہی ترجمے کے بنیادی اجزا نہیں ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف رواں اور سلیس کیسے ہوسکتا ہے جب کہ زبان کا مزاج اور جملوں کی ساخت ہماری زبان کے مزاج اور جملوں کی ساخت سے مختلف ہو۔ جب کہ ایک طرف تو ہمارے ہاں طویل جملے لکھنا مشکل کام ہو اور دوسری طرف قول محال اور جملہ معترضہ کا رواج بھی جدید روش کے ساتھ زبان میں داخل ہوا ہو۔ ترجمہ کا مزاج اصل تحریر کے مزاج سے الگ ہوتا ہے۔ ترجمہ کے ذریعے زبان ایک نئے مزاج سے روشناس ہو کر پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ نئے لہجے اور جملوں کی نئی ساخت کو اپنے مزاج میں جذب کر کے اظہار کی نئی قوتوں سے متعارف ہوتی ہے۔ ترجمہ کی اہمیت یہی ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعہ نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں جس سے ذہنی جذب و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسرے زبان کی قوت اظہار میں نئے امکانات پیدا ہونے لگتے ہیں اور وہ زبان بھی سنجیدہ خیالات کے بیانات پر قدرت حاصل کر کے احساس و خیال کی نئی نئی تصویریں ابھارنے کی اہل ہو جاتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکثر ترجمہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو ہمارے ہاں افسانوں اور ناولوں کے آزاد ترجموں کی وجہ سے راہ پا گئی ہے جب کسی فلسفیانہ پیچیدہ تحریر کا ترجمہ کیا جائے گا تو ظاہر ہے اس میں وہ روانی تو ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی جو خود اپنی زبان میں براہ راست لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جب یہ روانی ترجمہ میں پیدا نہیں ہوسکتی تو وہ ترجمہ اصل کیسے معلوم ہوگا۔ ایسے میں مترجم کا فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کا خیال رکھے۔ لفظوں کا ترجمہ قریب قریب معنی ادا کرنے والے الفاظ سے نہ کرے اور ضرورت پڑنے پر نئے مرکبات بنائے، نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ایسے ترجمے میں آخر کیا فائدہ جو سلاست تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح، اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے اور ساتھ ساتھ زبان کے مزاج کو اسی طرح روایتی روش و اظہار بیان پر قائم رکھے اور اس میں کسی اضافے، نئے امکان یا تجربے کی کوشش نہ کرے۔ زبان کے مزاج کو بدلنے، اسے نئے امکانات سے روشناس کرانے اور طرز ادا کے نئے نئے ڈھنگ سے آشنا کرانے میں مترجم کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ترجمہ کے ذریعے ایک زبان کی تہذیب دوسری زبان کی تہذیب کے ساتھ مل کر نئے نئے گل کھلا سکتی ہے۔

انگریزی زبان تہذیب و مزاج کے اعتبار سے اردو زبان سے مختلف ہے انگریزی میں جملوں کی ساخت فاعل، فعل، مفعول کی ترتیب اور تہذیبی انداز نظر ہماری زبان سے مختلف ہے ایسے میں تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس۔ (اسے ترجمہ کرنا نہیں کہتے۔ مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں) دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ مفہوم لے کر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے روایتی و مقبول انداز بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کر دیا جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو ترجمہ کی شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ساتھ بیان کا ایک نیا سانچا آ جاتا ہے۔ دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے۔ اب جب کہ زبانوں کے رشتے زیادہ وسیع ہو کر ایک دوسرے سے قریب تر ہو رہے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ مترجمین بھی اظہار کے سانچوں اور جملوں کی ساخت کا خاص طور پر خیال رکھ کر زبان کو نئے تقاضوں اور نئے امکانات سے روشناس کریں۔ جہاں تک ہماری زبان کا تعلق ہے اس میں شاعرانہ انداز بیان کے لیے بڑی گنجائش ہے لیکن پیچیدہ و فلسفیانہ تحریروں کے ترجموں میں یہ ماندی پڑ جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے ایسے ترجمے کم کیے ہیں جس میں زبان و بیان کے نئے اسلوب و تجربہ کا خیال بھی رکھا گیا ہو۔ دوسرے ترجمہ کرتے وقت نہ تو ہم نے نئے لفظوں کی ٹوہ لگائی ہے اور نہ لفظوں کو مخصوص معنی و مفہوم میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے ایک ہی لفظ کو مختلف لفظوں سے ترجمہ کر کے ہمیشہ اپنا کام نکال لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ الفاظ ذہن میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پورے طور پر ذہنی مفہوم کی تصویر ابھارنے میں ناکام رہتے ہیں۔ لفظوں کے ترجمے اور معنی متعین کرنے سے ایک طرف تو ابلاغ کا مسئلہ سہل ہو جاتا ہے دوسرے زبان میں سنجیدگی اظہار پیدا ہو جاتی ہے پچھلے دنوں میٹرک کے امتحان میں ایک سوال یہ پوچھا گیا کہ "مخلوط اور مرکب میں کیا فرق ہے۔ مثالیں دے کر واضح کیجیے بہت سے طلبہ اس سوال کا جواب صرف اس لیے نہ دے سکے کہ انہوں نے اپنے نصاب کی کتاب میں "آمیزہ" اور "مرکب" کا فرق پڑھا تھا اور یہاں ممتحن نے "آمیزہ" کے بجائے "مخلوط" کا لفظ استعمال کر کے ابلاغ کے مسئلہ کو طلبہ کے لیے دشوار تر بنا دیا تھا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ترجموں کے ذریعہ اس ابہام کو دور کریں اور لفظوں کے معنی و مفہوم متعین کر کے انہیں اپنی تحریروں کے ذریعہ مروّج کریں۔ انگریزی لفظوں کے اُردو ترجموں کی بے احتیاطی کا اثر ہمیں جدید نثر میں عام طور پر نظر آتا ہے۔ جس کے اکثر جملے بے معنی و بے ربط سے معلوم ہوتے ہیں اچھے ترجموں کے ذریعے اس خرابی کو بھی دور کیا جاسکتا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مترجم میں کام کرنے کا محرک یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دماغ پر زور ڈالے بغیر کسی دوسرے کے پھلوں کو اپنی زبان کے خوان میں رکھ کر پیش کر دے۔ اگر کتاب کا مصنف مشہور ہوا تو اس کے سہارے مترجم کو بھی شہرت کے پر لگ گئے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ایک طرف تو مترجم کی ذات مصنف کی ذات سے ہمیشہ کم تر رہتی ہے۔ برخلاف اس کے مصنف کی شخصیت ترجمے کے ذریعے پھیل کر اور بڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی بات ہو تو آدمی جس طرح چاہے اس کا اظہار کر دے لیکن ترجمہ میں آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگر اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے بالکل مطابق رہنے کی کوشش کی تو بیان میں اجنبیت در آتی ہے۔ جملوں کو توڑ کر اپنے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی تو اس کی زبان، بیان و اظہار کے نئے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کے اظہار کو اپنی زبان کے اظہار سے قریب تر لائے۔ اور مصنف کے لہجے اور طرز ادا سے اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب کے لیے راہ ہموار کرے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر ترجمے اُردو کے روایتی و مروّجہ طرز ادا کے ذریعہ کیے گئے ہیں جس سے زبان اور قوت اظہار کو ترجموں سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے جس کے امکانات ہمیشہ اچھے ترجموں میں ہوتے ہیں اور جن کی ہمیں زبان و بیان کی ترقی کے لیے شدت سے ضرورت ہے۔ ایسے ترجموں میں ممکن ہے آپ کو اجنبیت کا احساس ہو لیکن اس اجنبیت سے جب آپ مانوس ہو جائیں گے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اب زبان خیال و احساس کے بوجھ تلے دب کر نہیں رہ جاتی بلکہ اب اس میں اثر آفرینی کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے ترجمے رواداری میں نہیں پڑھے جا سکتے۔ اور نہ ان کی حسن و دلکشی ایک ہی نظر میں آپ کے دیدہ و دل تک پہنچ سکتی ہے بلکہ ایسے ترجموں کو آپ پلاٹ، کہانی یا موضوع کی دلچسپی اور افادیت زیادہ نئے فلسفیانہ انداز فکر، سنجیدہ تہذیبی رویوں، جملوں کی نئی ساخت،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اظہار و انداز بیان کے نئے امکانات کے لیے پڑھیں گے۔ ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''جب ایک زبان دوسری زبان سے سبقت لے جانے لگتی ہے تو عام طور پر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ زبان ایسے فوائد اپنے اندر رکھتی ہے جو اسے آگے بڑھاتے ہیں اور جو نہ صرف اپنے اور غیر مہذب زبان کے درمیان فکر اور لطافتِ اظہار کے اعتبار سے امتیاز رکھتی ہے بلکہ احساس کے اعتبار سے بھی بلند درجہ رکھتی ہے۔''

ہم اپنی زبان کو جب تک لطافت اظہار کے تنوع اور علوم کی وسعت سے مفید نہیں بنائیں گے، ہماری زبان پیچھے رہ جائے گی اور ہماری پوری تہذیب بھی موت کے آغوش میں جا سوئے گی۔ میرا خیال ہے کہ اچھے ترجموں کے ذریعے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی خدمت کر کے اسے مفید، کارآمد اور مؤثر بنا سکتے ہیں۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاعری کا ترجمہ: چند عملی مسائل
(ذاتی تجربات کے حوالے)

ف۔س۔اعجاز

ترجمہ ایک مشکل فن ہے۔ شاعری کا ترجمہ، وہ بھی شاعری میں، خصوصاً زیادہ مشکل کام ہے۔ اگر یہ کام آسان ہوتا تو جتنی انگریزی نظمیں اب تک مجھے پسند آئیں میں نے ان سب کا اردو میں ترجمہ کرلیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ جس ادب پارے کو میں نے پسند کیا اس نے اگر میرے جذبے کو بھی اکسایا اور مجھ سے میری زبان میں اپنے اظہار کا راستہ مانگا اور مجھے لگا کہ میں اس تقاضے کی تکمیل کر پاؤں گا تبھی میں نے اس ادب پارے کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ یعنی میں ترجمے سے پہلے تخلیق سے مانوس ہوجانا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب تک تخلیق اور ترجمہ ایک ہی ذہنی افق پر نظر نہ آنے لگیں، ترجمہ خصوصاً شاعری کا ترجمہ اثر کو ترستا رہے گا۔

ترجمہ یوں تو ایک سے دوسری زبان میں متن کی لسانی اور معنیاتی منتقلی کا نام ہے لیکن اس کا ایک منصبی پہلو بھی ہوسکتا ہے۔ اور وہ ہے اصل زبان کی ادبی صفات اور اس زبان سے وابستہ تہذیبی قدروں سے حصول آشنائی۔ مثلاً کالی داس یا رابندر ناتھ ٹیگور کے شہکاروں کے ترجمے کے ذریعہ ہم سنسکرت اور بنگلہ کے شعری نظام کے علاوہ مخصوص عہد کے مخصوص کلچروں کی نمائندگی کرنے والے فنکاروں کے طرز فکر اور عالم خیال سے آگاہ ہو پاتے ہیں۔

ترجمہ برائے ترجمہ یا ترجمہ برائے تفریح طبع کوئی اہم مقصد نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس ترجمے کے ذریعہ کسی بڑے مقصد کی تکمیل مترجم کی ذولسانی تفہیم اور فطری اپج پر منحصر ہوتی ہے۔ یعنی زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے ان دونوں کی اتنی سدھ بدھ مترجم کو ہونی چاہیے کہ وہ ایک طرف اصل متن کے اشارات ومفاہیم وصول کرسکے اور دوسری طرف ان موصولہ اشارات ومفاہیم کو اپنی زبان میں ادا کرسکے۔

دیگر زبانوں سے اردو میں شاعری کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے کچھ باتوں کا بطور خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصول ترجمہ، ترجمانی، اسلوب ترجمہ میں اوزان و بحور کا التزام کیا جاتا ہے اور نہیں بھی کیا جاتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا ہے کہ ایک نظم بیشتر پابند ہوتی ہے لیکن بیچ بیچ میں معریٰ یا نثری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی نظموں میں دو یا دو سے زائد بحریں بھی استعمال ہوئی ہیں جس کا مقصد مروجہ فارم سے انحراف ہے تو دوسرا مقصد پیرایہ اظہار میں قصداً ایک سے زیادہ ''لہجوں'' کے استعمال سے نظموں کی ساخت اور آہنگ کو متاثر کرنا ہے تاکہ اصوات و الفاظ کھردرے پن سے یکسر عاری نہ ہوں۔ ممکن ہے اسے اصل زبان کی شعری خصوصیت قرار دیا جائے لیکن کوئی اسے عجز شاعر پر بھی محمول کر سکتا ہے۔ ایسے بعض مواقع پر ترجمے کا آہنگ بھی کسی نظم کی ترجمے میں منتقلی وہ اہم چیزیں ہیں جن پر ترجمے کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ مترجم اگر شاعر بھی ہو تو شاعرانہ صلاحیت اس کام میں اس کی معاون سمجھی جائے گی۔

پیرافریز (Paraphrase) یعنی کسی عبارت کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کرنا ترجمے کی آسان منزل ہے۔ لیکن شاعری کے ترجمے میں فارم کی شرط لگا دی جائے مثلاً انگریزی سانیٹ کا ترجمہ اردو میں بھی سانیٹ ہی کیا جائے تو مترجم کو واقعی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ انگریزی میں چودہ سطروں میں کہی گئی نظم کا ترجمہ اردو میں چودہ مصرعوں میں ہی مکمل ہونے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ وہ بھی ہیئت کے التزام کے ساتھ کہ چار چار مصرعوں کے تین بند قوافی و ردائف کے ساتھ مکمل ہوں، پھر دو مصرعے مطلع غزل یا مثنوی کے شعر کی طرح موزوں کیے جائیں۔ لفظ بہ لفظ، مصرع بہ مصرع ترجمہ غالباً ممکن نہیں ہوگا۔ ایسی صورت میں مترجم زیادہ سے زیادہ متن کے مجموعی مفاہیم کی ادائیگی اور اردو کی شعری و عروضی پاسداری کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ یعنی پیرافریز سے بچ کر چلنا صرف مترجم کے ارادے اور صلاحیت پر منحصر نہیں ہے۔ میں نے ولیم شیکسپیئر کے چند سانیٹ اردو میں ترجمے کیے تو بڑی مشکلوں سے دوچار ہوا۔ لغت بھی میری زیادہ مدد نہیں کرتا تھا۔ ایک تو سوا چار سو سال پرانی انگریزی وہ بھی شیکسپیئر کے طرز خاص میں۔ زبان کا وہ طرز خاص اب متروک ہو چکا ہے۔ شیکسپیئر کے اسم، فعل، رموز و اوقاف کا ٹھیک ٹھیک سمجھنا کارے دارد ہے۔ وہ اس کے اسلوب میں بہت سموئے ہوئے ہیں۔ میں کبھی انگریزی ادب کا طالب علم بھی نہیں رہا۔ بس یہ زبان کالج اور یونیورسٹی میں میرا میڈیم تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا میرا فرض ہے۔

خیر، میں اپنا کوئی تجربہ بیان کر رہا تھا۔ میں نے اصل متن کے کلیدی مصرعوں کو اردو مصرعوں میں اس طرح موزوں کیا کہ معناً دونوں قریب قریب متبادل کہلائیں۔ پھر سانیٹ کے اصل مقصد اور شاعر کے لب و لہجہ کو بہت انہماک سے دیکھا۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن ایسا محسوس ہوا کہ شیکسپیئر جیسا بڑا شاعر بھی عام شاعروں کی طرح بیچ بیچ میں کچھ بے ربط یا اول فول کہہ جاتا ہے جس سے صرف نظر کرنا مترجم کے لیے بہرحال جائز نہیں لیکن جس صنف سخن میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کی پابندی اور خود ترجمے کی اثر پذیری کا خیال مترجم کو قدرے ردوکد پر مجبور کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تعقید لفظی کا سہارا لیا جائے تو بہتر ہے۔ یعنی الفاظ اپنے صحیح مقام پر سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آگے پیچھے کر دیئے جائیں تو کسی حد تک بات بن سکتی ہے۔ یہاں آ کر پیرافریز سے ہٹ کر خلاصہ آرائی کا کوئی طریقہ مترجم کو حسب حال خود دریافت کر لینا پڑتا ہے جس سے اصل متن اور ترجمے میں مطابقت اور انحراف کا کوئی خوشگوار اور معاون پہلو بر آمد ہو سکتا ہے۔ مطابقت اور انحراف کی ایک ملی جلی مثال شیکسپیئر کے ایک سانیٹ اور میرے ترجمے کے دو ٹکڑوں میں ملاحظہ فرمایئے۔

Those parts of thee that the world's
eye doth view want nothing that the
thought of hearts can mend: All
tongues-----the voice of souls-----give
thee that due,
Uttering bare truth, even so as foes
commend.

وہ پہلو ترا دنیا کی آنکھیں جسے دیکھیں
محتاج نہیں لوگوں کے کلمات رفو کا
سچ بول دے جب خلق خدا خود ترے حق میں
کلمہ پڑھے دشمن بھی ترے جوہر خو کا

اس مثال میں خصوصاً تیسرا مصرع مفہوم کی ترجمانی ہے، الفاظ کا لغوی ترجمہ نہیں ہے۔ اب اسی سانیٹ میں بند نمبر دو میں اصل اور ترجمے میں کچھ زیادہ مطابقت کا نمونہ دیکھیں۔

Thy outward thus with outhward praise is crown'd;

ظاہر کو ہے ظاہری توصیف کا اک تاج

But those same tongues that give thee so thine own.

لوگوں کی زبانیں جو بھی کرتی ہیں تائید

In other accents do this praise confound.

گر ٹھان لیں کر دیتی ہیں عزت کو بھی تاراج

By seeing farther than the eye hath shown.

جب آنکھوں کو ہر بات بجھا دیتی ہے تنقید

اس کے بعد شیکسپیئر کے سانیٹ سے اردو سانیٹ میں میرے ترجمہ کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ یہ ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاید اصل سے زیادہ قریب ہے۔

Why is my verse barren of new pride,

جانے کیوں ہیں میری نظمیں نئے فخر سے عاری

So far from variation or quick change?

ہر ہونی انہونی سے ہوں کیوں اتنا بے گانہ

Why with the time do I not glance aside

سمے کی بدلی دھارا دیکھوں ایسی خو نہیں ڈالی

To new-found methods and to compunds strange?

نئی نئی ترکیبوں سے ہوں میں بالکل انجانا

Why write I still all one, ever the same,

کیوں لکھتا ہوں جانے اب تک وہی ایک سے بول

And keep invention in a noted weed,

وہی پرانا سبزہ میرا میدان تحقیق!

That every word doth almost tell my name,

اک اک اکشر پیٹے میرے نام کا ڈھول

Showing their birth, and where they did proceed?

کتنی دور کی راہی ہوگی میری ہر تحقیق؟

O! know sweet love, I always write of you.

لیکن اے محبوب ہمیشہ تیری ہی باتیں لکھتا ہوں

And you and love are still my argument;

تو اور تیری پیت ابھی تک میرا ایک سوال

So all my best is dressing old words new,

اسی لیے تو شبد پرانے پھر سے سجاتا رہتا ہوں

Spending again what is already spent;

تاکہ جس کو خرچ کیا پھر خرچ کروں وہ مال

For as the sun is daily new and old,

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسے سورج روز نیا ہے، جیسے روز پرانا

So is my love still telling what is told.

میری پیت کا کام ہے پچھلے قصے کو دہرانا

پہلے سانیٹ کی انگریزی زبان ادق ہے اور شعری ساخت پیچیدہ ہے۔ دوسرے سانیٹ کی اصل زبان نسبتاً صاف اور رواں ہے اور ساخت بھی الجھی ہوئی نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں ترجمے کے میکنزم پر جو اثر پڑ سکتا تھا وہ ترجموں سے واضح ہے۔ اگر ترجمہ نثر میں کیا جاتا تو اصل متن پورے کا پورا اردو میں اپنے معانی کے اختصاص کے ساتھ منتقل ہو جاتا لیکن وہ کسی رومانی تاثر سے محروم ہوتا۔ دوسرے سانیٹ کے مصرعہ اولیٰ کا ترجمہ میں نے اولاً یہ کیا تھا: "جانے کیوں ہیں میری نظمیں نئے رنگ سے خالی" اور یہی چھپا بھی تھا۔ یہی مجھے زیادہ پسند بھی ہے۔ انگریزی میں کلر آف پرائڈ اکثر پڑھا بھی ہے۔ لیکن یہاں میں نے ترجمہ بدل دیا ہے اور اپنی ترجیح ختم کر دی ہے۔ مترجم کو آزادی ملنی چاہیے کہ وہ دوران ترجمہ اصل متن کے کسی ثقل وسقم کا اسقاط کر کے اس عیب کو موروثی بننے سے روک دے۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال ہے۔ ضروری نہیں کہ کوئی اس سے اتفاق کرے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ شاعری میں اگر خیال کی آمد ہوتی ہے تو ترجمے میں اسی خیال کی دوبارہ آمد ہوتی ہے جس سے مترجم اور صرف مترجم کو سروکار رہتا ہے جس کے سامنے اس کے اپنے قارئین ہوتے ہیں۔

کہیں کہیں مثلاً ٹی ایس ایلیٹ کی نظموں میں اصل متن کی خصوصیت کو برقرار رکھنے کی غرض سے درمیان میں دو ایک جگہ اوزان کی پابندی کو توڑنا پڑا۔ مضمون کی ابتدا میں اس طرف میں نے اشارہ بھی کیا تھا۔ شاید یہ میری اپنی کسر رہی ہو یا پھر اس "شکستہ وزن" کو منظوم ترجمے کی مجبوری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایلیٹ ہی کی نظم "The Hollow Men" میں تین جگہ اوزان تبدیل ہوئے ہیں۔ (بحر کی تبدیلی نظم گوئی میں نئی نہیں ہے اور نہ یہ عیب ہے۔ ساحر لدھیانوی کی طویل نظم "پرچھائیاں" ملاحظہ فرمائیں)۔ جی چاہتا ہے یہاں مذکورہ نظم کا ایک اقتباس اپنے ترجمے کے ساتھ پیش کروں۔ چنانچہ نظم "The Hollow Men" (کھوکھلے لوگ) کی چوتھی فصل ملاحظہ فرمائیں:۔

The eyes are not here — آنکھیں یہاں نہیں ہیں

There are no eyes here — اس جا نہیں ہیں آنکھیں

In this valley of dying stars — دم توڑتے سسکتے تاروں کی وادیوں میں

In this hollow valley — اس کھوکھلی زمین پر

This broken jaw of our lost kingdome — اس کھوئی مملکت کے اجڑے ہوئے کنارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے طن کی گویا اس آخری جگہ پر

In this last of meeting places اک دوسرے کو اپنے ہاتھوں سے ہم ٹٹولیں

We grope together ہونٹوں سے کچھ نہ بولیں

And avoid speech چڑھتی ہوئی ندی کے ساحل پہ چپ لگائے

Gathered on this beach of the tumid river ہم لوگ بے بصارت یونہی کھڑے رہیں گے

جب تک نہ لوٹ آئے

Sightless, unless بینائی پھر ہماری

The eyes reappear اور دائمی ستارہ

As the perpetual star اس موت کے جہاں میں

Multifoliate rose نابینا جھٹپٹے کے

Of death's twilight kingdom اوراق گل نہ پلٹے

The hope only ہر خالی آدمی کی

Of empty men. امید بس یہی ہے

اس کے بعد نظم کا پانچواں اور آخری حصہ آتا ہے جس کے آغاز اور انجام میں ایلیٹ نے چار چار سطروں کا ایک بند تحریر کیا ہے۔ پوری نظم معریٰ اور ایک بحر میں ہے لیکن یہ دو بند علیحدہ بحروں میں ہیں، اور دونوں بند ایلیٹ نے Italics یعنی ترچھے خط میں لکھے ہیں۔ ان میں سے پہلا بند دیکھیے جو پانچویں حصے کا آغاز ہے:

Here we go round the prickly pear

Prickly pear prickly pear

Here we go round the prickly pear

At five o'clock in the morning.

اس بند کا ترجمہ میں نے خط نسخ میں ایک معمولی حذف کے ساتھ کیا ہے۔ دو لفظ "Five o'clock" میں نے حذف کیے ہیں لیکن ترجمے میں وقت کا وہی تصور یا احساس آپ کو ملے گا جو اصل متن میں پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

ناشپاتیاں دینے والا خاردار اک پیڑ

جب ہوتی ہے صبح کی بیلا جب ہوتی ہے بھور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گشت لگانے آجاتے ہیں ہم اس پیڑ کی اور
ناشپاتیاں دینے والا خاردار اک پیڑ

اب پانچویں حصے کا آخری بند جو نظم کا بھی آخری بند ہے۔ نقل کر رہا ہوں۔

This is the way the world ends
This is the way the world ends
This is the way the world ends
Not with a bang but a whimper.

اسی طرح مرتی ہے دنیا
اسی طرح مرتی ہے دنیا
اسی طرح مرتی ہے دنیا
کوئی دھماکہ شور کیے بن
ریں ریں کر کے مرجاتی ہے

دو باتوں پر غور فرمائیں۔ خوش آہنگی کی خاطر شاعر کے چوتھے مصرع کو میں نے قصداً دو لخت کر کے دو مصرعے بنادیئے ہیں تاکہ ''اسی طرح مرتی ہے دنیا'' کی تین تکراروں سے اردو ترجمہ کرکرانہ ہو جائے اور یہ تکرار محض اصرار میں بدل جائے۔ دوسری بات یہ کہ ان مقامات پر شاعر کی وضاحت کے بغیر پس منظر سے کورس آوازوں کے ابھرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہاں صوتی آہنگ اور تال پر مترجم کو عبور ہونا چاہیے۔ میں نے اس کا دھیان رکھا ہے۔ (اس موقع پر میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ایلیٹ کی عصری حسیت سے بھرپور اس نظم کے چار مختصر بند جو ان دونوں بندوں کے درمیان آتے ہیں میری نظر میں اعلیٰ درجے کے شہ پارے ہیں)

یہ واضح رہے کہ اگر اصل سے راست ترجمے کے بجائے ترجمے سے ترجمہ کیا جا رہا ہو اور اس درمیانی ترجمے میں کوئی لفظی یا معنوی نقص رہ گیا تھا تو مترجم کو وہاں الجھن ہو سکتی ہے۔ کہیں کہیں متن کے کسی ٹکڑے کو ترجمے کا بہاؤ قبول نہیں کرتا اور اگر اس ٹکڑے کا ترجمہ کر دیا جائے تو ترجمے کی ترکیب بگڑ سکتی ہے۔ کہیں محض ایک لفظ کی تبدیلی مترجمہ نظم کی معنویت اور ترسیل کے لیے جادو اثر ثابت ہوتی ہے۔ سلومیجانیرس (Salomeja Neris) لتھوانیا کی رومانی شاعرہ کی ایک پرسوز و پرکیف نظم کا عنوان "Twenty Sou" ہے۔ نظم 1937ء میں کہی گئی۔ اس میں لتھوانیا کی کرنسی کا نام "Sou" (بروزن "You") تھا یا ہے۔ روسی مترجم دوریان روتنبرگ (Dorian Rottenberg) نے 1987ء میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ میں نے اس کا اردو ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1991ء میں کیا۔ ماجرا یہ ہے کہ پیرس کی سڑکوں پر ایک گل فروش لڑکی یا عورت صبح سے کچھ پھول بیچنے کی ناکام کوشش میں تھک گئی۔ بیس سو کے پھول اس کا اثاثہ تھے جنہیں وہ دن بھر میں فروخت نہیں کر پائی اور اپنی یومیہ آمدنی سے محروم رہی۔ اس کی مایوسی طبیعت پر ایسا تاثر چھوڑ جاتی ہے کہ ناظرین مغموم ہو جاتے ہیں۔ پانچ بند کی پابند نظم کا ترجمہ میں نے پانچ بند کی پابند نظم میں کیا ہے۔ ہر بند کے چوتھے مصرع میں "For only twenty sou" کی تکرار سے گل فروش یا مالن کی محرومی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب ''سو'' کو ہمارے یہاں کون جانتا ہے؟ ڈالر، پونڈ وغیرہ تو سب جانتے ہیں۔ چنانچہ "For only twenty sou" کا میں نے ''بیس روپیوں کی اک رقم کے لیے'' ترجمہ کر دیا۔ پیرس میں روپیوں کا ذکر بے محل ہے لیکن بہ حیثیت مترجم میرے سامنے میرا اپنا مسئلہ تھا۔ صرف ''سو'' کو ''روپیوں'' سے بدل دینے سے یقین جانئے میرا یہ ترجمہ بے حد سراہا گیا کیونکہ ہر پھر کر اس نظم میں جذبہ احساس کو انگیز کرنے والا یہ لفظ کلیدی ہے اور اسے ہندوستان، پاکستان وغیرہ میں ہر زبان کا ہر فرد جانتا ہے۔

دراصل یہ نظم انوکھی کیفیت کی نظم ہے۔ پھول رومان اور حسن کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سینتیس کی نظم ہے۔ معاشرے میں کس طرح کا مالی بحران رہا ہوگا جب ایک حسینہ کے ہاتھوں لوگ دن بھر میں بیس روپے کے پھول نہیں خرید پاتے ہوں گے۔ اس صورت حال میں نسائی لہجے میں غم و یاس کا اظہار ملاحظہ فرمائیے:

The passers-by won't answer,

I don't know what to do.

I'm freezing here since morning

For only twenty sou.

راستہ چلتے لوگ بھی چپ ہیں

بجھ گئے میری آرزو کے دیئے

صبح سے میں بھٹک رہی ہوں یہاں

بیس روپیوں کی اک رقم کے لیے

تیسرے مصرعے کا ترجمہ دراصل یوں کرنا چاہیے تھا: ''صبح سے منجمد کھڑی ہوں یہاں''۔ یہاں مجھ سے ایک چوک ہوئی۔ اس نظم کا ترجمہ میں نے پیرس کی سیر کے بعد کیا تھا۔ وہاں ایک جگمگاتی رات میں شانزالیزے کی شاہراہ پر میں نے ایک گل فروش کو گشت کرتے ہوئے پھول بیچتے دیکھا تھا۔ شاید بوقت ترجمہ اس کی بھاگ دوڑ کی تصویر میرے ذہن میں ابھر آئی اور مصرع میں دو لفظ بدل گئے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تخلیقی ترجمے میں بھی کبھی مترجم کا اپنا کوئی مشاہدہ یا کیفیت چپکے سے داخل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔ (اس کا احساس مترجم کو بعد میں بھی ہو سکتا ہے)۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح ''تحریف ناز ک'' کی چند اور مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ واضح رہے میں نے تحریکِ نازک کہا ہے تحریف خفی نہیں۔ تحریف نازک سے یہاں میری مراد تحریف برائے نزاکت ولطافتِ فن ہے۔ میرے ایک مقامی دوست سبرتو بندو پادھیائے بنگلہ اور انگریزی میں جدید شاعری کرتے ہیں۔ ان کی فرمائش پر میں نے ان کی کئی نظموں کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ جہاں کہیں علاقات واستعارات کے ترجمے کی مشکل درپیش آتی ایسا لگتا کہ مجھے اپنے وجود پر کمبل اوڑھ کر کسی غار میں کشفِ معنی کے انتظار میں بیٹھے رہنا پڑے گا۔ ابہام کو خوبصورت اور کارآمد بنانا بھی مترجم کی ذمہ داری ہوسکتی ہے۔ یہاں کسی خاص تفصیل میں نہیں جانا ہے۔ علامت نگاری سے الگ ایک چھوٹا سا تجربہ بیان کرنا ہے۔

میرے دوست کی ایک نظم کا عنوان تھا "A play, a play"۔ نظم میں جو کچھ ہے مصنف اس سے مراد لیتا رہا ''ایک کھیل، ایک کھیل''۔ کھیل کیسا؟ جنسی چھیڑ چھاڑ کا، پیار محبت کا۔ میں نے اس کی یہ نظم بار ہا پڑھی تو دیکھا بات تو اس میں جنسی خواہش اور پیار کے کھیل کی ہے لیکن آغاز میں ایک سمندری جہاز کے عرشے پر معشوقہ کے بینجو بجانے کا ذکر بھی آیا ہے کہ وہ کچھ بہکی اور آوارہ دھنیں بجا رہی ہے۔ میں نے اس نثری نظم کا نثری نظم میں ترجمہ کر دیا اور اس کو عنوان دیا ''ایک دُھن، ایک کھیل''۔ انگریزی میں موسیقی کا آلہ بجانے کے لیے بھی ''پلے'' کا ہی لفظ آیا ہے۔ جب شاعر کو میں نے اس انگریزی عنوان کا یہ اُردو ترجمہ بتایا تو وہ اس معنوی تصرف پر چونکا اور خوش بھی ہوا۔ اپنے ہی عنوان کی معنوی محویت اس کے دامِ خیال میں نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح مترجم سے فروگذاشت ممکن ہے اسی طرح شاعر سے بھی فنی چوک ہوسکتی ہے۔ اسی لیے میں نے اوپر کہیں لکھا تھا کہ مترجم متن کے ثقل اور سقم پر بھی نظر رکھے اور اسے ہٹا دے تو کچھ برا نہیں ہے۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے ترجمہ اور نکھر جائے۔ خصوصاً تجریدی تخلیق کے ترجمے میں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے۔

ترجمے کے دوران اپنی زبان کے محاورات اور روزمرہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس سے ترجمے میں چاشنی، نکھار اور سبھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ صرف متبادل الفاظ کے استعمال سے بات نہیں بنتی۔ ترجمے کے الفاظ کو پوری نظم کی صورت حال کا عکاس بھی ہونا چاہیے۔ ایڈورڈس ی ڑے لائیتس کی ایک انقلابی روسی نظم میں نے انگریزی ورژن "Unite My Eyes!" سے اُردو میں ترجمہ کی ہے۔ جس کا مقصد ہے ظلم کے خلاف گہرے انسانی جذبات کو ابھارنا ہے۔ ایک نہتا سرفروش، جری انسان ظالموں کے نرغے میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی ہے اور سے ایک خندق میں زندہ دفن کیا جانے والا ہے۔ وہ جیالا بار بار دشمنوں کو للکارتا ہے ''یہ پٹی کھول دو''۔ یہ پٹی کھول دو۔ نظم کی ارتقائی کیفیت اعلیٰ درجہ کی سرجوشی سے پُر ہے۔ اس نظم کو میں نے ''میری آنکھیں کھول دو!'' کے عنوان سے پیش کیا۔ اور آنکھوں پر پٹی بندھنا یا آنکھوں سے پٹی کھلنا وغیرہ اُردو محاوروں سے استفادہ کیا۔ ذرا سے طنز کی شمولیت سے مفہوم میں ایک نوکیلا ابھار پیدا کرنا مقصود تھا کہ پٹی دراصل سرفروش کی آنکھوں پر نہیں ظالموں کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آنکھوں پر بندھی ہوئی ہے۔ پوری نظم دہرائے بغیر میں اپنے استدلال کو ثابت نہیں کرسکتا۔ لیکن نظم طویل ہے اس لیے صرف اس کا کلائمکس پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

Take off your rag! To meet death blind
is beneath mans dignity.
Allow these bitter tears of mine to dry
up in the wind.
I loved this life too much --- I'll die
In proud tranquility.
I lived for life's sake --- in life's name
Today I meet my end.
"Take off your rag, you murderers!
Don't hide your faces, you!
I'll look into the eyes of those
who my death-sentence signed.
"Take off your rage --- I want to know,
who at this hour fears who?!
And so I tell you one more time:
Untie, untie these eyes of mine!"

اب آپ ترجمہ پر غور فرمائیں کہ کس طرح تخلیق سے زیادہ ترجمے میں لفظوں کے حرکی پہلو پر زور صرف کرنا سودمند ہوسکتا ہے۔ اور تعقیدِ معنوی کی بھی ترجمہ میں بڑی اہمیت ہو جاتی ہے۔

''تم نے باندھی ہے جو پٹی کھول دو!
اندھی آنکھیں موت سے ملتا ہے جو
وہ قابلِ تحقیر ہے
میرے کڑوے آنسوؤں کو
خشک ہونے دو ہوا میں
زندگی کو میں نے چاہا ہے بہت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجھ کو یہ اعزاز ملنا چاہیے
پر سکوں اک پُر سکوں انداز سے
زندگی کے واسطے جیتا رہا
زندگی کے نام پر مرتا رہا
(یہاں مرنا محاورتاً جینے کے معنی میں ہی آیا ہے)
آج ملنا ہے مجھے انجام سے
اپنی پٹی کھول دو تم قاتلو!
اپنے چہرے مت چھپاؤ بز دلو!
جھانکنا ہے ان کی آنکھوں میں مجھے
دستخط میری سزائے موت پر جن کے ہوئے
پنی پٹی کھول دو اے قاتلو!
میں بھی دیکھوں کون کس سے ڈر رہا ہے اس گھڑی؟
اس لیے اک بار پھر کہتا ہوں میں
میری آنکھیں کھول دو، ہاں میری آنکھیں کھول دو!"

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ شاعری کا ترجمہ قانون کی کتاب (Statute book) کے ترجمے سے الگ کام ہوتا ہے۔ اس میں جذبات کی لہریں اوپر نیچے چلتی رہتی ہیں۔ ہر ملک کی شاعری اس کے عوامی کلچر اور طرزِ فکر سے متاثر ہوتی ہے۔ اس میں مقامی علائم و استعارات بھی بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں۔ ان باتوں کے علم کے ساتھ ادب کی گلوبلائزیشن کے لیے ایک زبان کے شہکاروں کو دیگر زبانوں میں منتقل کرنا ضروری ہے۔ اور اس ضمن میں ترجمے کو تخلیق سے معاونت کرنا چاہیے۔ اس کی کئی صورتوں اور ضرورتوں پر اپنے تجربات کے حوالے سے میں نے روشنی ڈالی ہے اور یہ ایں ہمہ مجھے اپنے عجزِ فن کا اعتراف ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شعری ادب کے تراجم کے مسائل اور مشکلات

پروفیسر جیلانی کامران

(۱)

شان الحق حقی نے اپنے مقالے میں ترجمے کے لسانی عمل کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسانوں کے وسیع گروہوں کے مابین ربط اور اشتراک کے لیے ترجمہ ایک بنیادی تقاضا بھی ہے اور اس کے کئی افادی پہلو بھی ہے۔ انہوں نے مذہبی کتابوں، فنی اور سائنسی تعلیمات کے تراجم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مقالے کا زیادہ تر حصہ اور شعری ادب کے تراجم کے بارے میں دشواریوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ شعری ادب کے ترجمے کے سلسلے میں انہوں نے مترجم اور متن کے رشتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ ترجمہ اس مقصد کے تابع ہوتا ہے جس کی خاطر کسی شعری یا ادبی متن کا ترجمہ کیا جاتا ہے اور مقصد بھی یا تو علمی ہوتا ہے یا اسے ادبی ضرورتیں بروئے کار لاتی ہیں۔ اسی ضمن میں انہوں نے شعری ادب کے ترجمے کی ذیل میں یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کیا شعری ادب کا ترجمہ نثر میں کارآمد ہوتا ہے یا اسے شعر ہی میں منتقل کرنا مناسب ہے۔ جو اس سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ نثری ترجمہ اصل شعری متن کے مزاج کے ساتھ غالباً انصاف نہیں کرتا اور اس طرح نثری ترجمے کے باعث اصل شعری متن کی تاثیر کم ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی سوالوں کے ساتھ یہ سوال بھی سامنے آیا ہے کہ کیا شعری متن کا براہ راست ترجمہ ممکن بھی ہے؟ جبکہ زبانوں کے محاورے اور زبانوں کا لسانی سانچے مختلف ہوتے ہیں اور اگر ایسی دشواری رفع نہیں کی جا سکتی تو کیا ترجمہ کرنے والے کو اجازت ہے کہ وہ وجدانی تحریک کے زیر اثر اصل متن کی روح میں اترے اور آزاد فکر کی مدد سے اصل شعری متن کو ترجمہ کرے۔ یوں ترجمہ تشریحی ہوگا۔ ترجمے کے عمل کی وضاحت کے سلسلے میں انہوں نے اردو کے کلاسیکی ادب کا ذکر کیا ہے جو فارسی اور عربی سے ترجمہ کیا گیا تھا شکسپیر اور فٹز جیرالڈ کا تذکرہ کیا ہے نذرالاسلام اور ٹیگور کی بنگالی نظموں کا حوالہ دیا ہے لارڈ لٹن کی نظم اور احسن لکھنوی اور چار دوسرے شاعروں کے ترجمے کا ذکر کیا ہے جو "اندھی پھول بیچنے والے کے گیت" سے مشہور ہے۔ شان الحق حقی کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہنا ہے کہ ترجمے کے لیے خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے تاہم ضروری یہ ہے کہ ترجمے اور اصل متن کا باہمی رشتہ برابر قائم رہے اور اصل متن کے ساتھ تعلق ان نئے لوگوں کے لیے برابر سودمند ہو جن کے لیے اصل شعری متن کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

(۲)

ترجمے کے عمل کا اگر ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف ممکن ہے کہ کوئی بھی ترجمہ سو فیصد اصل متن کے مطابق نہیں ہوتا اور دوسری بات یہ نظر آتی ہے کہ خواہ گفتگو ہی کے جملوں کو دو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تو جہاں زبانیں ایک ہی لسانی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں وہاں جملے کی ساخت قریباً یکساں ہوگی لیکن جہاں ایسے یکساں لسانی گھرانے موجود نہیں، وہاں جملے کی ساخت میں بھی ردو بدل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ان دونوں باتوں کو ترجمے کے عمل کی بنیادی دشواری قرار دیا جاسکتا ہے۔تاہم ایسی دشواری ایک اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ترجمے کی صورت میں متن کی شکل ہر طور بدلتی ہے۔متن ترجمے کے عمل سے گذرتے ہوئے ایک نیا قالب اختیار کرتا ہے اور نئے لسانی پیکر میں نئے لفظوں کے ذریعے آشکار ہوتا ہے۔علاوہ ازیں ہر زبان کے الفاظ کی اپنی محاکاتی فضا ہوتی ہے۔ یوں ترجمے کا عمل متن کو ایک نئی لسانی آب و ہوا میں آباد کرتا ہے۔اس امر کو دوسرے اصول کے طور قبول کیا جاسکتا ہے۔اس لیے اگر دو اصولوں کی روشنی میں ترجمے کے عمل کو دیکھا جائے تو علم ہوگا کہ ترجمے کے ذریعے الفاظ بدلتے ہیں لیکن متن کا مافیہ قائم رہتا ہے اور ترجمے کے عمل کا انسانی مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ متن کا مافیہ لوگوں کے درمیان گردش کرتا رہے اور لوگ اس مافیہ کے ذریعے وحدت انسانی کے تصور کی تائید کرتے رہیں کہ زمین ایک ہے اور اس پر ایک ہی نوع انسان آباد ہے۔

شان الحق حقی نے ادب عالیہ اور شعری ادب کے ضمن میں بائبل کے مشہور ۱۶۱۱ء کے ترجمے کا ذکر کیا ہے اور ایسے ہی حوالے کے تحت شاہ عبدالقادر کے مشہور ترجمے کی طرف اشارا بھی کیا ہے جو عربی نحو کے مطابق آیات کو اردو میں منتقل کرتا ہے۔ان عظیم ترجموں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے غالباً اس امر کو ملحوظ نہیں رکھا کہ لاطینی بائبل اور قرآن کریم دونوں کی قدیم ترین روایت ناظرہ تلاوت کی رہی ہے اور بلند آواز سے دونوں زبانوں میں مقدس کتابوں کی تلاوت ہوتی رہی ہے اور عصر حاضر میں بھی برابر ہوتی ہے۔دونوں تراجم میں اس اعتبار سے جملوں کے صوتی تاثر کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے اور یوں وہ گہرا اثر صادر ہوتا ہے جو انسان کے لیے لازمی ہے۔۔۔تاہم جہاں تک بائبل کا تعلق ہے ۱۶۱۱ء کے ترجمے کے لیے جو کمیشن قائم کیا گیا تھا اس نے بائبل کے عبرانی مزاج کو ملحوظ رکھا تھا اور اہل علم کی متفقہ رائے ہے کہ ۱۶۱۱ء کے ترجمے نے اپنے عہد کی انگریزی کو ایک نئے اسلوب سے روشناس کیا تھا۔اسی طرح شاہ عبدالقادر کے ترجمے نے بھی اردو زبان کو ایک اعلیٰ پیرایہ اظہار دیا ہے اور اس ترجمے کو اردو نثر میں یقیناً اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں نے ان عظیم تراجم کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان تراجم میں "لفظ" کو کسی طرح ثانوی حیثیت نہیں دی جاسکتی مقدس کتابوں میں لفظ ہی قطعی اور مستقل اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے اصل متن کی ترکیب کے مطابق لفظ کے مطابق لفظ کا استعمال لازمی ہے اور اسے کسی معاشرے میں رائج جملوں کی ساخت کے تابع نہیں کیا جاسکتا کسی زبان کی اپنی گرائمر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان آسمانی کتابوں کے جملوں کو اپنے قواعد کے مطابق بدل دے جن کے الفاظ کا مقام نشست اور وجود کے اعتبار سے قطعی ہے۔ اس لیے ترجمے کا عمل ان مقدس کتابوں کی ضمن میں لفظ کے مطابق لفظ اور مقام لفظ کے مطابق مقام لفظ کے احوال سے انحراف نہیں کرسکتا لیکن ادب عالیہ کی شعری تخلیقات کے بارے میں اس اصول کو استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔

(۳)

شعری ادب کے ترجمے کے بارے میں اس خیال کو ملحوظ رکھنا کہ شعری متن کو مروجہ شعری صورت ہی فراہم کی جائے اس لیے ضروری ہے کہ مختلف لسانی گھرانوں کے عروضی نظام عموماً مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ غالب کی غزل کو انگریزی کی (Heroic Couplet) میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے تو یہ سوچنا مناسب ہے کہ محض سانچے کی مشابہت سے غالب کی غزل کا انگریزی ترجمہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ غالب کی صد سالہ تقریبات پر کلکتے اور نیویارک سے غالب کے ترجمے اسی اصول کے تحت کیے گئے تھے اور شائع بھی ہوئے تھے اور دونوں تراجم میں غالب کے ساتھ قطعاً انصاف نہیں ہوا تھا۔ انگریزی شعری روایت نے غالب کے مقام کو گرادیا تھا۔ غالب کو بجا طور پر صوفی نیاز کے انگریزی ترجمے میں شناخت کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ صوفی نیاز کا ترجمہ روایتی (Heroic Couplet) کا سانچہ استعمال نہیں کرتا لیکن غالب کی شعریت تک ضرور رسائی پاتا ہے۔ اسی طرح جاوید نامہ اور آربری کا ترجمہ بھی غور طلب ہیں نکلسن نے اسرار خودی کے انگریزی ترجمے میں اسلوب کی بجائے اسرار خودی کے مافیہ کو مدنظر رکھا ہے۔ اسی طرح یورپی زبانوں میں دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کے وہی انگریزی ترجمے مقبول ہوئے ہیں جہاں نثری طریق اختیار کیا گیا اور گوئٹے کے فاؤسٹ کو بھی ایسے ہی طریقے سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ جرمن زبان ٹیوٹانک لسانی گھرانے کی زبان ہے اور انگریزی کا تعلق بھی اسی لسانی گھرانے کے ساتھ رہے اور جہاں تک اطالین زبان کا تعلق ہے وہ بھی انگریزی کے عروضی نظام سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

کبھی زمانے میں "میرا جی" نے یورپی قرون وسطیٰ کے "وانڈرنگ سکالرز" کے گیتوں کا اردو ترجمہ کیا تھا لہذا یہ ترجمے "میرا جی" کی کتاب "مشرق و مغرب کے نغمے" میں شامل ہوئے اور شائع ہوئے تھے، لیکن "میرا جی" نے اضافتوں اور غزل شعری زبان کے استعمال سے ان گیتوں کی سادگی کو زائل کردیا جو اصل شعری متن میں برابر موجود ہے اور انگریزی میں بھی جن کا حسن اور جن کی تازگی محسوس کی جاتی ہے۔ میرا جی نے شعر کو شعر میں ترجمہ کرنے کا اصول اپنایا تھا اور نتیجہ حسب حال برآمد نہ ہوسکا۔ تاہم بعض حالات میں نظم کا ترجمہ نظم میں بھی ممکن ہوا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۔مثلاً مجید ملک کی نظم " مجھے تجھ سے عشق نہیں " تا ثیر کا سائیٹ تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لیے یا احسن لکھنوی کی مشہور نظم " ...د میں مالن کے ہیں ٹوٹی ہوئی ڈالی کے پھول " ۔ایسے تراجم ہیں جنکو کامیاب کہا جاسکتا ہے ۔اسی طرح عظمت اللہ خاں نے ورڈز ورتھ کی دو نظموں کا ترجمہ " کوئل " اور ہم ستا ہیں کیا ہے جنکو خوبصورت نظمیں قرار دیا جاسکتا ہے ۔تاہم اگر ان تراجم کو جانچا جائے تو اصل متن کا ردھم ،اور کیڈنس ان تراجم میں منتقل نہیں ہوئے اور قدامت پسند ادیبوں کا خیال ہے کہ نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہوتی ہے ۔ان دونوں صورتوں سے جو بات نمایاں ہوتی ہے یہ ہے کہ اگر انگریزی نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہے اس شعریت کے ضروری اجزا ردھم اور کیڈنس بھی ہیں ۔لیکن اردو ترجمے میں نہ تو وہ کیڈنس ہے اور نہ ردھم ہے ۔تو اس سے یہی مراد لی جاسکتی ہے کہ اردو شاعروں نے ترجمے کے لیے اپنی پسند کے عروض استعمال کیے ہیں اور یوں شعر کو شعر میں ترجمہ کرتے ہوئے آزادی انتخاب کا استعمال کیا ہے اس لیے اگر یہ کہا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا کہ اگر شعر کو شعر میں ترجمہ کرتے وقت نظم کا پیکر بدل سکتا ہے ۔عروض برقرار نہیں رہتے ،ردھم وہی نہیں رہتا اور زبان اور شعری جملے کا کیڈنس بھی قائم نہیں رہتا تو پھر شعر کو شعر میں ترجمہ کرنا لازمی ہے کہ معاشرے کی ادبی عادات ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور کیا معاشرے کی ادبی عادت کو بدلا نہیں جاسکتا تا کہ شعری ادب کے مافیہ سے براہ راست ہم کلامی ممکن ہو،

(۴)

انگریزی شاعری کے دو مشہور شاعروں ،"بائرن اور " کیٹس " کی تخلیقات بھی اس ضمن میں قابل توجہ ہیں ۔اس امر سے انگلستان کے علمی حلقے بھی خاصے پریشان ہوئے تھے کہ مغربی یورپ کی زبانوں میں بائرن کے تراجم تو موجود تھے لیکن کیٹس کے تراجم دکھائی نہیں دیتے تھے ۔اس اعتبار سے انگلستان کی رومانی تحریک کی پہچان بائرن بن چکا تھا ۔آخر کار غور وفکر کے بعد معلوم ہوا کہ بائرن ایک ایسا شاعر ہے جسے ترجمہ کیا جاسکتا ہے ۔کیٹس کی شاعری ترجمے کی گرفت میں نہیں آتی ۔دونوں شاعروں کی شعری زبان میں نمایاں فرق یہ ہے کہ بائرن کی زبان بیانیہ اور شفاف ہے ۔جبکہ کیٹس کی شعری زبان استعارے کا استعمال کرتی ہے اور اس کی امیجری زبان کے بطن سے پھوٹتی ہے ۔اگر اس بات کو ملحوظ رکھا جائے تو استعارے کی شعری زبان کو ترجمہ کرنا نہایت غیر مناسب ہے جب تک کہ استعارے کو منہا کرنے کا اصول تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ کہ استعارہ شعری زبان کے لسانی پیکر میں ضم ہوتا ہے اور اسے ترجمہ کرتے ہوئے زبان کی محض ایک جہت ہی کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے جو حقیقتاً شاعری کے مافیہ سے بے تعلق ہوتی ہے ۔اس لیے غالب کو ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے اور غالباً جو ترجمے سو سالہ تقریب پر شائع ہوئے تھے اسی لیے ناکام ثابت ہوئے تھے ۔

" بائیوگرافیا لٹریریا " میں کولرج نے منظومات اور شاعری کو ایک دوسرے سے الگ قرار دیا ہے ۔اس کی رائے ہے کہ اوزان اور عروض کے استعمال سے کسی شے کو شاعری نہیں بنایا جاسکتا ۔تاہم ان کو نظم کہا جاسکتا ہے اور یہ بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری نہیں کہ نظم بھی شاعری ہو۔کولرج کا کہنا ہے کہ شاعری کے لیے عروض اور قافیے کی کوئی قید نہیں۔شاعری ان میکانکی پابندیوں کے بغیر بھی رونما ہوتی ہے اور ہوتی رہی ہے۔کولرج نے اس ضمن میں پرانے عہدنامے کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔جوعظیم ترین شاعری ہیں (مثلاً "یرمیاہ" "نبی صحیفہ") اوران پر نہ تو قافیے کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ وہ نظام عروض کی پابند ہیں۔کولرج کی رائے میں لازوال شاعری وہی ہے جو ترجمے کے عمل سے گزر کر شاعری رہے اور ترجمے کے عمل کے بعد اصل شعری متن کا مافیہ ہی شاعری کی نشاندہی کرتا ہے۔اس اعتبار سے کسی شعری متن کا مافیہ اصل شعری ہے!

شان الحق حقی نے اپنے مقالے میں شکسپیئر کے بعض ڈراموں کے ترجمے کا ذکر کیا ہے اور مولی عنایت اللہ دہلوی کے تراجم کی طرف اشارہ کیا ہے تاہم شکسپیئر کے کچھ ڈراموں کو آغا حشر نے بھی اردو میں منتقل کیا تھا۔لیکن اس ضمن میں قابل توجہ یہ ہے کہ شکسپیئر کو منظوماتی طور پر ترجمہ کرنے سے شکسپیئر شاید باقی نہیں رہتا۔تاہم کمال امروہی نے نرگس آرٹ کنسرن کی فلم "رومیو اینڈ جولیٹ" میں شکسپیئر کی شاعری کو اردو میں منتقل کر کے جو کامیابی حاصل کی تھی وہی اس امر کا ثبوت ہے کہ شعر کو شعر میں ترجمہ کرنے کا طریق متروک ہو چکا ہے۔شاعری کو شاعری میں منتقل ہونا چاہیے!

تاہم شعر کو شعر اور نظم میں ترجمہ کرنے کی روایت ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب اردو شاعری میں نہ تو جدید نظم ظاہر زمانے میں تعلق رکھتی ہے جب اردو شاعری میں نہ تو جدید نظم ظاہر ہوئی تھی اور نہ نثری نظم ہی کہ تجربے ہی سامنے آئے تھے۔اس لیے بے قافیہ نظم اور نثری نظم کی مدد سے کسی بھی شعری متن کو اردو میں بڑی آسانی سی منتقل کیا جا سکتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اصل متن کی شاعری سے براہ راست ہم کلام ہونا ممکن ہوسکتا ہے۔شان الحق حقی نے اپنے مقالے میں نثری ترجمے کا ذکر بھی کیا ہے لیکن میرے خیال میں نثری ترجمے کی ترکیب ایسے طریق کار کے ساتھ نہیں رکھتی۔کیوں کہ انہوں نے نثری ترجمے کو منظوم ترجمے کی ضد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

میرے خیال میں اگر شعری ادب کے تراجم کے لیے ان پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے جو عروض، قافیے اور اضافتوں کی سکہ بند زبان سے تعلق رکھتی ہے۔تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے۔لیکن ان پابندیوں کو نرم کرتے وقت شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی شرط کا عائد کرنا لازمی ہے ۔اگر تراجم کی زبان شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی صلاحیت کو بروئے کار لاسکتی ہے تو تراجم کی زبان کا ایک نیا شعری آہنگ ظاہر ہوگا،کیونکہ شاعری جب بھی کوئی قالب اختیار کرتی ہے شاعری ہی کو رونما کرتی ہے۔ایسا رویہ اور ایسا طریق کار اعلیٰ شعری ادب کو عالمی ورثے میں شامل کرتے ہوئے میکانکی ہیئت کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے قابل ہوگا اور دنیا کے اس شعری ورثے سے جو ہمارے پاس ہے اور ہماری عظیم روایتوں میں سے ہے، دوسری قومیں مستفید ہوسکیں گی اور ہم بھی عالمی ورثے کو اپنے شعری ادب میں حاصل کرسکیں گے۔شاعری کبھی اپنے الفاظ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روشن نہیں رہتی۔ اس لیے جس بشکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے اپنے ہی اصل لباس کو آشکار کرتی ہے۔ انسان کے قلب ونظر کی گفتگو شاعری ہے اور اسے قلب ونظر کی گفتگو ہی میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ترجمے کے عمل کو قلب ونظر کی گفتگو بنا دینے سے اعلیٰ شعری ادب کے در و بام کھل سکتے ہیں! شان الحق حقی نے اسے وجدانی تحریک کا نام دیا ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ: اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی (مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد اور لفظی ترجمہ

تھیوڈر سلوری/آصفہ جمیل

فن کار خواہ وہ کسی بھی فن سے متعلق ہو اپنے اتالیق یا نقاد کے بغیر ادھورا ہوتا ہے جو اسے ہمیشہ یہ بتانے کے لیے تیار رہتے ہیں کہ اس کو کیا کرنا چاہیے یا اس نے کیا کیا ہے۔؟

مترجموں کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ہدایت، نصیحت، اصلاح اور نکتہ چینی میں تینوں طرح کے اشخاص سے استفادہ کرنے کے لیے تیار رہیں یعنی جو جانتے ہیں، جو نہیں جانتے اور جو غلط جانتے ہیں۔ لیکن یہ تینوں طرح کے اشخاص یہاں تک کہ موخرالذکر بھی (جن کی معلومات غلط ہیں) سب سے زیادہ خطرناک ہیں اور اپنی آواز بغیر وثوق کے بلند کرتے رہتے ہیں بیشک اگر ان کے دلائل کی بنیاد کچھ روشن اصولوں پر ہو تو یہ اصول ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ کیا یہ اصول الفاظ کی پیچیدگی اور ابہام کے باوجود واضح طور پر سمجھے جاسکتے ہیں اور ان کا کوئی جواز ہوسکتا ہے؟

اس سوال کا ایک جواب یہ ہے کہ ترجمہ کے اصولوں کے بیان میں اختصار تاممکن ہے اور توضیحی شکل اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنی ہم سمجھتے ہیں لیکن یہ دشواری خود مترجموں کی تحریروں سے پیدا ہوئی ہے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ترجمہ کے کوئی عالمی اصول تسلیم نہیں کیے گئے ہیں کیونکہ ان اصولوں کی تشکیل کرنے والے حضرات خود آپس میں کبھی متفق نہیں ہوسکے اور ان کے خیالات میں بے انتہا مغائرت ہے، انہوں نے جو کچھ بھی ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ منتشر خیالات کا ایک ایسا ابتر مجموعہ ہے جس کی ہمیں ادب کے دوسرے شعبوں میں مثال نہیں ملتی۔ مترجموں کی کوششوں کا ماحصل مندرجہ ذیل نکات سے زیادہ واضح ہو جائے گا۔

۱۔ ترجمہ میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

۲۔ ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۳۔ ترجمہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ ترجمہ کو ترجمہ ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

۵۔ ترجمہ میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔

۶۔ ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔

۷۔ ترجمہ اصل متن کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

۸۔ ترجمہ کو مترجم کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

۹۔ ترجمہ میں اصل تصنیف سے حذف و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ ترجمہ میں اصل متن سے حذف و اضافہ کبھی ممکن نہیں۔

۱۱۔ نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔

۱۲۔ نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔

دی گئی فہرست میں سب سے پہلے جو متبادلات ہیں ان کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک لفظی یا دیانتدارانہ ترجمہ پر اصرار کرتا ہے اور دوسرا با محاورہ یا آزاد ترجمہ پر۔ اس ترجمہ کی ہمیشہ حمایت کی گئی ہے جو امکانی حد تک لفظی ترجمہ کہلائے اور یہ حمایت اس خیال کی بنیاد پر کی گئی ہے کہ اصل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وفاداری مترجم کا فرض ہے۔ کوئی مترجم عام مصنف سے کسی بھی طرح کی غیر دیانت داری کا الزام لینے اور اس سے بچنے کا خواہاں نہیں ہوتا، لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اس سے بچنے کی ضمانت حاصل کرے اس کے ذہن میں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ دیانت داری سے کیا مطلب ہے اور یہ کن عناصر پر مشتمل ہے؟

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لفظی یا لفظ بہ لفظ ترجمہ، ترجمہ کا سب سے اولین طریقہ ہے بلکہ یہ خالص دنیاوی اور غیر ادبی کاموں کے لیے مناسب ہے اور اگر دیانت داری بھی اس معنیٰ میں لی گئی ہو تو صرف یہی نا قابل احتراز سچائی بچے گی کہ کسی زبان میں ہر لفظ کا بالکل صحیح مترادف تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

دیانت داری کی حمایت کی ایک وجہ یہ ہے کہ مترجم یہ کبھی نہ بھولے کہ وہ ایک مترجم ہے وہ تسلیم کرے کہ وہ اصل مصنف نہیں ہے اور وہ کام جو اس کے ہاتھ میں ہے اس کا اپنا نہیں ہے اس کی حیثیت ایک ترجمان کی ہے جس کا فرض قارئین اور مصنف کے درمیان ایک پل کا کام کرنا ہے اس کو اپنی حیثیت بالکل فراموش کر دینا چاہیے اور وہ روم یا برلن کو لندن یا پیرس سے براہ راست بولنے کی اجازت دے اگر وہ یہ محسوس کر لے کہ اس نے ایسا کیا ہے تو اپنی فتوحات پر فخر کر سکتا ہے۔ ولیم کوپر نے ہومر کے ترجمہ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ مجھے سب سے بڑا فخر اس کا ہے کہ میں اصل متن کے زیادہ سے زیادہ قریب رہا ہوں۔

مگر مترجم جو یہ اصول قبول کرتا ہے بہت جلدی مشکلات میں گھر جاتا ہے جس کا اظہار **Rossetti** سے زیادہ بہتر اور موثر طریقے پر کسی نے نہیں کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> ''مترجم کا کام (اور یہ پوری عاجزی سے کہا گیا ہے) نفی ذات میں سے ایک ہے۔ اکثر وہ محاورے اور اپنے عہد کی خصوصیات سے کام لے گا اگر اس خواہش کا تعلق صرف اسی سے ہے تو اس کا اپنا احساس ترنم اس کی رہبری کرے گا اگر اصل مصنف کا اسلوب اور احساس ترنم اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا تو ایسا ہوگا کہ کبھی موسیقی کے لیے مواد کی قربانی دے گا اور کبھی مواد کیلئے موسیقی کی۔ لیکن نہیں، اس کو دونوں کے ساتھ برابری کا رویہ رکھنا پڑے گا۔ کبھی کبھی ایسا ہوگا کہ اصل تصنیف میں کوئی خامی یا کوتاہی اسے روکے گی، اور وہ بظاہر اپنے طور سے اسے دور کرنے کی کوشش کرے گا، اس طرح مصنف کے لیے وہ کام کرے گا جس سے اس کے عہد نے اسے محروم رکھا تھا۔ مگر نہیں ان سب کاموں کے لیے وہ مجبور نہیں ہے۔''

اس پیراگراف کے مطالعہ کے بعد کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ لفظی ترجمہ کو لیاقت کے ساتھ ترتیب دینا بہت مشکل کام ہے اور ہم کو آزادی کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اس لیے پوسٹ گیٹ کو یہ کہنے کی ترغیب ملی کہ ''دیانت داری کے اصول ترجمہ کی افادی حیثیت اور عام رضامندی سے نہ کہ عالمی مشق و روایت کی رو سے وضع کیے گئے تھے۔''

اکثر لوگوں نے ترجمہ میں آزادی کی حمایت کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مترجم نے خود کو اصل تک رسائی کی محنت سے بچالیا ہے۔

اکثر ہم سے کہا جاتا ہے کہ ترجمہ میں اصل کتاب کی ضرورت کے مطابق کوئی بھی بامحاورہ اظہار ترجمہ میں شامل کرنے کے مجاز ہیں۔

پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ انگریزی میں ہونا چاہیے کہ وہ اصل کی طرح پڑھا جائے اور اصل مضمون کے تمام نقوش اس میں دکھائی دیں۔ ان سب ہدایات کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ ترجمہ ایسا ہونا چاہیے جو بہت آسانی اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاسکے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کبھی نہیں پڑھا جاسکے گا۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ترجمہ کبھی بھی نہیں کیا گیا ہوتا۔

یہ خطرات وہ ہیں جن کو مترجم خود مول لیتا ہے، ان کی حدود شاید ان الفاظ میں ظاہر ہوسکیں جو ہمارے کسی دوست کے منہ سے ہماری درخواست پر کی دوسری زبان کے ایسے خط کا ترجمہ کرتے ہوئے جس کی عبارت صاف طور پر نہیں پڑھی جاتی نکلتے ہی، وہ خاص انہاک کے ساتھ اپنی عقل مندی کا اظہار کرتے ہوئے اس خط پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے ''دراصل میں اس خط کو پوری طرح نہیں پڑھ پا رہا ہوں لیکن اس کا مطلب کچھ ایسا نکلتا ہے.......''

میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس طرح کا تجربہ ہوا ہوگا۔ اپنے اس دوست کے آزاد اور خاصے بے معنی و بے مصرف ترجمہ کی مدد لینے کے بجائے ہم یہ طریقہ اختیار کریں کہ ایک محدب شیشہ لے کر اس خط کے ایک ایک لفظ کا لغت کی مدد سے ترجمہ کر لیں۔

ایک آزاد اور قابل قبول ترجمہ کی خصوصیات کا محتاط جائزہ.... تین اہم نکات ہمارے سامنے لائے گا۔

ا۔ بہت مختصر اور اذعانی بیان کہ ایک ترجمہ اپنے متن کی طرح ہونا چاہیے، استدلال کی مدد سے اس بات کی حمایت کی جاسکتی ہے۔ متن کا ترجمہ متن کی طرح ہونا چاہیے یعنی اس نظریہ کا منطقی ماحصل یہ ہے کہ قاری یہ امتیاز نہ کر سکے کہ یہ ترجمہ فرانسیسی یا یونانی سے، عربی یا روسی سے کس زبان سے کیا گیا ہے۔

۲۔ جب یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مترجم اور اصل مصنف میں نمایاں فرق ہے تو مترجم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ مصنف کا مقروض ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ ترجمہ اصل تصنیف کا نتیجہ ہے جو مترجم نے کیا ہے، اسی طرح اصل مصنف بھی مترجم کا مقروض ہے جو ایک قابل لحاظ حد تک اس ترجمہ کا مالک ہے۔ اس ملکیت کی بنا پر ہی مترجم کو اظہار و ادا میں ایک حد تک انحراف کی اجازت دی جاسکتی ہے مگر سوال صرف اس بات کا ہے کہ کس حد تک انحراف کی اجازت ہو۔ یہ مسئلہ مترجم کی خواہش کے مطابق حل نہیں کیا جاسکتا مگر اس کی زبان کی ماہیت وسعت، محاورے، اظہار اور ساخت مترجم کی زبان کے درست ہونے کی ایک مثال ترجمہ کو بنانے کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

۳۔ یہ حقیقت کہ مصنف کے برخلاف مترجم ان بہت سے مترجموں میں سے ایک ہوتا ہے جو اس سے پہلے ترجمہ کا یہی کام کر چکے ہوتے ہیں۔ ایک مترجم جو گوئٹے یا موپاساں کی تصانیف کا ترجمہ کر رہا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہ ان مترجموں کے سلسلے کی سب سے آخری کڑی ہے جنھوں نے ماضی میں ان مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی جن کا اب وہ سامنا کر رہا ہے اس سے کچھ نازک سوالات اس کے سامنے آتے ہیں کہ اگر اس نے ایک فقرہ تراشا ہے جس کے بارے میں اس کو یقین ہے کہ اس سے مصنف کے مفہوم کا ہو بہو اظہار ہوتا ہے اور اگر پھر اس کو یہ معلوم ہو کہ اس کے پیش رووں میں سے کسی نے پہلے ہی اس کا استعمال کیا ہے تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟ سند یافتہ لوگوں سے خیالات میں اختلاف ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسے بھی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے کہا کہ جو ترجمہ ایک دفعہ کر لیا گیا آئندہ آنے والے اس کو مقابلتاً بہتر بنانے کی کوشش نہ کریں اور یہاں تک کہنے سے گریز نہیں کیا کہ ایک ایسا مقابلہ صرف اتفاقی مطابقت دور کرنے کے لیے ہونا چاہیے اگر یہ سختی سے لاگو کیا گیا تو بیوقوفی ہوگی۔ ورجل نے دوسری Aeneid کے شروع میں Conticuere Omnea لکھا جس کا کی نے اس طرح ترجمہ کیا۔ All were hushed اور دوسرے نے اس طرح کیا All were silent پھر ایک نیا مترجم کیا یہ ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرے؟ "They all held their tougnes"

''ان سب نے اپنے منہ سی لیے''

ایک زیادہ قابل قبول نقطہ نظر جے پوسٹ گیٹ نے پیش کیا جس کا خیال اس کے برعکس ہے کہ اگر ایک مترجم نے بہترین ترجمہ کیا ہے اسے معلوم ہو کہ اس کے کچھ فقرے اس سے پہلے دوسروں نے استعمال کیے ہیں تو اسے ان کو تبدیل کرنے کا کوئی راستہ نہیں سوچنا چاہیے۔

ایک ترجمہ محاوراتی اظہار پر مشتمل ہوسکتا ہے جو کہ اس کی زبان سے مخصوص ہے اور جس کو کہ مترجم قبول کرنے کے لیے مناسب سمجھتا ہے مگر اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ مصنف کا اسلوب اپنا لیتا ہے جس کی کہ ایک قاری امید کرتا ہے۔ اسلوب تحریر کے ہر ٹکڑے کا امتیازی وصف ہے، مصنف کی شخصیت کا ماحصل اور اس کے لحاتی جذبات اور کچھ حد تک اس کی فطرت کو ظاہر کیے بغیر ایک پیراگراف بھی یکجا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر جو مصنف کیلئے حقیقت ہے وہی مترجم کے لیے بھی ہے۔ مصنف کا اسلوب خواہ فطری ہو یا اکتسابی الفاظ کا انتخاب وہ خود کرتا ہے جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ مترجم اکثر متبادل الفاظ کے درمیان انتخاب کے لیے مجبور ہوتا ہے، اور اپنے انتخاب کے عمل میں وہ اپنی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اس کا اپنا اسلوب نہیں مگر اس کا دھندلا سا عکس ہوسکتا ہے۔

لفظی ترجمہ کو ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے مصنف کے اسلوب کے نزدیک تر آنے کا زیادہ امکان ہے اس کو اور بھی درست ہونا چاہیے۔ اور کوئی نقل چاہے تصویر یا نظم کی ہو اس کی صحت سے جانچنا زیادہ موزوں ہے تاہم یہ حقیقت ہے کے تصنیف کے اثر کو دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش میں بہت زیادہ لفظی ترجمہ ایک غلطی ہے۔ اس کے تاثرات دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے مصنف کے جملوں کی ساخت کو بدلنا ضروری ہوسکتا ہے جیسے کہ ڈاکٹر ای، وی، ایو Odssey کے اپنے ترجمہ کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے

''دوسرے تمام بڑے ادیبوں کی طرح ہومر کی تصانیف میں بھی
مواد اور اسلوب ایک دوسرے میں جذب ہوگئے ہیں اور اگر ہم ہومر کی
تصانیف کو بجنسہ منتقل کریں تو معنی اور اسلوب دونوں سے ہاتھ دھونا
پڑتا ہے۔''

یہ نا قابل انکار حقیقت اس بات کی حمایت کرتی ہے کہ باقاعدہ صحیح اور لفظی ترجمہ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ بہترین ترجمہ کی مثال جو مترجم اپنے رکھ سکتا ہے رشی اور مورے نے اتنے اچھے طریقے سے بیان کی ہے کہ ان کے الفاظ کا اقتباس دینا ہی مناسب ہے۔ ''فرض کرو ہم رسکن کے ایک خاص صفحے کا دیانت دارانہ ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ہم اسے دو فرانسیسی تعلیم یافتہ دوستوں کو تنقید کے لیے پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک انگریزی کم جانتا ہے جب کہ دوسرے کی ہماری زبان کے بارے میں اچھی خاصی معلومات ہیں اگر پہلے نے یہ کہا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتا کتنا پیارا انداز ہے۔اس کا مصنف کون ہے؟ دوسرا جواب دے ''یقیناً رسکن ہے اگر چہ مجھے اس کا اصل اقتباس یاد نہیں ہے۔'' تب ہم یقین کر سکتے ہیں کہ اسلوب کے اعتبار سے ہمارا ترجمہ مثالی ترجمہ سے دور نہیں رہا ہے۔ہمیں بامحاورہ فرانسیسی زبان ہی لکھنا چاہیے اور کوشش یہ ہو کہ اس میں اصل کا لطف برقرار رہے۔

اسلوب مصنف کی شخصیت اور تاریخ کے اس عہد سے جس میں وہ رہتا ہے دونوں سے متاثر ہوتا ہے ترجمہ جس طرح زمانی خلا کو پر کرتا ہے اسی طرح مکانی خلا کو بھی۔چاسر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے انگریزی میں لکھا تھا مگر اس کے باوجود کافی قارئین ''کینٹری بری ٹیلس'' کو ناقابل فہم پاتے ہیں اور اس کے ترجمہ کو اپنے زمانے کی انگریزی میں پڑھ کر زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چوسر کے بعد Arcbishop Crammer نے عام دعاؤں کی کتاب اس وقت تک لکھی گی انگریزی کتابوں میں سب سے دلکش انگریزی میں لکھی ہے اس کے باوجود آج ایسے پادری بہت ہیں جو یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اس کے الفاظ تبدیل کر دیں۔جہاں تک عام ترجمہ کا تعلق ہے اس مسئلہ کو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔سروانٹس Don Quixote 1605 میں شائع کی۔کیا اس کہانی کا ترجمہ اس کی ہم عصر انگریزی زبان میں ہونا چاہیے۔یعنی وہ زبان کہ اگر وہ انگریز ہوتا تو اس میں تصنیف کرتا۔یا آج کی انگریزی میں؟ اصولی طور پر اسکے جواب میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا،اور اکثر حالتوں میں قاری ایک ایسی زبان میں ترجمہ کی توقع کرنے میں حق بجانب ہے جس کا وہ عادی ہے اگر ترجمہ کا کام اپنے قارئین کے ذہنوں میں وہی احساسات پیدا کرنا ہے جو اصل کو پڑھ کر اولین قارئین کے ذہنوں میں پیدا ہوئے تھے تو جواب واضح ہے۔ جب مصنف اپنے مواد سے زیادہ اپنے اسلوب کی وجہ سے پڑھا گیا ہو تو استثنا کے امکان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔خصوصاً ہم سسرو کی تقاریر کو پڑھ سکتے ہیں داد دے سکتے ہیں۔آج انگریزی کا سب سے بڑا خطیب چرچل ہے۔مگر چرچل کا اسلوب سسرو کا اسلوب نہیں ہے کیا سسرو کی تقریر کو اس کی ضرورت ہے کہ ہم چرچل کے انداز خطابت کے مطابق اس کا ترجمہ کریں؟ نہیں!

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ خیالات کے انتشار کا بڑا سبب خود ایک انوکھی چیز ہے جو وضاحت طلب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وضاحت کا جز انسانی ذہن کی طبعی تغیر پذیری میں پایا گیا۔یہی واحد سبب ہے کہ کچھ قارئین لفظی ترجمہ کو اور کچھ دوسروں کے آزاد ترجمہ کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی سبب کچھ قارئین کی اس ترجیح کو جو کبھی یہ نہیں بھولتے کہ وہ ایک ترجمہ پڑھ رہے ہیں اور باقی دوسرے جو اس بات کو ذہن سے محو کر دیتے ہیں اس کو بھی واضح کرتا ہے۔مگر یہ بیان تمام اختلافات کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہے۔

ترجموں کے قارئین کی اپنی ذاتی پسند ہی مختلف نہیں ہوتی، بلکہ ان کے پڑھنے کی وجوہات بھی مختلف ہوتی ہیں ،شاید سب سے اہم سبب قدیم ترجمہ کے کام کا مقصد،اصل تصنیف کی زبان سے لاعلمی کی کمیوں کو پورا کرنا ہے لیکن اکثر ترجمہ ایسے اشخاص بھی پڑھتے ہیں جو مترجم کی طرح ہی اصل زبان کو جانتے ہیں اور جب تنقید کرنا مناسب سمجھتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں تو ان کے ذہن اس واقعے سے نجات نہیں پاسکتے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ عام قاری جو اصل زبان سے ناواقف ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی ناواقف ہی رہے، اسکے لیے ان کی تنقید بے معنی ہوسکتی ہے۔ اور شاید ایسے قاری کے لیے وہ ترجمہ خوشگوار اور اطمینان بخش ہوسکتا ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ اصل زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

پھر آخر ترجمے ہوتے کس لیے ہیں؟ اس باب میں چار حصے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

اول ایسا قاری ہے جو تصنیف کی زبان بالکل نہیں جانتا وہ احساس تجسس کے تحت یا اس زبان کے ادب سے حقیقی دلچسپی کے زیر اثر پڑھتا ہے جس کا ایک جملہ بھی وہ اصل زبان میں نہیں سمجھ سکتا۔

دوسرا طالب علم وہ ہے جو اصل تصنیف کی زبان سیکھ رہا ہے وہ ترجمہ کی مدد سے اس کے ادب کو پڑھ کر بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔

تیسرا وہ قاری ہے جس نے ماضی میں اس زبان کو سیکھا تھا۔ لیکن چونکہ دوسرے فرائض اور کاروبار کی وجہ سے اپنی ابتدائی معلومات کو تقریباً فراموش کر بیٹھا ہے۔

چوتھا دانشور ہے جو اسے ابھی تک جانتا ہے۔

ظاہراً قارئین کی یہ چار قسمیں ہیں ترجمے کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کررہی ہیں۔

اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ چونکہ عام طور پر مختلف طریقوں اور آلات کی مدد سے مختلف مقاصد حاصل ہوتے ہیں اس لیے ایک ہی طرح کا ترجمہ ایک ہی طریقہ سے ان سب کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا۔ دوسرے الفاظ میں قاری کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ترجمہ کی ہر شکل کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔ جو ٹھیک طریقہ سے اس وقت پورا ہوتا ہے جب اسی قاری نے اسے استعمال کیا ہو جس کے لیے وہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیئے اس کو وضاحت سے دیکھیں کوئی بھی بہت آسانی سے ان الفاظ کا تصور کرسکتا ہے جو ترجمہ کی کسی نئی کتاب کو ہاتھ میں لینے پر چار مختلف حضرات کی زبان سے نکلیں۔

پہلا اپنے تئیں کہتا ہے یہ کتاب کس موضوع سے متعلق ہے؟ میں لوگوں کو اس کتاب کے بارے میں یوں بات کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، مصنف نے ان کی دلچسپی کے لیے کیا کیا ہے؟

دوسرا کہتا ہے اس ترجمہ کے مطالب میں آسانی سے سمجھ لوں گا ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر میں اس کا خیال ذہن نشین کرلوں گا۔ تیسرا کہتا ہے زیادہ عرصہ نہیں گذرا، میں نے خود اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ترجمہ میں کیا کیفیت پیدا ہوئی ہے؟ اس وقت مجھے جو لطف آیا تھا یہ ترجمہ بھی اسے دینے میں کامیاب ہے یا نہیں؟

چوتھا کہتا ہے میں بھی دیکھوں کہ مترجم نے اصل کتاب کی کیا حالت بنادی، مجھے خود اس کتاب سے محبت تھی اور امید ہے کہ اس نے اس کتاب کے حسن کو تباہ نہیں کیا ہوگا۔

قارئین کی یہ چار اقسام ہمارے ترجمے کی مختلف قسموں سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔ کم علم آدمی آزاد ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پڑھ کر خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کے تجسس کو تسکین پہنچاتا ہے اور وہ سوچنے کی زحمت اٹھائے بغیر آسانی سے پڑھ لیتا ہے زبان کے طالب علم کو صحیح انگریزی میں لفظی ترجمہ سے مدد ملے گی۔ وہ زبان کی مختلف ساختوں کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں اس کی مدد کرے گی وہ الفاظ جن کو وہ کم جانتا ہے ان کے صحیح استعمال اس کے سامنے آتے ہیں۔ تیسرا اس ترجمے کو ترجیح دیتا ہے جو ترجمہ کی طرح معلوم ہوتا ہو یہ اس کے سابق علم کی یادوں کو واپس لے آتا ہے اور اس کے لاشعور کو ایسا لگتا ہے گویا وہ اصل زبان پڑھ رہا ہے۔ اور چوتھا جو اصل کا مواد اور اسلوب دونوں جانتا ہے وہ ترجمہ کے بعض حصوں میں علمی نکات سے محظوظ ہوگا اگرچہ یہاں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس ترجمہ کے بارے میں اس کی رائے زنی اکثر طنز آمیز نکتہ چینی پر مشتمل ہوگی۔

ان چاروں قسم کے قارئین کی تعداد کم نہیں ہے جیسے ایک مصنف نے جس نے تقریباً 20 سال ایک پبلک لائبریری میں گذارے ہوں، جانتا ہے کہ لائبریری کا عام قاری ایک ایسی شخصیت ہے جو کہیں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہ یہ مشہور تصنیف کا ترجمہ جو کتب خانے کی زینت بنتا ہے وہ اپنے قدر شناسوں کا حلقہ خود پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے ماسوا بہت سے قارئین ایک سے زیادہ تراجم پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ تراجم ایک ترجمہ کے مقابلے میں چار گنا زیادہ بہتر ہوتے ہیں اور ادبی مہمات کے وسیع میدان میں ان سب کے لیے جگہ موجود ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لفظی ترجمہ

خالد محمود خان

فن ترجمہ میں لفظی ترجمہ نگاری کی خاص تاریخی اہمیت ہے۔ لفظی ترجمہ کی ابلاغی اہمیت اس کی تاریخی اہمیت میں ضم ہو جاتی ہے۔ عہد قدیم میں مقتدر کتابوں، دستاویزات، اقوال، مراسلات، اور بادشاہوں کے فرمان کو تقدیس کی اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ تقدیس کے محافظوں نے ترجمہ کے لیے سخت ترین اصولوں کا تعین کیا۔ خیال غالب یہ تھا کہ ترجمہ نقل سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور پھر نقل بھی ایسی جو بمطابق اصل نہ ہو۔ ترجمہ کے عمل میں ترجمہ نگار ذریعہ کی زبان میں خیالات کی سمت سے بھٹک سکتا تھا، اس لئے نہ صرف ترجمہ کو کسی تیسرے درجے کا عمل Activity گردانا گیا بلکہ ترجمہ نگار کو بھی تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ بادشاہ ریاست کا سربراہ تھا اور مقدس ادارے چرچ اور مندر، وغیرہ اس کے مفادات کے محافظ تھے۔ بظاہر تقدیس بادشاہ کی ترجیحی اقدار میں آتی تھی۔ دراصل تقدیس Divinity بادشاہ کو زیادہ بااختیار اور مطلق آمر بنانے میں مدد کرتی تھی۔ عوام کو مقدس اداروں کی ہدایات، فرمان، تبلیغ۔ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کے متعلق سوال و جواب کا حق نہ تھا۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کلیسا کے لئے بادشاہ کا احترام عام کے خلاف کسی دھوکے یا جعلی پن سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ جب کلیسا بادشاہ کے مفاد میں اس کی مرضی کے فرمان جاری کرسکتا تھا تو تقدیس بادشاہ کی مرضی، انتخاب اور خوش نودی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھی۔ اسی طرح کلیسا سے منسوب کی گئی مقدس اقدار Divine Values کا درجہ رکھتی تھیں۔ کلیسا اور بادشاہ کے کہے گئے لفظوں، تحریر کردہ دستاویزات کے ترجمہ میں تحریف اور تصریح کو یقینی شرط سمجھ لیا گیا تھا۔ ترجمہ میں ابلاغ کی روح قبض کر لی گئی تھی۔ ابلاغ سے عوام استحصالی اداروں کے کردار، مقدس اور مقتدر تحریروں کا تجزیہ بھی کر سکتے تھے۔ ان کے استدلال کو تسلیم بھی کر سکتے تھے اور ان سے اختلاف بھی۔ جبکہ بادشاہ اور کلیسا کے نظام میں تسلیم و رضا آئین اول و آخر تھے۔ جبکہ تجزیہ، اختلاف، تبصرہ، تنقید اور توضیح نے انکار کے انداز میں جنم لیا۔ اشرافیہ بادشاہ کا وہ خدمت گار طبقہ تھا جو عوام کو کلیسا کے شکنجے میں کسنے کا مقدس فریضہ سرانجام دیتا تھا۔ بادشاہ، اشرافیہ اور کلیسا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے خیالات کے اخفاء میں محفوظ Secure محسوس کرتے تھے اور اس کے افشا میں غیر محفوظ Insecure۔ یہ انداز فکر استحصالی تکون کی بقا کے لئے ضروری بھی تھا اور انکی نفسیاتی تشکیل کا خمیر بھی۔ ایسے خیالات جو مفید ہوتے انہیں اخفاء میں رکھا جاتا تھا کہ کوئی استحصالی اداروں کے کردار کے خلاف ردعمل ہی نہ کر سکے۔ "سینہ بہ سینہ علم" کے تصور کے اسباب بھی "تحفظ اور عدم تحفظ" کے تقاضے ہی تھے۔ مسلمانوں نے خاص طور سے علم طب Medical Science فن تعمیر Architechire میں ان مکروہات کو بڑی سنجیدگی سے اپنایا۔ مسلم تہذیب میں سائنسی عمومیت کی کبھی بھی زیادہ اہمیت نہیں رہتی۔ ترجمہ کے ارتقاء کے عمل کو سمجھنے کے لئے کلیسا، بادشاہ اور اشرافیہ کے پس منظر کو واضح کرنا بے حد ضروری تقاضا ہے۔ اس سے قدیم تراجم میں قباحتوں کی تشریح ہوتی ہے۔

ترجمہ کے عمل پر علمی تظلم اور تشدد کی تاریخ کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ عوام کو شعوری طور پر لاعلم، جاہل اور بے فکر رکھ کر علم سے افادہ کلیسا، بادشاہ اور اشرافیہ کی پناہ گاہ تھا۔ ابلاغی ترجمہ ان کے لئے تباہی کا باعث ہو سکتا تھا۔ عوام کو عوامی ابلاغ سے محروم کر کے تنزل کی تاریکیوں میں پھینک دیا گیا۔ ان کی جہالت کے ثمرات جھولیاں بھر بھر کر کئی کئی نسلوں کے لیے سمیٹ کر خزانوں میں محفوظ کر دیے گئے۔

قدیم ہندوستان میں ترجمہ کے عمل کا ارتقاء بہت ہی دلچسپ ہے۔ ہندوستان میں قدیم داستان، رامائن، مہابھارت اور بھگود گیتا سے اخذ کی جاتی تھی۔ اگرچہ مندر میں مقدس کتابوں کی تلاوت سنسکرت میں کی جاتی تھی مگر سنسکرت عوام کی زبان نہ تھی۔ عام طور پر برہمن، پنڈت یا دیگر ہندو مذہبی رہنما سنسکرت سے واقفیت رکھتے تھے۔ لوگوں کی شادی بیاہ، موت فوت سے لے کر مندر میں عبادات کی زبان بھی سنسکرت ہی تھی۔ عوام صرف اس زبان میں وہ کچھ سنتے تھے جس کی انہیں خاطر خواہ سمجھ نہ تھی۔ مندر میں جنتر منتر اور بھجن تنتر سب سنسکرت میں پیش کیے جاتے تھے۔ عام آدمی کا سنسکرت سے ناواقف ہونا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ سنسکرت ایک مقدس زان ہے اور اسے تقدیس کے محافظ یعنی پنڈت، پروہت ہی سمجھنے اور بولنے کے اہل تھے۔ اس کی وجہ سے وہ معاشرے میں اہم اور ممتاز مقام رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کا نظام بہت ہی سخت گیری سے مسلط رہا۔ ایک ذات کے لوگ دوسری ذات کے لوگوں سے زیادہ معزز اور اہم تھے۔ اسی طرح بہت سی ذاتوں کے لوگ حقیر سمجھے جاتے تھے۔ کھشتری، برہمن سے، ویش کھشتری سے اور شودر، ویش سے حقیر اور کم تر سمجھا جاتا تھا۔ آج اس عہد جدید میں بھی ہندوستان میں "دلت عوام" کی موجودگی اسی پرانی حقیقت کو ثابت کرتی ہے جسکی بنیاد پر ذات پات کا غیر انسانی معاشرہ تشکیل دیا گیا تھا۔ پاکستان میں مصلی، میراثی، بھنگی، کوہلی اور شیدی کے علاوہ بہت سی ایسی ذاتیں اور پیشے ہیں جن کو ارذل سمجھا جاتا ہے۔ ان سے گھٹیا کاموں کے علاوہ چوری چکاری، اٹھائی گیری، ڈاکہ زنی، قتل و غارت اور دیگر سماجی جرائم بھی کرائے جاتے ہیں۔

ذات پات کے اس نظام کی بنیاد مذہت تھا جس کا مقصد عوام کا معاشی استحصال تھا۔ تقدیس میں معاشی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استحصالی اور مفاد پرستی کے خلاف سوال وجواب کی گنجائش نہ تھی۔ دیوی دیوتاؤں کے نام پر عوام کو نہ صرف ترقی کے سفر میں معذور کر دیا جاتا تھا بلکہ استحصالی طبقوں کے لیے ان ہی کے مفادات کی حد تک محدود کر دیا جاتا تھا۔ ذہن اور سوچ پر اس بربریت اور تشدد کا عالم یہ تھا کہ استحصالی طبقوں نے اپنے خیالات یا اپنے مذہب کے خیالات کو عام کرنے کے لیے بھجن گانے والے مردوں، عورتوں کا انتخاب کر رکھا تھا۔ بھگت، سنت، سادھو، سیوک، شیوک مقدس گیت گا کر پنڈت، پروہت کے لیے نہ صرف شہرت کا باعث بنتے بلکہ اس کے لیے بے حد اہم معاشی وسیلہ بھی تھے۔ وہ مندر سے نکلتے اور گاؤں گاؤں، گلی گلی مقدس گیت گا کر عوام سے مندر اور پروہت کے لیے خیرات مانگتے۔ بھگوان کے نام پر مندر اور پروہت کے لیے خیرات دینے کی اصل معنویت کسی پر آشکار ہی نہ ہوتی تھی۔ یہ رویہ آج بھی اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ اس غیر انسانی اور غیر معزز عمل کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مقدس گیت عوام کے دروازوں پر گائے جانے لگے۔ اس طرح استحصالی طبقہ اس طریق سے اپنے معاشی مفادات کے لیے پھیلاؤ پیدا کر لیتا تھا۔ جس قدر زیادہ سنت، سادھو جتنے زیادہ لوگوں کے پاس جا کر گاتے اسی قدر مال و زر سونا چاندی، کپڑا لتا اور فصلیں پکنے پر ہر جنس میں حصہ بھی ملتا تھا۔ پاکستان میں مسلمانوں کے دربار، درگاہ کے ادارے کا بھی ایسا ہی کردار ادا ہے۔ درویش، بزرگ، فقیر، منش ہستیوں کے نام کو معاشی استحصال کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ دربار، درگاہ کو بنانے، چلانے کا طریق مندر کے طریق جیسا ہی ہے۔ مسلمانوں نے مندر ہی کے طریق کو اپنے مذہبی خدوخال کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

گیت گانے کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے مقدس گیت عام لوگوں تک پہنچنے لگے۔ چونکہ مذہبی ادارہ اس مرحلے پر زیادہ رسمی انداز اختیار نہیں کر سکتا تھا اس لیے گیت گانے والوں اور ان کے گیتوں میں کافی زیادہ غیر رسمی پن پیدا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ سنسکرت کے مقدس گیت عوام کی زبان میں گائے جانے لگے۔ قدیم ہندوستان میں یہ مرحلہ ترجمہ کے عہد کے آغاز کی طرح تھا۔ ہندوستان کی مقدس کتابوں کے کوئی رسموں اور باضابطہ تراجم اب بھی موجود نہیں ہیں۔ ہندوستان کی عام زبانوں میں گائے جانے والے مہا بھارت، رامائن اور بھگوت گیتا کے گیت، بھجن ہی وہ ابتدائی تراجم ہیں جن کے ذریعے سنسکرت کی مقدس داستانیں آنے والے زمانوں کے لئے محفوظ کیا گیا تھا۔ سنت، سادھو، کے گیت، بھجن میں میلا اور تہوار، شادی بیاہ اور موت فوت کے درمیان زبان کا رشتہ، یعنی ابلاغ لازم تھا اور اس اہم ترین تقاضے کو مقدس داستانوں کے عام زبانوں میں تراجم کی وسعت سے پورا کیا گیا۔

ہندوستان میں جس طرح غیر رسمی انداز میں مقدس داستانوں کے غیر رسمی تراجم کر کے ان کو محفوظ کر لیا گیا چین میں بالکل یہی عمل بدھ مت کے ساتھ وقوع پذیر ہوا۔ بدھ مت کے سُترا Sutral بھی سنسکرت زبان ہی میں محفوظ تھے۔ ان کو چینی زبان میں ترجمہ کر کے پیش کیا گیا اس طرح چین کے بادشاہ، پگوڈا اور ریاست کا رشتہ عوام کے ساتھ چینی زبان میں تراجم کے ذریعہ جوڑا گیا۔ چین میں عوامی انقلاب سے قبل عہد تک بادشاہ، دربار اور بدھ مت کا عوام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے خلاف استعمال کیلئے وہی رشتہ تھا جو ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی اداروں کے درمیان تھا۔ یہ کہانی جاپان میں اسی انداز سے دہرائی گئی۔

مارکس ٹی لیس سائس رو قبل مسیح Marcus Tillius Cicero, 106-43 جب یونانی زبان کے خطیبوں Orators ایشنیز اور ڈیموس تھینیز کے تراجم کر رہا تھا تو اس نے ترجمہ سے متعلق اپنا یہ نقطہ نظر پیش کیا۔

" And I did not translation as an interpreter, but as an orator, keeping the same ideas and form, or as one might say, the fingures of thought, but in language which confroms to our usage. And in so doing, I did not hold it necessary to render word for word, but I preserved the general style and force of the Language." [1]

"میں کسی ترجمان کی طرح ترجمہ نہیں کرتا بلکہ خطیب کی طرح، تا کہ خیالات اور انداز اصلی انداز میں پیش کیے جاسکیں۔ یا جیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ زبان کے نقوش مگر اس زبان میں جو ہماری زبان سے علاقہ رکھتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنا ضروری نہیں سمجھا، بلکہ اصلی زبان کے عمومی اسلوب کی زبان کی قوت کو محفوظ کیا۔"

سائس رو کا بیان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے عہد یعنی 46 قبل مسیح میں بھی لفظی ترجمہ کے خلاف بغاوتوں پر آمادہ تھا۔ مگر اس کے بیان میں دلائل کی تہہ میں لفظی ترجمہ کے حق میں زوردار دلائل موجود ہیں۔ اس بیان کے آغاز ہی میں وہ کہتا ہے کہ وہ ترجمان Interpretier کی طرح ترجمہ نہیں کرتا جس کا مطلب ہے کہ متن میں پیغام Message کا ابلاغ یا ترجمانی سائس رو کی ترجیح نہ تھی۔ وہ بڑی نفاست سے اور مہارت سے ترجمہ میں ترجمانی کے خلاف تو تصور سے گریز کر جاتا ہے۔ وہ اپنے اس خیال کو خطیب Orator کی زبان کے تصور میں چھپا کر ترجمانی اور خطابت کے فرق میں طالب علموں کو دھکیل دیتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ "خیال" انداز اور نقش کو ترجمہ کے معیار قرار دیتا ہے۔ اپنے ترجمہ کے تصور میں مبہم سی آزادی کا اظہار کرنے کے بعد پھر لفظی ترجمہ کے قریب تر ترجمہ کے لئے توثیقی بیان دیتا ہے کہ وہ ذریعہ کی زبان کا عمومی اسلوب اور زبان کی طاقت کا تحفظ کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی تاریکی میں ابلاغ کی روشنی کا خوف زدہ انداز میں وضاحت کر رہا تھا۔

ترجمہ میں لفظی ترجمہ اور معنویت کی ترجمانی یا ابلاغ کے درمیان مناقشہ اس قدر طاقتور تھا کہ 395ء تک کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑی تبدیلی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔سینٹ جیروم Sain Jerome نے انجیل کا ترجمہ عبرانی Hebrew زبان سے کیا۔جب کہ یونانی زبان میں انجیل کے ترجمہ کو قدیمی سمجھا جاتا تھا۔اس انجیل کو سیپ چواجنٹ Setuagant کہتے تھے۔جیروم انجیل مقدس کے ترجمہ سے حاصل تجربہ کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

" Now I not only admit but freely announce that in translating from the Greek - exept of course in the case of the Holy Scripture, where even the syntax contains a mystery - Irender not wordfor , but sense - for- sense" [2]

"میں اب صرف اس بات کا اعتراف ہی نہیں کرتا بلکہ اعلان کرتا ہوں کہ یونانی زبان سے ترجمہ، یقیناً سوائے مقدس کتابوں کے تراجم سے، جن میں جملوں میں پراسراریت ہوتی ہے، میں لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کرتا بلکہ مفہوم سے مفہوم تک کا۔"

مذہب چونکہ پراسراریت Mystery سے بھرپور کائنات ہوتا ہے اس لیے اس کے تصورات میں کوئی حتمی نتائج اخذ نہیں کیے جاسکتے۔جیروم نے اپنے ترجمہ کے تصور اور عمل میں اس امر کا خاص ادب و لحاظ کا اہتمام کیا ہے۔گویا اس مقدس کتابوں کا ترجمہ اصل متن کی حدود میں مقید رہتا ہے۔وہ مقدس دستاویزات کے ترجمہ کو نوجی انداز و اطوار میں پیش کرتا ہے۔گویا اصل متن ترجمہ کی زبان میں اس طرح داخل ہوتا ہے جیسے کوئی فوجی قیدی فاتح کی قید میں۔اس کے سوا دیگر موضوعات میں اس کے ترجمہ کا تصور بہت ہی واضح ہے۔

مسلمانوں نے ابتدائی اسلام سے ہی تراجم کا آغاز کر دیا تھا۔مختلف ریاستوں کو سیاسی پیغامات ارسال کرنے سے لے کر اپنے تجارتی، کاروباری، تعلق داروں سے پیغام رسانی کے لیے بھی مختلف زبانوں میں دسترس حاصل کرنا ضروری تقاضا تھا۔بغداد میں دارالترجمہ کی بنیاد رکھی گئی۔شام، دمشق میں بھی اس کا آغاز کیا گیا۔عام طور پر مسلمان مترجمین یونانی زبان سے سائنس اور فلسفہ کی کتابوں کے تراجم کرتے تھے۔بالعموم یہ تراجم لفظی ترجمہ ہوتے تھے۔ان کی افادیت بہت زیادہ نہیں تھی۔غالباً یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے جدید دنیا میں کوئی بڑا قابل ذکر حصہ علمی حصول میں نہیں ڈالا۔تاہم بتدریج مسلمانوں نے لفظی ترجمہ سے مفہوم سے مفہوم تک کے اصولوں تک کا سفر طے کیا۔حنا Hanna اور بیکر Baker مسلمانوں کے فن ترجمہ کے ارتقاء کے متعلق درج ذیل اصول پیش کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

" The first [method], associated with Yuhanna ibn al -Batriq and ibn Na'ima al - Hismi, was higley literal and consisted of translating each Greek word with an equivalent Arabic word and, where none existed, borrowing the Greek word into Arabic." [3]

یوحنا ابن البطریق اور نائمہ الحمیسی سے منسوب پہلا طریقہ بہت ہی لفظی (ترجمہ) تھا۔ ہر یونانی لفظ عربی کے (معنوی) مساوی پر مشتمل ہوتا تھا۔ جہاں (عربی کا) لفظ نہ ملتا تو یونانی لفظ کو مستعار لیا جاتا تھا"۔

" The Second method, associated with Ibn Ishaq and Al-Jawahari, consisted of translating sense for sense, creating fluent target texts which conveyed the meaning of the original without distorting the target lanaguage." [4]

"ابن عشاق اور الجواہری سے منسوب دوسرا اصول مفہوم سے مفہوم تک پر مشتمل تھا۔ جس سے ترجمہ کے متن میں روانی (آجاتی تھی)۔ اس سے اصل متن کا مفہوم ترجمہ کی زبان کو مسخ کیے بغیر ابلاغ ہو جاتا تھا"۔

درجہ بالا بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں سے درجہ بدرجہ لفظی ترجمہ کے آغاز سے مفہوم سے مفہوم تک، کے ترجمہ کو ارتقاء کیا۔

لفظی ترجمہ کا ارتقاء انسانی تہذیب کا مشکل ترین سفر تھا۔ ترجمہ نگاروں کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ خاص طور سے یورپ کے ترجمہ نگاری کے ارتقائی سفر میں اس کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں۔ 1981ء ب۔م میں وائی کلفWycliff نے انجیل کا ترجمہ کیا جس کی اشاعت پر بادشاہ کے دربار اور کلیسا سے پابندی لگا دی گئی۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ نکلا یہ ترجمہ کبھی شائع نہ ہوسکا۔ ولیم ٹنڈیلWilliam Tindle(1490.1536) نے انجیل کا ترجمہ کیا۔ وہ عبرانی زبان سمیت دس زبانوں کا ماہر تھا۔ اس نے انجیل کا ترجمہ وطن بدری میں کیا جس کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی اور اس کی جلدیں بادشاہ ہنری ہشتم نے ضبط کرنے کا فرمان جاری کیا۔ ٹنڈیل کو اغواء کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے برطانیہ لایا گیا۔اس پر خلاف مذہب جرائم کا الزام عائد کیا گیا۔اس جرم میں اسے 1536ء میں سزائے موت دی گئی۔اسی طرح ڈولے Etienne Dolet نے افلاطون کے "ڈائیلاگ Dylogue" کا ترجمہ کیا۔اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے ترجمہ میں افلاطون کے متن میں ترمیم و اضافہ کیا تھا۔اس جرم میں اسے جلتی لکڑی کی کیلیوں پر ڈال کر جلا دیا گیا۔اسی عہد میں اراس مس Eramus نے بھی انجیل کا ترجمہ کیا۔مگر ترجمہ کی دنیا میں انقلابی اقدام مارٹن لوتھر Mirtin Luther نے جرمنی میں اٹھایا۔اس نے انجیل کے جرمن ترجمہ میں ابلاغ کو اہمیت دی۔اس نے New Testament کا 1522ء میں ترجمہ کیا اور Old Testament کا 1534ء میں۔ابتداء میں اس کو خلاف مذہب حرکت قرار دیا گیا۔اس قسم کی مثالوں سے انسانی تاریخ بھری پڑی ہے۔اس بات کا علم کوئی نہیں رکھتا کہ کتنے واقعات دنیا میں ہوئے مگر تاریخ میں درج نہ ہو سکے۔

لفظی ترجمہ کی عملی اہمیت اور ماہیت سے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب فرماتے ہیں:

> "ترجمہ کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ایک طریقہ تو یہ کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے اور بس۔(اسے ترجمہ کہنا نہیں۔مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں"۔[5]

ڈاکٹر جمیل جالبی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے لفظی ترجمہ بے کار کی مشق قرار دیتے ہیں۔وہ اس عمل کو کراہت کے انداز میں مسترد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ مفہوم کے ابلاغ پر مبنی ترجمہ کے متعلق فرماتے ہیں:

> "ترجمہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے۔اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ کا اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔ترجمہ کی یہ شکل سب سے زیادہ مشکل ہے۔ایسے ترجموں سے زبان و بیان کو ایک فائدہ تو یہ پہنچتا ہے کہ زبان کے ہاتھ ایک نیا سانچہ آ جاتا ہے۔دوسرے جملوں کی ساخت ایک نئی شکل اختیار کر کے اپنی زبان کے اظہار کے سانچوں کو وسیع تر کر دیتی ہے"۔[6]

ڈاکٹر جمیل جالبی لفظی ترجمہ کے برعکس معنویت کے ابلاغ پر زور دیتے ہیں۔اصل مصنف کا لہجہ تک محفوظ رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔اس طرح کے تراجم کو وہ زبان و ادب میں زرخیزی دینے والے عوامل گردانتے ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی کا کہنا ہے:

> "جہاں تک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے سلسلہ خیالات کو ذرا بھی برہم نہیں ہونے دیا فقروں کی ترکیب کی پیچیدگی دور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ہے۔معانی کو کامل اور روشن کرنے کے لیے ایک لفظ کے ترجمے میں
حسب ضرورت دو دو اور تین تین لفظ رکھ دیے ہیں لیکن خیالات پیچیدہ کا
سہل کرنا میرا کام نہ تھا"۔[7]

اکبرالٰہ آبادی یہ تو اعتراف کرتے ہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتے ہیں مگر اس شرط کی پابندی کے ساتھ ابلاغ کے کامل ہونے کے لیے متن کے ایک لفظ کے متبادل دو دو اور تین تین لفظ استعمال کرنے کی آزادی بھی اختیار کرتے ہیں۔وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اگر ذریعہ کے متن میں خیالات پیچیدہ نوعیت کے تھے وہ انہیں آسان بیان نہیں کر سکتے۔

مولوی محمد حسین آزاد رقمطراز ہیں:

"نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں۔وہ
انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں
خبر نہیں ہوتی کہ وہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے وطن کے انگریزی دانوں
کے پاس ہے"۔[8]

مولوی محمد حسین آزاد ترجمہ کو نئے انداز کے زیور اور پیرہن خیال کرتے ہیں۔مغرب کی علمی استطاعت اور استعداد کو "صندوقوں" کے استعارہ میں بند کر کے کھولتے ہیں۔ان خزائن کو کھولنے کی صلاحیت انگریزی دانوں کے پاس ہے مگر آزاد بڑے تاسف کے لہجے میں کہتے ہیں کہ انگریزی دانوں کو اس کی توفیق ہی نہیں۔

مولوی سید عبدالغفور شہباز کہتے ہیں:

"ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ حالت ہے کہ ہمارے انگریزی خواں دوست
اردو اخبارات اور تصنیفات کو ہاتھ تک لگانا جرم سمجھتے ہیں۔ترجمے کے
لیے انگریزی کی دو سطریں دیجئے تو یہ کہہ کر معذورانداز سے کاغذ میز پر
رکھ دیں گے کہ بڑی مشکل ہے کہ اس سے اردو میں الفاظ نہیں "اردو میں
الفاظ نہیں یا آپ کی نظر میں وسعت نہیں"۔[9]

مولوی سید عبدالغفور شہباز بھی انگریزی دانوں کا تلخ ترین شکوہ کرتے ہیں کہ وہ انگریزی کا تو علم رکھتے ہیں مگر اردو کا نہیں۔وہ اس احساس کمتری کی وجہ ترجمہ کا کام سرانجام نہیں دیتے کہ وہ اردو نہیں جانتے یا اردو اس قابل ہی نہیں کہ اس کی تربیت حاصل کی جائے۔

خواجہ حسن نظامی کلام پاک کے ترجمہ سے متعلق کہتے ہیں:

"کلام الٰہی کا اصل؛ بدبہ ترجمے میں نہیں آ سکتا"۔[10]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواجہ حسن نظامی دہلوی کا قرآن مجید کے ترجمہ میں مفہوم کے ابلاغ پر بات کرنے کی بجائے کلام پاک اور ترجمہ کے لہجہ میں فرق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بڑی دریافت اور پتے کی بات کہ کلام الٰہی کا دبدبہ ترجمہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے مشاہدہ میں لہجہ "دبدبہ" کا ذکر کیا ہے۔ معنویت کے ابلاغ کا نہیں۔

سید باقر حسین کا خیال ہے:

"اردو میں ابھی تک وہ الفاظ ہی نہیں جو مغرب سے آئے ہوئے خیالات کو ادا کر سکیں اور یہ بات کچھ اصلاحات ہی تک محدود نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ ترقی یافتہ ہیں جو عام بول چال کے الفاظ ہیں ان سب کے مترادفات بھی اردو میں موجود نہیں۔[11]

سید باقر حسین اردو زبان کی گنجائش Capacity کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انگریزی کے عمومی لفظ اور محاورات کے اردو مترادفات بھی نہیں ملتے۔ دراصل سید باقر حسین اپنے یہ خیالات اس زمانہ میں پیش کر رہے تھے۔ علم ترجمہ Translation Studies سائنسی Scientific انداز میں نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اب تو کمپیوٹر میں گوگل پر چالیس بین الاقوامی زبانوں کی مکمل لغت موجود ہے جو خودکار Automatic انداز میں ایک دوسری کا مکمل زبان کا مکمل ترجمہ، مفہوم یا مدعا بیان کر دیتی ہیں۔

سید عبدالقادر، سید باقر حسین کے خیالات کا جوابی نظریہ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

"اگر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے آپ کو دقتیں ہوئیں تو آپ کو اردو کے متعلق اپنا عقیدہ بدلنے میں اتنی جلدی نہ کرنا چاہیے تھی۔ کیونکہ ممکن ہے ترجمے کا کام آپ ہی کے لیے موزوں نہ ہو اور اس میں اردو کا جرم نسبتاً بہت خفیف"۔[12]

سید عبدالقادری ترجمہ میں ناکامی پر ترجمہ نگار پر برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا تہہ لفظ یہ خیال ہے کہ اردو بے توفیق زبان نہیں ہے۔ ہاں البتہ ترجمہ نگار نااہل یا ترجمہ کی توفیق سے محروم ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

(1) Marcus Tillius Cicero, Quoted Jeremy Monday, "Introducing Translation Studies" 3rd Edition , p.30. Routlege, London, Uk, 2012.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(2) St. Jerome, Qouted Jeremy Monday, "Introducing Translation Studies" 3rd Edition, P.31, Routledge, London, U.K. 2012.

(3) Baker and Hanna, Qouted Jeremy Monday, "Introducing Translation Studies" 3rd Edition, P.35, Routledge, London, U.K. 2012.

(4) Baker and Hanna, Qouted Jeremy Monday, "Introducing Translation Studies" 3rd Edition, P.36, Routledge, London, U.K. 2012.

(5) ڈاکٹر جمیل جالبی، "ترجمے کے مسائل" مشمولہ، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، "ترجمے کا فن"، مقتدرہ قومی بان اسلام آباد،ص1987,119ء

(6) ڈاکٹر جمیل جالبی، "ترجمے کے مسائل" مشمولہ، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، "ترجمے کا فنی نظری مباحث"، مقتدرہ قومی بان اسلام آباد،ص1987,119ء

(7) اکبرالہ آبادی مقدمہ کتاب، "مسلمانوں کی حالت آئندہ" ترجمہ، مطبوعہ: میرٹھ 1884ء، مشمولہ، ترجمے کا فن" ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی بان اسلام آباد،ص1987,66ء

(9) مولوی سید محمد عبدالغفور شہباز، مجموعہ رباعیات پر اظہار خیال" صفحہ 199۔ مشمولہ، "ترجمے کا فن" مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،ص:1987,70ء

(10) حسن نظامی دہلوی خواجہ خطیب وحی منظوم از سیماب اکبر آبادی، مطبوعہ :1946، مشمولہ "ترجمے کا فن"، مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،ص:1987,98ء

(11) سید باقر حسین "ترجمے کا اصول" رسالہ ماہ نو کراچی ستمبر 1950ء، مشمولہ "ترجمے کا فن، مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قوم زبان، اسلام آباد،ص:1987,102ء

(12) سید عبدالقادر رسالہ مخزن۔ نومبر 1950ء، مشمولہ "ترجمے کا فن"، مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،ص:1987, 102ء۔

☆☆☆

(مشمولہ: فن ترجمہ نگاری، مصنف خالد محمود خان)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ: روایت کے مباحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو میں ترجمے کی روایت

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

ایک یونانی مقولہ ہے کہ ''ترجمہ ہمیشہ ایک بھنا ہوا سٹرابیری رہے گا۔'' یعنی ترجمے کے اور اصل چیز کے ذائقے میں فرق ضرور رہے گا۔

کچھ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر سموئیل جانسن شاعری کے ترجمے کو نامکمل قرار دیتے ہیں اور جے ایچ فریئر کو ترجمے کی زبان قابل التفات دکھائی نہیں دیتی۔ حد یہ ہے کہ مشہور مترجم ایڈورڈ فٹز جیرالڈ، زندہ کتے کو، مردہ شیر سے بہتر قرار دیتے ہیں۔

ترجمے کے فن سے متعلق یہ آراء تو 19 ویں صدی تک کی ہیں جبکہ 20 ویں صدی میں دو مکتبہائے فکر سامنے آتے ہیں۔ پہلا گروہ مخالفین کا ہے۔

گرانٹ شاورمین کوسیلی کے خیال میں ''ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے۔''

پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ کے نزدیک ''ترجمہ، نام ہے ایک سعی نامشکور کا، جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔''

جب کہ عملی سطح پر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ارنسٹ فینولوسا، ایزرا پاؤنڈ اور آرتھر ویلی نے ترجمے ہی کے ذریعے قدیم مشرقی شاعری کو مشرق و مغرب کی حال کی شاعری میں بدل دیا، اور پاؤنڈ نے جب بھگت کبیر کے چند دوہوں کے ترجمے کے بعد کینٹوز لکھے تو اس کی شاعری میں ''کہت کبیر'' کی گونج نمایاں تھی۔ یوں ترجمہ، گماں کا ممکن ہے۔ اور یہ کام کچھ لوگ کر گزرے، جنہیں ''نمک حرام'' اور ''غدار'' تک کہا گیا۔ اس میں پہلا نام 250 قبل مسیح کے لیویوس اینڈرونیکس کا ہی لیا جائے گا' جس نے اوّل اوّل ہومر کی ''اوڈیسی'' کو لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور تادیر گمنامی سے نباہ کیا۔ انگریزی میں بائبل کے اوّلین مترجم ولیم ٹنڈل کی ساری عمر جلاوطنی میں گزری۔ پھانسی پائی اور اس کی لاش کو آگ میں جھونک دیا گیا۔ خود ہمارے ہاں ترجمہ قرآن کے بعد نذیر احمد دہلوی سے عالمانہ مذہبی تقدس بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھن گیا۔

شاید اسی لیے ترجمے کی دیومالا نے مترجم کی حالت زار کو ''سسی فش'' سے تشبیہ دی ہے، جو انتہائی بااختیار ہونے کے باوجود بے بس اور قابل رحم ہے۔

اب آیئے اُردو میں ترجمہ کی روایت کی طرف۔

صراحت پہلے کردوں کہ یہ مقابلہ صرف مغربی ادبیات کے تراجم کے جائزے تک محدود ہے۔ نیز اُردو میں ترجمے کے اولین نمونوں / بائبل اور اناجیل کے اوّلین مترجمین ولیم کیری، ہنری مارٹن، رام باسو اور پنڈت مرتونجے ودیالنکار کے کام کا جائزہ یہاں پیش نہ کروں گا۔

ہمارے ہاں ادبی تراجم کی تاریخ میں ''از ڈاکٹر سیموئیل جانسن کے ترجمہ ''تواریخ راسلس شہزادہ حبش کی'' از سید محمد میر لکھنوی مطبوعہ آگرہ، طبع اوّل 1839ء کی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ بلا کسی شک وشبہ کے مغرب کے کسی بھی زبان سے اُردو میں ہونے والا، کتابی صورت میں پہلا ادبی ترجمہ ہے۔اس سے قبل ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنی کتاب ''ہندوستانی زبان کے قواعد'' مطبوعہ کلکتہ طبع اوّل 1786ء میں ولیم شیکسپیئر کے دو ڈراموں ''ہیملٹ'' اور ''ہنری ہشتم'' کے دو چیدہ اقتباسات کا اُردو ترجمہ پیش کیا تھا۔

واضح رہے کہ ہمارے اوّلین دیسی مترجم سید محمد میر لکھنوی، ریورنڈ چارلس کی چھ جلدوں میں کیمسٹری سے متعلق کتاب کا ترجمہ 1828ء میں طبع کروا چکے تھے، اور یہی وہ زمانہ ہے جب میر امن دلی والے نے ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کے بعد ریورنڈ چارلس کی سات جلدوں پر مشتمل کتاب ''ستہ شمسیہ'' کا ترجمہ غلام محی الدین متین حیدرآباد مسٹر جونس اور موسیو تندرس کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔(1)

1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے ہنگام تک صرف علمی تراجم سامنے آئے، جن کی تفصیل وقت چاہتی ہے۔لیکن یہی وہ زمانہ ہے جب علمی اور ادبی سطح پر ہمارے ہاں ایک داخلی کشمکش دکھائی دی۔اس دور کے ادباء وشعراء کے ایک گروہ کے خیال میں پیروی مغرب ہی زندہ رہنے کی واحد صورت تھی اور دوسرا گروہ مغرب کے پہیے کا زیر بار احسان رہتے ہوئے ابن العربی اور ابن رشیق پر گزارا کرنا چاہتا تھا۔جب کہ تیسرا گروہ مغرب سے بھی صاحب سلامت کا خواہاں تھا اور مشرق تو تھا ہی اپنا۔سو 19 ویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور 20 ویں صدی کے نصف اوّل میں ہم مشرق اور مغرب کے فکری ابعاد کے درمیان ڈگمگاتے پھرے۔

لیکن یہ دوطرفہ آگ تھی۔ ہمارا ادیب ترجمے کی معرفت مغرب کی سمت تجسس کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور مغرب نے مشرقی لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی تھی۔

مغرب میں اس میلان کے ابتدائی نقوش مارلو اور شیکسپیئر کے ڈراموں میں دکھائی دیتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں 1880ء کے قریب، رڈیارڈ کپلنگ اپنے مشرقی حوالوں کے ساتھ ابھرا۔یہ الگ قصہ ہے کہ باطنی طور پر اس نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزی راج کے ہی تصور کو تقویت بہم پہنچائی۔(2)

پلنگ سے پہلے میکنزی نے 1885ء میں مسز مشروم اور کرنل میڈوز ٹیلر نے امیر علی ٹھگ کی ذات کے حوالے سے ہندوستان کے باسیوں کا خوب خوب مضحکہ اڑایا اور ہمارے رتن ناتھ سرشار نے اصل حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر میکنزی کی کتاب ''اعمال نامہ روس'' کا ترجمہ کیا۔ سو کہا جاسکتا ہے کہ کپلنگ کی ذہنیت پیدا کرنے کو 1785ء سے زمین ہموار کی جارہی تھی۔ آگے چل کر بقول محمود ہاشمی۔

> ''ایزرا پاؤنڈ'' میگنا کارٹا کے ساتھ ساتھ مشرقی فلسفے شاعری کے تراجم اور حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ایلیٹ اپنے ''خرابے'' اور ''کارتھیج'' کے خوابوں کے بعد ''اوم شانتی شانتی'' کی منزل تک آتا ہے۔ اسی لیے سارتر، بدھ سے قریب دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے بیشتر مغربی ادیب بدھسٹ بن گئے تھے۔ اسی لیے ایلن جوھانسبرگ، امریکہ سے ہندوستان کا سفر کرتا ہے اور امریکہ میں رہتے ہوئے اپنی نظم میں اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ
>
> "(America) When will send your Eggs to India" (3)

یہ تو تھی مجمل صورتحال، البتہ اردو میں مغربی زبانوں سے ادبی تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت اور تکنیکی سطحوں پر گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ مثلاً یہ کہ تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا، نئے طرز احساس کو ابھارا، پیرایہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال کو بڑھاوا دیا اور پیرائیہ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔ یوں اُردو ادب میں تذکرہ کی جگہ تنقید، داستان اور تمثیل کی جگہ ناول، رہس اور نوٹنکی کی جگہ ڈراما اور کہانی کی جگہ افسانہ جیسی جدید اصناف نے لے لی، اور ادبیات عالم کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کا خواب ہم نے پہلی بار دیکھا اور یہ سب اس وقت ہوا، جب ہم نے سو سے زائد آپ بیتیاں، ڈیڑھ سو افسانوی مجموعے، درجنوں ادبی تاریخ سے متعلق کتب، دو سو پچاس ڈرامے سے متعلق کتب، ساٹھ سفرنامے، ایک سو اٹھارہ سوانحی کتب اور ڈیڑھ ہزار ناول کتابی صورت میں نہ صرف ترجمہ کر لیے بلکہ یہ سب کچھ کتابی صورت میں شائع بھی ہوا۔

قصے، رزمیے، کہانیاں، روزنامچے، مضامین، خطوط، تنقیدی کتب اور شعری مجموعوں کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔ (4)

نیز مستقبل میں ترجمہ شدہ غیر مدون مواد طباعت کے وقت کئی لاکھ صفحات گھیرے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابتداء میں ادبی سطح پر، ترجمے کی معرفت ہیئت، تکنیک اور موضوعی کروٹوں سے آشنائی نئی نئی تھی اور مغربی ادبیات کی روایت کا شعور تقریباً ناپید تھا۔ جس کے نتیجہ میں تراجم ہوئے تو، لیکن انتہائی بے سلیقگی کا مظاہرہ بھی دیکھنے میں آیا۔ قاری کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمے کے نام پر کاٹھ کباڑ کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔

ایسے تراجم کا بڑا نقص یہ ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے، وہ مستند اور اہم کتب کے ترجمے نہیں تھے۔ مثلاً جارج ولیم۔ ایم رینالڈز کے کتابی صورت میں چھپن سے زائد ترجمے ہوئے اور مختلف مترجمین نے کیے۔ (5) اور اس پر غضب یہ کہ ترجمہ در ترجمہ ہوئے اور مترجمین نے اصل متن دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

ابتدائی مترجمین کی ترجمے کے فن سے ناواقفیت اور تن آسانی نے تراجم میں ایک نیا طرز تحریر بھی ایجاد کیا، جس کے لیے انگریزی میں Journalese کی اصطلاح موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی ناقص زبان لکھی گئی، جو گویا داخلی ہیئت کی نمائندہ ہے۔

محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں لکھا تھا کہ

> ''ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے، جو کشور علم میں مشرقی اور مغربی، دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہوگئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی۔''

اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مہدی جعفر لکھتے ہیں۔

> ''ملحوظ خاطر رہے کہ یہ بات پانی لانے کی ہے، کناروں پر تیرتے ہوئے الفاظ اکٹھا کرنے کی نہیں۔ تخلیق اور ترجمے میں بہرحال فرق ہے۔ خیر مغرب والوں نے اپنے پانی سے اپنے ہم مزاج الفاظ نکالے ہیں۔ ہم نے ترجمے کے ذریعے انہیں الفاظ سے شعبدہ بازی یا چونکانے کا کام لیتے ہوئے بے اعتمادی کا ثبوت دیا ہے۔'' (6)

مہدی جعفر نے مندرجہ بالا مضمون میں مشرق اور مغرب کے مزاجوں کی سطح پر فرق کو ''کیمیا گری'' اور ''کیمیا دانی'' کا فرق قرار دیا اور اُردو ادب کو تراجم کی معرفت کیمیا گری سے کیمیا دانی کی طرف لانے کا کام یوں تو فورٹ ولیم کالج میں ہونا قرار پایا تھا لیکن اس بات میں بھی سر سید احمد خاں بازی لے گئے۔ انہوں نے اُردو ادب کو جس ذہنیت کا تحفہ دیا اس کی بنیادیں عقلیت، اجتماعیت، مادیت اور حقائق نگاری پر تھیں۔ (7)

سر سید احمد خاں کی معرفت مشرق کے لیے مغرب کی اس عطا کی کھوج میں نکلیں تو پتا چلتا ہے کہ ''لفظ'' کی سطح پر ہم ''داخلیت'' سے اسی زمانے میں دست کش ہونا شروع ہوگئے تھے جب سے یورپی اقوام نے ہمارے ساحلوں پر اول اول قدم رکھا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''نئے'' اور ''جدید'' ادب تک آتے آتے نہ ہماری زمینی بوباس اپنا پتا دیتی ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور نہ ہی ہمارے ہاں کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حوالوں کا نشان ملتا ہے۔ اُردو میں مغربی تراجم کے زیر اثر ہمارے افسانوی ادب کو مخصوص نوع کی مغربی روش کا سامنا رہا جس کے باعث ہمارے افسانوی ادب کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اسے بڑی آسانی سے "اینگلو انڈین ادب" کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ادباء کو اوائل 20 ویں صدی کی قومی تحریکوں کا ہمنوا بن کر ہی ترجمے کی طرف آنا چاہیے تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں زرق برق مغربی تہذیب، اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ مخصوص معاشرتی اور سیاسی حوالوں، ذہنی رویوں، ضرورتوں اور انگریزی زبان نیز مغربی ادبیات کے پس منظر میں رکھ کر کرنا چاہیے تھے، اور یہ بھی کہ اُردو زبان کے نئے عہدے سے مطابقت رکھنے والی لسانی تشکیل اور اسلوبیاتی دائرہ عمل کے بارے میں منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔

محمد حسن عسکری نے مذکورہ بالا عنوان کا تجزیہ کرتے ہوئے اُردو ترجمے کی روایت کو کھنگال ڈالا (8) اور اس کا رد عمل خود ان کے تراجم ہیں۔

اُردو میں ترجمہ نگاری کے مروجہ چلن پر عسکری صاحب نے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر ترجموں کے ذریعے ہمارے تخلیقی ادب کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ ہمارے مترجمین، ترجمے کی اہمیت سے ناواقفیت کی بنا پر اسے تخلیقی مسئلہ نہیں سمجھتے۔ ترجمے کا جواز محض موضوع یا کہانی کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں۔ اصل بات تو ترجمے کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں کے اسالیب کو اپنی زبان میں ڈھالنے اور رائج کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ خواہ رتن ناتھ سرشار کا سروانٹس سے ترجمہ "خدائی فوجدار" (9) ہو یا قیس رام پوری کا رینالڈز سے ترجمہ "فسانۂ لندن" (10) ہمارے ہاں آزاد ترجمے کی روایت نے بڑے بڑے گل کھلائے ہیں اور ترجمے کے مذاق کو خراب کرنے میں انہی آزاد ترجموں کا ہاتھ رہا ہے۔ پھر اُردو نثر اور بالخصوص افسانے پر آسکر وائلڈ اور دیگر مغربی جمال پرست ادباء کے غالب اثر کی مذمت کی جاتی ہے اور اسے اُردو نثر کی اسلوبیاتی روایت کے لیے نقصان دہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بات مکمل طور پر قبول نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک تراجم کے زیر اثر زبان کو بڑھاوا دینے کا معاملہ ہے تو اس میں مولانا حامد علی خان، لطیف الدین احمد، جلیل قدوائی، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ منظور حسین جیسے جمال پرست ادیبوں کی عطا سے انکار کیسے ممکن ہے؟

مجموعی طور پر دیکھیں تو پریم چند کے فوراً بعد مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں ایڈگر ایلن پو کے زیر اثر تحیر اور اسرار کی جو انوکھی فضا بندی دیکھنے میں آتی ہے وہ تکنیکی اور موضوعی حوالوں کے ساتھ اسلوبیاتی سطح پر بھی خاصے کی چیز ہے۔ جب کہ مجنوں کے افسانے جہاں اسلوبیاتی سطح پر فکر محض کی زبان کو اُردو فکشن میں پہلی بار متعارف کروانے کے سلسلے میں یادگار رہیں، وہیں پر ان کی گہری سنجیدگی اور محسوسات کے بیان پر قدرت، انگریز اور دیگر مغربی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادبیات سے گہرے شغف پر دال ہے۔ خیر یہ تو ہوئیں اثر و قبول کی دو ایک مثالیں۔ لیکن جہاں تک اسلوبیاتی سطح پر رد و قبول کا معاملہ ہے تو ہمارے ہاں کے مترجمین نے ہمیشہ روانی اور سلاست کی ہی تمنا کی ہے اور ہمارے اکثر ناقدین نے اسی روانی اور سلاست کو ترجمے کی خوبی گنوایا ہے۔ حالانکہ بڑا مترجم وہ ہے جو متمول زبانوں سے ترجمہ کرتے وقت یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی اپنی مفلس زبان کے رہے ہوئے کھانچے بھر جائیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے محمد حسن عسکری نے فلابیئر اور محمد سلیم الرحمٰن نے ہومر کو ترجمہ کرتے وقت گنجلک اور طویل جملوں کو اُردو جیسی قدرے نئی زبان میں منتقل کرنے کا جتن کیا ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر مترجمین نے روانی اور سلاست کی دوڑ میں یہ نہیں سوچا کہ اُردو نثر کا بڑا مسئلہ تو طویل اور پیچیدہ جملہ لکھنے کا ہے اور اگر کسی ترقی یافتہ زبان کے فن پارے میں تخلیق کار نے پیچیدہ تر احساسات و جذبات کو لفظوں میں منتقل کرتے وقت یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو کوشش کر کے اس کو انہی قواعد و ضوابط کے ساتھ اردو میں کیوں نہ منتقل کر لیا جائے، اس سے ہماری زبان میں بھی اسلوبیاتی سطح پر کوئی نئی راہ سوجھنے کا امکان پیدا ہوتا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ اُردو نثر میں گنجلک تجربات اور پیچیدہ جذبات و تجربات کو سہارنے کی قوت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ''اور''، ''اگر''، ''لیکن'' وغیرہ لگا کر جملوں کو جوڑتے چلے جانے سے بڑا جملہ نہیں بنتا ہے۔ سو کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان اور ادبیات نے ترجمے کے ایک عظیم جوکھم سے نبرد آزما رہنے کے باوجود خاطر خواہ حد تک فائدہ نہیں اٹھایا۔

اب آیئے سرسری طور پر یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ہماری مختلف اصناف ادب نے ترجمہ کے زیر اثر کیا سمجھ کر منفی اور مثبت اثرات قبول کیے۔

ناولوں کے سینکڑوں تراجم ہو چکنے کے باوجود شروع شروع میں ہمارے ہاں داستان، تمثیل اور ناول میں فرق مٹا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک مدت تک نذیر احمد دہلوی کے تمثیلی قصوں کو ناول قرار دیتے رہے اور نذیر احمد دہلوی کے سر اولین ناول نگار ہونے کا سہرا باندھتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مغربی ناول نگاروں خصوصاً وکٹر ہیوگو، الیگزینڈر ڈوما، زولا، بالزاک، اناطول فرانس اور اسکاٹ وغیرہ کے تتبع میں نذیر احمد دہلوی کے ساتھ رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، سجاد عظیم آبادی، راشد الخیری اور مرزا ہادی رسوا اُردو ناول نگاری کے چلن کو عام کرنے میں مصروف تھے۔

نذیر احمد دہلوی کی تمثیلیں اسٹی ون سن کے ''ٹریژر آئی لینڈ'' کی طرح ہر قسم کی بد اخلاقی حتیٰ کہ حسن و عشق سے بھی خالی ہیں۔ نذیر احمد پر دوسرا بڑا اثر جارج ایلیٹ کے ناولوں کا تھا خصوصاً کرداری پیشکش میں نفسیاتی تجزیہ نگاری جو جارج ایلیٹ ہی سے مخصوص ہے۔ جب کہ ''بنات النعش'' ٹامس ڈے کا چربہ ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا ''فسانہ آزاد'' (11) اور ''خدائی فوجدار'' ہر دو تحریریں سروانتس کے ''ڈان کیخوتے ڈی لامانشا'' سے جنم لیتی ہیں اور کچھ یہی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاملہ سجاد حسین کے "حاجی بغلول" کا ہے۔

ہمارے باقاعدہ اولین ناول نگار عبدالحلیم شرر کی تاریخی ناولوں کی تمام تر عمارت سر والٹر اسکاٹ اور رچرڈسن کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ جب کہ انہوں نے ایک باقاعدہ ترجمہ رینالڈز کے ناول کا "خونی قسمت" کے نام سے بھی کیا۔ اسلوبیاتی سطح پر شرر نے بے قافیہ شاعری کرتے ہوئے مصرعوں کو ایک آزاد تسلسل میں مربوط رکھنے کا جتن کیا ہے جو سراسر سکاٹ سے مخصوص ہے۔ سر والٹر اسکاٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اسلوبیاتی سطح پر اسکاٹ کے اثرات شرر سے حکیم محمد علی خان تک پہنچے، جنہوں نے ناول کو "ادب لطیف" بنانے کی کوشش کی۔

مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی کے پانچ جاسوسی ناولوں کو "خونی بھید" "خونی جورو" "خونی مصور" "خونی عاشق" اور "بہرام کی رہائی" کے نام سے 1938ء تک ترجمہ کے طبع بھی کروا دیا تھا، یہ الگ قصہ ہے کہ انہوں نے اپنی طبع زاد فکشن میں جاسوسی عنصر کو شامل نہیں ہونے دیا۔ البتہ جاسوسی ادب سے اثر پذیری، ظفر عمر کے ہاں باقاعدہ سراغ رسانی کے ادب میں ڈھل گئی۔ اور تیرتھ رام فیروز پوری کے طبع زاد ناول اس سے اگلا قدم ہیں۔ جب کہ بطور مترجم تیرتھ رام فیروز پوری نے ایک سو چھتیس ناولوں کے تراجم مطبوعہ کتابی صورت میں یادگار چھوڑے۔ مغرب کے معروف ناول نگاروں میں آر۔ ایل اسٹیونسن (مترجم: مولانا عبدالمجید سالک) ارنسٹ ہیمنگوے (مترجم: اشفاق احمد، ابن سلیم، بشیر ساجد) ارونگ سٹون (مترجم: سید قاسم محمود) اسٹفین کرین (مترجم انتظار حسین)، اشرووڈ اینڈرسن (مترجم: محمد حسن عسکری) اگنات ہرمن (مترجم: حمید اختر) البرٹو موراویا (مترجم: ایس۔ اختر جعفری) البیر کامیو (مترجم: بشیر چشتی، ڈاکٹر افضل افضال، محمد عمر میمن، انیس ناگی) الفرڈ نیو مین (مترجم: خواجہ عبدالکریم) الیگزینڈر ڈوما (مترجم: تیرتھ رام فیروز پوری) اناطول فرانس (مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی، عبدالرزاق ملیح آبادی) او۔ ہنری (مترجمہ: ابن انشاء، سلیم صدیقی) ایڈگر ایلین پو (مترجمہ: ابن انشاء) ایڈگر رائس (مترجم: ایم۔ جے۔ عالم) ایرچ سیگل (مترجم: ستار طاہر) ایرک پریا ریمارک مترجم: احسن طاہر) ایف۔ ایل۔ گرین (مترجم: ابوسعید قریشی) ایلزبیتھ کولس ورتھ (مترجم: مولانا عبدالمجید سالک) ایمائل زولا (مترجم: سید حسن رضوی) ایوان بنین (مترجم: نذر صدیقی) بالزاک (مترجم: سید نسیم ہمدانی، یوسف عباسی) پرل ایس بک (مترجم: اختر حسین رائے پوری، ابوسعید قریشی، قمر نقوی، احسان علی، یوسف ظفر)، ٹامس ہارڈی (مترجم: مجنوں گورکھپوری، رئیس احمد جعفری، شفیق بانو منہاج) جارج ایبٹ (مترجم: محمد سعید) جارج ولیم ایم رینالڈز (مترجم: تیرتھ رام فیروز پوری، مولانا ظفر علی خاں، عبدالحلیم شرر، امیر حسن کاکوروی، کندن لال شرر، صدیق احمد، اثر لکھنوی، نوبت رائے نظر، بابو پرشاد، شمیم بلہوری، لال دینا ناتھ) جان سٹین بک (مترجم: ابن انشاء ممتاز شیریں، زہرہ سیدین، مظہر انصاری) جان ماسٹرز (مترجم: شان الحق حقی، غلام حسین) چارلس ڈکنز (مترجم: خان احمد حسین، فضل الرحمٰن) ڈی۔ ایچ۔ لارنس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(مترجم: محمد سیدہ نسیم ہمدانی) رڈیارڈ کپلنگ (مترجم: مولانا ظفر علی خان، مولوی عنایت اللہ دہلوی) ساؤمنگ (مترجم: محمد خلیق) ستاں دال (مترجم: محمد حسن عسکری) سمرسٹ ماہام (مترجم: ڈاکٹر سید محمد عقیل) سنکلیئر لوئیس (مترجم: عابد علی عابد) سروانتس (مترجم: رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین) شارلٹ برانٹے (مترجم: سیف الدین حسام) فرنسوا ساگاں (مترجم: ستار طاہر) گستاؤ فلابیئر (مترجم: محمد حسن عسکری، مولوی عنایت اللہ دہلوی) فیلکس سالٹن (مترجم: ظہور الحسن ڈار) کرسٹو فر اشروڈ (مترجم: محمد حسن عسکری) کلیئرنس ڈے (مترجم: جاوید شاہین) کینتھ رابرٹس (مترجم: سید قاسم محمود) گوڈ فرے لیاس (مترجم: شاہد احمد دہلوی) گوئٹے (مترجم: میاں محمد افضل) لوئیز السکاٹ (مترجم: حجاب امتیاز علی تاج، اشرف صبوحی) لوئیس بروم فیلڈ (مترجم: مولوی عنایت اللہ دہلوی) لوئیس، سنکلیر (مترجم: عابد علی عابد) مس کون کوئسٹ (مترجم: صادق الخیری) موپاساں (مترجم: سید قاسم محمود، نصیر حیدر، نوح فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، طاہر قریشی) میڈوز ٹیلر (مترجم: محمد رئیس الزماں خاں رئیس) نیتھنیل ہاتھارن (مترجم: سید نسیم ہمدانی) نٹ ہمسن (مترجم: عشرت رحمانی) سر والٹر اسکاٹ (مترجم: عبدالحلیم شرر) وکٹر ہیوگو (مترجم: سعادت حسن منٹو، رام سروپ شرما، بشارت انور) والٹیئر (مترجم: سجاد ظہیر، بشیر ساجد) ولیم سرویاں (مترجم: ن۔م راشد، شفیق میلول (مترجم: محمد حسن عسکری) ہنری جیمز (مترجم: قرۃ العین حیدر) ہنری رائیڈر ہیگرڈ (مترجم: سلمٰی تصدق، مولانا ظفر علی خاں، مظہر الحق علوی، آغا اقبال، بشیر احمد اختر، منشی خلیل الرحمٰن، عاصم صحرائی، ثریا اقبال، مولوی عنایت اللہ دہلوی) ہیرالڈلیمب (مترجم: عزیز احمد، گلزار احمد، یوسف عباسی، جمیل نقوی، اختر عزیز اختر، غلام رسول مہر، وزیر الحسن عابدی، سید ہاشمی فرید آبادی، محمد ہادی حسین)

یہ چند ایسے نام ہیں جن کے اُردو میں ترجمے سے ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ ناول کا چلن عام ہوا بلکہ ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی سمجھنے میں مدد ملی۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کوشش میں معروف شاعر یوسف ظفر کا بھی حصہ ہے۔ جن کا ترجمہ ''امی میں تمہاری ہوں'' (از پرل ایس بک) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا اور اس کتاب پر ناشر نے ن۔م راشد کا نام شائع کرنا مناسب خیال کیا۔ واضح رہے کہ یہ ترجمہ یوسف ظفر کا ہے نہ کہ ن۔م راشد کا۔

پارسی اسٹیج کے فروغ کے ساتھ ہی انگریزی سے اسٹیج ڈراموں کو اُردو میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا اور ولیم شیکسپیئر کی عالمگیر شہرت سے باکس آفس پر کامیابی کا تصور بندھا لیکن افسوس کہ شیکسپیئر کے بیشتر تراجم ناقص ہیں۔ ان میں پلاٹ کی تبدیلیاں کی گئیں ہیں، مقامی رنگ میں اس قدر رنگ دیا گیا کہ پہچان مشکل ہوگئی، یہاں تک کہ تجارتی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بڑے پیمانے پر کاٹ چھانٹ بھی کی گئی اور اس فعل قبیح میں ڈرامے کا اولین دیسی مترجم احسان اللہ بھی شامل تھا، جس نے شیکسپیئر کے ''اوتھیلو'' کا ترجمہ 1890ء میں شائع کروایا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آغا حشر بھی۔حشر کا کیا ہوا King Lear کا ترجمہ ''سفید خون'' (12) اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

سو، ڈراما کے باب میں ہمارا پہلا قدم ہی غلط پڑا، کہا جا سکتا ہے کہ باکس آفس پر کامیابی کی خواہش نے ہمیں مغربی ڈرامے کی فنی خوبیوں سے دور رکھا۔

سوائے ''جولیس سیزر'' کے دو ترجمے از عزیز احمد اور سید فیضی ''رومیو جولیٹ'' کے دو ترجمے از عزیز احمد اور مولوی عنایت اللہ دہلوی، ''اوتھیلو'' کے ایک ترجمے از شان الحق حقی کے کسی ترجمے کی داد نہیں دی جا سکتی جب کہ شیکسپیئر کے ہمارے ہاں دو سو سے زائد ترجمے ہوئے اور مارس میترلنک کے ترجموں کی بھی کم و بیش یہی صورت ہے۔ دیگر ڈراما نگاروں کے ترجموں میں ''فاؤسٹ'' از گوئٹے (مترجم: ڈاکٹر عابد حسین) ''بگڑے دل'' از مولیئر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی) ''سلمیٰ'' از آسکر وائلڈ (مترجم: انصار ناصری) ''ظاہر و باطن'' از شیریڈن (مترجم: فضل الرحمٰن) چند ایسے ترجمے ہیں جن کے طفیل آگے چل کر اُردو ڈرامے کو رفیع پیر، خواجہ معین، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ جیسے ڈراما نگار مل گئے۔

دیگر معروف ڈراما نگاروں میں آسکر وائلڈ (مترجم: مجنوں گورکھپوری، تمکین کاظمی، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، حسن عباس) آندریف (مترجم: ابو سعید قریشی، تھارنٹن وائلڈر (مترجم: مخدوم محی الدین و مولوی میر حسن، مجنوں گورکھپوری، محمد اکبر وفا قانی، خورشید نگہت) جان گالزوردی (مترجم: سید قاسم محمود، منشی جگت موہن لال رواں، ویا نرائن نگم) جے۔بی۔ پریسلے (مترجم: اظہار کاظمی، محمد خلیق) آرچرڈ (مترجم: مخدوم محی الدین)، دوستوفسکی (مترجم: کمال احمد رضوی) رچرڈ ہٹن (مترجم: بدر جہاں آراء) سمرسٹ ماہام (مترجم: محمد اکبر وفا قانی) سموتوف (مترجم: عبداللہ ملک) سوفوکلیز (مترجم: شاہدہ خان) شلر (مترجم: محمد عمر و نور الٰہی گوئٹے (مترجم: شاہد احمد دہلوی، منشی جوالا پرشاد برق، عبدالقیوم خان باقی، منور لکھنوی، عزیز احمد) لیسنگ (مترجم: منشی جگت موہن لال رواں، منشی محمد نعیم الرحمٰن) مارس میترلنک (مترجم: نور الٰہی و محمد عمر، مجنوں گورکھپوری، وحشی محمود آبادی، شاہد احمد دہلوی) ماس ہارٹ و جارج ایس کافمین (مترجم: سید رضی ترمذی، کمال احمد رضوی)، ہنرک ابسن (مترجم: عبدالشکور، فضل الرحمٰن، عزیز احمد، صفدر) ہنری رائیڈر ہیگرڈ (مترجم: آغا اقبال) کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

افسانے کی صنف میں تین نام بہت ترجمہ ہوئے یعنی چیخوف، موپاساں اور رابندر ناتھ ٹیگور۔ ٹیگور کو انگریزی کی معرفت اُردو میں متعارف کروانے میں پریم چند پیش پیش تھے اور یہ سلسلہ منٹو تک چلا آیا۔ منٹو نے چیخوف اور موپاساں کو نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ ان کے طرز تحریر کو عام کرنے میں حصہ لیا۔ اسی طرح ٹالسٹائی اور گورکی بھی منٹو کی معرفت اُردو میں متعارف ہوئے۔

چیخوف، موپاساں اور مارس میترلنک کے ترجموں کی عطا راجندر سنگھ بیدی، منٹو اور غلام عباس ہیں۔ ایڈگر ایلن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پواوراو۔ ہنری کو بھی ہمارے ہاں خصوصی توجہ دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ ایڈگر ایلن پو کے ابتدائی تراجم کے فوراً بعد اسی طریقہ کار کی جھلک مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کے ہاں دیکھنے کو ملی۔

سمرسٹ ماہام جیسے دوسرے درجے کہ افسانہ نگار کو ہمارے ہاں سادہ زبان اور سہل انداز نگارش کے باعث مقبولیت حاصل ہوئی۔ ماہام سے اثر پذیری کی سب سے بڑی مثال کرشن چندر کے افسانے ہیں۔ روسی افسانہ نگاروں کا واضح اثر پروفیسر محمد مجیب کے اولین افسانوی مجموعے ''کیمیاگر اور دوسرے افسانے'' (مطبوعہ 1932ء) میں دیکھنے کو ملا۔ لطیف الدین احمد اور جلیل قدوائی، ترجمہ اور طبع زاد افسانے کی ملی جلی صورتیں سامنے لاتے رہے۔

(13)

اختر حسین رائے پوری کا افسانوی مجموعہ ''محبت اور نفرت'' واضح طور پر روسی افسانوں کے اثر کے تحت لکھا گیا اور افسانوں کی انتھالوجی ''انگارے'' مرتبہ: احمد علی میں جیمز جوائس، ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور ستاؤ فلابیر کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اختر شیرانی نے شہرت تو رومانی شاعر کے طور پر سمیٹی لیکن انکا سب سے اہم کام انتھالوجی ''دھڑکتے دل'' میں شامل آسکر وائلڈ، موپاساں اور گالزوردی کے افسانوی تراجم ہیں۔

معروف افسانہ نگاروں میں اسٹیفن کرین (مترجم: جاوید صدیقی) ایڈگر ایلین پو (مترجم: ابن انشاء) اینڈرسن (مترجم: ریاض جاوید) سروانٹس (مترجم: رحیم) پرل ایس بک (مترجم: قمر نقوی، یوسف ظفر) ٹامس ہارڈی (مترجم: مجنوں گورکھپوری) جیک لنڈن (مترجم: انور عنایت اللہ) رابندر ناتھ ٹیگور (مترجم: منصور احمد، حامد اللہ افسر، پرتھوی راج نشتر) موپاساں (مترجم: نصیر حیدر) مورس لیول (مترجم: امتیاز علی تاج) واشنگٹن ارونگ (مترجم: نیاز فتح پوری، غلام عباس، سید وقار عظیم) کے کتابی صورت میں مطبوعہ تراجم نمایاں ہیں۔ سفرنامہ کی صنف ہمارے ہاں نئی نہیں اور نہ ہی ہمارے ہاں مغربی سفرناموں کے تراجم خاطر خواہ حد تک ہوئے۔ لیکن ہمارے سفرنامہ لکھنے والوں پر مغربی سفرنامے کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ جدید سفرناموں کی مغربی فضا بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا اُردو سفرنامہ اپنی قدیم روایت کے مقابلے میں سفرنامہ کم اور دیوکارڈ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی سفرناموں کی طرح کا تہذیبی مزاج ہمارے سفرناموں میں تا حال پیدا نہیں ہوسکا۔ اتنا بھی نہیں جتنا چوسر اور مارجری کیمپ کی تحریروں میں تھا حالانکہ وہ سفرنامے میں ان کے ابتدائی نام ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ مستنصر حسین تارڑ کی طرح ڈان جوآن، بننے کی کوشش میں کتاب کو بیسٹ سیلر بنانے کی فکر کی گئی۔

اُردو میں ترجمہ ہونے والے سفرنامہ نگاروں میں جنرل گارڈن، ڈاکٹروی میکنزی، ہنری۔ ایم اسٹینلے، کالیر، جے۔ بی۔ ٹیونیز، لیڈی ڈفرن (مترجم: محمد مظہر) رسل اردن (مترجم: مرتضیٰ احمد خان میکش) پروفیسر ومیری، مسز میکسن ملر (مترجم: سید رشید الدین) سر آورل آسٹن (مترجم: سید محمد اعظم فہمی) آر۔ ایف برٹن (مترجم: محمد انشاء اللہ) ایڈمنڈ اسٹیونسن، لیڈی ایولن کیولڈ زنب (مترجم: محسن بشیر) پرنس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

البرٹ (مترجم: بشمبھر ناتھ) موسیو تھیونو، جان بنین (مترجم: ٹی ہیری ویونسن سنگھ) جان لوئی برکھارٹ، میجر جنرل جان میلکم (مترجم محبوب عالم) جولز ورن اور میجر ولیم گفرڈ وغیرہم کے نام کتابی تراجم میں نمایاں ہیں۔

اُردو میں منظوم تراجم کی روایت بھی اتنی ہی مضبوط ہے جتنی کہ منثور ترجمے کی، البتہ کتابی صورت میں بہت کم یکجا ہو پائی۔ اس خصوص میں الطاف حسین حالی کو اوّلیت حاصل ہے۔ ''دیوان حالی'' (14) میں ''انگریزی اشعار کا ترجمہ'' کے عنوان سے ایک نظم کا ترجمہ ملتا ہے۔ البتہ شاعر کا نام درج نہیں۔ (15) بہاری لال ''منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم'' 1869ء میں منظر عام پر لائے۔ 1878ء میں حالی نے ''زمزمہ قیصری'' کے عنوان سے ایک معاصر برطانوی شاعر اسٹوک کی طویل نظم جو دربار قیصری منعقدہ 1878ء میں پڑھی گئی) کا ترجمہ کیا۔ (16) اسی طرح آلیور گولڈ سمتھ کی نظم ''ڈزرٹیڈ ولیج'' کا منثور ترجمہ بھی حالی سے یادگار ہے۔

اکبرالٰہ آبادی نے رابرٹ ساؤدے اور ٹینی سن کو پہلی بار اُردو دنیا سے متعارف کروایا۔ ٹینی سن کی نظم ''برگ'' کا ترجمہ ہمیشہ یادگار رہے گا، لیکن منظوم تراجم کے باب میں جو شہرت گرے کی ''گورغریباں'' کے حوالے سے طباطبائی نے پائی، اس کا توڑ آج بھی ممکن نہیں۔ طباطبائی نے یہ ترجمہ عبدالحلیم شرر کی فرمائش پر کیا، جو پہلی بار جولائی 1897ء کے ''دلگداز'' میں شرر کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

اس ترجمے کی بے پناہ مقبولیت کے پیش نظر نظم طباطبائی نے کئی ایک ترجمے اور کیے۔ جن میں ''زمزمہ فصل بہار'' (گرے) اور ''دولت خداداد افغانستان'' (سر الفرڈ لائل) نے شہرت پائی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اُردو میں منظوم تراجم کی تحریک عبدالحلیم شرر کی تھی طباطبائی کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ضامن کنتوری نے منظوم تراجم کا مجموعہ ''ارمغان فرنگ'' 1901ء میں شائع کروایا، جس میں ارل آف آکسفورڈ، مسز الزبیتھ ہیرٹ براؤننگ، ولیم کوپر، ورڈز ورتھ، کولرج، الگزینڈر پوپ، آلیور گولڈ سمتھ، جارج لٹن، جیمز مانٹگمری، ٹامس ہڈ، لانگ فیلو، شیلے، اسکاٹ اور ولیم شیکسپیئر جیسے شعراء کے ساتھ پہلی بار ایک جرمن شاعر کی نظم کا ترجمہ ''صلائے عام'' کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ یادر ہے کہ ضامن کنتوری کا ایک اور کارنامہ ٹامس مور کی مثنوی ''لالہ رخ'' کا منظوم ترجمہ ہے۔ بعد میں ''لالہ رخ'' کا ایک منثور ترجمہ احمد اکبر آبادی نے کیا۔

یوں شرر کے رسالہ ''دلگداز'' کی تحریک نے زور پکڑا، اور جب اپریل 1901ء میں ''مخزن'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے اغراض و مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا۔

> ''انگریزی نظموں کے نمونے پر طبعزاد نظمیں، انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تاکہ متقدمین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔''

''مخزن'' کے پہلے ہی شمارے میں علامہ اقبال کی نظم ''ہمالہ'' سے متعلق سر عبدالقادر نے لکھا کہ شاعر نے ملک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الشعرائے انگلستان، ورڈز ورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالہ سے مکالمہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ اسی شمارے میں مولانا ظفر علی خاں نے ٹینی سن کی نظم ''ندی کا راگ'' کا ترجمہ پیش کیا تھا۔ مولانا نے بعد میں ورڈز ورتھ کی ایک نظم ''وفا'' کو بھی اُردو میں منتقل کیا۔

علامہ اقبال نے متعدد ترجمے کیے، جن میں ایمرسن کی ''پہاڑ اور گلہری'' ٹینی سن کی ''عشق اور موت'' اور رخصت اے بزم جہاں'' لانگ فیلو کی ''پیام صبح'' ولیم کوپر کی ''ہمدردی'' ''پرندے کی فریاد'' اور ماں کی تصویر دیکھ کر'' نمایاں ہیں۔ اسی طرح اقبال نے فرانسیسی شاعر گاتیر کی نظم ''آفتاب'' کا بھی ترجمہ کیا۔ (17)

سرسری طور پر دیکھیں تو متقدمین سے ''اندھی پھول والی کا گیت'' از ٹامس مور (ترجمہ: حسرت موہانی) ''مئی کا جوان چاند'' از ٹامس مور (ترجمہ: عزیز لکھنوی) ''تربت جاناں'' ''مقصد الفت''، ''عالم پیری اور یاد ایام''، ''انجام محبت''، ''جان شیریں'' از معاصر برطانوی شعراء (ترجمہ: غلام بھیک نیرنگ)، ''مرحومہ کی یاد میں''، ''گزرے زمانے کی یاد''، از ٹامس مور (ترجمہ: نادر کاکوروی)، ''کوئل'' از ورڈز ورتھ (ترجمہ: عظمت اللہ خان)، ''مئی سے خطاب'' از ٹامس مور (ترجمہ: نادر کاکوروی)، کوئل'' از ورڈز ورتھ (ترجمہ: تلوک چند محروم)، شیب وشباب'' از رابرٹ براؤننگ (ترجمہ: وقار احمد)، ''آسمانی صیاد'' (نوحے) از فرانسس تھامسن (ترجمہ: ہادی حسین)، ''مجھے دے دے رسیلے ہونٹ'' از رابرٹ براؤننگ (ترجمہ: فیض احمد فیض) اور سکائی لارک'' از شیلے (ترجمہ فاخر ہریانوی) یادگار ترجمے ہیں۔

منظوم تراجم کی پہلی انتھالوی ''منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم'' مرتبہ بہاری لال (1869ء) اور ضامن کنتوری کی ''ارمغان فرنگ'' (1901ء) کے بعد باقاعدہ انتھالوجیز میں نادر کاکوری کی کتاب ''جذبات نادر'' (مطبوعہ: 1910ء)، غلام محی الدین کی ''دو آتشہ'' (1969ء) فاخر ہریانوی کی انتھالوجی مطبوعہ عطر چند کپور اینڈ سنز، میر حسن (حیدر آبادی) کی ورڈس ورتھ اور اس کی شاعری'' (1932ء)، ''قریہ ویراں'' از اولیور گولڈ سمتھ (مترجم: سید راحت حسین) ''شعرائے فرنگ'' (مترجم: ڈاکٹر عبدالوحید خان) 1932ء اور ''رنگ بست'' (مترجم: جعفر علی خان اثر) 1942ء کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

خیر یہ تو ہوئی متقدمین کی مثالیں، متوسطین کے لخت لخت تراجم کے علاوہ جب عزیز احمد نے ٹی۔ ایس ایلیٹ کی زندگی میں ہی ان سے باقاعدہ مشورہ کر کے ''ویسٹ لینڈ'' کا ترجمہ ''خراب آباد'' کے عنوان سے پیش کیا (18) اور میرا جی نے ''مشرق و مغرب کے نغمے'' مرتب کی تو جدید مغربی شاعری کی طرف دریچے وا ہو گئے۔ اب جہاں شوکت واسطی نے ملٹن کی ''پیراڈائز لاسٹ'' کا ترجمہ ''فردوس گم گشتہ''، کرسٹوفر مارلو کی ''ٹریجک لائف آف ڈاکٹر فاسٹس'' کا ترجمہ ''المیہ حکیم فسطاس''، دانتے کی ''ڈیوائین کامیڈی'' اور ہومر کی ''ایلیڈ'' کے چھ دفتروں میں ترجمہ کیے، وہیں مغرب کے اہم نظریہ ساز شعراء از قسم بودلیئر، ریِن بو اور طاہر بن بو اور طاہر بن جلون کو لئیق بابری نے ترجمہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کردیا۔ یہاں تک کہ ایزراپاؤنڈ، کاراِبن داریو، پابلونرودا، بریخت، سلویاپلاتھ، خورخے لوئیس بورخیس اور اوکتاویوپازتک نئے اور اہم نام ترجمہ ہو چکے۔(19) انتھالوجیز کی سطح پر شان الحق حقی کی مرتب کردہ ''درپن درپن'' آخری قابل ذکر چیز ہے۔

یہ ہوا ایک مختصر جائزہ۔ تفصیل میں جائیں گے تو بقول فراق، یہ قصہ طولانی ہے۔ ادبیات عالم میں ترجمے کے ذریعے اخذ واستفادے کا انقلاب آفریں سلسلہ جاری وساری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم ترجمے کے تمدن کے ہمہ گیر اثرات کو کس طرح قبول کرتے ہیں۔

پیروی مغرب بھی بہت ہو چکی۔ مغربی پہیے کے زیر بار احسان ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ کیا ہم اب بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں کیمیادانی سے کیمیاگری کی طرف جانا ہے؟

حوالہ جات وحواشی

(1)۔ ریوری رنٹ چارلس کے سات سائنسی رسائل مطبوعہ: 1818ء لندن کا ترجمہ ''ستہ شمسیہ'' 5/8'' کی تقطیع پر 1256ھ مطابق 1840ء میں شمس الامراء ثانی نواب محمد فخر الدین خاں نے اپنے ذاتی سنگی چھاپہ شمس الامراء حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔

(2)۔ رڈیارڈ کپلنگ کے 1891ء تک افسانوں کے چار مجموعے سامنے آئے، جن میں چھیانوے افسانے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک افسانہ بھی ایسا نہیں، جس میں ہندوستان کی آزادی کی طرف اشارہ ہو۔ "Naulakha" اور "Kim" دو ناول ہیں اور ان میں بھی ہندوستانی فکر کی صحیح عکاسی نہیں کی گئی۔

(3)۔ بحوالہ: ''ایک خطرناک میلان'' از محمود ہاشمی، مطبوعہ: ''اوراق'' لاہور، شمارہ نمبر 4 بابت 1966ء، ص 119

(4)۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: ''مغرب سے نثری تراجم'' از مرزا حامد بیگ، مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل: مئی 1988ء

(5)۔ رینالڈز کے چند تراجم: ''گردش آفاق''، ''نظارۂ پرستان''، ''فسانہ لندن''، فریب حسن'' (مترجم: تیرتھ رام فیروزپوری)، ''فسانہ لندن''، فریب حسن'' (مترجم: تیرتھ رام فیروزپوری)، ''فسانہ لندن'' ایک جلد (مترجم: مولانا ظفر علی خان) ''مسٹریز آف لندن'' (مترجم: کندن لال شرر)، ''فسانہ الدین ولیلیٰ''، ''فریب حسن''، ''فسانہ لارنس ورتھ'' (مترجم: امیر حسن کاکوروی)، ''روزالبرٹ'' (مترجم: اثر لکھنوی)، ''باپ کا قاتل'' (مترجم: شمیم بلہوری)، چاک گریباں'' (مترجم: بابو پرشاد)، ''شام جوانی'' (مترجم: نوبت رائے نظر لکھنوی)، ''جھیل کی معشوقہ'' (مترجم: لالہ دینا ناتھ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(6)۔ بہ حوالہ: ''اُردو افسانے کے افق''، از مہدی جعفر، مطبوعہ: اوراق' لاہور مئی۔ جون 1983ء، ص 357

(7)۔ دیکھئے: ''سرسید کا اثر ادبیات اُردو پر''، از ڈاکٹر سید عبداللہ، مشمولہ: بہترین ادب''، مرتبہ: مرزا ادیب، مطبوعہ: مکتبہ اُردو، لاہور: 1955ء، ص 11

(8)۔ عسکری کے تین مضامین: گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے، مطبوعہ ''ماہ نو'' کراچی، بابت: فروری 1954۔۔۔ ''کچھ ترجمے کے بارے میں'' مطبوعہ ''ماہ نو'' لاہور، عسکری نمبر، بابت: مارچ 1978ء ''کچھ اُردو نثر کے بارے میں'' مشمولہ: ''ستارہ یا بادبان'' از محمد حسن عسکری۔

(9)۔ ''خدائی فوجدار'' مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ: 1903ء

(10)۔ ''فسانہ لندن'' (Mysteries of London) ترجمہ شدہ دس جلدیں، طبع اول: نرائن دت سہگل، لاہور۔ طبع دوم: (13 جلدیں۔ صفحات 1700) ایشیاء بکڈپو، لاہور۔ طبع اول: 1927ء

(11)۔ ''فسانہ آزاد'' مطبوعہ: نولکشور پریس لکھنؤ، طبع اول: 1880ء آخری ایڈیشن 1934ء

(12)۔ ''سفید خون'' ترجمہ: آغا حشر کاشمیری، طبع اول: 1906ء

(13)۔ دیکھئے افسانہ: ''بیوی'' ازل۔ احمد اکبر آبادی (لطیف الدین احمد)، مطبوعہ: ''نقوش'' لاہور۔ یہ افسانہ روسی افسانہ نگار P.Romanoy سے بحذف و اضافہ مستعار ہے۔

(14)۔ ''دیوان حالی'' مطبوعہ نامی پریس، کانپور۔ ص 214

(15)۔ حالی کے ترجمے سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

وہ دلربا اُمیدیں، جن پر کہ تو ہے شیدا
جب دور تیرے دل سے ہوجائیں گی سراپا

(16)۔ تین حصوں پر مشتمل حالی کی اس ترجمہ شدہ نظم کے پہلے بند کو دیکھیے:

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند
جانب ہندوستان محمود نے ہانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابر رحمت تھا مگر
ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند
وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی واں آفت بپا
اور چلتا تھا جلو میں اس کے آسیب وگزند

(17)۔ گاتیر کے اس ترجمے سے ایک شعر ملاحظہ ہو

آفتاب، روح روان جہاں ہے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شیرازہ بند دفتر کون ومکاں ہے تو

(18)۔ ایلیٹ کی نظم ''ویسٹ لینڈ'' کے اب تک تین ترجمے سامنے آچکے ہیں۔ عزیز احمد کے بعد محمد صفدر نے ایک حصے کا ترجمہ کیا۔ دوسرا مکمل ترجمہ رفیق خاور کا ہے۔

(19)۔ نئے دور کے مترجمین میں شمس الرحمٰن فاروقی، مقبول الٰہی، محمد سلیم الرحمٰن، سہیل احمد، سہیل اختر، انیس ناگی اور اجمل کمال بہت نمایاں ہیں۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب

سید احتشام حسین

تجارت کی طرح مختلف قوموں اور ملکوں کے درمیان تہذیبی لین دین کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ دنیا کی کوئی تہذیب اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ خالص ہے اور اسے کسی دوسری تہذیب میں ایسے عناصر نظر نہیں آئے جن کی طرف اس نے شوق اور رشک آمیز تجسس کے ساتھ نہ دیکھا نہ ہو۔ تہذیب کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں ادب میں یہ بات زیادہ نمایاں ہوتی ہے کیونکہ رقص موسیقی اور مصوری کی نقل اتارنے کے بہ نسبت خیالات کو اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں ڈھال لینا آسان ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ادب دوسرے ادب سے وہ چیزیں اپنے یہاں منتقل کرلیتا ہے جنھیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے ادبی مزاج سے ہم آہنگ یا مفید پاتا ہے۔ اس کی محرک عملی توسیع کی خواہش بھی ہوسکتی ہے اور محض تجارتی مفاد بھی۔ اردو دنیا کی بہت سی زبانوں کے مقابلہ میں کم عمر ہے۔ اس کا ادبی ارتقاء اس وقت ہوا جب بہت سی زبانوں کے ادب میں گراں بہا سرمایہ جمع ہو چکا تھا اس لیے اسے شروع ہی سے دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملا لیکن جہاں تک مختصر افسانے کا تعلق ہے اس کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی اور گو اس سے ملتی جلتی چیزیں ہندوستان، ایران، چین اور عرب وغیرہ میں قدیم زمانے سے نظر آتی ہیں۔ لیکن جدید مفہوم میں افسانہ نگاری کا سلسلہ گزشتہ صدی ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت افسانے کا یہی مفہوم پیش نظر ہے۔

اردو میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کا کام تو بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن مغربی ادب سے ترجمے انیسویں صدی ہی میں شروع ہوئے ان ترجموں میں بھی مختصر افسانوں کی نوبت بہت دیر میں آئی۔ افسانہ کو بعض نقادوں نے ادب اور صحافت کے درمیان ایک صنف قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ افسانے کا عروج رسالوں کا پیٹ بھرنے کے سلسلے میں ہوا۔ اردو میں بھی مختصر افسانے پہلے رسالوں ہی کی زینت بنے۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا کہ انیسویں صدی کے آخری حصہ میں جو رسائل نکلے تھے ان میں افسانے شائع ہوتے تھے یا نہیں لیکن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب لاہور سے مخزن، کانپور سے زمانہ، آگرہ سے نگار، دہلی سے صلائے عام، وغیرہ نکلنے شروع ہوئے تو بعض یورپی افسانوں کے ترجمے بھی ان میں شائع کیے گئے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ ان کے اثر سے خود اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی جانب مائل ہوئے۔ ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں کے ادب میں ترجمہ، اخذ اور اقتباس کی کوششوں نے مشہور ومعروف افسانہ نگاروں سے نہ سہی مغربی افسانوں سے اردو والوں کو روشناس کرایا۔ اگر رسائل کی ورق گردانی کی جائے تو ایسے متعدد افسانے ملیں گے جو مغربی زبانوں سے لیے گئے ہیں اور یا تو انہیں ویسے کا ویسا ہی رکھا گیا ہے یا ہندوستانی لباس پہنا کر اپنا لیا ہے۔ مشکل ہی سے کسی جگہ یہ معلوم ہوگا کہ یہ ترجمہ کس کا ہے اور کس زبان سے لیا گیا ہے گو یہ صورت حال آج بھی جاری ہے اور چوری کی نیت سے لے کر بھی ادبی خدمت کے شوق تک یہ بات نظر انداز کردی جاتی ہے کہ افسانہ کس کا ہے لیکن باقاعدہ ترجموں کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ ان پر نظر ڈالنے کے لیے وقت چاہیے۔

شروع میں سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری نے مختلف زبانوں سے ترجمے کیے۔ کبھی یہ معلوم ہوسکا کہ افسانہ کا اصل کون سا افسانہ ہے اور کبھی نہ معلوم ہوسکا، اس دوران میں بنگالی میں افسانہ نویسی عام ہوچکی تھی بعض افسانے وہاں سے بھی لیے گئے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے قریب کئی اچھے لکھنے والے باقاعدہ افسانوں کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے اور یہی نہیں کہ انہیں جو ملا اس کا ترجمہ کرلیا بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں کے اچھے افسانوں کی جانب نگاہ کی۔ ان مترجمین میں خواجہ منظور حسین، حامد علی خاں، جلیل قدوائی محشر بدایونی، فضل حق قریشی، اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی نے روسی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی اور انگریزی کے ذریعے، دوسری زبان کے افسانے ترجمہ کے لیے منتخب کیے۔ رسائل ان ترجموں کو اہمیت دیتے تھے اور اچھے ترجمے نئے لکھنے والوں کے لیے شمع راہ بنتے تھے۔ خواجہ منظور حسین اور جلیل قدوائی نے روسی افسانہ نویس چیخوف کے یہاں سے اعظم کریوی نے ہندی سے اور دوسرے لکھنے والوں نے مختلف زبانوں سے افسانے لیے اور باقاعدہ ترجمے کیے۔ انہوں نے لفظی ترجمے کرنے کے بجائے انگریزی کہانیوں اور خاص کر ہارڈی کی کہانیوں پر اپنے افسانے ڈھال لیے۔ ان مترجمین نے یقیناً اردو افسانہ نگاری کو نئی راہیں دکھائیں کیونکہ ان کے ترجمے اعلیٰ درجے کا ادبی حسن بھی رکھتے تھے۔

ترجمے کی اس کوشش میں یہ بات واضح ہوئی کہ فرانس کے عدیم النظیر افسانہ نگار موپاساں اور روس کے حقیقت پسند افسانہ نویس چیخوف کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے اگر غور کیا جائے کہ ایسا کیوں تھا تو اس کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اردو میں حقیقت پسندی اور نفسیاتی رومانی رجحان دونوں کے لیے جگہ بن چکی تھی اور یہ افسانہ نویس اپنے طرز اظہار اور انتخاب موضوع سے یہاں کی زندگی کے حقائق اور خوابوں سے قریب معلوم ہوتے تھے۔ کچھ دنوں کے اندر روسی اور فرانسیسی افسانوں کے ترجمے نہ صرف رسالوں میں بلکہ کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ سعادت حسن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منٹو نے خود طبع زاد افسانے لکھنے سے پہلے ترجموں کی طرف توجہ کی اور اپنے ترجموں کا مجموعہ روسی افسانے کے نام سے لاہور سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں کاونٹ لیوٹالسٹائی کے دو افسانے، تین سوال اور شراب، شیطان، چیخوف کی خادمہ اور ایشار گورکی چھبیس مرد ایک عورت، چری کوف کے جادوگر کے علاوہ سلوگب کے دو مختلف افسانے شامل تھے۔ روسی ادب کی حقیقت پسندی، زندگی کے مسائل پر گہری نگاہ، عوامی نقطہ نظر ہر چیز ہندوستانی ادب کے عام میلانات سے ہم آہنگ تھی۔ اس لیے روسی ناولوں اور ڈراموں کے ساتھ ساتھ افسانوں کے ترجمے بھی بڑی تعداد میں ہوئے۔ چیخوف، لیوٹالسٹائی اور گورکی کے، علاوہ نئے روسی ادیبوں مثلاً میموتوف، پیٹروف شخوناف، الکسی ٹالسٹائی، شولوخوف کے افسانے بھی برابر ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ پچھلی لڑائی کے زمانے میں شولوخوف نے ایک دلچسپ اور زبردست کہانی نازی بربریت کے خلاف لکھی۔ سبط حسن نے اس کا ترجمہ نفرت کے نام سے شائع کیا۔ انہیں دنوں میں بنے سیمونوف کی ایک کہانی کا ترجمہ غلام کی پیدائش کے عنوان سے کیا۔ کیونکہ ہندوستان میں بیرونی حکومت اور غریبی کے خلاف عوام جو جدوجہد کر رہے تھے ان کی خوبصورت تصویر اس افسانے میں بھی ملتی تھی بہرحال روسی کہانیوں کا ترجمہ ہوتا جا رہا ہے۔ حال میں رضیہ سجاد ظہیر نے روس کی کچھ بہترین کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اس مجموعہ میں پشکن، چیخوف، الکسی ٹالسٹائی، شولوخوف اور سیمونوف کے ایک ایک افسانے لیے گئے ہیں۔

اردو میں ترجمہ کے نقطہ نظر سے موپاسان فرانسیسی افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے افسانے کی رنگینی سادہ نفسیاتی انداز بیان اور واقعات کے ڈرامائی موڑ اسے ہر ملک میں ہر دل عزیز بناتے ہیں۔ اردو میں اس کے نہ جانے کتنے افسانے اخذ و ترجمہ ہو کر آئے ہیں۔ موپاساں کے افسانوں کے دو مجموعے آج بھی آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ افسانوی ادب کے مشہور مترجم منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے موپاسان کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ رنگین افسانے کے نام سے شائع کیا۔ جس کے کم از کم دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ دوسرا مجموعہ موپاسان کے افسانے کے نام سے سید نصیر حیدر نے مرتب کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1944ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں بھی گیارہ افسانے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں مختلف افسانے ہیں۔ فرانسیسی افسانوں کا ایک مجموعہ حیدر آباد سے بھی شائع ہوا۔ جس کی ترتیب میں اردو کے مشہور افسانہ نویس اور ادیب عزیز احمد نے حصہ لیا تھا۔ یہ مجموعہ اس اہم سلسلہ کی ایک کڑی تھا جو دنیا کے شاہکار افسانے کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کے چودہ مجموعوں میں سے چند ہی مجموعہ شائع ہو سکے۔ اگر یہ مجموعہ مرتب ہو گئے ہوتے تو دنیا کے ہر اہم ادب کی نمائندگی ہو جاتی۔ اس سلسلے کے مدیر عمومی پروفیسر عبدالقادر سروری تھے جو مجموعے شائع ہوئے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ قدیم افسانے، انگریزی افسانے، فرانسیسی افسانے چینی اور جاپانی افسانے ممکن ہے بعض اور مجموعہ بھی شائع ہوئے ہیں لیکن وہ میری نظر سے نہیں گذرے۔

انگریزی افسانوں کے ترجمے بھی برابر ہوتے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انگریزی کے ہی توسط سے دوسری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغربی زبانوں سے شناسائی ہوئی، لیکن پھر بھی انگریزی افسانہ نویسی سے بھی اردو افسانہ نگار اس قدر متاثر نہیں ہوئے جتنا روسی، فرانسیسی اور چینی سے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ایک مجموعہ "انگریزی افسانے" جس کا ذکر ابھی ہوا تھا۔ حیدر آباد سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں گولڈ اسمتھ، اسکاٹ ایڈیسن کے علاوہ ڈیکنس، ہارڈی، اسٹی ونسن، آسکر وائلڈ، کپلنگ، ایچ۔ جی۔ ویلز، کیتھرائن، نیس فیلڈ کے افسانے شامل ہیں۔ ایڈگر ایلن پو، جسے بعض نقاد افسانہ نگاری کا بانی کہتے ہیں اردو ادب میں پسند کیا جاتا ہے اور اسی کے افسانوں کا ترجمہ ابن انشا نے کیا ہے۔ واشنگٹن ارونگ کے افسانوں کا ترجمہ الحمراء کے افسانے کے نام سے حامد علی خاں نے کیا تھا۔ انہوں نے اور بہت سے یورپی افسانوں کا ترجمہ شائع کیا۔ کپلنگ کو ظفر علی خاں نے اردو کا جامہ پہنایا۔ ڈکنس کی بارہ کہانیوں کا مجموعہ "ارغوان راز" کے نام سے شائع ہوا۔ گالزوری کے طویل مختصر افسانے "سیب کا درخت" کے دو ترجمے ہو چکے ہیں اور دونوں اردو کے دو اہم ادیبوں پطرس اور قاضی عبدالغفار نے کیے ہیں۔ انگریزی افسانہ نویسوں میں سامرسیٹ مام او ہنری اور کیتھرائن مینسفیلڈ بھی ترجمہ کے لیے مخصوص ہیں۔ یورپ کی زبانوں میں جرمنی، ہسپانوی، پولش افسانوں کے ترجمے بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔

ایشیا کی زبانوں میں بعض ایسی زبانیں ہیں جن سے اردو کا تعلق بہت قدیم اور گہرا ہے لیکن کیونکہ ان میں مختصر افسانہ خود بہت بعد میں پیدا ہوا اس لیے وہاں سے ترجمہ کا سلسلہ بھی دیر میں شروع ہوا مثلاً عربی سے جو ترجمے ہوئے ہیں وہ حال ہی میں ہوئے ہیں۔ عربی مصنفوں میں مصطفیٰ المنفلوطی اور خلیل جبران کے ناولوں اور افسانوں کے متعدد ترجمے اردو میں موجود ہیں "سرخ کتاب" کے نام سے ضیاء الحسن نے چند عربی افسانوں کا ترجمہ حال ہی میں کیا ہے فارسی اور اردو کا گہرا ادبی رشتہ ہے۔ حامد حسن قادری نے "ایرانی افسانے" کے نام سے چند فارسی افسانوں کا ترجمہ شائع کیا۔ منیب الرحمٰن نے جمال زادہ کے کئی فارسی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترکی سے ترجموں کی ابتدا سجاد حیدر یلدرم نے کی تھی وہ اب بھی جاری ہے۔ نامق کمال اور خالدہ ادیب خانم کے کئی افسانے اردو میں مل جاتے ہیں۔

پہلے پہل جدید چینی افسانوں سے ہندوستان اس مجموعہ سے متاثر ہوا جو Living of China کے نام سے شائع ہوا۔ تمنائی نے اس مجموعہ کے کئی افسانوں کا ترجمہ اردو میں کیا اور اسے "زندہ چین" کے نام سے شائع کیا، چین کے متعلق پرلبک کی بعض کہانیوں کے ترجمے بھی ہوئے تھے لیکن زیادہ دلچسپی خود چینی اور افسانہ نویسوں سے لی گئی۔ الگ الگ افسانوں کے ترجموں کے علاوہ ظ۔ انصاری نے چین کی پانچ نمائندہ کہانیوں کا مجموعہ "چین کی بہترین کہانیاں" کے نام سے شائع کیا۔ چین کے لیہ سون کو چینی پریم چند کہا جاتا ہے۔ اس کو متعدد کہانیاں اردو میں ملتی ہیں۔ لیہ سون کے علاوہ پوٹانو، ماؤنون پھوسنگ لنگ لاؤش، لیوپائی تو تنگ لنگ وغیرہ کی بہت سی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ کچھ جاپانی افسانوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک مجموعہ چینی اور جاپانی افسانے کا شائع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو چکا ہے۔ جسے راحت بی۔اے نے مرتب کیا تھا۔ کتابوں کی شکل میں تو نہیں لیکن رسائل میں انڈونیشیا اور کوریا کے افسانوں کے ترجمے بھی چھپتے رہے ہیں۔

اس بات چیت میں محض چند نام گنائے جاسکتے ہیں اور اس میں ابھی ہندوستان کی ان متعدد زبانوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ جن سے براہ راست اردو کا تعلق ہے۔ ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی، کشمیری، تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم ہر زبان کے پاس مختصر افسانوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ابھی اردو میں ایسے کم لوگ ہیں جو ہندی کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں سے براہ راست ترجمہ کر سکیں۔ پھر بھی ان تمام زبانوں کے افسانے اردو میں آہستہ آہستہ منتقل ہو رہے ہیں اور بعض اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ وہ ان ترجموں کو شائع کر سکیں۔ ٹیگور کے تقریباً تمام افسانے اردو میں بھی مل جاتے ہیں۔ 1947ء میں بنگلور کے رسالہ نیا دور نے اپنا بنگالی افسانہ نمبر شائع کیا جس میں ٹیگور کے بعد کے افسانہ نگار لیے گئے تھے اور بنگال کے بارہ نمائندہ افسانے اس میں شامل تھے۔ کرشن چندر نے نئے افسانے کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نمائندہ افسانے منتخب کیے تھے۔ اس طرح اردو میں دوسری زبانوں کے مختصر افسانوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن سب کو دیکھنے کے بعد اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ کہ یہ کام اور زیادہ نظم اور سلیقے کے ساتھ ہونا چاہیے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم

ڈاکٹر اصغر عباس

سرسید کے مصلحانہ کارناموں کا حرف آغاز سائنٹفک سوسائٹی ہے۔ شمالی ہند میں انیسویں صدی کے نصف آخر پر اس علمی اور سیکولر انجمن کی پرچھائیں اتنی لمبی ہے کہ غالباً کسی اور انجمن کی نہیں۔ اس انجمن کے قیام سے یہاں سوچ اور اظہار کے نئے اسالیب اور عمل کے نئے طریقوں کا دربار ہوا ہے۔ یہی سوسائٹی تھی جس نے مغرب سے لائی ہوئی برکتوں سے ہم آہنگ کرنے اور خاص طور پر شمالی ہند میں ایک تہذیبی نشاۃ ثانیہ کو بروئے کار لانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی تاسیس سے قبل شمالی ہند میں اس نوع کی جتنی انجمنوں کی تشکیل ہوئی وہ انگریزوں کی یا ان کے زیر اثر قائم ہوئی تھیں اسی لیے عام طور پر ہندوستانی انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر ان کی سرگرمیوں میں حصہ لیا گیا تو عیسائی ہو جانا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ بنگالی دانشوروں کی قائم کردہ انجمنوں کا طریقہ کار سیکولر نہیں تھا اور محدود اپیل رکھتا تھا اس لحاظ سے شمالی ہند میں سائنٹفک سوسائٹی پہلی انجمن تھی جو اپنے معنی اور مقاصد کے لحاظ سے سیکولر اور ہمہ گیر پروگرام رکھتی تھی یہی وہ انجمن تھی جہاں ہندو مسلمان اور انگریز ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر وہ بدو ہوئے اور اس کے ذریعہ باہمی افہام و تفہیم کی فضا ساز گار ہوئی۔ اس ادارہ کا بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کی علمی کتابوں کے تراجم کو رواج دینا اور ایک نیا علمی اور عقلی انداز فکر پیدا کرنا تھا۔

سائنٹفک سوسائٹی کا پہلا جلسہ 9 جنوری 1864ء کو غازی پور میں ہوا۔ لیکن 1863ء ہی میں سرسید ایک تحریر 'التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند' کے ذریعہ تعلیم کے مسئلہ پر غور کرنے کے دعوت دے چکے تھے انہوں نے ساکنان ہندوستان سے کہا:۔

> ''دنیا کے اس دور میں جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں ملک کے دور کا وہ زمانہ ہے کہ جب ہم اس پر بہ لحاظ مضمون تعلیم کے لحاظ کرتے ہیں تو اس کو چمکتا ہوا نہیں پاتے۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم کا مسئلہ شمالی ہند میں ہندوستان کے دوسرے حصوں سے زیادہ پیچیدہ تھا یہاں دہلی کالج کو مجہلہ قرار دے گیا تھا۔ اور خاص طور پر سرسید کے ہم کیش تیار نہیں تھے اور یہ پسماندگی قومی زندگی کا ایک افسوسناک باب بنتی جارہی تھی۔ اس صورت حال سے نکالنے کے لیے مندرجہ بالا تحریر میں سرسید نے یہ حل پیش کیا:

''ایسی بد بخت حالت کے علاج کی راہ نکالنی اور ہمارے ہم وطنوں ہندوؤں اور مسلم قوموں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا تجویز ہوتا ہے جس کا مقصد یہ ہوگا، اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کی بہت عمدہ کتابوں کا دوسرے انگریزی زبان سے اور دیگر زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا او. چھاپنا جو سب کے لیے مفید ہوں، دراصل یہی تحریر سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا پیش خیمہ تھی۔

سوسائٹی کے پہلے جلسہ میں اس کا نام سائنٹفک سوسائٹی تجویز ہوا لیکن بعد میں سوسائٹی کے بعض ارکان اور ملک کے کچھ انگریزی اخبارات نے اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ یہ سوسائٹی، نام بڑے اور درشن چھوٹے کے مصداق ہے۔ لہٰذا سرسید نے 11 اپریل 1964ء کے جلسہ میں تجویز پیش کی کہ انجمن بجائے سائنٹفک سوسائٹی "Society for the Better Diffusion of Useful Knowledge" سے موسوم کی جائے لیکن سوسائٹی کے ارکان کی بڑی تعداد نے اس تجویز کی تائید نہیں کی اور یہ فیصلہ کیا کہ سوسائٹی کا پہلا نام برقرار رہنا چاہیے اور سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد یہ تھے۔

ا۔''ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔''

۲۔ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کر کے بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

۳۔ سرسید کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں زمانہ اور حقیقت دونوں کا عرفان تھا۔ قوم کی کمزوریوں اور خامیوں کی دھندلی اور روشن تصویریں ان کے سامنے تھیں تو دوسری طرف انگریزی اقتدار کا بھاری جوا اور ان کے لائے ہوئے علوم و فنون کی بڑھتی ہوئی طاقت بھی تھی، ان کی نگاہوں میں تھا کہ ہندوستانیوں کو ازمنہ وسطیٰ کے سرورازلی کے دلدل سے نکالنا اور انہیں یورپ کے عقلی تجزیے کی خشکی میں لا کھڑا کرنا بغیر مغربی علوم کے استفادہ کے ممکن نہیں۔ سرسید کا یہ بھی خیال تھا کہ ہماری ہمہ جہت ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک یہ کوششیں عوامی بنیادی نہ رکھتی ہوں۔ اسی لیے انہوں نے ترجمہ کے کام کو اولین اہمیت دی کہ اس کے ذریعے بڑے پیمانے پر قوم کو ان حقائق اور محرکات کو سمجھنے میں مدد ملے گی جس نے یورپ کے لوگوں کو ایک متحرک اور فعال طاقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنادیا ہے۔اس لیے سرسید نے سوسائٹی کے اشاعتی پروگرام کو اس طور پر ترتیب دیا کہ ایک طرف تو وہ اعلیٰ سطح پر مستند و معیاری کتابوں کے ترجمے پر توجہ کرے تو دوسری طرف جدید سائنس کے عملی نتائج سے بھی عوام کو روشناس کرائے۔سرسید کا خیال تھا کہ ''انگلستان کو کتابی تعلیم سے فائدہ پہونچا چاہیں تو اس طرح پر ہو کہ جس طرح ہم اس کو اپنی سلطنت یا قوانین سے فائدہ پہونچاتے یعنی ہم کو لازم ہے کہ اکثروں تک رسائی کر کے کتابی علم کو شائع کریں اور اس رکاوٹ سے جس میں وہ پڑا ہے اس کو آزاد کریں اور اس سے اپنا اصلی ارادہ اور مقصد یہ ٹھہرائیں کہ ان مقصدوں مذکورہ بالا سے ہندوستانیوں کی حالت اصلی تبدیل ہوجائے۔ مناسب یہ ہے کہ علم کو ایسی شے ٹھہراو جس سے ہر روز فائدہ حاصل ہو اور اس کی تحصیل میں جہاں تک ممکن ہو آسانی ہو یہ سب میری خواہشیں اور اس لیے میں ملکی زبان کے ذریعہ کو علم پہنچانے کے لیے حد سے زیادہ ترجیح دیتا ہوں کیونکہ وہ آسان ہے اور جو علم اس کے ذریعہ سے پہونچایا جاتا ہے وہ عملی طور سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اس کے وسیلہ سے علم کثرت سے پھیلتا ہے۔

غازی پور میں سرسید مغربی علوم کی اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے اور اپنے مقاصد کی ترویج و اشاعت میں سرگرم تھے کہ اسی اثنا میں ان کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا تو سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ آ گیا۔6 جون 1864ء کی میٹنگ میں سوسائٹی کی علمی مجلس (جسے کونسل مشیر کہتے تھے) کے ارکان کی کثرت رائے سے مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ اور تالیف بترتیب ذیل شروع کرنے کی تجویز ہوئی۔

۱۔ایک مختصر رسالہ بیان میں یورپ کے علوم و فنون کے جو مانڈ صاحب کے خزانہ علم میں سے تالیف کیا جاوے گا۔

۲۔پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب آدم اسمتھ صاحب کی کتاب کا جو قوموں کی ترقی دولت کے بیان میں ہے۔

۳۔تاریخ ہندوستان مؤلفہ الفنسٹن صاحب۔

۴۔رسالہ بھاپ کے کلوں کے بیان میں مصنفہ ڈبلو۔جے۔ایم۔کورین کاہن صاحب۔

۵۔تاریخ جدید ہندوستان مؤلفہ مارشمین صاحب۔

۶۔ایک اچھا بڑا نسخہ جغرافیہ کا جو کئی انگریزی جغرافیوں سے تالیف کیا جاوے۔

۷۔رسالہ یورپ کے آلات کشت کاری کے بیان میں جو کئی انگریزی کتابوں سے تالیف کیا جاوے۔

۸۔تاریخ چین، زبان فارسی ترجمہ محمد زمان عرف فرنگی خاں اصل انگریزی مصنفہ ایک پادری صاحب کے جس میں بیان ہے چین کی صورت اور پیداواریوں اور علوم و فنون اور مذہب اور رسومات سلطنت مورخہ چھٹی صدی۔

۹۔ایک کتاب بطور فہرست کے جس میں عمدہ عمدہ مشرقی کتابوں کے نام ہوں گے اور مصنفوں کے نام اور تاریخ تصنیف اور نام زبان جس میں وہ کتاب ہو اور کچھ اس کے مضمون کے اور ان لوگوں کے نام جن کے کتب خانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں وہ ہوں۔

۱۰۔ رسالہ اثر کہربائی جس میں عملی اور علمی دونوں مذکور ہیں معہ بہت سی تصویروں کے مصنفہ بسکاٹل صاحب۔

۱۱۔ رسالہ جیالوجی یعنی اس علم کا جس میں انقلابات زمین کا بیان ہے معہ بہت سی تصویروں کے مصنفہ جان فلپس صاحب۔

۱۲۔ تاریخ ایران مصنفہ سرجان مالکوم صاحب۔

۱۳۔ تاریخ بھوپال مصنفہ سرجان مالکوم صاحب جس کا انتخاب کیا جاوے گا۔ ان کی تاریخ ہندوستان سے۔

۱۴۔ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ اسپین جو تالیف کی جاوے گی تاریخ عربوں کا اسپین مصنفہ کانڈ صاحب اور اسپین کے عربوں کی تاریخ مصنفہ شیخ ابی العباس المقری اور تاریخ اسپین مصنفہ کالی کٹ صاحب میں سے۔

۱۵۔ رسالہ علم فلاحت یعنی کشت کاری مصنفہ لائبی صاحب۔

۱۶۔ تاریخ اسکندر اعظم مصنفہ ایرین صاحب۔

۱۷۔ مغلیہ دربار کا بیان مصنفہ برنیر صاحب۔

۱۸۔ رسالہ علم طبیعات جو نہایت پسندیدہ اور آزمودہ ہے مصنفہ جے۔ جے گریفن صاحب۔

۱۹۔ کلک صاحب کے آخری نسخہ کی چوتھی اور پانچویں فصل۔

۲۰۔ واٹلی صاحب کی کتاب منطق۔

۲۱۔ متعدد رسالہ حکمت قدرت کے ویل صاحب کے سلسلہ میں ہے۔

۲۲۔ جنرل کننگھم صاحب کی رپورٹ ان تلاشوں کی جو انہوں نے صوبہ بہار اور گورکھپور میں کیں۔

۲۳۔ رسالہ ہیئت یا کئی دنیاؤں کا ثبوت مصنفہ وی ول صاحب۔

۲۴۔ رسالہ پہاڑوں کی شہادت مصنفہ ملر صاحب۔

۲۵۔ بکل صاحب کی دوسری جلد کا چھٹا باب جس میں نتیجے نکالنے کی حکمت کی عظمت کا بیان ہے۔

۲۶۔ میکس مولر صاحب کی کتابیں درباب علم سنسکرت۔

۲۷۔ مواعظ سکندر مصنفہ ارسطو۔

۲۸۔ پولیٹنکل اکانومی یعنی انتظام مدن مصنفہ سنیر صاحب۔

اس کے علاوہ عبدالغفور نساخ کے بھائی مولوی عبداللطیف خاں جو مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ کے ناظم اور سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر تھے 8 جنوری 1865ء کے سوسائٹی کے نام ایک خط میں مندرجہ ذیل کتابوں کے ترجمے شائع کرنے کی تجویز پیش کی۔

۱۔ رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی جو اور صاحب کے دائرہ علوم میں سے لیے جاویں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ رابرٹ سن اور پرسکٹ صاحب کے رسالہ درباب تحقیق ہونے امریکہ یعنی نئی دنیا کے۔

۳۔ ہمبولٹ صاحب کی سیاحی کے حالات اور نیم حالات سیاحی اور کسی مصنف کے۔

۴۔ تاریخ خلفاء عباسیہ۔

۵۔ گلیک صاحب کی تاریخ انگلستان۔

۶۔ رسالہ درباب ترکیب اور نظام سلطنت انگریزی۔

۷۔ رسالہ درباب سڑک ریل۔

۸۔ لیک پرالیس صاحب کا رسالہ درباب فن من فاتک گرانی یعنی سورج کے عکس سے تصویر کھینچنے کا فن۔

۹۔ رسالہ درباب امریکہ کی ترکیب اور انتظام سلطنت موجودہ کے۔

۱۰۔ تھارنٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان۔

۱۱۔ حیات نامے مشہور زندہ لوگوں کے جن کا انتخاب اس کتاب میں سے کیا جاوے جو زمانے کے لوگوں کے نام سے مشہور ہے۔

۱۲۔ انگریزی اور سنسکرت کی کتابوں میں سے وہ رسالہ جو فن سلنگ اور اشعار سانگ سے متعلق ہے۔

۱۳۔ کانب صاحب 8 رسالہ باب ترکیب جسم انسانی کے۔

۱۴۔ ڈاکٹر اے کانب صاحب کی طبیعات متعلقہ تندرستی اور تعلیم۔

۱۵۔ ڈاکٹر سونر کا رسالہ درباب سلامتی عقل۔

۱۶۔ ہربٹ صاحب کا رسالہ درباب حقوق انسانی اور ان حقوق کی حفاظتوں ملکی کے۔

۱۷۔ ڈاکٹر جارج ولسن صاحب کا رسالہ درباب تار برقی کے۔

۱۸۔ می پانپر صاحب کا رسالہ درباب استعمال بجلی متعلقہ ملمعہ کرنے کے مندرجہ بالا کتابوں کے ترجمہ و تالیف کی تجویز کے قبل رولن صاحب کی قدیم تاریخ مصر اور مل صاحب کی پولیٹکل اکونمی کے ترجمہ کی تجویز سرسید کیم فروری 1964ء کے سوسائٹی کے جلسے میں منظور کرا چکے تھے۔ اور 12 مارچ 1864ء تک تاریخ مصر کا ترجمہ مکمل ہو چکا تھا۔

سوسائٹی جب علی گڑھ آئی تو اس کی سرگرمیوں اور مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا۔ غازی پور میں یہ اگر ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی تھی تو یہاں وہ ایک موج رواں بن گئی۔ اس لیے جب کام کی رفتار بڑھی تو نئی ضرورتوں کا احساس بھی بڑھا اور سوسائٹی کی ایک اپنی عمارت کا ہونا ازبس ضروری قرار دیا گیا۔ سوسائٹی کے جلسہ میں یہ تجاویز پیش ہوئیں۔

ا۔ ''اول یہ کہ مکان وسیع واسطے اجلاس سوسائٹی کے بنایا جائے کہ جس میں سوسائٹی کا اجلاس ہوا کرے اور تمام کتابیں اور اسباب متعلق سوسائٹی کا بہ حفاظت اور آراستگی اس میں رکھا رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ دوسرے یہ کہ سوسائٹی کے متعلق ایک عام ذخیرہ ہر قسم کے علوم وفنون کی کتابوں انگریزی اور فارسی اور عربی اور اُردو اور سنسکرت کا کیا قلمی اور کیا چھاپا جمع کرنا چاہیے اور یہ کتب خانہ بطور عام کتب خانہ کے رہے گا۔ اور ہر شخص کو بموجب ان قواعد کے جو کونسل کار پرداز مقرر کرے گی ان کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل رہے گا۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جمیع قسم کے علوم وفنون کے آلات جو یورپ میں مروج ہیں اور جن کے ذریعے سے طالب علموں کو ہر قسم کے علوم وفنون کے تجربے دکھائے جاتے ہیں۔ سوسائٹی کو جمع کرنا چاہئیں کیونکہ ابتدا سے سوسائٹی کی خواہش ہے کہ ہر مہینہ میں دو تین دفعہ بذریعہ لیکچروں کے اور دکھانے کے ہندوستانیوں کو یورپ کے علوم وفنون کی نئی تحقیقاتیں بخوبی سمجھائی جاویں۔"

علی گڑھ اور بلند شہر کے زمینداروں کی مدد اور سوسائٹی کے ارکان کے تعاون سے مجوزہ عمارت کے لیے رقم جمع ہونے لگی۔ 30 نومبر 1864ء کو سوسائٹی کی عمارت کی رسم تنصیب لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب مسٹر اے ریمنڈ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ بتیس ہزار کی لاگت سے یہ عمارت سرسید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوئی اور 14 فروری 1866ء کو اس کا افتتاح ہوا۔ اس عمارت میں سب سے پہلے سرسید نے قانون پر لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا اس کی برائے نام فیس بھی تھی جو سوسائٹی کے فنڈ میں جمع کردی جاتی۔ سوسائٹی کے کونسل کار پرداز نے جب ان لیکچروں کی افادیت محسوس کی تو عام پبلک کے لیے ایسے موضوعات پر لیکچروں کا انتظام کیا جن سے معلومات اور فکر و نظر میں وسعت پیدا ہو ساتھ ہی دلچسپ اور معنی خیز بھی ہوں۔ ان لیکچروں کی کوئی فیس نہیں تھی۔

اس کے علاوہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے راہ ورسم پر، ستہ فصلی، تعلیم نسواں اور ہندوستان کے باشعور لوگوں کو فلاح و بہبود کے کاموں پر متوجہ کرنے کے لیے سوسائٹی میں لیکچر دیئے گئے۔ 28 جون 1967ء علم طبیعات پر علی گڑھ کے انگریزی مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر نے لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ڈاکٹر کلکلی جن کے سپرد سوسائٹی کے معمل کا انتظام والصرام تھا ہر ماہ سائنس کے کسی موضوع پر لیکچر دیتے اور آلات سائنس جو سوسائٹی میں موجود تھے ان سے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔

28 جنوری 1865ء سے سوسائٹی کے مجوزہ کتب خانہ کی تنظیم کا آغاز ہوا۔ سرسید نے چھ سو روپیہ کی کتابیں کتب خانہ کو دیں اس کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی میں اشرف علی، کمسن صاحب، عبداللہ عبیدی، منشی نولکشور، ولیم ناسولس، عبدالرحمٰن کپتان فلرا جی ایف، آئی، گراہم کے عطیات شامل ہیں۔ سوسائٹی کے دارالمطالعہ میں 1866ء میں چالیس اخبارات آتے تھے جن میں انگریزی اور اُردو کے علاوہ سنسکرت عربی اور فارسی کے اخبارات بھی تھے۔

14 فروری 1866ء کو سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار نکالنے کی تجویز ہوئی۔ مجوزہ اخبار کا اجراء 3 مارچ 1866ء سے ہوا۔ پہلے یہ اخبار ہفتہ وار تھا لیکن بعد میں سہ روزہ ہوگیا تھا انیسویں صدی کے آخری عشرہ میں یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخبار پھر ہفتہ وار ہو گیا۔ اس اخبار کو صحافتی اہمیت سے قطع نظر اس نے اُردو نثر کو جو نیا اسلوب زیادہ خود اظہار کے لیے نئے قالب کی حیثیت رکھتا ہے۔

15 اگست 1867ء کو سرسید کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس ہوا۔ بنارس سے بھی سرسید سوسائٹی کے کاموں میں امداد دیتے رہے اور اس کی مستقل آمدنی کے وسائل تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے ایک تجویز کی کہ اس ضلع (علی گڑھ) کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے۔ بنارس سے سرسید جب انگلستان روانہ ہوئے تو راستہ میں بھی سائنٹفک سوسائٹی کا خیال برابر لگا رہا۔ عدن کے قریب کسی مقام سے مہدی علی (محسن الملک) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> ”مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے، کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے۔ اور کوئی درجہ سعی و کوشش کے واسطے شکست دینے سائنٹفک سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کو سنبھال لیں اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمادیں۔ مرزاپور کے لوگوں نے اگر چندہ نہیں دیا تو ان کو ممبر بنایئے بہر حال سوسائٹی کے معاملہ میں حد سے زیادہ خیال و کوشش فرمائیے۔“

لندن کے زمانہ قیام میں بھی وہ سائنٹفک سوسائٹی کے خیال سے غافل نہیں رہے۔ انہیں سوسائٹی کے قرضہ کا خیال لگا رہا۔ وہاں سے وہ برابر اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں اپنے سفر کے حالات و کوائف لکھتے رہے۔ لندن ہی سے انہوں نے مختلف علوم کی اہم کتابوں کی ایک فہرست علمائے لندن سے انتخاب کرا کر سوسائٹی کو ترجمہ کے لیے بھیجی۔ انہیں کتابوں میں علم ریاضی کی کتابیں بھی شامل تھیں جن میں بیشتر کا ترجمہ مولوی ذکاءاللہ نے کیا ہے۔

سرسید کے بنارس چلے جانے کے باعث سائنٹفک سوسائٹی کے سیکرٹری راجہ جے کشن داس ہوئے۔ انہوں نے سوسائٹی کے کاموں میں دلچسپی لی لیکن سرسید کی ذات سوسائٹی کی سرگرمیوں میں اس طرح گھل مل گئی تھی کہ انکے چلے جانے پر اس کمی کا احساس ہونا لازمی تھا۔ راجہ جے کشن داس کے زمانہ نظامت میں رسالہ علم برقی، اصول سیاست مدن اور تاریخ ایران کے حصے سوسائٹی سے شائع ہوئے انہوں نے ترجموں کے علاوہ مستقل تصانیف کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دی۔ اور اس سلسلہ میں ملک کے اہل علم کی خدمات حاصل کیں اور ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کی ضروریات پوری کرنے کے لیے موضوعات کی فہرست تیار کرائی جن کا مقصد جدید تقاضوں اور اصولوں کے تحت اُردو ادب کی تدریس تھا۔

اس کے علاوہ تاریخ یمینی، تاریخ خواجہ ابوالفضل بیہقی، تاریخ المآثر، طبقات ناصری۔ تاریخ فیروز شاہی، تاریخ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیموراور تاریخ ابن خلدون کا انتخاب شائع کرنے کی بھی تجویز تھی۔ کتابوں کی اشاعت کا یہ پروگرام پوری طرح روبہ عمل نہ آسکا اس کی ایک وجہ سوسائٹی کے منتظمین کی جلد جلد تبدیلیاں بھی تھیں۔ 21 فروری 1874ء کو راجہ جے کشن داس کا تبادلہ الہ آباد ہوگیا ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں سوسائٹی کا آنریری لائف کو پریسیڈنٹ بنایا گیا۔ راجہ جے کشن داس کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں سیکرٹری مقرر ہوئے 11 جون 1874ء کو نظامت کے فرائض سے وہ عارضی طور پر سبکدوش ہوئے ان کی جگہ زین العابدین اور پنڈت رادھا کشن سیکرٹری مقرر ہوئے۔ 25 اگست 1874ء کو مولوی سمیع اللہ خاں نے اس عہدہ کا دوبارہ جائزہ لیا۔ 2 مئی 1877ء تک مولوی سمیع اللہ اور پنڈت رادھا کشن دونوں سوسائٹی کے سیکرٹری رہے۔ اس زمانہ میں سرسید بنارس سے آکر علی گڑھ میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ لہٰذا نظامت کے فرائض کا بار بھی سرسید پر پڑا۔ اس زمانہ میں سوسائٹی پر قرضہ کا بوجھ تھا۔ ممبروں کی تعداد دن بدن گھٹتی جارہی تھی کتابوں کے ترجمہ کا کام بند پڑا تھا اس صورت حال سے نکالنے کے لیے سرسیّد نے 26 ستمبر 1878ء کو سوسائٹی کے لیے جدید بائی لاز بنائے لیکن اس کے باوجود سوسائٹی کی گرتی ہوئی حالت میں کوئی متعدبہ فرق نہ آیا۔ 1878ء ہی میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر نامزد ہوئے لہٰذا 1878ء کے اواخر میں خواجہ محمد یوسف سائنٹفک سوسائٹی کے سیکرٹری منتخب ہوئے ان کے زمانہ میں بھی سوسائٹی کی اصلاح نہ ہوسکی۔ 1882ء میں سوسائٹی میں صرف دس ممبر اور چار آنریری ممبر و عہدیدار رہ گئے جب کہ سوسائٹی کے ابتدائی زمانہ میں ممبروں کی تعداد تقریباً ڈھائی سو تھی۔

1886ء میں ممبران کی تعداد تین رہ گئی۔ اور 1887ء میں وہ بھی نہ رہے چنانچہ 10 جولائی 1887ء کو سائنٹفک سوسائٹی کو مدرستہ العلوم میں ضم کردیا گیا۔ اور 7 نومبر 1887ء کو سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت میں ایک کلب قائم کردیا گیا۔

حالی نے لکھا ہے کہ "قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصّوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی پھر 35 برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اس کے بعد اور اسی کی ریس سے قائم ہوئیں" حالی کا یہ خیال حرف بہ حرف صحیح ہے کہ اس سوسائٹی کے قیام کے بعد ملک کے طول و عرض میں انجمنوں کا جال سا بچھ گیا۔ جنہوں نے فکر و نظر کے نئے قالب تیار کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا۔ بنارس انسٹی ٹیوٹ" اٹاوہ ریڈنگ اینڈ ڈبیٹنگ کلب، سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور بہار، انجمن تہذیب لکھنؤ، سروجنک سبھا پونا، کٹک سوسائٹی اڑیسہ اور انجمن راجپوتانہ وغیرہ کا قیام سرسید کی اسی سوسائٹی کے زیر اثر عمل میں آیا۔

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات پر سلسلہ کا نمبر بھی درج ہوتا تھا اور انہیں سوسائٹی کے سرپرست ڈیوک آف ارگل کے نام منسوب کیا جاتا تھا۔ سرسیّد کی یہ تجویز سوسائٹی کے ارکان نے متفقہ طور پر منظور کر لی تھی کہ ''ہماری سوسائٹی جو کتاب چھاپے اس کا سرنامہ ہمیشہ ہزگریس ڈیوک آف ارگل پیٹرن سوسائٹی کے نام سے زینت پاوے تاکہ ایسے جلیل القدر حاکم کی جس نے ہم ہندوستانیوں کی بہتری کے لیے اپنی فیاض مہربانی کو پیٹرن ہونے سے ظاہر کیا ہے ہمیشہ کو یادگاری رہے؟'' اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سائنٹفک سوسائٹی سے صرف پندرہ کتابیں شائع ہوئیں جن میں گیارہ ہمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ یہاں ان کتابوں کی فہرست پر ان کے ٹائٹل پیج کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

۱۔ نمبر مصر کی قدیم تاریخ جوروان صاحب کی تاریخ قدیم میں سے باضافہ چند مضامین تالیف ہوئی۔ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ 1870ء مصر کی قدیم تاریخ کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔

۲۔ نمبر 2 تاریخ چین مصنفہ پادری ایکسوس کہ آنرا محمد زماں خاں مشہور بہ فرنگی خاں باشارہ پادری پورنو صاحب بزبان فارسی ترجمہ نمودہ بود بہ تائید سین ٹیفک سوسائٹی بہ قالب طبع درآمد، کلکتہ، بالپٹ مشن پریس۔ 1864ء۔

۳۔ نمبر یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ جورولن صاحب کی تاریخ قدیم سے باضافہ چند مفید حاشیوں کی تالیف ہوئی۔ پہلا حصہ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے علی گڑھ۔ سیّد احمد پرائیویٹ پریس۔ 1865ء

۴۔ نمبر یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ جو جورولن صاحب کی تاریخ قدیم سے باضافہ چند مفید حاشیوں کی تالیف ہوئی۔ دوسرا حصہ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے علی گڑھ۔ سیّد احمد پرائیویٹ پریس۔ 1865ء

۵۔ نمبر یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ جو جورولن صاحب کی تاریخ قدیم سے باضافہ چند مفید حاشیوں کی تالیف ہوئی۔ تیسرا حصہ ترجمہ کیا اور مشتہر کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی نے علی گڑھ۔ سیّد احمد پرائیویٹ پریس۔ 1865ء۔ اس کتاب کے تین حصے اور تھے جنہیں شائع کرنے کی تجویز تھی۔ سائنٹفک سوسائٹی کی روئداد دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے یہ حصے شائع نہ ہو سکے۔

۶۔ نمبر رسالہ علم فلاحت یعنی فرنگستان کے طریقہ پر فن کشت کاری کا بیان معہ تصویرات کے۔ مولفہ رابرٹ اسکاٹ برن صاحب جو مسٹرول صاحب کی کتابوں کے سلسلے میں شامل ہے اور جس کو باضافہ چند مفید حاشیوں کے سائنٹفک سوسائٹی نے اُردو میں ترجمہ کر کے مشتہر کیا۔ علی گڑھ سیّد احمد پرائیویٹ پریس۔ 1865ء۔

۷۔ نمبر رسالہ علم انتظام مدن مولفہ ناساولیم سینیر صاحب ایم۔ اے سابق پروفیسر علم انتظام مدن یونیورسٹی آکسفورڈ جس کو باضافہ چند مفید حاشیوں کے سائنٹفک سوسائٹی نے اردو میں ترجمہ کر کے مشتہر کیا، علی گڑھ سیّد احمد پرائیویٹ پریس۔ 1865ء۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۔ نمبر تاریخ ہندوستان، ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہد کی ابتدا سے 1861ء مطابق 1175ھ تک مؤلفہ انربیل مونٹ اسٹورٹ الفسٹن صاحب بہادر سابق گورنر بمبئی معہ تتموں اور حواشی اور نقشہ ہندوستان جس کو سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے ترجمہ کر کے مشتہر کیا، علی گڑھ، سید احمد پرائیویٹ پریس۔ 1866ء

۹۔ نمبر رسالہ علم برقی مؤلفہ سرولیم اسنو ہیرس صاحب جس کو باضافہ مفید حاشیوں کے سائنٹفک۔ سوسائٹی علی گڑھ نے اُردو زبان میں ترجمہ کر کے مشتہر کیا۔ علی گڑھ، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ 1896ء

۱۰۔ نمبر اصول سیاست مدن، مقالہ اوّل مؤلفہ رائے بہادر پنڈت دھرم نرائن دہلوی از کتاب عدیل عمدۃ الحکماء جون سٹورٹ مل صاحب سلمہ الرحمٰن و دیگر ماخذ جس کا حق طبع مؤلف نے سائنٹفک سوسائٹی کو مرحمت فرمایا اور سوسائٹی نے اس کو بہ نظر افادہ عام چھاپ کر مشتہر کیا۔

۱۱۔ نمبر تاریخ ایران، حصہ اول، جس میں نہایت قدیم زمانہ سے حال تک سلطنت مذکور کے باشندوں کے مذہب اور طرز حکومت اور راہ ورسم اور خصلت کا ذکر ہے۔ مؤلفہ میجر سر جان میلکام صاحب۔ جی۔ سی۔ بی۔ کے۔ ایل، ایس، گورنر سابق بمبئی۔ جس کو سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اردو زبان میں ترجمہ کر کے مشتہر کیا، علی گڑھ مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ 1872ء سائنٹفک سوسائٹی کی ساری مطبوعات علاوہ تاریخ ایران کے چاروں حصوں کے ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ مذکورہ کتابوں کے علاوہ سائنٹفک سوسائٹی کی روئدادوں سے اور گزٹ میں سوسائٹی کی مطبوعات کے اشتہارات سے پتہ چلتا ہے کہ ذیل کی کتابیں بھی سوسائٹی کی مطبوعات میں شامل ہیں جو ہمیں دستیاب نہ ہو سکیں۔

۱۔ رسالہ علم جغرافیہ حصہ اوّل، دوم، سوم اور چہارم، مؤلفہ مسٹر ولکنسن۔

۲۔ رسالہ نیچرل فلاسفی مصنفہ چارلیس ٹامنس۔ ۳۔ رسالہ علم آب و ہوا مصنفہ چارلس ٹامنس۔ ۴۔ رسالہ جرثقیل مصنفہ چارلس ٹاملنس۔

مولوی عبدالحق نے مولوی ذکاء اللہ کی ترجمہ کردہ سترہ کتابوں کو سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات میں شامل کر دیا ہے لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ کتابیں سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کی تائید مطبع مرتضوی دہلی میں طبع ہوئی ہیں مثال کے طور پر رسالہ مسائل معادلات کے ٹائٹل پیج کی یہ عبارت ہے۔

"رسالہ مسائل معادلات معہ بہت سی مثالوں کے۔ مؤلفہ ٹاڈھنٹر صاحب ایم اے۔ الف۔ آر۔ ایس۔ جس کو منشی محمد ذکاء اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول دہلی نے بتائید مقاصد سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، سائنٹفک سوسائٹی بہار، اُردو میں ترجمہ کیا اور بمقام دہلی مطبع مرتضوی میں باہتمام حاجی محمد عزیز الدین کے مطبوع ہوا۔ 1871ء ٹائٹل پیج مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔

"قوموں کی زندگی میں کبھی ایسا بھی لمحہ آتا ہے جب علوم وفنون کی تنویری قوت مدھم پڑ جاتی ہے ایسی صورت میں میں یہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے مائل بہ انحطاط علوم کو دوسری بڑھتی ہوئی یا ترقی یافتہ قوموں کے علوم سے توانا بنائیں انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں یورپ کے علمی ورثہ کو جذب کرنے کا عمل با قاعدہ طور پر دہلی ورینکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے ذریعہ شروع ہوا۔اس کے معاونین میں شاہ اودھ اور شمس الامراء امیر کبیر بھی شامل تھے۔خود ان لوگوں نے بھی اپنے اپنے حلقوں میں یورپ کے تہذیبی ورثہ کو اُردو میں منتقل کرانے کا سلسلہ شروع کیا لیکن ان کوششوں کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہ دیکھا۔لیکن سائنٹفک سوسائٹی کی کوششیں مذکورہ کوششوں سے اس لیے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں کہ اس نے تمام ذرائع اور وسائل کو منظم طور پر یک جا اور مربوط کر کے ترجمہ کا کام شروع کیا، یہ کام وقت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔لہٰذا اس کی اہمیت کا احساس پیدا کر دیا۔اسی لیے سائنٹفک سوسائٹی کے کارنامے کیت کے اعتبار سے کم سہی کیفیت کے لحاظ سے عظمت کے حامل ہیں۔''

سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سرسیّد کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی وہ تاریخ کو شہنشاہوں کے کارناموں کا بیان نہیں بلکہ انسانیت کے عروج وزوال کی کہانی سمجھتے تھے۔رولن کی کتاب اسی لیے ان کی پسندیدہ کتابوں میں تھی کہ اس سے ذہنی اور معاشرتی کارناموں کی تہوں تک رسائی ہوتی ہے۔یہاں تاریخ زندہ حقیقت معلوم ہوتی ہے خود سرسیّد کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں جہاں جایئے تاریخ سے مفر نہیں ان میں اس بات کا شدید احساس ہے کہ ان کا ماضی ان کے حال کا حصہ ہے وہ اپنے ماضی سے بے زار نہیں بلکہ اپنے دور کے مزاج سے بے زار تھے۔تاریخ کی کتابوں کے ترجمے سے وہ یہ چاہتے تھے کہ قوم میں حقیقت پسندی کا جذبہ اور معروضی انداز نظر پیدا ہو۔

سوسائٹی نے جن کتابوں کا ترجمہ کرایا ان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ حواشی کی مدد سے متن کے ایسے اشارات اور اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی تھی جن سے عام طور پر ہندوستانی ناواقف ہوتے تھے۔سوسائٹی کے یہ ترجمے عام فہم ہیں اور اس لیے انہیں مقبولیت حاصل ہوئی ان ترجموں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مغربی افکار وخیالات اُردو کے سانچے میں ڈھل رہے تھے دوسری طرف تخلیقات یا طبع زاد تحریریں بھی ان ترجموں کا اثر قبول کر رہی تھی اور ان کا ایک مزاج متعین ہو رہا تھا۔انیسویں صدی میں شمال ہند میں ترجموں کے سلسلہ میں سائنٹفک سوسائٹی کی یہ آخری کوشش تھی جو بروئے کار آئی۔یہاں سے کتابیں کم ترجمہ ہوئیں لیکن ان کتابوں نے ملک کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اندھیرے سے نکالنے کے لیے جو فضا تیار کی اس کی اہمیت مسلمہ حقیقت ہے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے منصوبوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کا خواب بھی سرسیّد نے اس کام کے دوران دیکھا گو اس کے تمام خط و خال ان کے ذہن میں پورے طور پر انگلستان کے سفر کے بعد متعین ہوئے اس لیے علی گڑھ تحریک کو سمجھنے کے لیے بھی سائنٹفک سوسائٹی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے کہ یہی سوسائٹی علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز ہے۔

ماخذ و مصادر

۱۔۲۔ التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند، سرسیّد، سیّد احمد پرائیویٹ پریس، غازی پور 1863ء ص ۱۔۷

۳۔ قانون واسطے سین ٹیفک سوسائٹی کے غازی پور 1864ء

۴۔ روئیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر 1 غازی پور 1864ء

۵۔ روئیداد سین ٹیفک نمبر 5 گورنمنٹ پریس الہ آباد 1864ء

۶۔ روئیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر 7

۷۔ روائیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر 2

۸۔ روائیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر 3

۹۔ روائیداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر 6

۱۰۔ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ 25 مئی 1866ء

۱۱۔ حیات جاوید، حالی۔ ص 191

۱۲۔ مکتوبات سرسیّد، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی ص 41

۱۳۔ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی 22 مئی 1868ء

۱۴۔ حیات جاوید۔ حالی۔ ص 279

۱۵۔ سیّد احمد خاں حالات و افکار۔ عبدالحق ص 151

۱۶۔ روئداد سین ٹیفک سوسائٹی نمبر 4

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی تصانیف کے اُردو تراجم

ڈاکٹر عبدالحق

ترجمہ کا مفہوم کسی خیال کا دوسرے تک منتقل کیا جانا ہے اس اعتبار سے اس کا آغاز انسانی تہذیب کی ابتدا سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے انسان نے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے لکڑی اور لکیر کا سہارا لیا۔ بعدازاں ان ٹوٹی اور بکھرتی لکیروں کو مربوط کر کے تصویروں کو استعمال کیا یہ تصویریں Hieroglyphics یا مقدس تحریریں قرار پائیں۔ ان سے حروف تہجی ایجاد ہوئے رفتہ رفتہ زبان وجود میں آئی جو مفروضہ صوتی علامات کا مجموعہ ہے گویا عقیدہ و افکار نے زبان کو جنم دیا اور اسے پروان چڑھایا۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے نظریہ و خیال کی اشاعت چاہتا ہے۔ وہ اپنے ایمان و عقائد کا حلقہ وسیع بنانے کی فکر میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ دوسروں کو ہم مشرب اور ہم راز بنانے کی جدوجہد میں دیوانگی کی حد تک بڑھ جاتا ہے اور اسے باعث خیر اور موجب نجات سمجھتا ہے یہی جدوجہد اور خواہش ترجمہ کی تحریک پیدا کرتی ہے اگر مخاطب ہم زبان اور ہم قلم نہیں ہے۔ تو کسی مشترک زبان اور ذریعۂ اظہار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ہماری زبان میں لسانی سطح پر مترادفات سے ترجمہ کا آغاز ہوا۔ ان مترادفات میں تصرفات بھی ہوئے۔ گویا اُردو کے عناصر ترکیبی میں ترجمہ کا خمیر شامل ہوا۔ جب زبان اظہار کے قابل ہوئی تو فارسی کے مختلف اصناف سخن کو جوں کا توں اُردو میں منتقل کیا گیا۔ ترجمہ کے ساتھ کہیں تصرف اور پھر تخلیق کا دور شروع ہوا۔ لیکن تخلیق کے مقابلہ میں ترجمہ کا ذخیرۂ ادب کہیں زیادہ وقیع اور قابل قدر ہے۔ کبھی کبھی یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ شاید ترجمہ کا ہی بول بالا ہے۔

ایک عام فہرست سازی کے مطابق ہماری زبان میں اب تک تقریباً اٹھارہ ہزار سے زائد کتابیں تراجم کی صورت میں موجود ہیں۔ عبداللہ قدسی نے اپنی کتاب ''پاکستان میں ذہنی رجحان'' (1958ء) میں تراجم کی ایک نامکمل فہرست اس طرح پیش کی ہے۔ یہی جریدہ (کراچی یونیورسٹی) میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن پاک کے تراجم تقریباً	52
احادیث	150
اسماء رجال	50
کتب فقہ	150
سیر و تاریخ	500
فلسفہ اور منطق	100
مختلف علوم و فنون	5000

یہ ایک نا تمام فہرست ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے تراجم کا ایک حصہ اس میں شامل نہیں ہے اور نہ ...دکے تراجم کے اعداد و شمار شامل ہیں۔ اس پندرہ سال کی مدت میں تراجم کا قابل ذکر ذخیرہ اردو میں منتقل ہوا ہے۔

اردو میں سب سے بڑا سرمایہ عربی تراجم کا ہے۔ تفسیر و احادیث کے علاوہ سفرنامہ ابن بطوطہ ...ن ج...، ابن خلدون، تاریخ طبری، ابن اثیر، فصوص الحکم، حکمت الاشراق، الملل والنحل، قانون شیخ الرئیس، اخوان الصفا، غزالی و رازی کے ساتھ تقریباً ہر بنیادی کتاب کا اردو ترجمہ موجود ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عربی علم و فن کی زبان ہے۔ اس کا اثر و نفوذ اتنا گہرا اور دیرپا تھا کہ اس نے بیشتر ...بانوں کو اپنی تہذیب کے ساتھ ساتھ مغلوب کیا۔ پروفیسر ای جی براؤن نے تاریخ ادبیات ایران میں، اس امر...طرف بڑی صراحت کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ فارسی زبان کی پوری تربیت عربی کے زیر سایہ ہوئی اور فارسی نے ا...دو کی سرپرستی کی۔ ایران میں علم و فضل کی زبان عربی ہی تھی فارسی نہیں۔ اور تقریباً یہی صورت حال ہندوستان میں تھی۔

کم سے کم اکبر کے زمانے تک عربی کا ہی بول بالا تھا۔ علم و فضل کا معیار بھی اس کو سمجھا جاتا تھ...۔ بیشتر علماء کی کتابیں اسی زبان میں ملتی ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کا خیال صحیح ہے کہ مغلیہ سلطنت سے پہلے فارسی ...ر...نا...ے قابل ذکر نہیں۔ ابن حوقل اور اصطخری کے قول کے مطابق چوتھی صدی ہجری کے وسط اور آخر تک ملتان و...منصو...ہ سندھ کے لوگ عربی اور سندھی بولتے تھے اس کے بعد بھی تقریباً چھ سو سال تک یعنی عہد اکبری تک عربی کا ...واج...تا ہے۔ صرف زبان ہی نہیں بلکہ فنون لطیفہ کے دوسرے ارکان میں بھی حجازی آہنگ نمایاں ہے، خود فارسی میں عربی تصانیف کے تراجم کا سب سے بیش بہا ادب موجود ہے۔ فارسی زبان شاعری، انشاپردازی داستان سرائی اور تاریخ نگاری کے لیے زیادہ مستعمل دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ترجموں کا آغاز داستانوں اور تاریخی تص...نیف سے ہوتا ہے۔ امیر خسرو کی مشہور مثنوی ہشت بہشت کا ترجمہ ملک خشنود نے 1056ھ میں مکمل کیا۔ نظامی ک...ی ہفت پیکر کا ترجمہ بہرام و گل اندام کے نام سے 1081ھ میں تکمیل کو پہونچا۔ چھاپے خانے کی ایجاد نے تراجم کو کافی فروغ دیا۔ اخلاق ہندی (مفرح القلوب) فارسی سے پہلا مطبوعہ اردو ترجمہ ہے جو 1803ء میں ...رٹ ولیم کالج

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی سرپرستی میں شائع ہوا۔

عتیق احمد صدیقی کی تالیف صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات، و مطبوعات میں ان حسب ذیل کتابوں کے تراجم کا ذکر ملتا ہے۔

گلستان 1849ء

مفتاح الدقائق ارسطو طبی رسالہ (عربی سے) 1849ھ

اخلاقی جلالی (فارسی سے) 1850ھ

تحریر اقلیدس (عربی سے) 1801ء

میزان الطب (عربی سے) 1801ء

اخوان الصفا (عربی سے) 1801ء

مگر اس بیش بہا ذخیرہ پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ شاید تخلیق کے مقابلے میں اسے در خورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اور ترجمہ نگاری کے فن پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ہمارے یہاں معیار سازی کا کوئی مرکزی ادارہ بھی نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے یکساں آداب و اصول بھی نافذ نہیں کیے جا سکے۔ اسی لیے ترجموں میں یکسانیت اور اصطلاحات میں ہم آہنگی خاطر خواہ پیدا نہ ہو سکی۔ مختلف افراد و ادارے حسب خواہش اصول و ضوابط پر کاربند رہے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، عیسائی مشنریاں، علی گڑھ تحریک، امیر کبیر ثانی، نول کشور پریس، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے علاوہ بہت سے کم معروف اداروں نے اُردو زبان کو ترجمہ کے ذریعے نئی جہت سے روشناس کرایا۔ ان کی گراں مایہ خدمات سے اُردو کا دامن مختلف علوم سے بھر گیا۔ ان ترجموں پر تخلیق کا گمان ہونے لگا مگر اس کے باوجود ناقدینِ ادب نے کم توجہ دی۔

ترجموں کے مذہبی ادب پر اور بھی کم توجہ دی گئی۔ شاید معاش و مادے کے اس بحرانی دور میں ذہن انسانی اس طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُردو ادب کا سب سے گراں مایہ ذخیرہ مذہبی تراجم پر مشتمل ہے۔ یہ سلسلہ صوفیا کے احوال و کوائف سے متعلق سینکڑوں رسالوں کی اشاعت و تبلیغ سے شروع ہوا۔ جس نے اُردو زبان و ادب کی ترویج میں سب سے اہم رول ادا کیا۔ دکنی نظم و نثر کا ایک قابل قدر حصہ اسی حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ شمالی ہندوستان میں فضلی کی کربل کتھا سنگ میل کی حیثیت سے معروف ہے اس کے بعد شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے تراجم قرآن کو اُردو ادب کی تاریخ میں مہتم بالشان کارنامہ قرار دے سکتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ اسی زمانے میں عیسائی مشنریوں کے زیرِ اہتمام انجیل مقدس کے تراجم شائع ہوئے اور مناظرہ و مباحث کی پوری فضا میں ترجموں کی افادیت کا احساس پیدا ہوا۔

''قرآن اسلام کا اصل الاصول ہے۔ عقائد و افکار کی بنیاد بھی اسی پر ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے، عام ہندوستانی کے لیے اس کا سمجھنا اور سمجھانا بہت مشکل ہے۔ اور ہندوستان میں عربی کو وہ مقام نہیں ملا جو فارسی کو حاصل تھا یا بعد میں اُردو کو ملا۔ اس لیے اس اہم ترین صحیفۂ آسمانی کے مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کے لیے ہمیشہ ان تھک محنت کی جاتی رہی ہے۔ قرآن کے تراجم پر سب سے زیادہ اہتمام ملتا ہے اور ہر دور میں تراجم قرآن پر سنجیدگی سے کام ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں قرآن کے سینکڑوں تراجم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ماہر علوم قرآنی ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق چودھویں صدی کے ربع چہارم تک قرآن کا دنیا کی سو سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے بعض زبانوں میں ایک سے زیادہ تراجم موجود ہیں۔ دنیا کی ساری زبانوں کے مقابلے میں اُردو میں تراجم قرآن کی تعداد سب سے زیادہ ہے ان کی دریافت کے مطابق تقریباً نوے تراجم ملتے ہیں۔ اس کے بعد فارسی کے تراجم ہیں جن کی مجموعی تعداد باون ہے۔ (ملاحظہ ہو برگ گل (جریدہ) کراچی شمارہ 5 ص 356) راقم السطور کے خیال میں یہ تعداد بھی ناکافی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تراجم جزئی اور مکمل دیکھنے میں آتے ہیں ڈاکٹر محمد مسعود نے اپنے مقالے ''اردو تراجم و تفاسیر قرآنی'' میں مترجمین و مفسرین کی تعداد ایک سو پچپن بتائی ہے۔''

(ملاحظہ ہو۔ فکر و نظر ماہ دسمبر 1974ء ص 235)

مختلف گروہوں کے عقائد میں جزوی یا فروعی اختلاف کی وجہ سے بھی ترجمہ میں بوقلمونی پیدا ہوئی ہے۔ ان کثیر التعداد ترجموں میں چند زیادہ مقبول عام ہوئے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے علاوہ، سر سید احمد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی عبدالحق، شبیر احمد عثانی، مولانا اشرف علی تھانوی، فتح محمد جالندھری، ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالماجد دریا آبادی، احمد رضا خاں بریلوی، احمد سعید دہلوی، کے ایڈیشن اور تعداد اشاعت کی کثرت سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں بھی ایک اندازے کے مطابق فتح محمد جالندھری کا ترجمہ سب سے زیادہ شائع ہوا ہے اس کا اسلوب معیاری اُردو سے بہت قریب ہے سادے اور مختصر جملوں میں ایک خاص دل کشی محسوس کی جا سکتی ہے کہیں حاشیے سے بھی نفس مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ 1915ء میں پادری..... شاہ نے بھی ترجمہ شائع کیا تھا۔ عیسائی اہل قلم کا یہ دوسرا ترجمہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کے مخاطب اوّل عرب تھے بعد میں عجم بھی شامل ہوا۔ قرآن کی تفسیریں بھی پہلے عربی اور بعد میں فارسی میں لکھی گئیں۔ ان تفسیروں میں تلاش وتعبیر کے علاوہ ذہن وفکر کا اختلاف بھی دیکھنے میں آتا ہے ان چند گرانمایہ تفسیروں کے اُردو تراجم بھی ملتے ہیں، تفسیر ابن کثیر کو موضوعات کی جامعیت نکات آفرینی، تفسیر بالحدیث اور وضاحتی انداز نگارش کی وجہ سے ممتاز کہا جاتا ہے۔ اس تفسیر کے دو ترجمے ہوئے آزادی سے قبل تفسیر محمدی کے نام سے مولوی محمد جونا گڈھی نے اور آزادی کے بعد انظر شاہ کشمیری نے، مکتبہ فیض القرآن دیوبند نے ایک خاص اشاعتی پروگرام کے تحت تین حصّوں میں شائع کیا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک انتہائی خوشگوار اور حیرت انگیز اضافہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ کا سلسلہ وار ترجمہ ہے۔ آں حضرت رسالت مآب ﷺ کے چچازاد بھائی امام المفسرین حضرت عبداللہ ابن عباس کی روح پرور تفسیر ہے۔ یہ نادر تفسیر علامہ سیوطیؒ کے مرتبہ شان نزول کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔ اب تک آٹھ پاروں کی تفسیر ادارۂ درس قرآن دیوبند سے شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی مشہور تفسیر ہے اسے مولانا عبدالدائم الجلالی نے اُردو میں منتقل کیا ہے آٹھ جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد 4218 ہے مولانا رشید احمد گنگوہی کی بیس مختلف سورتوں کی تفسیر رشیدی اور مولانا قاسم نانوتوی کی چند مختلف سورتوں کی تفسیر المعوذتین اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سورہ کہف کی عربی تفسیر کا اُردو ترجمہ معرکۂ ایمان ومادیت کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی کی تفسیر حسینی فارسی زبان میں مشہور تفسیر ہے۔ تفسیر قادری کے نام سے اس کا ترجمہ نولکشور نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ 1966ء میں اس کا تیرہواں اڈیشن سامنے آیا ہے۔ مولوی نقیرالدین کے اس دلکش ترجمہ کے صفحات کی مجموعی تعداد لمبی تقطیع کے 1285 صفحات میں قرآن کی ایک دلچسپ منظوم تفسیر مولوی عبدالسلام کے قلم کا نتیجہ ہے جو تفسیر زاد الآخرت کے نام سے مشہور ہوئی تھی۔ 1761 صفحات ہیں اس منظوم تفسیر کی موجودگی سے قرآن پر کام کرنے والوں کی عرق ریزی اور ان بے پناہ ذوق وشوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قرآن کی بہت سی سورتوں کی تفسیریں علیحدہ کتابی سورتوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ قرآن کو ادب وانشا کے اسالیب میں ڈھالنے کی برابر کوشش رہی ہے۔ قرآن کے منظوم ترجمے اور تفسیریں بھی اسی کی کڑیاں ہیں اگرچہ علماء نے اسے مستحسن نظر سے نہیں دیکھا۔ اُردو کے مشہور ادیب سیماب اکبرآبادی نے جب ترجمے کو نظم کی صورت میں پیش کرنا چاہا تو علماء نے اسے تحریف قرار دے کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہی صورت حال دسویں صدی ہجری میں پیش آئی۔ جب شیخ بدرالدین محمد بن رضی الدین الغزی دمشقی نے عربی میں منظوم قرآن کی سب سے پہلی تفسیر لکھی۔ تاریخ التفسیر کے مصنف پروفیسر عبدالصمد صارم الازہری کے مطابق اس تفسیر میں ایک لاکھ اشعار کے فارسی میں شیخ ابو محمد عبدالوہاب بن محمد شافعی کی تفسیر الشیر ازی فارسی زبان میں پہلی منظوم تفسیر ہے اس میں بھی تقریباً ایک لاکھ اشعار ہیں۔ اُردو کی قدیم ترین منظوم تفسیر شیخ بہاء الدین باجن (ولادت 790ھ) کی ہے۔ جو مکمل نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بلکہ جز کی ہے۔اور قدیم ترین زبان یعنی اُردو گجری میں ہے۔ضمیر نیازی نے نوائے ادب بمبئی اکتوبر 1975ء کے شمارہ میں ''کلام پاک کے، اولین منظوم ترجمہ اور تفسیر'' کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے اس میں چودہ مکمل تراجم وتفاسیر کی فہرست اس طرح دی ہے۔

۱۔	تفسیر مرتضوی	غلام مرتضیٰ جنوں الہ آبادی	1194ھ
۲۔	تفسیر اویسی	شاہ غلام محی الدین قریشی سرہنوی	1209ھ
۳۔	زاد الآخرت	عبدالسلام بدایونی	1224ھ
۴۔	نظم البیان فی مطلب القرآن	شمس الدین شائق ایزدی	1316ھ
۵۔	نظم مقدس	آغا شاعر قزلباش	1901ء
۶۔	تفسیر چغتائی	مرزا ابراہیم بیگ چغتائی	1936ء
۷۔	وحی منظوم	سیماب اکبر آبادی	1940ء
۸۔	نظم المعانی	مطیع الرحمٰن خادم	1946ء
۹۔	تفسیرِ غضنفر	سید غضنفر علی سونی پتی قبل از	1947ء
۱۰۔	تفسیر محمد	ابراہیم پانی پتی قبل	1947ء
۱۱۔	تفسیرِ عرشی	آغا عبدالرحیم عرشی گوالیاری	1947ء
۱۲۔	سحر البیان	مجید الدین اثر زبیری	1951ء
۱۳۔	مفہوم القرآن	محمد ادریس کیف بھوپالی	1959ء
۱۴۔	آب رواں	سید شمیم اختر	1960ء

ان کے علاوہ بیسیوں جزئی ہیں۔جس زبان میں ایک کتاب کے تراجم کی یہ حیرت انگیز صورت ہو۔اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مختلف سورتوں آیتوں پنج سوروں دعاؤں اور وظیفوں کے مجموعے بہت ہی دیدہ زیب اڈیشن حنائی اور رنگین اہتمام کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔جو لاکھوں نہیں کروڑوں تک چھپے ہیں۔مکتبہ الحسنات رامپور نے چوبیسویں اور تیسویں پاروں کا آسان فہم ترجمہ کتابی سائز میں شائع کیا ہے۔اب تک 8 اڈیشن نکل چکے ہیں۔اسی طرح مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کے تیسویں پارہ کی تفسیر وترجمہ کو علیحدہ کتابی صورت میں خاص اشاعتی پروگرام کے تحت پہلے ہی اڈیشن کو بیس ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا ہے۔

قرآن کی مقبولیت اور حسن طلب کو دیکھ کر بعض ناشرین نے اس کی اشاعت پر خاص توجہ دی ہے۔تاج کمپنی لاہور کو اشاعت قرآن کے لیے سب سے بڑا فخر حاصل ہے۔ہندوستان میں ادارۂ اشاعت دینیات نظام الدین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دہلی نے اب تک دس سے زیادہ اشاعتی قسمیں پیش کی ہیں تجارتی نفع کی وجہ سے ایسے ناشرین نے بھی توجہ دی ہے جو اس کلام الٰہی کو الہامی صحیفہ تسلیم نہیں کرتے۔ اور آج وہی اشاعت قرآن میں سرفہرست ہیں۔

قرآن آخری صحیفۂ آسمانی ہے۔ کائنات عالم کے لیے رشد و ہدایت کا آخری ذریعہ بھی ہے اس لیے شش جہات کی اس دنیا میں اس کے پیغام کو گھر گھر پہونچانا اس کے پیروؤں کی ذمہ داری ہے۔ غالباً اسی لیے دنیا کی ہر زبان میں اس کے ترجمہ و تفسیر پر بہت ہی سنجیدگی سے توجہ دی جاتی رہی ہے۔ اور ہر دور میں ایک نئی تعبیر و تشریح کو ضروری سمجھا گیا۔ وراس ضرورت کے پیش نظر اسلاف نے اصول تفسیر کے ضابطے اور حدود مقرر کیے ہیں۔ علامہ سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن، شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر امام مالک اور امام ابن تیمیہ کی اصول تفسیر اسی سلسلے کی ناقابل فراموش کڑیاں ہیں۔

ترجمہ کے محرک عوامل میں بہت سے اسباب کارفرما ہوتے ہیں ان میں ایمان وعقیدہ یا فکر و نظر کی اشاعت کا رجحان سب سے زیادہ حاوی ہوتا ہے۔ انسانی کمزوری ہے کہ اپنے افکار سے عالم کو روشناس ہی نہیں کرانا چاہتا بلکہ منوانا بھی چاہتا ہے۔ یا اپنے حلقۂ خیال کو وسیع تر بنانے کی مہم جوئی میں سرگرداں اور خدمت دین یا خدمت خلق کے ذوق سے سرشار ہوتا ہے۔ اس مخصوص لٹریچر کی نشر و اشاعت میں پوری تن دہی سے مصروف کار دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا محرک جذبہ مال ومنافع بھی ہے۔ مادی ضرورتوں سے بھرپور اس دنیا میں سود و زیاں سے بے نیاز نہیں رہا جا سکتا۔ افراد اور اداروں کی نظر بازار اور عوام کی قوت خرید پر ہوتی ہے اصل کتاب کے موضوع اور مبادیات پر خاص توجہ دی جاتی ہے اسی لیے کتابوں کی اسمگلنگ بھی ہوتی ہے۔ اوران کی اشاعت پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ سنسنی خیز کتابیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں جن پر بعض وقت کئی ناشرین کی توجہ ہوتی ہے یہ کتابیں کثیر الاشاعت ہوتی ہیں ہمارے ادب میں اس طرح کے ادبی ذخیرے کی کمی نہیں ہے بہ قول انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب قرآن ہے اور اس کتاب سے متعلق ادبیات کا ایک گراں مایہ ذخیرہ موجود ہے اور اس ذخیرے نے ترجمہ میں خاصا اضافہ کیا ہے، اوران ترجموں نے علوم وآگہی میں سب سے زیادہ توسیع کے ساتھ انسانی ذکر وفکر کے رُخ ورفتار کو تیز تر کیا ہے۔

قرآن اسلام کا اصل الاصول ہے، احادیث اس کی توضیع وتشریح اور اور جزئیات وتفصیلات کا سب سے بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ دنیائے ادب میں یہ ایک لافانی ذخیرۂ ادب ہے جس کی ضخامت تخیل وتصور سے بھی بالاتر ہے۔ اور پھر اس عظیم سرمایہ سے پیدا ہونے والے علوم فنون سے متعلق دوسری تصانیف کا بھی ایک وافر مجموعہ موجود ہے۔ تراجم قرآن کے بعد علماء احادیث کی طرف متوجہ ہوئے اب تقریباً ہر مجموعہ حدیث کا اُردو ترجمہ موجود ہے اور عوام و خاص کی رسائی ہے۔ صحاح ستہ کے مجموعے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں اُردو میں منتقل ہوئے۔ بخاری شریف، تجرید بخاری، تلخیص بخاری، مشکوٰۃ شریف کامل، ترمذی شریف کامل، ترمذی شریف، شمائل ترمذی، سنن ابن ماجہ، صحیح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم شریف، موطا امام مالک، موطا امام محمد، مسند امام مسلم، کتاب الآثار کے علاوہ زاد سفر جلد اوّل، امام نوری شارح صحیح مسلم کی مشہور کتاب ریاض الصالحین کا عام فہم ترجمہ ہے یہ احادیث کا پہلا اُردو ترجمہ ہے۔ جسے ایک خاتون مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خواہر عزیزہ اُمت اللہ تسنیم نے انجام دیا ہے۔ حصن حصین وظائف اور دُعاؤں کا مشہور ترین مجموعہ اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ صحیفہ ہمام بن منبہ اور جامع بیان العلم وفضلہ اور کتابوں کا ترجمہ بھی ملتا ہے۔ خدمت حدیث میں مولانا بدر عالم میرٹھی کا کارنامہ قابل رشک ہے انہوں نے ترجمان السنہ (چار جلدیں) کے نام سے ایک نیا انتخاب ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ صفحات کی کل تعداد بڑی سائز کے 2178 ہے۔

اسی طرح کلام نبوت الدین الحنیف، معارف الحدیث (چار جلدیں) کے انتخاب صحاح ستہ، انتخاب الترغیب والترھیب، اُردو حدیث وغیرہ احادیث تراجم ہیں۔ اس عہد کے سب سے مشہور بزرگ حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث نے احادیث کے انتخاب وترجمہ کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جو تبلیغی نصاب کے نام سے مشہور عام ہے یہ براہِ راست کسی کتاب کا ترجمہ نہیں لیکن اس میں احادیث کے تراجم کا خاصا ذخیرہ موجود ہے حکایات، صحابہ، فضائلِ نماز، فضائل رمضان، فضائل ذکر، تبلیغ، فضائل قرآن، درود شریف، علیحدہ صورتوں میں بھی ملتے ہیں یہ امر قابل ذکر ہے۔ موجودہ دور میں قرآن کے بعد سب سے زیادہ شائع ہونے والی یہی کتاب ہے۔ صحیح تعداد کا علم نہیں کیوں کہ ناشرین اشاعت اور تعداد اشاعت نہیں بتاتا۔ اس میں اس کی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔

مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ مظاہر حق کے نام سے نولکشور نے چار جلدوں میں شائع کیا تھا۔ اب تتمہ جلد چہارم ملا کر پانچ جلدیں شائع ہیں، کل صفحات کی تعداد 2248 ہوتی ہے۔ آٹھوں نقش 1967ء میں شائع ہوا ہے، الجواہر والزواہر کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مشکوٰۃ الانوار کا ترجمہ تحفتہ الاخبار کے نام سے ہوا ہے۔ نماز و دُعا اور اوراد وظائف پر مشتمل قرآن واحادیث کے کئی ایک انتخاب ترجموں کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور کئی ہزار کی تعداد میں مولانا محمد عاشق الٰہی کی مسنون دُعائیں سب سے زیادہ مقبول ہوئی ہیں الجواہر والزواہر بھی انہیں کا کیا ہوا ترجمہ ہے اذکار مسنونہ مجموعہ اوراد بھی اُردو میں موجود ہے۔

حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی وجہ سے اسالیب فکر میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جمعہ کے خطبات کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر کارفرما تھے۔ کچھ لوگ صرف عربی متن کی قرأت پر اصرار کرتے تھے۔ دوسرا طبقہ اُردو ترجمہ کا بھی حامی تھا ہندوستان میں عام طور پر مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا علمی کے خطبے رائج ہیں۔ آخر الذکر دیہات وقصبات میں زیادہ معروف ہے۔ ان خطبوں کے تراجم بھی دستیاب ہیں۔

قرآن اور احادیث سے شب وروز کی زندگی اور سماج کے لیے ایک ضابطہ حیات مقرر کیا گیا ہے فرد اور جماعتی زندگی کے قوانین مرتب کیے گئے ہیں انہیں تشریعی قوانین پر عمل پیرا ہو کر دونوں عالم میں سرخرو ہوا جا سکتا ہے۔ اسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فقۂ اسلامی اور تاریخ فقہ اسلامی کہتے ہیں۔تاریخ فقہ اسلامی، زہرہ ریاض الابرار، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ عزیزیہ، فتاویٰ نذیریہ میں ہدایہ، غایۃ الاوطار کی ضخیم جلدیں اسی سلسلے کی یادگار زمانہ تراجم ہیں۔فقہی احکام ومسائل سے متعلق شیخ الحدیث عبدالجلیل سامرودی کی عربی تالیف زہرہ ریاض الابرار کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

اسلامی آثار و آثار میں قرآن واحادیث کے بعد تاریخ وسیر کو فوقیت حاصل ہے۔سیرت نگاروں کو اس موضوع سے جو والہانہ عقیدت رہی ہے اس کی نظیر قلب مومن کے سوا دوسری جگہ ناپید ہے۔اس گراں قدر اور بے مثل خدمت ادب سے پوری انسانیت زیربار ہے۔سیرت نگاروں نے اسے سیرت یا سوانح نگاری کے اعلیٰ ترین فن کی صورت ہی نہیں بخشی بلکہ اسے انسانی علم وادب کی معراج بنادیا۔سیرت رسول سیرت کائنات عالم ہے اس سیرت پاک کے ... یا نشان بھی یہی تھا کہ زندگی کے تمام عوامل وکوائف، جلوت وخلوت کے سارے پہلو، شب وروزہ کی پوری تفصیلات ذکر وفکر کے تمام اقوال واسالیب اس طرح محفوظ ہو جائیں کہ رہتی دنیا کے لیے رشد وہدایت کا سرچشمہ بنے رہیں۔ذہن اسلاف کی ندرت کا یہ اختراعی کارنامہ پوری انسانیت کے لیے باعث افتخار وامتیاز ہے۔اردو میں سیرت نبوی پر ایک گرانمایہ ذخیرہ موجود ہے۔لیکن مولانا شبلی کی سیرۃ النبی اور زمانہ حال میں نعیم صدیقی کی تصنیف محسن انسانیت کو سب سے زیادہ شہرت ملی ان کے انگریزی تراجم بھی ملتے ہیں kk آنحضرت ﷺ کی سیرت پر سیرت طیبہ مشہور تصنیف تسلیم کی جاتی ہے اسے خاص اشاعتی پروگرام کے تحت اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ کامل۔عبدالجلیل صدیقی اور غلام رسول مہر کا ترجمہ سیرت ابن ہشام، منہاج النبوۃ مدارج النبوۃ کا ترجمہ ہے۔اس کی ضخامت 1847 صفحات پر مشتمل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مکتوبات ومعاہدات، بلوغ المرام، منہاج النبوۃ بلاغ المبین۔سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین، النبی الامی، اسوۂ حسنہ اثبات النبوۃ وغیرہ کتابیں اسی سے متعلق تصانیف ہیں۔

سیرت ... انھوں نے پیغمبر اسلام کے بعد صحابہ کرام کی سیرت پر توجہ دی ہے صحابیات کا یہ حصہ کافی ضخیم متنوع اور دلکش تراجم کا بیش بہا سرمایہ ہے۔"حیات الصحابہ" دعوت وتبلیغ کی عالمگیر تحریک کی امیر ثانی مولانا محمد یوسف کاندھلوی مرحوم کی بے نظیر کتاب ہے۔اُردو میں تین جلدوں میں منتقل کیا گیا ہے۔صفحات کی کل تعداد 2273 ہے۔میری رائے میں اُردو ترجموں میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا یہی ترجمہ ہے۔اب تک چھ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ناشر کے بیان کے مطابق ہر ایڈیشن پانچ ہزار پر مشتمل ہوتا ہے، آفسٹ کی کتابت وطباعت کا اہتمام بھی موضوع کے شایانِ شان ہے۔عثمانؓ اور علیؓ زمانہ حال کے مشہور مصری عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی یادگار ... ابوبکر صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ اعظم محمد حسین ہیکل کی مشہور زمانہ تصانیف ہیں۔الموافق بین اہل البیت والصحابہ علامہ ... شریؒ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غزواتِ حیدری، لسان المتقین، جامع جعفری، رشید المومنین سراج السالکین بھی اسی سلسلے کے ترجم ہیں۔

زمانہ جدید میں چند عظیم المرتبت شخصیتوں نے اپنی فکر انگیز اور انقلاب آفریں تحریروں ۔۔ متاثر کیا ہے۔ ایسی برگزیدہ ہستیوں میں سید قطب شہید کا نام سرفہرست ہے ان کی تصانیف کے ترجمے کئی زبانوں میں دستیاب ہیں ان کی مشہور تصنیف ''اسلام میں عدل اجتماعی کا سادہ مگر دلکش ترجمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے کیا ہے۔ سلام کا روشن مستقبل'' اسلام ایک ضرورت، نقوش راہ، کیا مسلمان متعصب ہوتے ہیں وغیرہ ان کی دوسری تصانیف کا ترجمہ بھی ملتا ہے۔ فلپ حتیٰ کی مشہور کتاب ''عرب اور اسلام'' کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ سید مبارز الدین رفعت اس کے مترجم ہیں مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند کی معروف کتاب Impact of Islam on Indian Culture کے دو ترجمہ دیکھنے میں آتے ہیں ایک ہندوستان کا دوسرا پاکستان کا۔ محمد بن علی بن طباطبا کی الفخری کا ترجمہ تاریخ الفخری کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی حجت اللہ البالغہ ازالۃ الخفا، اسلامی نظام معیشت وغیرہ اب اردو میں بھی دستیاب ہیں۔ حافظ ابن قیم کی ''اعتدال کی راہ'' افکار مسنونہ کا ترجمہ مرکزی جماعت اسلامی ہند نے شائع کیا ہے۔

عالم اسلام کے مایۂ ناز مفکر سید ابوالحسن علی ندوی کی کئی تصانیف پہلے عربی میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد ان کا دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ان کی مشہور ترین تصنیف ہے جس کے اب تک آٹھ قانونی اڈیشن عربی میں شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں دو، فارسی میں ، ترکی میں ایک اور اردو میں سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مذہبی تصانیف کی ہمہ گیری اور مقبولیت کا راز ان اعداد و شمار میں دریافت کیا جاسکتا ہے۔ مولانا کی دوسری کتاب ارکان اربع ہے جس کے عربی میں چار، ترکی میں دو، اردو میں دو اور انگریزی میں ایک اڈیشن نکل چکا ہے۔ ''ہندوستانی مسلمان''۔

مولانا کے عربی خطبات کا اُردو ترجمہ ہے۔ دوسرا نقش میرے پیش نظر ہے مولانا کی ایک ادبی کتاب ''روائع اقبال'' عربی میں تھی نقوش اقبال کے نام کے اردو ترجمہ کے دو اڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ شمس تبریز خاں نے ترجمے کو تخلیق کا حریف بنا دیا ہے، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ مولانا محترم کے عربی خطبات کے تراجم کی کئی جلدیں ہو سکتی ہیں جو وقتاً فوقتاً ندائے ملت اور تعمیر حیات میں شائع ہوتے رہتے ہیں شمس تبریز خاں نے امام ابن تیمیہ کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم کا ترجمہ شائع کرایا ہے۔ جرمنی کے مشہور نو مسلم محمد اسد کی طوفان سے ساحل تک فکری سرگذشت کی داستان حیرت خیز ہے پروفیسر خورشید احمد فاروقی کے دو تراجم ''اسلامی دنیا'' دسویں صدی عیسوی میں'' اور تاریخ ردہ قابل ذکر ہیں۔ سید امیر علی کی مشہور انگریزی کتاب تاریخ اسلام کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ''دھرتی پر انسان'' شیخ عبدالقادر عودہ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

''قصیدہ بردہ'' شریف ایک ادبی شاہکار ہے۔ امام شرف الدین البوصیری الدلاصی کے عربی قصیدہ کو مولانا جامی نے فارسی میں منظوم کیا تھا۔ محمد فیاض الدین نظامی نے اردو منظوم ترجمے کو بہت ہی دیدہ زیب کتابت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وطباعت کے اہتمام سے آراستہ کیا ہے۔عربی اور فارسی متن بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ارمغانِ حجاز دانائے راز کا نذرانہ عقیدت ہے جسے بارگاہِ رسالت مآب میں گدائے بے نوا نے پیش کیا ہے اردو کے کہنہ مشق شاعر منور لکھنوی نے اسے نظم کی صورت دی ہے۔اقبال کی تمام فارسی اور انگریزی تصانیف کے تراجم بھی اُردو میں موجود ہیں۔ان کی شرحیں علیحٰدہ ہیں۔کبیر بانی کبیرداس کی 128 منتخب نظموں کا ترجمہ وتشریح ہے۔مثنوی مولانا روم اور سعدی کی گلستان بوستاں کے کئی تراجم دیکھنے میں آئے ہیں۔یہ اردو کی جامعیت اور ہر دل عزیزی کی مثالیں مثنوی معنوی کا ترجمہ پیراہن یوسفی کے نام سے دوجلدوں میں شائع ہوا تھا جس کے صفحات کی کل تعداد 1330 ہے۔

النظم الاسلامیہ، الاسلام والحضارہ العربیہ، تاریخ التشریع الاسلامی، الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند، طبقات الامم جیسی مستند اور بنیادی کتابوں کے تراجم پورے اہتمام سے شائع ہو چکے ہیں۔اوران کے سہارے اُردو خواں فکر ونظر کی بالیدگی اور علم وآ گہی کا عرفان حاصل کرسکتا ہے۔اور انکے اصل ماخذ تک رسائی ہوسکتی ہے۔

حکومت الٰہیہ علامہ حمیدالدین فراہی کی کتاب ملکوت اللہ کا ترجمہ ہے مذاق العارفین (احیائے علوم الدین) اور اکسیر ہدایت (کیمیائے سعادت) کا ترجمہ ہے۔اول الذکر کتاب کی ضخامت 1812 اور آخر الذکر کے صفحات کی تعداد 629 ہے۔کیمیائے سعادت کا ایک دوسرا بھی ترجمہ ہے جو گنجینۂ ہدایت کے نام سے معروف ہے اور اس میں 851 صفحات ہیں۔المرشد الدین احیائے علوم، دوسرا ترجمہ نہیں بلکہ تلخیص ہے اس کا تیسرا ترجمہ دورِ حاضر کی یادگار ہے۔اس کا نام اسلام کی اخلاقی تعلیم ہے۔

فکر ساز اور برگزیدہ ہستیوں کی تحریر وتقریر کو محفوظ کرنے کا محترم جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔انکے ملفوظات، مکاتیب اور خطبات کا ایک بیش قیمتی ذخیرۂ ادب کا گراں بہا حصہ بن چکا ہے اسی حصہ ادب کو بھی اُردو میں بڑی سرعت سے منتقل کیا گیا ہے مکاتب کی نوعیت، تاریخی اور تہذیبی نیز علمی ہی نہیں ہے بلکہ ادبی سماجی اور فکری بھی ہے۔اسی افادیت کے پیش نظران کے تراجم کی ضرورت محسوس کی گئی۔اس موضوع کے تراجم میں پروفیسر خورشید احمد فاروقی کے تراجم قابل ذکر ہیں۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط، حضرت عمر فاروقؓ کے سرکاری خطوط، اور حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ندوۃ المصنفین دہلی شائع کر چکا ہے۔مکتوبات امام ربانی، مکتوبات خواجہ معصوم سرہندی کو مولانا نسیم امروہوی نے شائع کرایا ہے۔ان کے سو مکاتیب جو ازواج مطہرات کی صفات عالیہ اور مناسب جلیلہ سے متعلق ہیں ان کا بھی ترجمہ علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات کو اُردو قالب دیا ہے۔بانی دیوبند مولانا قاسم نانوتوی کے مجموعۂ مکاتیب کا ترجمہ بھی حال ہی میں تشریح کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ان کے افادات محبت السلام کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔براہین قاسمیہ مولانا قاسم نانوتوی کے ارشادات کا اُردو ترجمہ ہے۔مرزا جان جاناں کے خطوط بھی ترجمہ کی صورت میں ملتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصوف دنیائے علم وعرفان اور فکرودانش کا دلچسپ موضوع رہا ہے آج کے دور ابتلا میں بھی ذہن انسانی اور سماجی شعور کو کسی نہ کسی حد تک متاثر کررہا ہے۔عربی وفارسی میں اس موضوع اوراس کی جزئیات سے متعلق ادب کا سرمایہ خاصا ضخیم ہے اس کی تاویل وتوجیہ، تذکرہ مطالعہ ومشاہدات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ان کلاسیکی کتابوں کو استفادۂ عام کے لیے اُردو صورت دی گئی ہے۔روضۃ الاصفیاء، تذکرۃ الاولیاء، روضۃ الاولیاء کشف المحجوب، خیرالمجالس، تاریخ تصوف اسلام کے اُردو تراجم ملتے ہیں ڈاکٹر تنویر علوی نے صحائف معرفت،اور صحیفۂ ابرار جیسی کم معروف مگر مفید تصانیف کے تراجم پیش کیے ہیں۔یہ علم کی بڑی خدمت ہےاور قابل ستائش بھی شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین''فتوح الغیب اور خطبات کے اُردو تراجم ملتے ہیں بحرالعلوم علامہ عبدالعلیم انصاری کی کتاب''وحدت الوجود'' اُردو میں دستیاب ہے اسمٰعیل شہید کی طبقات کا ترجمہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے مکمل کیا ہے بچن سنگھ طالب نے بابا فرید گنج شکر پر انگریزی میں ایک مختصر رسالہ لکھا تھا۔ابھی حال ہی میں اس کا اُردو ترجمہ منظر عام پر آیا ہے۔داراشکوہ کی مشہور تصنیف مجمع البحرین کے اُردو ترجمہ کا نام نورالعین ہے جو مخزن الانوار گنج الاسرار کا ترجمہ ہے۔

تصوف، تزکیہ نفس اور تطہیر باطن کا دوسرا نام ہے دھیان گیان اور مشق ومزاولت کا زور انہیں پر صرف کیا جاتا ہے۔اچھے اخلاق اور اقدار کی تربیت اس کا موضوع ہے۔یہ جذبہ فرد سے بیدار ہوکر سماج کی پنہائیوں میں گم ہوجاتا ہے، اخلاقی ادب مشرقی ادبیات، کا بہت ہی پسندیدہ موضوع رہا ہے۔یہ جذبہ اسے نہ تو سرتاپا مذہبی کہہ سکتے ہیں اور نہ غیر مذہبی، کیف وکم،موضوع اوراسلوب کے اعتبار سے یہ حصّہ ادب مذہب سے زیادہ قریب ہے۔

اخلاقی ادب کا خاطر خواہ حصّہ اُردو میں منتقل ہو چکا ہے۔اخلاق جلالی، اخلاق ناصری، اخلاق محسنی کے تراجم فورٹ ولیم کالج کے قیام سے شروع ہوجاتے ہیں۔اور آج یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ دنیا کے قابل قدر مذاہب اور دبستاں کے اخلاقی آداب وافکار سے اُردو کے ذریعہ اچھی طرح واقفیت بہم پہونچائی جاسکتی ہے۔

نفسیات واردات روحانی

تاریخ اخلاق یورپ جلد اول وجلد دوم

غزالی کا تصور اخلاق

فرض شناسی، ضبطِ نفس اور نفس پرستی، نظامِ حیات انسانی، علم الاخلاق، اخلاقیات، تاریخ اخلاقیات، علم الاخلاق، مکالماتِ برکلے اخلاق نقوماجس وغیرہ کتابیں اسی ذہنی رجحان اور شعوری احساس کا پتہ دیتی ہیں۔

اُردو صوت وآہنگ کی ادائیگی کے لیے مشہور ہے اور دنیا کی بیشتر آوازوں کے اظہار پر قدرت رکھتی ہے صوت وصدا کے اعتبار سے یہ ایک آفاقی زبان کی خصوصیات رکھتی ہیں۔انسانی فکر جذبے اور تخیل کے لطیف ترین احساسات کو بھی بخوبی پیش کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے یہ کئی مختلف تہذیبوں کے امتزاج کا خوب صورت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجموعہ ہے۔ یہ امتزاج اس کے خمیر، ساخت ترکیب اور ترویج کے ہر دور میں پایا جاتا۔ اس کی بنیاد اسی امتزاج پر قائم ہے۔

مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کی مختلف تہذیبی اکائیوں کا اتنا دلنشیں امتزاج دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ اسی لیے اُردو کو صرف ایک زبان یا وسیلۂ اظہار نہیں کہہ سکتے بلکہ اسے ایک مکمل تہذیب کہنا چاہیے۔ جس کے جلو میں مختلف ثقافتوں کی رُوح نے ایک نیا قالب اختیار کیا ہے۔ اُردو نے مشرق وسطیٰ کے افکار و عقائد کی نشر و اشاعت میں بھی سب سے بڑا رول ادا کیا ہے اور یہ فخر یہاں کی کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہے، اس امر کا بخوبی اندازہ ڈاکٹر محمد عزیز مرحوم کی تصنیف ''اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصّہ'' کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے اُردو نے ہندو، بدھ، سکھ، جین، آریہ سماج، برہمو سماج کی یکساں خدمت کی ہے۔ ہندوستان مذہبی اور نیم مذہبی ادب اور ان سے متعلق اساطیری ادب کا ضخیم حصّہ رکھتا ہے، جس کے صفحات کا شمار آسان نہیں ہے۔ وید، پران، مہابھارت، گیتا، رامائن اور پھر ان کی تفصیلات اور جزئیات پر مشتمل تصانیف کا کثیر لٹریچر قابل ذکر ہے ان میں گیتا کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے یہ ہندو عقائد کی اساس ہے۔ اور ہر دور میں اس کی ترجمہ و تشریح پر توجہ دی جاتی رہی ہے اُردو میں سب سے زیادہ ترجمہ اسی کتاب کا ملتا ہے یوں تو ایک عام اندازے کے مطابق رامائن کو مکمل اور نا تمام شامل کر کے تقریباً بیس ترجمے ہوتے ہیں لیکن گیتا کے تراجم کی تعداد اس سے زیادہ ہے، راقم السطور کی نظر سے گذرے ہوئے ترجموں کی حسب ذیل فہرست سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

گیان پرکاش	منشی کنھیا لال عرف، الکھ دھاری
گوہر معرفت	گوری ناتھ منظوم
گلدستۂ حقیقت	سیتل پرشاد احقر منظوم
سکھ ساگر	رائے مکھن لال
سٹیک سری مدبھاگوت گیتا	تین جلدوں میں سوامی مترسین
دیوی بھاگوت	پنڈت پیارے لال
وشنو بھاگوت	منشی رگھبیر دیال
گیتا مہاتم	منشی رام سہائے تمنا
شری مدبھگوت گیتا	موسوم بہ فلسفۂ الوہیت پنڈت جانکی ناتھ مدن
مخزن اسرار	پنڈت دینا ناتھ مدن منظوم
شری مدبھگوت گیتا	پنڈت جانکی ناتھ
بھگوت گیتا منظوم	منشی رام سہائے تمنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سری مد بھگوت گیتا منظوم	مترجم یسین جی
بھگوت گیتا معہ ترجمہ اُردو	بھگوان داس بھارگو
زیورِ ہند یا سری مد بھگوت گیتا	سید حبیب منظوم
نغمۂ رحمانی	گیتا نظم مد شرح، منشی سورج نرائن مہر
نغمۂ الوہیت	حسن الدین احمد
آہنگ سرمدی	الم مظفر نگری منظوم
نسیم عرفانی	منور لکھنوی منظوم
دل کی گیتا	خواجہ دل محمد منظوم
منظوم دل آویز	سردار سنگھ بھارگو
بھگوت گیتا	منشی دیوی پرشاد
بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی	محمد اجمل خاں
گیتا پروچن (ونو بھاوے کی تفسیر گیتا،	خواجہ ذکریا فیاضی

کلام ربانی شری مد بھگوت گیتا منظوم، یوگی راج نظر سوہانسوی

شری مد بھگوت گیتا رہسیہ اور شری مد بھگوت گیتا کے نام سے لوک مانیہ تلک نے دو کتابیں لکھی تھیں ان کا ترجمہ شانتی نرائن نے کیا ہے اس کے علاوہ بھی اور ترجمے ہوں گے جو ہنوز تحقیق طلب ہیں اس فہرست سے گیتا کے تراجم پر خصوصی توجہ کے اسباب سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف گیتا پر توجہ دی ہے وید پران اپنشد، منوسمرتی، درشن، یوگ، بھگتی، مہابھارت اور رامائن کے علاوہ دوسرے اخلاقی، مذہبی تصانیف کے قابل ذکر تراجم موجود ہیں مگر اتنی کثرت سے نہیں۔ گیتا کے علاوہ دوسری کتابوں کے تراجم میں ادبی اسلوب کاری کا فن تقریباً ناپید ہے یہ تراجم سیدھے سادے اور سپاٹ انداز لئے ہوئے ہیں، ان میں جاذبیت یا شعر و نغمہ کا فقدان ہے۔ اور مذہبی اصطلاحات کا کثرت استعمال ان کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ گیتا کے بعض تراجم میں ادبیت اور پرکشش اسلوب نگارش ملتا ہے ڈاکٹر محمد عزیز مرحوم نے لکھا ہے کہ گیتا کا سب سے اچھا ترجمہ پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی کا نغمۂ الوہیت ہے لیکن میرا خیال ہے کہ سب سے اچھا ترجمہ خواجہ دل محمد کا ہے۔

ان کے علاوہ چاروں ویدوں کے خلاصے کا ترجمے الکھ دھاری عرف منشی کنھیالال نے الکھ پرکاش کے نام سے کیا تھا جو 1861ء میں شائع ہوا تھا، منشی سورج نرائن مہر دہلوی نے اُپ نشد کا ترجمہ اور شرح دو جلدوں میں لکھی ہے۔ بابو پیارے لال نے ''مجموعہ اُپ نشد'' کے نام سے بارہ اُپ نشدوں کا ترجمہ اور شرح 1900ء میں شائع کی تھی۔ سوامی وویکانند کی کتاب ''بھگتی اور ویدانت'' کا ترجمہ شانتی نرائن نے کیا ہے۔ سوامی کنھیا داس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشہور تصنیف کا آسان ترجمہ اُردو بچار ساگر کے نام سے شائع ہوا تھا۔عملی ویدانت، یوگ شاستر، گیان یوگ بھگتی، بھگت مال وغیرہ تراجم اسی سلسلے کی مختلف النوع کڑیاں ہیں۔ڈاکٹر محمد عزیز مرحوم نے مہابھارت سری رام کرت مہابھارت، مہابھارت منظوم جو منشی طوطارام شایاں کا ترجمہ ہے۔دس ہزار اشعار پر مشتمل فیضی کے مہابھارت کا پہلا منظوم اُردو ترجمہ ہے۔1893ء میں پانچواں اڈیشن شائع ہوا یہ زبان وبیان کی دل کشی کی وجہ سے خوب مقبول ہوا آزادی کے بعد پنجابی پستک بھنڈار اور دیہاتی پستک بھنڈار دہلی نے ہندو مذہب کی بعض کلاسیکی کتابوں کے ترجمے شائع کیے ہیں، مگر ان کا معیار طباعت وکتابت بہت ہی افسوس ناک ہے، ترجمے بھی اچھے نہیں ہیں۔جیسے مہابھارت اور سمپورن مہابھارت اصول فلسفۂ ہندو وغیرہ۔

ہندوستان کی سرزمین مذہبی رہنماؤں اور مصلحتوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔انہیں کی سرپرستی یا زیرِ اثر اکثر و بیشتر اصلاحی تحریکیں وجود میں آتی رہیں۔انہوں نے اپنے مشن کو عوام تک پہونچانے کے لیے ہمیشہ اُردو کا سہارا لیا۔اُردو کا یہ ناقابل فراموش کارنامہ ہے وہ ہر خیال اور ہر مذہب کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ پیش پیش رہی ہے۔بدھ مذہب، جین مذہب، سکھ مذہب کے علاوہ کبیر پنتھی، بھگتی تحریک، برہموسماج، آریہ سماج، رادھا سوامی مت، دیوسماج، ویدسماج وغیرہ سے متعلق اُردو میں ترجمہ کا ذخیرہ موجود ہے۔

ان تحریکوں میں سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت آریہ سماج کو حاصل ہوئی اس کے چند اسباب ہیں اس کا سرمایۂ ادب بھی دوسری تحریکوں سے کہیں زیادہ ہے، اس تحریک نے اُردو زبان کو اپنے عقائد کی ترسیل کا وسیلہ قرار دیا۔بہت سی کتابیں اور رسالے جاری ہوئے۔طباعت کے طریقے بھی اُردو کے سہارے عوام تک پہونچائے گئے۔آریہ سماج کی سب سے مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش ہے جو تحریک کے بانی سوامی دیانند کی تصنیف ہے اس کتاب کے کئی اُردو ترجمے ملتے ہیں جیسے آتمارام رادھا کشن مہتہ، لالہ جیون داس، چموپتی وغیرہ۔اس بنیادی کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں کے تراجم بھی شائع ہوئے۔جیسے سورکہاشی مہرشی سوامی دیانند سرسوتی جی کا جیون چرتر، اپدیش منجری، پرشارتھ پرکاش، رگ ویدآدی بھاس بھومکا، یجروید سنسکار دیپکا، سندھیا منظوم، اصل ستیارتھ پرکاش وغیرہ اس تحریک سے متعلق کتابیں یا رسالے تراجم کی صورت میں کم ہیں اور طبع زاد زیادہ ہیں۔لیکن ترجموں کا انداز بدلا نہیں بلکہ عبارت میں وہی ثقالت اور گراں باری ہے۔جس کا اندازہ ان کتابوں کے ناموں سے ہوتا ہے ان تراجم کے مقابلے میں طبع زاد کتابوں کی عبارتیں زیادہ صاف اور رواں ہیں۔

جین مذہب سے متعلق بھی کتابیں لکھی گئیں مگر تراجم کا حصہ زیادہ نہیں۔شری اوشک سوتر اُردو، ویراگ پرکاش قابل ذکر ہیں۔بدھ مذہب سے متعلق کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔چونکہ یہ مذہب تبلیغی مشن سے محروم اور قدیم دور کی یادگار ہے ہماری سرزمین سے بھی دور ہونے کی وجہ سے اُردو سے اسے وہ قربت نہ رہی۔بھگوان بدھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دھرمانند کوسمبی کی مراٹھی کلاسیک کا ترجمہ پرکاش پنڈت نے کیا ہے، دھمپد مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات سے متعلق اہم ترین کتاب ہے۔ اسے گیتا جیسا مقام حاصل ہے منور لکھنوی نے اس کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ دھمپد کا ایک نثری ترجمہ رنگ محل دہلی سے بھی شائع ہوا ہے مگر مترجم کا نام درج نہیں۔ اس دور کے مشہور شاعر منور لکھنوی کو ترجمے کی ادبیات میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی کے بعد انہوں نے بہت سی اہم تصانیف کو اُردو میں منتقل کیا اور نظم کی صورت دی ان کے منظوم تراجم دوسرے مترجمین سے بہتر ہیں، گیتا شکنتلا اور ارمغان حجاز کے علاوہ آریہ ابھی نے سوامی دویکانند کی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ پرم بھگت جے دیو کی مشہور سنسکرت تصنیف کا ''گیت گوبند یا سرمدی نغمے کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ مالویکا گن منترے اور ساگر سنگیت یا بحرِ ترنم بھی انہیں کا ترجمہ ہے۔ موخر الذکر مشہور پیشوا۔ سی آرداس کی عشق و معرفت سے لبریز کتاب اروند گھوش نے اسے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ منور لکھنوی نے اسی انگریزی ترجمے کے سہارے اُردو کا لباس دیا ہے۔

اُردو شمالی ہندوستان میں بہ طور خاص مستعمل تھی۔ گنگا جمنا کے دوآبے کے ساتھ پورے شمال مغرب میں رائج تھی، اور اظہار و ابلاغ کے لیے سب سے زیادہ کارآمد اور ترقی یافتہ زبان تھی۔ مذہبی اعتبار سے یہی علاقہ مختلف عقائد کے مناظرے مباحثے کا میدان بھی تھا۔ عیسائی مشنریاں ہر عقیدے سے متصادم تھیں، بعد میں آریہ سماج برھمو سماج، قادیانی بہائی فرقوں کے درمیان بھی بحث و مباحثہ کا زور تھا، سکھ مذہب اسی علاقے میں وجود پروان چڑھا اُردو زبان نے اس مذہب کی ترویج و اشاعت میں سب سے زیادہ قابل ذکر خدمت انجام دی، سکھ مذہب سے متعلق اُردو میں وقیع سرمایہ موجود ہے۔

آمادی دار، پوتھی راہ راس، پوتھی سکھ منی صاحب، جپ جی صاحب سٹیک عطر روحانی (ترجمہ جپ جی) پوتھی پنج گرنتھی، پوتھی سکھ منی سٹیک، پوتی جب جی اسٹیک، سری جپ جی سٹیک، پوتھی شبد نادیں محل، پھول بہاری اُردو، جنم ساکھی بھائی والا والی کے علاوہ کچھ اور تراجم بھی قابل ذکر ہیں۔ جیسے گرونانک صاحب کا عارفانہ کلام ''جپ جی صاحب یا ذکر الٰہی گوپال سنگھ کی کتاب ''گرونانک دیو'' کا اُردو ترجمہ مخمور جالندھری نے کیا ہے۔ گرو گوبند سنگھ انگریزی کتاب کا بہت ہی دلکش سادہ اور رواں اُردو ترجمہ پروفیسر محمد حسن نے کیا ہے جو عنقریب منظر عام پر آنے والا ہے۔ گرو گوبند کے فارسی کلام ظفر نامہ کا بھی اُردو ترجمہ موجود ہے۔ شلوک بابا فرید شکر گنج کا ترجمہ اُردو کے مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ نے کیا ہے۔

انگریزی حکومت مغربی تہذیب و ثقافت کے ساتھ داخل ہوئی۔ علم و فن کے ساتھ فکر و نظر اور مذہب و عقیدہ بھی ساتھ ساتھ آئے لیکن اس حکمت عملی میں مذہب کی تبلیغ و توسیع کو اولیت حاصل تھی۔ مذہبی عقائد کے فروغ کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس سرپرستی کے نتیجے میں عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لیے سنہری مواقع ملے۔ عیسائی مشنریاں دین کی اشاعت میں سرگرم کار تھیں ضرورت اس بات کی تھی کہ عوام تک اپنے مشن کو پہنچانے کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوام کی زبان بھی استعمال کی جائے اس لیے اُردو زبان کا استعمال ناگزیر تھا۔ انجیل مقدس کے ترجموں سے اس کام کا آغاز ہوا۔ بعدازاں دوسری اہم ترین ضرورتوں کے ترجمے شائع کیے گئے۔ عیسائی مشنریوں کی تبلیغی دعوت کے لیے اُردو نے یہاں کی تمام زبانوں سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز خدمت کی۔ اسی لیے اُردو میں عیسائی مذہب سے متعلق لٹریچر کے بیش بہا ذخیرے کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ مناظرہ و مباحثہ نے اس لٹریچر میں بڑا اضافہ کیا۔ ہر شہر اور قریہ ان کی زد میں تھا اور پورا لٹریچر گھر گھر پہنچ رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد عزیر نے 118 کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں ترجموں کی تعداد 19 ہے۔ مسیحیت حقائق کی روشنی میں' عربی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے۔ سیرت مسیح پر ہورلیس بشنل' کی تصنیف' کیریکٹر آف جیسس' کا اُردو ترجمہ "محبوب خدا عرف سیرت کامل' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

دوسرے مذاہب کی بہ نسبت عیسائیت کے مبلغین اور متبعین نے اُردو کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور اسے ذریعہ دعوت و ارشاد بنایا یہی وجہ ہے کہ اُردو میں عیسائیت سے متعلق سب سے زیادہ ذخیرۂ ادب موجود ہے اور ان تراجم کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے۔ اب تک کی دریافت کے مطابق پہلا ترجمہ 1745ء کا ہے۔ جو کتاب پیدائش کے پہلے چار ابواب پر مشتمل ہے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عیسائی عقیدے کے متعلق تراجم میں ادبی رنگ و آہنگ موجودہ ان تحریروں میں صاف وررواں عبارت ملتی ہے۔ جو ہندو عقائد سے متعلق تراجم کے برعکس ہے یہاں اصطلاحات کی گراں باری اور عبارت کے بوجھل پن کا بہت کم احساس ہوتا ہے، عیسائیت سے متعلق ابتدائی تراجم کی ایک فہرست گریرسن نے Linguistic Survey of India-vol.IX........ دی ہے، برصغیر کے مختلف جغرافیائی علاقوں پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شمال مغرب کا علاقہ مختلف مذہبی واصلاحی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو کا بھی یہی علاقہ تھا اس لیے اس خطے میں مذہبی لٹریچر کی نشر و اشاعت کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ اسلام کے علاوہ عیسائی عقائد سے متعلق تراجم کا کثیر ذخیرہ لاہور سے شائع ہوا ہے توریت کا ایک اُردو ترجمہ نولکشور نے بھی شائع کیا تھا جو نوسو پچاس صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔

ان تراجم کی حیثیت مذہبی ہے ادبی نہیں۔ یعنی عقائد وافکار سے ہے اسلوب وانشا سے نہیں۔ لیکن ادب کے لیے موضوع کی تخصیص نہیں۔ ادب کا رشتہ اسلوب سے متعین ہوتا ہے آج بھی ادبی میراث کا بہترین حصہ مذہبی شہ پاروں پر ہی مشتمل ہے۔ یہ ذخیرۂ تراجم ادبی اسلوب کی دلکشی کا ایک توانا احساس دلاتا ہے ہم انہیں کامیاب تراجم کے ذیل میں پیش کر سکتے ہیں۔ ان تراجم میں اصطلاحات سازی کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں۔ جتنا دوسرے علوم جدیدہ میں ہاں اصطلاحات سازی سے زیادہ نازک مرحلہ درپیش ہوتا ہے جس کی معمولی کوتاہی یا لغزش سے ایمان کی سرحدیں کفر سے اور خیر کی شر سے ملنے لگتی ہیں۔ اسی لیے ان تراجم میں مترجمین نے کمال احتیاط کا ثبوت دیا ہے۔ ایسے مضموں پر اصل الفاظ ہی نقل کیے گئے ہیں اور حسب ضرورت محکمات ومتشابہات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے جس سے نفس مضمون کی وضاحت یا ترسیل میں کمی محسوس نہیں ہوتی اور نہ سیاق وسباق کا ربط ہی ٹوٹتا ہے۔ قاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مترجم کے بجائے مصنف کے ذہن سے قربت محسوس کرتا ہے یہ اصطلاحات چوں کہ تہذیبی میراث اور روزمرہ زندگی میں شامل ہو چکی ہیں اس لیے اجنبی نہیں لگتیں۔

ان ترجموں کا محرک جذبہ اپنے نظریہ، مشن، عقائد کی ترویج و اشاعت، خدمت خلق، ہم خیال بنانے کی سعی اور علم کی توسیع ہے بیشتر تراجم انفرادی کوششوں کا نتیجہ میں چند اداروں کی سرپرستی سے بھی تراجم کا ذخیرہ وجود میں آیا ہے۔ یہ افراد اور ادارے مالی مشکلات سے ہمیشہ دوچار رہتے ہیں، سرمایہ کی کمی سے کتابت وطباعت نیز جلد سازی کا معیار بہت ہی پست ہے۔ جب کہ بعض کتابوں کی قیمتیں کہیں زیادہ ہیں۔ یہی حال ادبی و سائنسی تراجم کا بھی ہے۔ معیشت کی تنگی اور ضروریات زندگی کی گراں باری کی وجہ سے عام انسان قوت خرید سے محروم ہے، پھر بھی ادبی کتابوں کے مقابلے میں مذہبی تصانیف کی مقبولیت کہیں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو میں بچوں کے ادب کے تراجم

ڈاکٹر اطہر پرویز

جب کسی نئی زبان کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس میں ادبی تخلیقات کی جا سکیں تو تخلیقی ادب سے زیادہ اس امر کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ دوسری زبانوں کی اہم تصانیف کو اس زبان میں منتقل کیا جائے۔ ترجمے کے کام کو اردو میں نہ جانے کیوں حقیر سمجھا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ملکوں میں علم، ادب اور دانشوری کو سب سے زیادہ فروغ تراجم کی بنا پر ہی ہوا۔ اس لیے کہ یہ انسانی تہذیب کی اساس ہیں۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، شیکسپیئر، طالسطائی وغیرہ کسی ایک ملک سے ہی متعلق نہیں۔ دنیا کے ہر ملک کے بسنے والوں کا ان پر حق ہے۔ ترجمہ کر کے ہی وہ دوسری زبانوں کے خزانوں کو کھنگالتے اور ان میں سے اپنے لیے جواہر چنتے ہیں۔ افکار و اقدار کے بیش بہا خزانے حاصل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ

> ''ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال خیال کا سادہ عمل ہوتے ہوئے بھی ایک پیچیدہ عمل ہے یہ عمل خالص .... اور کسی قدر تخلیقی نوعیت کا ہے، ترجمہ کرتے وقت مترجم ابلاغ اور ترسیل کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ اسلیے ترجمے کے عمل کے لیے تحقیقی ریاضت، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ اس مثلث کا ہر زاویہ اور ہر خط اپنی جگہ موزوں اور متوازن ہونا بھی ضروری ہے۔''

کسی زبان میں تخلیقی ادب کی اہمیت مسلّم ہے۔ لیکن دوسرے اور تیسرے درجے کی تصانیف کے مقابلے میں اگر ہم کسی زبان کے اول درجے کی تصانیف کو اپنی زبان میں منتقل کر لیں اور اس سے استفادہ کریں تو کیا یہ ہمارے لیے قابل قدر اور قابل فخر نہ ہوگا۔ دانشوری اسی طرح نشو و نما پاتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپی زبانوں کے ادب نے غیر معمولی طور پر فروغ حاصل کیا اسلیے ہر ایک کی نظر مغربی ادبیات پر پڑی۔ ہم نے یہ استفادہ انگریزی زبان کے توسط سے کیا۔ اس لیے کہ انگریزی زبان میں یورپ کی مختلف زبانوں کی اہم تصانیف منتقل ہو چکی تھیں اور ہم ان کا بالواسطہ مطالعہ کر سکتے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے اردو میں یہ کام شروع ہو گیا تھا۔ پھر دارالترجمہ حیدر آباد نے اس کام کو بڑے پیمانے پر کیا۔ بچوں کے ادب پر کبھی بھی توجہ نہیں دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں بچوں کا ادب وقعت حاصل نہ کر سکا۔ جن لوگوں نے اس کی طرف توجہ دی ان کا انداز بھی بالآخر معذرت کا سا ہو گیا۔ اور وقعت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بڑوں کے لیے ادب کی تخلیق شروع کر دی۔ جب تخلیقی ادب کا یہ حال ہو تو پھر ترجمے کی طرف کون دھیان دیتا۔ ذاکر صاحب کی کوششوں سے جامعہ نے اس کام کو مشنری جذبے کے ساتھ شروع کرنا چاہا لیکن پھر تجارتی مصلحتیں وہاں بھی آڑے آ گئیں یہ ضرور ہے کہ درمیان کا اکا دکا کتابیں چھپتی رہیں جن کا خاطر خواہ اثر نہ پڑ سکا۔ اب ترقی اُردو بورڈ سے کچھ امیدیں بندھی ہیں، دیکھئے اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔

ہم بڑوں کے ادب کی طرف جتنی توجہ دے رہے ہیں اگر اس کا ایک فی صد حصہ بھی بچوں کے ادب کی طرف منتقل کر دیں تو بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بڑوں کے ادب کے تراجم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی وقتی افادیت ضرور شبہ کی نظر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ آج جو لوگ ڈارون، مارکس، ہیگل اور آئن سٹائن وغیرہ کی اصل تصانیف کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کو انگریزی ہی میں پڑھنا پسند کریں گے اس لیے ان کتابوں کا ترجمہ نہ تو فوری افادیت رکھتا ہے اور نہ کسی فوری ضرورت کو پورا کرتا ہے، یہ تو اس لیے ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی کتابیں اُردو زبان میں بھی مل سکیں اور ہماری زبان کے خزانے میں وسعت ہو۔ لیکن بچوں کے لیے دوسری زبانوں کی کتابیں مادری زبان میں اس لیے ضروری ہیں کہ عام طور پر بچے صرف اپنی زبان کے ذریعے ان کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبیات عالم کی وہ کتابیں جنہیں بچے سمجھ سکتے۔ اور ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یا ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، وہ زیادہ تر اُردو میں بچوں کے لیے منتقل کر لی جائیں۔

اس وقت یہ بات عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کے لیے معلومات کی کتابیں بہت کم ہیں۔ اب ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایسی کتابیں براہ راست اُردو میں لکھوائی جائیں، لیکن یہ بات اس لیے مشکل ہے کہ جو لوگ علوم سے واقف ہیں یہ زبان لکھنے کے آداب سے واقف نہیں۔ مثلاً اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کے لیے ایک کتاب ایٹمی توانائی پر لکھی جائے تو ضروری ہے کہ اس کا لکھنے والا فزکس کا اچھا طالب علم ہو۔ لیکن اس کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ عام طور پر زبان وادب سے ناآشنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ کام اردو زبان وادب کے طالب علم سے لیا جائے جو بچوں کے لیے صاف ستھری زبان لکھ سکتا ہو۔ اور فزکس سے بھی آشنا ہو تو اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔

عام فہم انداز میں کسی مسئلے کے اور خاص طور پر سائنسی مسئلے کو مبادیات کو بیان کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک طرف مترجم اس سائنسی مسئلے پر عبور رکھتا ہو اور دوسری جانب وہ اظہار بیان پر قدرت رکھتا ہو یہاں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کتابیں طالب علموں کی درسی ضروریات کے پیش نظر لکھی گئی ہیں تو جہاں نفس مضمون پر دھیان دیں وہاں اس کا بھی خیال رکھیں کہ جن طالب علموں کے لیے وہ کتابیں لکھی گئی ہیں وہ ان کی عمر اور ان کی ذہنی صلاحیت کے مطابق ہے یا نہیں۔

اس لیے بہتر یہی ہے کہ دوسری زبانوں میں بچوں کے لیے ایسی کتابوں کا جو ذخیرہ ہے اسے کھنگالا جائے۔ یہ کتابیں بڑی محنت اور بڑا کثیر سرمایہ خرچ کر کے تیار کی گئی ہیں۔ ہم ان کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ معلومات کی کتابوں کے موضوعات عالمگیر اہمیت رکھتے ہیں اس لیے ان موضوعات کا مقامی ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ روس، انگلستان امریکہ اور مشرقی یورپ کے ممالک میں بچوں کے لیے سائنسی معلومات کی کتابیں سیریز کی شکل میں بڑے پیمانے پر رنگین تصویروں کے ساتھ چھاپی گئی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو یہ کتابیں اردو میں بھی ان تصاویر کے ساتھ شائع کی جاسکتی ہیں اور ان کے ناشرین بڑی خوشی کے ساتھ اجازت دے سکتے ہیں ان کتابوں کا ترجمہ کس طرح کیا جائے اس سلسلے میں میری معروضات مندرجہ ذیل ہیں:

سائنسی موضوعات کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ سائنس کے مخصوص الفاظ کا اردو میں ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ اس کے بجائے ان کو جوں کا توں اردو میں لے لیا جائے۔ اردو زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی تو ہے کہ یہ دوسری زبان کے الفاظ کو بڑی آسانی سے جذب کر لیتی ہے اور پھر جب وہ استعمال ہونے لگتے ہیں تو ان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ دراصل مشکل تو یہ ہے کہ زبان اور لغت کے ماہرین اس کام میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح ان الفاظ کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے۔ اگر یہ الفاظ اُردو میں لے لیے جائیں تو اس سے زبان کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ زبان تو سمجھنے اور سمجھانے والے کے درمیان پل کا کام دیتی ہے۔ اس کو جتنا عام فہم بنایا جاسکتا ہے بنانا چاہیے یہ ضروری نہیں کہ اٹیم، سیل، پینسلین انجکشن، مالیکیول، ایکسرے، ہائڈروجن، آکسیجن، پٹرول میمل وغیرہ کا اردو میں معرب اور مفرس طریقے سے ترجمہ کریں۔ یہ ترجمہ بچے اور لکھنے والے کے درمیان ایک دیوار بن جائے گا۔ مجھے ہندی کے ایک بڑے پبلشر نے بتایا کہ ہندی میں بچوں کے ادیب اسی زبان کی مشکل میں مبتلا ہیں کہ وہ سنسکرت کی رائج ترکیبوں سے بنائے ہوئے الفاظ کو انگریزی کے رائج الفاظ کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان دشوار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب ہم ان سے آسان زبان لکھنے کے لیے کہتے ہیں تو وہ انگریزی اصطلاحوں کو برقرار رکھتے ہیں اور اردو میں لکھنے لگتے ہیں۔ ان کو فکر لاحق ہوتی ہے کہ بچوں کے لیے اگر آسان ہندی لکھی جائے تو اردو ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ ہندی کے بچوں کے ادیبوں کو پریشان کرتا ہے دراصل وجہ یہ ہے کہ بچوں کے لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم لکھتے وقت اپنے ذہن میں بچوں کا تصور کر کے لکھیں۔ اگر ہم اس کے بجائے اپنے مخصوص طرز فکر اور ذاتی تعصب کو فروغ دینے کے لیے لکھیں گے تو یہ ممکن ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمارے خیالات اور انداز کی تبلیغ ہو لیکن یہ ادب صحیح معنوں میں بچوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے گا۔ اور یہ کتابیں اسکولوں کی لائبریریوں کی زینت بنی رہیں گی۔ اسلیے اگر یہ طریقہ کہیں اردو میں چل پڑا تو نہ صرف بچوں کے ادب کو نقصان پہونچے گا بلکہ زبان کی ترقی کے راستے بھی مسدود ہو جائیں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جس موضوع کی کتاب کا ترجمہ کرے اس سے خود بھی اچھی طرف واقف ہو جائے اور جن باتوں کا ان میں ذکر کیا گیا ہے ان کو خود بھی اچھی طرح سمجھ لے۔ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا کہ ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے مترجم خود اس کا ماہر ہو بلکہ یہ مہارت ترجمے کے حق میں مُضر بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بچہ بن کر اس موضوع کو خود سمجھنے کی کوشش کرے اور جب خوب اچھی طرح سمجھ لے تو اس کام کو اپنے ذمے لے اور یہ دیکھے کہ وہ جن خیالات کا ترجمہ کر رہا ہے ان کو خود بھی سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ بچوں کے ادب کے ترجمے کے لیے اس مخصوص علم کا ماہر ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا یہ ضروری ہے کہ وہ بچوں کا ادیب ہو۔ اگر وہ محض ماہر ہوگا۔ اور بچوں کی زبان لکھنے پر قادر نہ ہوگا تو اس کی ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ میں ان باتوں کو اپنے تجربے کی بنا پر زیادہ زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ میں نے چند کتابیں بڑی کامیابی کے ساتھ اردو میں منتقل کی ہیں، جو بچوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ ہم چاہے بچوں کو بہت زیادہ معلومات نہ دیں لیکن ان کے لیے جتنی بھی معلومات فراہم کریں وہ ان تک بہت اچھی طرح پہونچائیں۔ احتیاط کے طور پر ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ایسے ترجموں کو نظر ثانی کے لیے کسی ماہر کے پاس بھیج دیں تا کہ اگر کوئی واقعاتی غلطی ہو جائے تو اس کی تصحیح بر وقت ہو جائے۔

تیسری اہم بات جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے وہ یہ ہے کہ بچوں کی معلوماتی کتابوں کا ترجمہ لفظ بہ لفظ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ ترجمہ کرنے والے کو اس کا حق بھی دیا جائے کہ وہ آزاد ترجمہ کرے۔ یہ بات ضروری ہے کہ پڑھنے والے بچے کو اس کا احساس نہ ہونا چاہیے کہ وہ کسی دوسری زبان کی کتاب پڑھ رہا ہے بچے کو خیال سے اس طرح مانوس کیا جائے کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی اجنبیت کا احساس نہ ہو بچوں کے لیے ہر لکھنے والا جانتا ہے کہ وہ جس عمر کے بچے کے لیے لکھ رہا ہے اس کا ذخیرہ الفاظ کیا ہے۔

بچوں کی کتابوں کے مترجم کی ذمہ داریاں عام طور بڑوں کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ مترجم کو اس کا شدید طور پر احساس ہونا چاہیے۔ حسین حسان صاحب نے روسی ادیب الین کی کتاب۔ One Million Whys کا ترجمہ اردو میں بڑی کامیابی سے کیا ہے اور ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ کتاب اصل میں کسی دوسری زبان میں لکھی گئی ہے اور یہی اس کتاب کی مقبولیت کا راز ہے۔

مذکورہ بالا باتیں میں نے سائنس کی کتابوں کے بارے میں لکھی ہیں۔ عام ادبی کتابوں کے سلسلے میں یہ رویہ رکھنا چاہیے کہ اگر ہم کسی کتاب کو بچوں کے لیے منتقل کر رہے ہیں تو وہ بچوں کے لیے ہی ہو۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ جن خیالات کو ہم بچوں کے لیے پیش کر رہے انہیں بچے کس حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ جذبات اور احساسات اس کام میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں۔ ترجمہ تو ہم بڑوں کے لیے کر ہی سکتے ہیں لیکن جب ہم اپنے بچوں کو ان سے روشناس کرانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس کی پوری اسپرٹ اپنے اوپر طاری کر لیں۔ ہم خود یہ سمجھ لیں کہ یہ کتاب ہماری ہے ہم اس کے مصنف ہیں اور اسے ہم بچوں کے لیے از سر نو لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بجا طور پر ترجمے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے۔ ''ترجے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم ہیں۔ ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے۔ اسلیے امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔'' یہ کام جہاں دوسری زبانوں کی کتابوں کے سلسلے میں کریں گے وہاں یہ عمل ہمیں خود اپنی ادبیات کے سلسلے میں بھی کرنا چاہیے۔ ہمیں عالمی ادب میں بچوں کی معیاری کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا چاہیے۔ بچوں کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں میں ادبی کتابیں لکھی گئی ہیں مثال کے طور پر ہنس کرسچن انڈرس کی کہانیاں ادبیات عالم میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اس میں تخیل کی فراوانی ہے۔ یہ کہانیاں اور اسی قبیل کی کہانیاں ہمارے بچوں کے لیے بھی مفید ہو سکتی ہیں۔

بچوں کے لیے تخیلی ادب کی اہمیت اس لیے غیر معمولی ہے کہ اس کے توسط سے بچوں کی ذہنی نشو و نما ہوتی ہے۔ جب بچوں کا ذہن اپنے ماحول سے ذرا مختلف ماحول دیکھتا ہے تو وہ نہ صرف ایک نیا پن محسوس کرتا ہے بلکہ اس کے تخیل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ ''گلیور کا سفرنامہ'' جہاں ایک طرف ایک بڑی طنزیہ کتاب ہے۔ وہاں اس میں بچوں کے لیے تخیل کی فراوانی ہے۔ وہ چاہے بونوں کا دیس ہو، جہاں چھنگلیا کے برابر کے انسان ملتے ہیں جنہیں گلیلیور بآسانی جیب میں رکھ لیتا ہے۔ اور خود ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیوزاد سمجھتا ہے یا پھر وہ دیوزاد انسانوں کا دیس ہو جہاں وہ دیو پانچ چھ فٹ کے گلیلیور کو اس طرح پنجروں میں رکھتے ہیں جیسے ہم چڑیاں پالتے ہیں اور اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف ہمارے تخلیل کی آبیاری ہوتی ہے بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں بڑا یا چھوٹا ہمیشہ نسبتی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈیفو کا رابنسن کروسو ہمارے لیے نہ صرف ایک دلچسپ کہانی ہے بلکہ اس کے مطالعے سے انسان دوستی کے جذبے میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ ذوالفقار بخاری کا شعر

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ
دوست ہو کہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

دنیا کے ادب میں بچوں کے لیے دیوی، پریوں کی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں اور تاریخی و تہذیبی قصے بھی لوک کتھائیں بھی ہیں جن کی مدد سے انسان تہذیب نے غوں غاں کرنا سیکھا تھا۔ ان کہانیوں کی تعداد بہت زیادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ یہ کہانیاں تقریباً دنیا کے ہر ملک میں ملتی ہیں۔ ان کے مصنفوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اس لیے یہ جب جب بھی دوبارہ کہی گئی ہیں تو ان میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو گئی ہے بعض اوقات یہ تبدیلیاں کسی جذبے کے تحت ہوئی ہیں۔

لوک کہانیوں کی بڑائی ان کی سادگی میں چھپی ہوتی ہے۔ ان میں اختصار بھی ہوتا ہے اور جامعیت بھی ان میں حق و صداقت کا بول بالا ہوتا ہے۔ یہاں جزئیات کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا بلکہ انہیں پڑھنے والے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ خود خانہ پُری کرے۔ والٹر ڈیلا میئر نے صحیح لکھا ہے کہ

> ''ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ کہانی کے کردار' واقعات اور مناظر چاہے کتنے ہی اصلی اور حقیقی معلوم ہوں وہ اصل میں خیالی معلوم ہوتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ کہا جائے ہم تھوڑی دیر کے لیے اسے مان لیں اور اس کا اثر بھی قبول کر لیں۔ یہ دونوں باتیں اس پر مبنی ہیں کہ ہماری تخیل کی قوت کتنی ہے۔ یہ کہنا عقلمندی کی بات نہیں کہ فلاں فلاں بات نہیں ہو سکتی۔ کہانی میں تو یہ سب چیزیں تصور کی جاتی ہیں۔ اور اسی لحاظ سے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔''

انسانی تہذیب کے لیے یہ قابل فخر بات ہے کہ ادبیات عالم میں لوک کہانیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ یہ وہ کہانیاں ہیں جنھوں نے انسانی ذہن کو نہ صرف کچھ سوچنے بلکہ عمل کرنے پر بھی اکسایا ہے۔ ننھے منے تخیل کو پہلے آسمان پر اڑتے ہوئے قالین اور کل کے گھوڑے نظر آئے اور پھر اس کے بعد اس کے تعمیری ذہن نے ہوائی جہاز کا خاکہ مرتب کیا۔ پہلے اس نے سرمہ لگا کر زمین کے چھپے ہوئے خزانوں کو تخیل کی آنکھوں اور فریب کی نظر سے دیکھا لیکن پھر جب اس نے زمین کے سینے کو چیر کر دیکھا تو اس نے...... سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ اور بہتے ہوئے تیل کے چشمے نظر آئے۔ ہم اگر عالمی ادب سے اپنے بچوں کے لیے ایسی کہانیوں کو اردو میں منتقل کریں تو ہمارے بچوں کو یقیناً ان میں تخلیقی ادب کا لطف آئے گا۔

لوک کہانیوں ہی کے ذیل میں پریوں اور دیووں کی کہانی بھی آتی ہیں۔ ان قصوں کی فضا عام طور پر مقامی نہیں ہوتی کیونکہ لکھنے والے کا ذہن زمین پر قدم نہیں جما تا لیکن جہاں کہیں مقامی رنگ پایا جاتا ہے تو، ہاں ترجمہ کرنے والے کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان فنی خصوصیات کو برقرار رکھے اور اس ارضیت کو ختم نہ ہونے دے۔ ایڈی مور کے بقول

> ''پریوں کے قصے میں تنقید نگاروں کو کہانی کی بناوٹ ڈرامائی..... کردار نگاری، مضمون کی سادگی، اداکاری پر زور مکالمہ اور دوسری نمایاں خصوصیات کو تلاش کرنا چاہیے بچوں کے ادب کے ماہرین کو یہ بات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاننا چاہیے کہ یہ کہانیاں جو زمانہ دراز سے بچوں کے ادب کا ذخیرہ ہیں
ان کی مقبولیت کی کیا وجہ ہے۔؟"

البتہ ان قدیم کہانیوں کا ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اگر ہم اس کو آج کی تکنیک اور آج کی بول چال کی زبان میں منتقل کر دیں تو کیا اس سے نفس قصہ پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا۔ مشیر فاطمہ نے اپنی کتاب "بچوں کے ادب کی خصوصیات" میں بڑی بات کہی ہے کہ "ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ پریوں کے قصے ہماری ادبی میراث ہیں جن کا اپنا ایک طرز اور تکنیک ہے کہانی کا طرز جدید یا روایتی جو بھی ہو اس کا مقصد لوک کہانیوں کی خوبیوں کو بچوں تک پہنچانا ہونا چاہیے۔ جس طرح برادرز گرم برادرز نے ہم تک پہونچانے کی کوشش کی ہے وہ کہانیاں جن میں زندگی، خوبصورتی اور تخیل تھا۔"

پریوں کے قصے جو بھی دنیا کے مختلف ممالک میں لکھے گئے ہیں ان میں ایک خاص مماثلت ہوتی ہے۔ ان میں ایک حکایتی طرز بیان ہوتا ہے۔

ساری دنیا کے بچوں کے ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں غیر معمولی مماثلت ملتی ہے گویا انسان جب بچوں کی طرح سوچتا ہے تو وہ ایران و تاروزنگ کی دیواروں کو توڑتا ہوا پھلانگتا نکل جاتا ہے اور دنیا کے تمام بچے ایک برادری میں نظر آتے ہیں اور ان میں نسلی اور قومی امتیاز کا مصنوعی پن ختم ہو جاتا ہے۔ آج جب کہ ہمارے دانشور "ایک دنیا" کے خواب دیکھ رہے ہیں جب سائنسی ایجادات نے دنیا کے مختلف اور دور دراز ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے تو یہ لوک کہانیاں ان کے ذہنی فاصلوں کو کم کر سکتی ہیں۔

بچے ایک ہی قسم کی کہانیاں سننا پسند نہیں کرتے وہ تنوع چاہتے ہیں اس لیے کبھی انسانوں کی کہانیاں سنتے ہیں تو کبھی جانوروں کی، کبھی تاریخی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں تو کبھی محض تخیل کی دنیا کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔

والٹر ڈی لامیئر نے اپنی "جانوروں کی کہانیوں" کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"یہ ضروری نہیں کہ تمام اچھی کہانیاں خوشی کی کہانیاں ہوں۔ دکھ سے بھری ہوئی افسوسناک اور ہیبت دلانے والی کہانی، تصویر یا نظم بھی اچھی ہو سکتی ہے۔ یہ سب دماغ کو مالا مال کرتی ہیں اور خود بینی کو دعوت دیتی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے خواہ ہمیں تکلیف ہو یا دہشت ہو پھر بھی ہم ان کہانیوں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ان کہانیوں کی فضا اور ان کے کردار، واقعات اور مناظر ہمارے سامنے رہتے ہیں۔ ان کے خوبصورت الفاظ اور موسیقی ہمارے ذہنوں کو روشن کرتی رہتی ہے ایک چھوٹا بچہ ان ہیبت ناک کہانیوں کو سننے کے بعد سوتے وقت ڈر سکتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں خود ڈرا کرتا تھا لیکن مجھے ان کو بار بار سننے میں مزا بھی آتا تھا گو کہ ان کا بہت کچھ انحصار کہانی سنانے والا پر ہوتا ہے۔ بچپن میں ڈراؤنی دیو کی شکل اکثر سوتے وقت میرے سامنے آ جاتی تھی۔ مرجانہ کے ساتھ میں ہر تیل کے پیپے کے پاس جاتا تھا اور اس وقت تک اس کے ساتھ رہتا تھا جب کہ چالیس چوروں کو مار کر ختم نہ کردے۔ میں ان کہانیوں سے محض کہانیوں کا لطف لیتا تھا۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان ڈراؤنے قصوں کو سننے اور ان سے ڈرنے کے باوجود مجھے کوئی نقصان نہیں پہونچا۔"

مذکورہ بالا اصولوں کے پیش نظر ہم عالمی ادب سے بچوں کے ادب کے علاوہ بڑوں کے ادب سے بچوں کو روشناس کرا سکتے ہیں اور انہیں آسان اور عام فہم انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ یہ کام جہاں ہم دوسری زبانوں کے سلسلے میں کریں گے، وہیں ہمیں یہ عمل خود اپنی ادبیات کے سلسلے میں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی بعض ادبی کتابوں کو بچوں کے لیے بھی فراہم کریں۔ انگریزی میں شیکسپیئر، ڈکنس، سوفٹ، موپاساں، چیخوف اور دوسرے ممتاز ادیب ہر عمر کے بچوں کے لیے آسانی سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ ہم بڑی آسانی سے باغ و بہار فسانہ آزاد، مذہب عشق (گل بکاؤلی) توبۃ النصوح، فسانہ عجائب، آرائش محفل (قصہ حاتم طائی) گئودان، شریف زادہ وغیرہ کو بچوں کے لیے لکھ سکتے ہیں۔ یہ طریقہ ہم دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ساتھ بھی برت سکتے ہیں جیسے الف لیلہ ولیلہ، حاجی بابا اصفہانی، چارلس ڈکنس کے ناول، ڈیفو کا رابن سن کروسو، گلیور ٹریول وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح ہم اپنے بچوں کو دنیا کے ادب سے اور خاص طور پر بڑی کتابوں سے روشناس کرا سکتے ہیں۔

یہاں اس تجویز کو پیش کرتے ہوئے میرا یہ کہنا مقصود نہیں کہ اردو میں یہ کام سرے سے ہوا ہی نہیں۔ ترقی اردو بورڈ نے اس کام کو کافی حد تک اپنے ذمے لے لیا ہے اور میرے علم میں ہے کہ بعض کتابیں طباعت کی منزلوں سے گذر رہی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے بعض روسی کہانیوں کو بچوں کے لیے لکھا ہے جو بڑی مقبول ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے انہیں شائع کیا ہے۔

آزادی کے بعد اردو میں بچوں کے لیے معلومات کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ترجموں کی تعداد خاصی ہے۔ چلڈرن بک ٹرسٹ نے جہاں پنچ تنتر کی کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ وہاں انہوں نے اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ ہندوستان میں مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوسکیں۔ اور قومی ایکتا کے جذبے کو تقویت ملے۔ ان کتابوں کی قیمتیں بھی کم ہیں اور یہ رنگین فوٹو آفسٹ سے شائع کی ہیں۔ ہمیں ان کتابوں میں ہندوستان کی مختلف زبانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مصنفوں کی کتابیں ملتی ہیں۔ جن میں چند ممتاز ادیبوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ اماشنکر جوشی، بریگیڈیر گیان سنگھ، لیلا بھاگوت لیلا مجمدار، وشنو پربھاکر منوہر داس چترویدی، راجندر راوستھی، شاستارنگاچاری، تاراتیواری، ملک راج آنند، سرویندرس سانیال وغیرہ۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کتابوں کے ترجمہ کرنے والوں میں اردو کے جانے پہچانے ادیب بھی شامل ہیں۔ جیسے محمد شفیع الدین نیر، رضیہ سجاد ظہیر، انور کمال حسینی، رفیعہ منظور الامین، صالحہ عابد حسین، محمد ذاکر، عرش ملسیانی وغیرہ۔

ہماری زبان میں بچوں کے لیے کوئی انسائیکلو پیڈیا نہیں ہے یہ ایک بنیادی کام ہے لیکن ہمارا ذہن تو بھی ان بڑوں کی طرف متوجہ ہے جو انگریزی جانتے ہیں اور انگریزی کی انسائیکلو پیڈیا سے مستفید ہو سکتے ہیں اس کام کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن میرے پیش نظر فوری افادیت ہے۔

میری رائے ہے کہ بچوں کے لیے انسائیکلو پیڈیا تیار کی جائے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ آرتھری (Arther Mee) کی چلڈرن انسائیکلو پیڈیا کو اردو میں آزادانہ طور سے منتقل کی جائے۔ یہ کام کوئی بڑا ادارہ ہی کر سکتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ میری ایسی چند تجاویز پر ترقی اردو بورڈ کا چلڈرن پینل عمل کر رہا ہے اور پروفیسر عبدالعلیم کی رہنمائی میں اس کام کی ابتداء بھی ہو چکی ہے۔ بچے ایک تہذیب کے بنیادی پتھر ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کو ابتدا ہی سے صحت مند ادب کی طرف متوجہ کرویں گے تو پھر امریکہ سے آئے سستے، ہلکے پھلکے بازاری اور کاروباری ادب سے مقابلہ کرنے کے لیے ان میں آگے چل کر قوت مدافعت پیدا ہو جائے گی۔ مغرب سے آئے ہوئے جاسوسی ادب نے ہمارے ملک میں بھی اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا ہے اور اس کا مقابلہ ہم اسی صورت سے کر سکتے ہیں کہ بچوں کو پہلے ہی سے صحت مند ادب سے روشناس کریں۔

مشیر فاطمہ نے صحیح بات کہی ہے "کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ہم نے پریوں کے قصوں اور روایتی داستانوں کو بے معنی سمجھ کر ٹھکرا تو دیا لیکن اس کے بدلے ہم نے اپنے بچوں کو کچھ نہیں دیا اپنے روایتی ادب کے ورثے کو نظر انداز کر کے امریکی قسم کے سستے اور اوچھے ادب کی نقل دی ہے جس میں صرف ایک ایک کارنامہ ہوتا ہے جس میں ہمارے قومی کردار کے صبر وتحمل کا ذرا بھی شائبہ نہیں جہاں انجام صرف کامیابی ہے۔ جہاں صرف کامیاب انجام کیلئے ہیرو بہادری کے ہر کرتب دکھاتا ہے اور اپنا مقصد صحیح یا غلط کسی طریقے سے حاصل کر لیتا ہے۔

میں نے مذکورہ بالا سطروں میں نہ صرف چند مسائل پر بحث کی ہے۔ بلکہ ان کا حل اور طریقہ کار بھی پیش کیا ہے اس میں میں نے اپنے تجربے سے زیادہ مدد لی ہے اس لیے میری رایوں سے آسانی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے قارئین بھی ان مسائل پر غور کریں گے اور اپنی رایوں سے مستفید فرمائیں گے تاکہ ہم سب کی مشترکہ کوششوں سے بچوں کے ادب کو اردو میں فروغ حاصل ہو اور ہم اپنے بچوں کو بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ عالمی ادب کے نمونوں کو پیش کر سکیں یہی زمانہ ان کی شخصیت کو ڈھالتا ہے اور اسی لیے سب سے زیادہ بچے بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توجہ کے مستحق ہیں یہ زمانہ بہت تھوڑے دنوں رہتا ہے۔اس لیے اس وقت کو ضائع نہ ہونے دینا چاہیے اس زمانے ہی میں ان کو بہترین ادب فراہم کردینا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بچوں کے لیے سنجیدگی، خلوص، محبت اور محنت سے لکھا جائے گا، یہ چاہے ترجمہ ہو یا تخلیقی ادب۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ان کا دارالترجمہ

عبدالقادر سروری

مہاراجہ رنبیر سنگھ، ڈوگرا خاندان کے دوسرے حکمراں نے 1857-1756ء میں ریاست جموں وکشمیر کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور کوئی ۳۱ برس حکومت کرتے رہے ان کا زمانہ ریاست میں نئے عہد کے طلوع کا تھا۔ اور انہوں نے نئی تعلیم کو رائج کرنے اور نظم ونسق نئے تقاضوں کی سطح پر لانے میں اپنا فرض پوری طرح ادا کیا، لیکن ان کا ذاتی رجحان قدیم ویدی تہذیب اور سنسکرت علوم کی طرف زیادہ تھا۔ حالانکہ خود انکی تعلیم قدیم علوم وفنون میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ سناتن دھرم عقائد کے سختی سے پابند تھے، ان کا نام ڈوگرا عہد کی تاریخ میں نمایاں اور یادگار رہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کئی مندر بنوائے اور پرانے مندروں کی نگہداشت اور مرمت اور توسیع کا بھی بڑا اچھا انتظام کیا تھا۔ جموں میں رگھوناتھ مندر تعمیر کروا کر اس سے ملحق ایک سنسکرت پاٹھ شالہ بنوائی تھی۔ انہوں نے مندر کے اطراف میں کئی اور مندر تعمیر کروائے اور اس ملک کو سنسکرت علوم وفنون کی تعلیم کے لیے مرکزی حیثیت ویدی، اسی مندر کے احاطے میں سنسکرت ملفوظات اور کتب کو جمع کرنے اور ان کے تحفظ کے لیے وسیع کتب خانہ بھی تعمیر کروایا تھا جس سے متعدد مستشرقین مثلاً بوہر اسٹین وغیرہ نے استفادہ کیا تھا۔

نئی تعلیم اور نئے علوم وفنون جو ہندوستان میں رائج ہو رہے تھے انہیں ریاست میں روشناس کرانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ نئے نظم ونسق کے لیے نئی تربیت پائے ہوئے عہدہ داروں اور کلرکوں کی بھی ضرورت تھی۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے راجہ رنبیر نے انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کیے۔ درباری اور دفتری زبان ابھی تک فارسی مانی جاتی تھی۔ اور اکثر کارروائی بھی فارسی ہی میں ہوتی تھی اور درباری احکام بھی عموماً فارسی میں صادر ہوتے تھے لیکن برصغیر ہند کی طرح اس "ایران صغیر" میں عوامی بھی اب کوئی زندہ اور نشو پذیر زبان نہیں رہی تھی۔ اور نئے عہد کے تقاضوں نے عوامی زبان اردو کو اس خلا کو پُر کرنے کے لیے آگے بڑھانا شروع کر دیا تھا جو فارسی زبان کے میدان سے ہٹنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بارے میں کشمیر کے مورخ، صوفی غلام محی الدین نے ''کشمیر'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے پیش نظر اکبر اعظم کی علمی اور ادبی سرپرستیاں اور درباری شان وشوکت تھی، لیکن ان کے وسائل محدود اور ان کا مذاق عام پسند تھا۔ اس لیے جن لوگوں کو انہوں نے اپنے دربار کے ''نورتن'' میں شامل کیا تھا ان میں دو ایک سنسکرت علماء کے علاوہ سب اوسط علم اور اوسط ذہنی معیار کے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ایک بات یہ تھی کہ اس عبوری دور میں علم وفضل کے اگلے معیارات تقویم پارینہ بن چکے تھے اور نئی تربیت کے عمدہ نمونوں کے ابھرنے میں ابھی دیر تھی۔ اس لیے یہ ''نورتن'' حقیقی روشنی نہیں رکھتے تھے۔

ان میں سب سے پہلی قابل ذکر شخصیت دیوان کرپارام، مہاراجہ کے دیوان اور معتمد علیہ کی ہے۔ وہ فارسی اچھی جانتے تھے بلکہ فارسی میں چار پانچ کتابوں کے مصنف بھی تھے ان میں ایک ''گلاب نامہ'' مہاراجہ گلاب سنگھ بانی خاندان ڈوگرا بہت مشہور ہے، ان کی دوسری تصانیف ''ہدیۃ التحقیق'' یا تحقیق التناسخ'' اور ''رد اسلام'' ہیں، وہ مرصع اور مقفیٰ ہندوستانی طرز کی عبارت لکھتے تھے۔ صوفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے ابوالفضل سمجھے جاتے تھے، لیکن ابوالفضل کی وسعت نظری کے مقابلہ میں ان میں ہندو مذہب کی پاسداری زیادہ تھی۔ اس پہلو سے وہ ابوالفضل کی گویا ضد تھے۔

دیوان کرپارام کے ''گلاب نامہ کی تاریخ تصنیف وطباعت پر سید اسمعیل حسین منیر اور ان کے فرزند اور شاگرد ابو محمد بدر نے کئی تاریخیں کہی تھیں۔ دونوں کی ایک ایک تاریخ ملاحظہ ہو:

گلاب سنگھ مہاراجہ عظیم الشان! زمین ہند میں خورشید آسمان خرد
گلاب نامہ'' میں احوال انکا ہے مرقوم اسی سبب سے یہ نسخہ ہے بوستان خرد
علاوہ ان کے ہے حال اور بھی رئیسوں کا جو تھے زمانۂ پیشیں میں قدر دانِ خرد
خدیو عصر مہاراجہ زمانۂ حال کہ جن کے عہد میں عالی ہوئی ہے شانِ خرد
سپہر مرتبہ رنبیر سنگھ عالی جاہ! کہ انکی مدح میں درفشاں زبان خرد

منیر میں نے یہ تاریخ پائی سمت میں
''گلاب نامہ، بہار بہشت، جانِ خرد

(۱۹۲۲ بکرمی)

واہ کیا تالیف کی دیوان کرپارام نے ہر ورق خوش آئینہ خوش جو ہر پنجاب ہے
بدؔر نے تاریخ چھپنے کی یہ سمت میں کہی تحفۂ اخبار بلاد کشور پنجاب ہے''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیوان کرپارام کی دوسری تصنیف "ہدیۃ التحقیق" پنڈت شیوناتھ کول منتظر نے (جن کا حال آگے آرہا ہے) حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا تھا۔

واہ تحقیق تاریخ کیا چھپی　　　　تیرگی کی دور جسنے جہل کی
کوئی کیا تاریخ اس کی لکھ سکے　　　　ہاتف غیبی ہی جب خود یہ کہے

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے دوسرے علماء ڈاکٹر بخشی رام، پنڈت گنیش کول شاستری، پنڈت صاحب رام، مولوی غلام حسین طالب لکھنوی، مولوی عبداللہ مجتہد العصر حکیم ولی اللہ لکھنوری، حکیم نورالدین بھیروی ثم قادیانی، اور بابونصراللہ عیسائی سے "نورتن" کی یہ فہرست مکمل ہو جاتی ہے۔

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان میں مختلف علوم اور مکتبہ خیال کے نمائندے شامل ہیں، پنڈت گنیش کول شاستری اور پنڈت صاحب رام سنسکرت کے اچھے عالم تھے مشہور مستشرق سنسکرت فاضل شٹائن نے پنڈت صاحب رام کو "گذشتہ چند نسلوں میں کشمیر کا سب سے بلند پایہ عالم" مانا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ریاست کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے تیرتھوں کے جائزے اور ان کی توضیحی فہرست مرتب کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی تھی حکیم نورالدین، مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو تھے۔ اور بعد کو مرزا صاحب کے انتقال (1908ء) پر ان کے پہلے خلیفہ ہوئے۔ حکیم صاحب نے اپنی خودنوشت سوانح میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی بڑی توصیف کی ہے۔ بابونصراللہ عیسائی نے ان کی کشمیری ہینڈ بک کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی دلچسپیاں اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ایک مہتم بالشان کام جو مہاراجہ کے عہد میں انجام پایا، وہ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے اور ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ایک دارالترجمہ کا قیام تھا جس کے ذریعے انہوں نے مغربی علوم کو اردو اور ریاست کی دوسری زبانوں۔ ڈوگری، ہندی اور پنجابی میں منتقل کرانے کے علاوہ ان علوم اور فارسی اور عربی کی اہم علمی تصانیف کو سنسکرت میں منتقل کرنے کی سعی بلیغ کی تھی۔ اس طرح مہاراجہ کے قائم کیے ہوئے دارالترجمہ کا کام ایک سے زیادہ زبانوں سے تعلق رکھتا تھا، اور بعض کتابیں بیک وقت دو یا تین زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔

اس دارالترجمہ کی ساری تفصیلات اب ہماری دسترس میں نہیں ہیں تاہم اسکے کام کی جو باقیات الصالحات اب ملتی ہیں ان سے اور نظم ونسق کی ایک رپورٹ سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ رپورٹ 1882-1883ء کی ہے جس میں دارالترجمہ سے متعلق صرف یہ دو جملے ملتے ہیں۔

> "4502 روپیہ اجرت ترجمہ پر اس سال میں صرف ہوا اور سال حال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری میں اور شاستری میں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھاشا، اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، ختم نہیں ہوئی ہیں۔"

آگے یہ بھی لکھا ہے کہ اس بارے میں "تفصیلی رپورٹ سال آئندہ میں درج ہوگی۔" بدقسمتی سے یہ رپورٹ دستیاب نہیں ہوسکی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے جانشین مہاراجہ سری پرتاب سنگھ کو ان امور سے دلچسپی نہیں تھی، اس لیے یہ ادارہ بند ہوگیا۔ اور اس کا سارا ذخیرہ ریسرچ لائبریری سرینگر میں منتقل کر دیا گیا۔ لیکن اس منتقلی کے سلسلے میں احتیاط ملحوظ نہ رکھنے سے اور منتقل کرنے والوں کو اس عظیم کام کی اہمیت کا اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے کئی مخطوطات ضائع ہوگئے۔ جو بچ گئے وہ اب ریسرچ لائبریری میں رنبیر کلکشن کے زیر عنوان محفوظ ہیں ان مخطوطات کی تہذیب اور ترتیب میں لائبریری کے سابق ناظم صاحبزادہ حسن شاہ صاحب کی دلچسپی شامل رہی اور جہاں تک اردو مخطوطات کا تعلق ہے راقم الحروف نے انکا تھوڑا بہت ہاتھ بٹایا۔

رنبیر کلکشن میں مخطوطات کی بڑی تعداد علم طب سے متعلق ہے، اور یہ زیادہ تر انگریزی تراجم ہیں، کچھ عربی اور فارسی کے ترجمے بھی اردو اور مقامی زبانوں میں کیے گئے ہیں۔ طب میں میٹریا میڈیکا، علم تشریح، امراض اطفال، علم قابلہ پر کئی ترجمے ہوئے تھے طب کے علاوہ ایک دو مخطوطات انجینئری اور فن حرب سے متعلق ہیں ایک رسالہ منطق پر، کار آمد فنون کاغذ سازی اور طباخی پر بھی ایک ایک رسالہ ملتا ہے اسکے علاوہ تاریخ اور مشاہیر مذہب کے بارے میں بھی مخطوطات ہیں۔

میٹریا میڈیکا پر تین مخطوطات ملتے ہیں جو انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے گئے ہیں لیکن اصل کتابوں کے نام درج نہیں ہیں۔ مخطوطات نمبر ۱۹۱ میں صرف اتنا ذکر ہے کہ یہ انگریزی کا ترجمہ ہے۔ مخطوطہ نمبر 412 نہایت ضخیم اور تین جلدوں پر مشتمل ہے اسی موضوع پر ایک اور مخطوطہ نمبر 190 بھی ہے۔ یہ تینوں ترجمے سادہ، سلیس اور عام فہم اردو میں ہیں اور اردو کے ساتھ ناگری حروف میں بھی لکھے گئے ہیں۔ ترجمہ میں انگریزی کی اصطلاحیں عموماً جوں کی توں رکھی گئی ہیں جیسے سپرٹ، فنل اور ان کی شرح اردو میں دے دی ہے۔ اصطلاحوں کے فارسی مترادفات بھی درج کیے گئے ہیں۔ مثلاً مخطوطہ نمبر 191 سے ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

ٹرائی ٹیوریشن۔ اس لفظ کے معنی سفوف کرنے کے ہیں۔

گرانیولیشن۔ جملہ اشیاء از قسم دھات کے دانے اسی ترکیب سے بناتے ہیں کہ دانے بھی بنتے جاتے ہیں۔ اسی طرح "سفٹنگ"، "فلٹریشن"، "فاسفارک اسڈ"، "پوٹاشیم" غرض ساری اصطلاحوں کی شرح کردی گئی ہے۔ انگریزی اصطلاحوں کو اردو حروف میں لکھنے میں ایک خاص بات یہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ انہیں حتی الامکان "رکنی" (Syllabic) املا میں لکھا گیا ہے مثلاً ڈی کاکشن۔ سبلی میشن۔ ڈیکسی نیشن وغیرہ انگریزی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لاطینی اصطلاحیں بھی درج کی گئی ہیں مثلاً "کارگل"، "گارگا"، بعض مشکل اردو الفاظ کے معنی ہندی میں بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لکھ دیئے گئے ہیں۔

مخطوطہ نمبر 190 بھی اسی موضوع پر ہے، جس کے آغاز میں موضوع کے بارے میں تفصیل درج کی گئی ہے۔انگریزی ناموں اور اصطلاحوں کے علاوہ اردو میں جو نام اور اصطلاحیں رائج ہیں وہ بھی لکھ دی گئی ہیں۔جیسے تیزاب سونٹھ، قتلے کافور، مثلث وغیرہ جہاں انگریزی کے اوزان لکھے گئے ہیں، ان کے مقابل ہندوستانی اوزان بھی دیئے گئے ہیں:

مخطوطہ نمبر 413 کے آغاز کی عبارت سے ان ترجموں کی خصوصیات پر کچھ روشنی پڑتی ہے لکھا ہے:

> ''اس گرنتھ کا نام ہے ''میٹریا میڈیکا'' اس فن کا نام ہے، جس سے فائدہ اور استعمال دوا کا معلوم ہوتا ہے اور جب تک اس فن سے واقفیت کما حقہ نہ ہو، تب تک بیماری کا علاج نہیں کیا جاتا ہے لیکن فقط دوا کی خاصیت، فائدہ اور استعمال کا جاننا کافی نہیں ہے، ان کے ملانے اور وزن کرنے کی ترکیب سے بھی واقفیت پیدا کرنی ضروری ہے۔''

مخطوطہ نمبر 191 سے بھی ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے، اس پر ہندی کا اثر نمایاں ہے:

> ''تیسری قسم کی گوند کی اکیشیا وردے کا نا ک ہے کہ جس کو سنسکرت میں گرسندر'' کہتے ہیں۔اور ہندوستان میں جو دیخول کاورکش وار دلیہ کر کے ہوتا ہے، اسکے گوند کی خاصیت بھی اسی طرح ہے۔''

اناٹومی پر ایک ترجمہ اردو میں ہے جسکی دو جلدیں ہیں (مخطوطہ نمبر 458) یہ دیوناگری خط میں لکھا ہوا ہے۔ایک اور مخطوطہ علم الامراض پر اردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں ہے (مخطوطہ نمبر 200) زبان دونوں خطوں میں عام طور پر ایک ہی ہے۔صرف کہیں کہیں لفظ بدلے گئے ہیں، مثلاً اردو میں ''انسان'' کی جگہ ناگری میں ''آدمی'' علم طب کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''طب وہ علم ہے جس سے انسان (ناگری آدمی) کی تندرستی اور بیماری کا حال دریافت ہوتا ہے اور اس کے قاعدوں پر عمل کرنے سے صحت کا قیام اور مرض کا زوال ہوتا ہے۔''

تعریف تشریح۔

> ''تشریح وہ عمل ہے جس کے ذریعے سے اعضا کی ساخت اور شکل اور مقدار اور عدد اور وضع دریافت کی جاتی ہے۔''

تعریف فزیالوجی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''فزیالوجی اس علم کا نام ہے جس میں انسان کی صحت کے احوال مثل پرورش جسم اور خروج رطوبات اور دوران خون اور حرکت تنفس اور کیفیت قوت ہاضمہ اور جاذبہ اور حقیقت تولد انسان اور پیدائش ہر عضوِ بدن اور ان کے امکان وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔''

''ترجمہ شرح اسباب'' کا مخطوطہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں عام امراض کی تفصیل ہے اور دوسری میں امراض کبیر جیسے سوءِ مزاجِ جگر، ضعف الکبد وغیرہ کی تفصیلات شامل ہیں۔ اس کے مترجم حکیم فدا محمد خاں نے اس پر ایک طویل دیباچہ قلمبند کیا ہے۔ جس میں اپنے کچھ حالات اور ترجمے کے بارے میں تفصیلات دی ہیں اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مدح سرائی کی ہے، اسکا اقتباس حسب ذیل ہے۔

''امابعد احقر العباد اللہ الصمد فدا محمد ابن اشرف الحکماء حکیم محمد یوسف خاں مرحوم ابن زبدۃ الحکماء بطلیموس دوراں حکیم غلام حسین خاں مغفور شاہجہاں آبادی بخدمت شائقان و ماہران علم طب کے التماس کرتا ہے کہ کتاب شرا اسباب و علامات حکیم نجیب الدین سمرقندی کی شرح ہے اور شارح اس کے جالینوس وقت فیثا غورث ثانی حکیم نفیس الدین کرمانی ہیں یہ شرح غایت اشتہار سے محتاج تعریف و توصیف کی نہیں ہے۔ مگر چونکہ زبان عربی میں ہے اکثر عوام اس کے فوائد سے محروم تھے۔ لہٰذا حسب الحکم بندگان عالی مقالی، حضور فیض گنجور داد گستر عالی گوہر، رعیت پرور، قدردان علم وہنر برجیس مرتبت، کیوان منزلت نیر اعظم آسمان عظمت، ماہِ منیر سپہر رفعت، معدن الجود والاحسان، فیاض زماں، معلی نشان راجۂ راجگاں، مہاراج دھیراج راجیشورسری مہاراجہ رنبیر سنگھ بہادر مالک جموں وکشمیر کی سخاوت وبخشش اون کی شہرۂ آفاق ہے اور سب سے زیادہ اون کو شوق ترقی علم و کمالات ہے اور تین صاحب زادے والا تبار، گردوں وقار، حضور لامع النورجوں موالید ثلاثۂ عالم اجسام ضروری الوجود جوں ہر سہ ارواح بدن انسان مطلوب ومقصود......''

''اسباب امراض'' (مخطوطہ نمبر 195,196) بھی دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں ہے۔ ابتداء میں امراض صداع اور انکی تفصیل فارسی میں لکھی ہے اور ماخذوں کا ذکر کیا ہے۔ امراض نزلہ کی شرح کے حصے سے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:

''آتش یا گرمی عام یا گرمی سونگھنے چیزوں گرم، مث مشک وغیرہ وجہذ اوز عفران یا مالش کی جاوے سرکوں ساتھ کسی گرم چیز کے تو یہ عاید ہوتا ہے۔ فقط

''علامات: علامت اوس کی ظاہر ہونا سرخی آنکھوں کی خارش اور سوزش ہونا بنی کوزیادہ ہونا مرض کا باعث گرمی تپ سے اور ہونا پیاس زیادہ......''

ایک اور مخطوط (نمبر 398) ''اسباب الامراض والعلاجات'' وسنت رائے (بسنت رائے) کے مرتب کیے ہوئے رسالے کا ہے، اور یہ بھی اردو اور ناگری خطوں میں لکھا ہوا ہے، زبان، اردو پوٹھواری (پوٹھوہاری، پہاڑی) اور ہندی کا آمیزہ ہے، کتاب کی ابتداء میں ایک ایک دیباچہ ناگری میں ملتا ہے، جس میں مرتب نے اپنے کچھ حالات بیان کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''مہاراجہ والی جموں کشمیر ودی آ گیا تے میں نے وسنت رائے برہمن بیٹے شری لالہ بھولا ناتھ دادے دیش نور محل نگرباشی نے چار کتابوں یونانی چکتسا پوٹھواری بھاشا میں جگہ اسی پستک دکھے ماس سموت 1925 پر آرمبھ کر کے جیٹھ ماس 1926 ماس آشاڑھ ماس کے دے پورن کیا.....''

مخطوط حمد وثنا سے شروع ہوتا ہے۔ حمد وثنا کے بعد مرتب نے کتاب کی تالیف کا حال لکھا ہے۔

''علاج الامراض'' (مخطوطہ نمبر 196) بسنت رائے اور فضل الدین کا ترجمہ ہے بسنت رائے کا ترجمہ پوٹھواری میں اور فضل الدین کا اردو میں ہے۔ دونوں ترجمے سطر بسطر درج ہیں، یہ ترجمہ سمت 1925-1926ء بکرمی میں مکمل ہوا تھا۔ مخطوطے کا آغاز و بھارا اور بخاروں کے بیان سے ہوتا ہے۔ اس کا اقتباس ہے:

''ان امراض میں اکثر میدانی زہر بدن کے اندر سرایت کر جاتا ہے اور وہ یہ بیماریاں ہیں۔ اول ویرا و لایعنی چیچک دویم روتی رو لایعنی خسرہ سیوم اسکارلٹ فیور یعنی سرخ بخار چہارم ایلی سلیس یعنی حمرہ....''

دیباچہ میں اس کا تذکرہ ہے کہ اس کتاب تصنیف و تالیف ترجمہ تصحیح اور طباعت میں درجہ اول کے ''نیٹیو'' ڈاکٹر مرزا امیر بیگ سے بڑی مدد ملی، طب میں ان کی مہارت کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کتاب میں جتنے یونانی علاج شامل کیے گئے ہیں، وہ حکیم فضل الدین کے مجوزہ ہیں۔ تالیف میں جن کتابوں سے مدد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لی گئی ہے ان کی تفصیل بھی دی ہے۔ اس کے علاوہ سی پی چارلس ایلیٹ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ اور میجر مرسر ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کی امداد اور دلچسپی کا بھی اعتراف کیا ہے۔

امراض، ان کی تفصیل اور تشخیص کے بیان کرنے کا انداز صاف اور سلیس ہے جو اصطلاحیں عربی اور فارسی کی اردو میں رائج ہیں وہ استعمال کی گئی ہیں اور کہیں کہیں اصل انگریزی اصطلاحیں بھی برقرار رکھی گئی ہیں، بعض الفاظ میں املا کا اختلاف ہے، جیسے چوتھی (چوتھی) حتٰی کہ (حتیٰ کہ) چھڑاوتا ہے (چڑھ آتا ہے) وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ مقامی الفاظ بھی آ گئے ہیں جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے واضح ہوگا:

''ان دانوں کے نکلنے کے تیسرے روز ایک رطوبت مثال پانی کے جس کوشیدم بولتے ہیں، بھر جاتی ہے یہ رطوبت بھرے دانے طب انگریزی میں دیسی کل کہلاتے ہیں۔ جڑ ان دانوں کی خوب سخت اور متفرق ہوتی ہیں۔ سرے ان دانوں کے ہمیشہ دبے ہوئے ہوتے ہیں، اور یہی خاص کران دانوں کی شناخت ہے۔ ان دانوں کے نکلنے کے پانچویں روز رنگ اس رطوبت کا مثال بھوسی کے جس میں آدھا پانی سیرم اور آدھی پیپ ہو جاتا۔ سُدّے جو دبے ہوئے تھے وہ بباعث بدنی دانوں کے اوٹھ جاتے ہیں اور دانہ پکنے شروع ہو جاتے ہیں۔''

ترجمہ تشریح البدن' (مخطوطہ نمبر 198) اردو دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھا گیا ہے، اس کے مترجم بھی لالہ بسنت رائے ہیں۔ زبان میں کسی قدر ژولیدگی ہے، آغاز اس طرح کرتے ہیں۔

''بعد حمد وسپاس حکیم علی الاطلاق واضح ہو کہ یہ کتاب بیان تشریحات میں ہے اور تشریح عبارت ہے اظہار شے اور کشف کرنے حقیقت اوس شئی کی تمامہ جو اس میں کچھ شبہ ہووے جیسا کہ تشریح ہے کہ اول نطفہ بنایا خون بستہ، پھر بنایا اس کو پارۂ گوشت پھر اوس میں بنائیں استخواں اور پہنایا اون پر گوشت اور پوست اور بخشی صورت فقط۔''

اس مخطوطے کے کاتب رام چندر رینہ ہیں اور اختتام کا سال 1285ھ ترقیمہ کی عبارت ہے:

''بہ تمام رسید بہ انجام انجامید رسالہ ہذا فی التشریح بدن الانسان حسب الایمائے سید احمد شاہ کہ از صاحب حکمائے اجلہ واکابر روزگار است....
تحریر بتاریخ دوم ماہ مبارک ہکہ سمت 1928 مطابق 1285 ہجریہ مقدسہ راقم رام چندر رینہ۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فن طب کے دو اور مخطوطات ''ہدایت پیدائش بچہ'' (مخطوطہ نمبر 446) اور ''امراض الصبیان (مخطوطہ نمبر 236) میں سے ایک صرف اردو میں اور دوسرا اردو اور ناگری میں ہے۔ انکے مرتبین یا مترجمین کے ناموں کا پتہ نہیں چلتا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ کتابیں بھی انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ''ہدایت پیدائش بچہ'' نامکمل حالت میں ہے اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

> ''فصل اول جاننا چاہیے کہ جب لڑکا پیدا ہو، تو اس کے بدن کو ہوائے سرد سے محفوظ رکھیں، بعدہ ناف کی آنت کہ جس کو نال بھی کہتے ہیں، اور وہ مشمہ یعنی آنول سے لگی ہوتی ہے، اوس کو انگوٹھے اور سبابہ کی انگلی سے پکڑ کر بچے کے پیٹ سے آنول کی طرف بہ نرمی ملائمی اچھی طرح سے دوہیں تا خلط ریح وغیرہ سے جو کچھ کہ اس میں ہوتا ہے خوب صاف ہو جاوے، پھر سوت کے نرم دھاگے کو کسی مناسب روغن میں چرب کر کے ناف کی انتڑی کو دو جگہ سے بخوبی باندیں، ایک ناف کے نزدیک اور دوسرا اس سے ایک بالشت کے فاصلے پر۔''

''امراض الصبیان'' بچوں کے امراض اور علاج کے بارے میں اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ اصطلاحیں اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی سب استعمال کی گئی ہیں۔ بعض اردو لفظوں کے مترادف ہندی لفظ بھی دے دیئے ہیں جیسے عورت استری، بیان، ورنن وغیرہ۔ رسالہ چھ مقالوں اور چار حصوں پر مشتمل ہے زبان صاف اور سلیس ہے بچوں کی ہڈی ٹوٹ جانے اور اس کے علاج کی تفصیل کے بارے میں لکھا ہے۔

''ہڈی ٹوٹ جانا'' اصطلاح میں اس کو فرا کچر بولتے ہیں بچوں کی ہڈی مثل جوانوں کے ٹوٹ کر دو ٹکرے نہیں ہو جاتی، بلکہ خم کھا کر آدھی چیخ جاتی ہے اور آدھی بل کھا جاتی ہے۔ علاج اس کا معمولی طور پر کریں اور اسپلنٹ کو دو یا تین ہفتے باندھ کر رکھیں، مگر چمڑے یا موٹے کاغذ کا اسپلنٹ بہ نسبت لکڑی کے بہتر ہے۔''

''دستور قابلہ'' (مخطوطہ نمبر 194) بھی اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں لکھا ہے، ابتداء میں ناگری خط میں عنوانات کی تفصیل درج ہے۔ اصل متن آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''مقدمہ۔ پہلی فصل، پلوس کی ہڈیوں کے بیان میں۔
واضح ہو کہ کوکھ اور چوتڑ اور پیرو اور قطن اور دمچی کی ہڈیوں سے مل کر ایک مجموعی شکل سلفچی کے مانند بنتی ہے اس کو انگریزی میں پلوس بولتے ہیں۔''

''پلوس کی تشریح۔ پلوس چار ہڈیاں ہیں، دو ہڈیاں کولے کی جس کو اس انا نیما کہتے ہیں، اور تیسری ہڈی قطن، جسکو انگریزی میں سیکرم بولتے ہیں اور چوتھی ہڈی دمچی کی جسکو عربی میں عصعص اور فارسی میں استخوان نشستگاہ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزی میں کاٹیکس کہتے ہیں۔"

ایک رسالہ مدرسہ طبیہ کے طلبہ کے لیے ہدایتوں کے طور پر مرتب کیا گیا تھا جو "ہدایت الاطباء" کے نام سے موسوم ہے۔(مخطوطہ نمبر ۱۹۲) یہ رسالہ ایک تقریر پر مشتمل ہے جو غالباً کسی عہدیدار نے طلبہ کے سامنے ان کی تعلیم کے اختتام کے موقع پر کی تھی۔ تقریر میں پیشہ طب کی اہمیت اور طبیب کی ذمہ داریوں پر زور دیا گیا ہے۔ اور نوجوانوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ کسی بڑے مقصد کو پیش نظر رکھیں۔ رسالہ کے مطالب مفید اور اسلوب دلچسپ بلکہ ادبی ہے ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:

> "ہم زاہد ریاکار اور حاکم ظالم کی بہ نسبت طبیب نامعتبر کا منہ دیکھنا زیادہ پسند نہیں کرتے ہیں اس لیے کہ زاہد ریاکار اپنے ظاہر کو پاکی کے لباس سے آراستہ رکھتا ہے اور اس کے نزدیک ہر وقت دروازہ توبہ کا کھلا رہتا ہے۔ لیکن طبیب کا کام بذات خود اس قدر مخفی ہے کہ اوس کے ہم پیشہ لوگوں کو بہت کم پتہ لگتا ہے کہ اوس نے اپنی دیانت کو کیونکر نباہا اور عوام بہ سبب نہ ہونے معتبر پہچان کے، جس کے ذریعہ سے اوس کے کام کو بخوبی دریافت کرلیں۔ اپنی کسی خیالی دلیل پر اکثر اس کی عزت کرتے ہیں بہ ایں لحاظ کہ وہ ان کو لائق معلوم ہوتا ہے۔ اور اوس کی گفتگو شائستہ ہے یا کسی شخص کو اتفاقاً ایسے مرض سے آرام ملا ہے کہ جب بعض اطبا دست بردار ہوئے ہوں۔"

آخر میں طلبہ کو نصیحت کی گئی ہے کہ ہسپتال میں دل دہی سے کام کریں اور رات کا بڑا حصہ مطالعے میں صرف کریں۔

طب سے ہٹ کر دوسرے مفید فنون میں دو رسالے انجینئری یا فن حرب سے متعلق ہیں، جن میں ایک (مخطوطہ نمبر 438) رسالہ "مورچہ بندی" ہے جو کسی انگریزی رسالے کا ترجمہ ہے۔ اس کے مترجم مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے رکن رکین پنڈت بخشی رام ہیں۔ یہ رسالہ ۱۴۱ اوراق پر مشتمل ہے اور اس کی تکمیل کی تاریخ 26 ساون سمت 1925 بکرمی ہے۔ رسالے کی ابتدا میں اصطلاحوں کی تشریح کی گئی اور مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ مثلاً

"ا۔ کل عمارت حفاظت سے مطلب یہ ہے کہ تھوڑی فوج ایسی مفید جگہ پر رکھی جائے کہ وہ بہت سی فوج کا مقابلہ کر سکے۔"

ا۔ صلابت کو نچا ایک لمبی اڑ کو کہتے ہیں جس سے پیچھے کے آدمیوں کی حفاظت بہ آسانی ہو سکے یا اس سے دشمن دور رہ سکے اور یہ دو طرح کی ہے۔ ایک قدرتی، دوسری تیار کی ہوئی....."

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسالے کے سرنامے پر یہ عبارت درج ہے!

''کتاب ترجمہ کردہ پنڈت بخشی رام جی از کتاب انجیزی انگریزی۔''

فوجی فنون سے متعلق ایک دوسرا رسالہ ''علم تیراندازی'' (مخطوطہ نمبر 435) ہے غلام غوث خاں نے تصنیف کیا تھا۔ غلام غوث خاں جموں کے رہنے والے تھے۔ اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار میں ملازم تھے۔ علم تیراندازی میں غالباً وہ میاں پرتاپ سنگھ ولی عہد ریاست کے اتالیق تھے اور مہاراجہ کی فرمائش پر انہوں نے یہ رسالہ لکھا تھا۔ ابتدا میں وہ جس انداز سے پرتاپ سنگھ کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے لکھتے ہیں:

''درصفت خورشید آسمان شجاعت وسخاوت، ماہ تیر سپہر رفعت وعدالت
سری میاں صاحب پرتاپ سنگھ جیو صاحب بہادر دام اقبالہ می گوید۔''

''میاں'' کا لقب راجکمار اور خاص طور پر ولی عہد سلطنت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ایک نظم مہاراجہ رنبیر سنگھ کی تعریف میں بھی لکھی ہے اور اس کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ مہاراجہ نے ان سے علم تیر وکمان پر ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔

رسالہ پچیس کلیات پر مشتمل ہے اور آغاز پیغمبر اسلام کی سنت کے اس واقعے سے ہوتا ہے کہ آپ اکثر منبر پر یہ آیت تلاوت فرمایا کرتے تھے ''اعدوالھم ما استطعتم من قوۃ'' اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ ''الا ان قوت الرمی'' اس لیے علماء کہتے ہیں کہ علم تیراندازی کا سیکھنا ادب بلکہ سنت ہے۔ وہ علم تیراندازی کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

علم تیراندازی کا رب نے جو بھیجا در جہاں۔ ہوا نزول آدم کو یک کمان بے گماں
حضرت جبریل علیہ السلام نے سکھلایا اونکو یہ ہنر۔ تب مروج در جہاں ہوا ہنر تیر وکماں

غلام غوث خاں غالباً اس فن کے اچھے ماہر تھے لیکن وہ اچھے انشاء پرداز نہیں اور شاعر تو وہ بہت کم ہیں۔ کئی جگہ انہوں نے اردو اور فارسی اشعار بھرتی کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سب تک بندی ہے۔

پکوان کی ہدایت پر مشتمل ایک رسالہ ''رہنمائے رسوئیاں'' (مخطوطہ نمبر 455) ناقص الآخر ہے اس کے مصنف کا پتہ نہیں چلتا، رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''چونکہ یہ امر قابل لحاظ تصور کیا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی لطیف یا نفیس یعنی تکلف دار اور مزے دار کھانا بنوانا ہو تو ایسے ہر طرح کے کھانے کے بنانے سے یخنی شوربا، آب جوش اور آب گوشت کے بنانے کی بہت ضرورت ہے مگر جس حالت میں کہ روزمرہ کے طور پر کھانے بنوانا ہو تو اس حالت میں اون شوربوں کے بنانے کی ضرورت نہیں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فنون مفیدہ میں کاغذ سازی پر ایک رسالہ (مخطوطہ نمبر 444) اہم ہے جو کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن اصل کتاب اس کے مصنف اور مترجم میں سے کسی کا پتا نہیں چلتا ہے۔ یہ رسالہ کاغذ سازی'' کے نام سے موسوم ہے اور کاغذ سازی میں جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ان سب کی تفصیل اس میں لکھی گئی ہے۔ مشینوں کے نقشے بھی دیئے گئے ہیں اور کیمفر صاحب کے حوالے بھی جگہ جگہ دیئے گئے ہیں۔

''تذکرہ حالات انبیا'' (مخطوطہ نمبر 437) اور ذکر اولیائے ہنود'' (مخطوطہ نمبر 456) دو کارنامے اہمیت کے حامل ہیں۔ ''تذکرۂ حالات انبیا'' کے مصنف کا نام مخطوطے میں درج نہیں ہے اس میں آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ اور ظہور دانیال تک سارے اہم پیغمبروں کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔ اس میں ان انبیاء کے حالات شامل ہیں۔

''آدم، قابیل، وہابیل، شیث، عوج بن عنق، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسماعیل، داؤد، سلیمان، عزیز، خضر، یعقوب، یوسف، ایوب، عمران، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ، یوشع، کالوب، سموئیل، محمد رسول اللہ صلعم، ظہور دانیال۔''

آدم کے حال میں لکھا ہے:

> ''آدم علیہ السلام سب سے پہلے پیغمبر ہیں محرم کی دسویں تاریخ جمعہ کے
> دن بعد زوال کے آپ کے جسم مبارک میں روح داخل ہوئی، بعد اسکے
> فرشتوں نے سجدہ کیا اور یہ سبب کھانے گیہوں کے بہشت سے نکالے گئے
> ۔ ان کی پسلی کو چیر کر حوّا کو نکالا۔ ان ہی سے تمام دنیا کی آبادی ہوئی۔''

قابیل اور ہابیل کے واقعے کو تفصیل سے لکھا ہے اور یہ ایک دلچسپ مختصر قصہ بن گیا ہے۔ زبان اور اسلوب دونوں میں سادگی اور سلاست ہے۔

''ذکر اولیائے ہنود'' نابھ داس کی ''بھگت مال'' کا ترجمہ ہے۔ مترجم کے نام کا پتا نہیں چلتا۔ کتاب کا اسلوب تحریر صاف اور سلیس ہے کہیں کہیں ادبی چاشنی بھی موجود ہے۔

آگے میر مادھو کی کرامات اور بھگوان کی اس پر عنایات کا ذکر ہے۔ ان کے ایک فارسی قصیدے کا مطلع بھی لکھا ہے:

> تا کہ زخود رائی سخن سری کرشن گو سری کرشن گو
> بگذار کبر ما دمن، سری کرشن گو سری کرشن گو

ایک رسالہ علم منطق پر ''کتاب کبریٰ کا ترجمہ ہے اور کتاب کبریٰ اور علم منطق کے نام سے موسوم ہے (مخطوطہ نمبر 426) یہ ترجمہ سنسکرت اور اردو میں ہے اور دونوں ترجمے سطر بہ سطر لکھے گئے ہیں۔ سب سے پہلے فارسی ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جونہایت خوشخط ہے۔ اسکے نیچے سنسکرت اور سنسکرت کے نیچے ہندوستانی، ہندوستانی ترجمے میں ڈوگری اور پنجابی کی اتنی ملاوٹ ہے کہ قدیم اردو یا دکھنی کا انداز معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہے:۔

''جانو، سادھان ہووے کہ نشیہ کہ ایسا چتینا والا بل ہے، کیسا کہ جیسا تس
میں دستوؤں کیاں مورتیاں لکھنے آوتیاں ہیں جس پرکار درپن میں
مورتیاں لکھنے آوتیاں ہیں۔ پرنتو درپن میں محسوسا توں کیاں مورتیاں
کیوں دیکھنے میں آوتیاں ہیں....''

یہ رسالہ اپنے مطالب اور ترجمے کے طریقے کے لحاظ سے تو اہم ہے ہی اس کے علاوہ لسانی مطالعے کے لیے بھی مفید مواد فراہم کرتا ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے درباری، بابو نصراللہ عیسائی نے جن کے بارے میں اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان کی کشمیر سے متعلق تصنیف ''ہینڈ بک کو تاریخ رہنمائے کشمیر'' کے نام سے منتقل کیا تھا (مخطوطہ نمبر 443) اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اردو کے مہاراجہ کے حکم سے کیا گیا اور مکمل ہونے کے بعد ان کی خدمت میں منظوری کے لیے پیش ہوا۔ یہ ترجمہ 1874ء میں ہوا تھا۔ وادی کشمیر کے بارے میں ایک عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''کشمیر خصوصاً ایک ہی بڑی اور خوبصورت وادی ہے جو کہ ہر طرف سے
بلند اور برفانی پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے جس میں دریائے جہلم
موجزن ہے۔ اور علاوہ اس بڑی وادی کے اور بھی چھوٹی چھوٹی وادئیں
ہیں جن سے چہاروں طرف سے اس دریا میں پانی پڑتا ہے۔ مگر وادی
کشمیر اون تمام وادیوں سے بڑی اور مشہور و معروف ہے۔''

اس دارالترجمہ کے ناظم پنڈت گنیش کول مقرر ہوئے تھے۔ دارالترجمہ کے انتظام کے بارے میں اب کوئی تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں۔ اتفاق سے حکومت کی نظم و نسق کی ایک رپورٹ میں جو 1882-1883ء سے متعلق اردو میں لکھی گئی ہے، ایک اندراج ملتا ہے جس سے اس کے ایک سال کے اخراجات ترجمہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھا ہے:

''4502 روپیہ اجرت ترجمہ پر اس سال صرف ہوا اور سال حال میں
کوئی کتاب جو انگریزی سے شاستری اور شاستری سے بھاشا اور عربی
سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ لہٰذا اون کی تفصیلی
رپورٹ سال آئندہ میں درج ہوگی۔''

دارالترجمہ کی مساعی سے ہٹ کر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ریاست جموں وکشمیر میں اور علمی و ادبی کام بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے۔اسی زمانے میں وزارت لداخ ریاست جموں و کشمیر نے اردو میں ایک رسالہ مرتب کروایا تھا۔یہ رسالہ ''پیداوار و جانوران لداخ'' کے عنوان سے 1885ء میں مکمل ہوا۔اسی سال مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال ہوگیا۔رسالہ مرتب ہونے کے بعد وزارت لداخ، سردار محمد اکبر خاں نے اسے دیوان لکھپت رائے کی خدمت میں منظوری کے لیے پیش کیا تھا۔

پیداوار میں زمینی اور جانوروں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا گیا ہے۔زمینی پیداوار میں اکھروٹ (اخروٹ) ہاری، توت، انگور، سیب اور دوسرے میووں کی تفصیل دی گئی ہے اور ان کی پیدائش کے رقبوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔اسی طرح درختوں اور نباتات کی ان ساری قسموں کا بھی ذکر ہے جو اس دور دراز ملک میں پیدا ہوتے ہیں۔جانوروں میں جنگلی بیل، جنگلی بکری، ہرن، گرگ، جنگلی کتا، لونبڑی، (لومڑی) سانپ، جنگلی چوہا، خرگوش، مچھلی اور دریا سگ آبی، مرغ آبی، بگلا خورد، رام چکرا، ویشک (جو بیڑ جیسا ایک پرندہ ہوتا ہے۔کبوتر، برگو (ایک چڑیا) چلکا (ایک چڑیا) کی تفصیل لکھی گئی ہے۔دریاؤں اور کانوں کا حال بھی لکھا ہے کانوں کے بیان سے ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:

> ''علاقہ لو براہ موضع پنا ایک کے نزدیک ایک میدان ہے جس سے پھولی پیدا ہوتی ہے اور یہ جگہ لداخ سے پانچ منزل ہے اور علاوہ اس کے ایک کان پھولی علاقہ تانچی گوگرہ میں بھی ہے، مگر اوس جگہ سے لانے سے خرچ زیادہ آمدنی کم ہے۔اس واسطے اس جگہ سے لائی نہیں جاتی۔''

یہ رسالہ ایک سرکاری دستاویز ہے۔اور اس زمانے میں مرتب ہوا جب اردو کو ابھی سرکاری زبان کا مرتبہ نہیں ملا تھا نظم و نسق کی ایک رپورٹ کا حوالہ بھی اوپر گذر چکا ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرنے سے بہت پہلے ہی یہ سرکاری دفتروں اور عوام و خواص میں رائج اور مقبول ہو چکی تھی۔

اسی نوعیت کی ایک اہم دستاویز مہتہ شیر سنگھ کا سفرنامہ بھی ہے جو 1866-1867ء میں مرتب ہوا تھا۔مہتہ شیر سنگھ راپور (کشمیر) کے رہنے والے تھے اور مہاراجہ رنبیر سنگھ سرکار میں ملازم تھے۔مہاراجہ کے حکم سے انہوں نے پڑوسی ملکوں روس تاشقند، یارقند، خوقند بخارا وغیرہ کا دورہ کرکے تجارت کے مواقع معلوم کرنے اور اسے فروغ دینے کے مقصد سے یہ سفرنامہ مرتب کیا تھا۔یہ ایک طرح سے سرکاری رپورٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔مہتہ شیر سنگھ نے سرینگر سے لے کر ان ساری مقامات کے راستوں، وہاں کی حکومت اور کچھ سماجی حالات کی بھی تفصیل لکھی ہے۔نیز منازل اور فاصلوں کو کئی جدولوں کی صورت میں مرتب کیا ہے۔انہوں نے سفرنامے کے دیباچے میں اپنے متعلق چند باتیں اور سفر پر روانہ ہونے کی تفصیلات لکھی ہیں۔لکھتے ہیں:

> ''واضح ہو کہ یہ نمک پروردۂ قدیمی حضور انور سری مہاراجہ صاحب بہادر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فیاض زماں والی جموں و کشمیر، سکنہ خاص رامپور کا مہتہ شیر سنگھ نام قوم کا برہمن اور بہ نظر نمک اور آب و دانہ مقررہ، بہ روانگی واسطے کرنے دریافت حال تجارت ملک شاہ روس و امیر خوقند لطیف، و امیر بخارا شریف کے شہر سرینگر سے یعنی پایہ تخت حضور پُر نور بہ بدرقہ لطف الٰہی روانہ ہوا۔ چنانچہ یہ نیاز مند بتاریخ 16 ماہ ساون سمت 1923 بکر یاجیتی مکان مذکورہ سے بعد حصول قدمبوسی حضور انور براہ مظفر آباد و ہزارہ و اٹک و پشاور و کابل و بلخ و بخارا و سمرقند و طاش قند و خوقند لطیف و کاشغار و یارقند و لداکھ وغیرہ گردش کر کے بعد مدت شانزدہ ماہ بتاریخ 12 ماہ کاتک سمت 1924ء قدمبوس پایہ تخت جنت نظیر کا ہوا۔"

مہتہ شیر سنگھ نے کل 172 مقامات کا حال لکھا ہے۔ بعض چھوٹے چھوٹے مقامات کا ذکر انہوں نے ترک کر دیا ہے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اس سے سفرنامہ بہت طویل ہو جائے گا۔ ان ملکوں کے کچھ حالات سوالات اور جوابات کی شکل میں بھی لکھے ہیں۔ اس طرح یہ سفرنامہ بڑی مفید معلومات کا مخزن ہے اور ایک ایسے زمانے میں لکھی ہوئی دستاویز ہونے کی حیثیت سے جب سفر کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو آج کل موجود ہیں، یہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

یہ سفرنامہ مرتب ہونے کے بعد یکم فروری 1868ء کو دیوان نہال چند کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح اس سفرنامے کی حیثیت بھی سرکاری دستاویز کی ہو گئی ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دہلی ورینکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

سیّد ضمیر حسن

انیسویں صدی ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس دور کے مطالعہ سے اس ذہنی انقلاب کا پتہ چلتا ہے جو دبے پاؤں ہماری اجتماعی زندگی میں آ رہا تھا۔ پلاسی کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے وسطی ہندوستان اور صوبہ جات اودھ کی سیاسی ناک بندی کا کام بڑی تیزی سے شروع کر دیا تھا۔ اودھ کا الحاق اور ضابطہ انضمام اسی منصوبے کی دو اہم کڑیاں ہیں۔ اس وقت سلطنت مغلیہ کی شمع جھلملا رہی تھی اور انگریزی تسلط کی بنیادیں دن بدن مضبوط ہو رہی تھیں۔ 1803ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر شاہ عالم کو جو عبدالقادر روہیلہ کے ہاتھوں نابینا ہو چکا تھا۔ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور وہ تیموری جلال جس کے آگے کبھی شان عجم اور شوکت روم حقیر معلوم ہوتی تھی، نیست و نابود ہو گیا۔ شاہ عالم کی حکومت تو خیر پالم تک تھی لیکن اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت سمٹ کر قلعے کی چار دیواری تک رہ گئی۔ یہ بساط بھی 1857ء میں درہم برہم ہو گئی۔

غدر یکایک پیدا ہونے والا کوئی سیاسی ہنگامہ نہیں تھا۔ اسے حریت پسندوں کی آخری اور اجتماعی جدوجہد کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انگریزوں نے ہندوستان کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے گذشتہ دو سو برس سے جو سازشوں کا جال پھیلا رکھا تھا اس سے ہندوستان کے وہ لوگ جن کی نگاہ دور تک جاتی تھی بے خبر نہ تھے۔ اس عہد کا اردو ادب ٹوٹی پھوٹی جاگیردارانہ اقدار کا علم بردار سہی، بیرونی مداخلت کاروں کی اس شکست وریخت کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم نے اس ادبی سرمائے کا اس نظر سے جائزہ نہیں لیا۔ معاشی استحصال جو انگریزوں نے ہندوستان میں ایک مدت تک کیا تھا اور جس کے بل پر انگلستان کے صنعتی انقلاب میں جان پڑ گئی تھی، ہماری پسپائی کا سب سے بڑا سبب بنا۔ یہ بات مصحفی جیسے غزل گو کی نگاہ دوررس سے پوشیدہ نہ تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی

کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی!!

یا دیسی حکمرانوں کی بے دست وپائی پر جرأت جیسے معاملہ بند شاعر کا یہ اظہار خیال بڑا معنی خیز ہے۔

کہیے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر انگریزوں کے ہاتھ قفس میں اسیر

جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے اسیر

مختصر یہ کہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ وتصرف محض عسکری تغلب کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ داستان اورنگ زیب کی وفات سے غدر تک تقریباً ڈھائی سو برس کی مدت میں پھیلی ہوئی ہے۔

مینا نہ یورپ کے دستور نرالے ہیں لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

(اقبال)

اس موقعہ پر اپنی کوتاہیوں کا ذکر کرنا ہی کچھ بے جا نہیں ہے۔ زندگی کے وہ فرسودہ ضابطے جو قوموں کی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں ہماری تہذیب کا ایک لازمی جزو بن گئے تھے۔ حرکت اور عمل کا دور دور کہیں پتہ نہیں تھا۔ شاہان اودھ اور وارثان تخت دہلی معزول کیے جانے پر عورتوں کی طرح روتے تھے۔ جدوجہد کرنے، تلوار دکھانے اور میدان میں نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ان میں باقی نہ رہا تھا۔ یہ صورت حال بھلا کب تک برقرار رہتی۔ آخر وہی حشر ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ کوئی ماحول کی ظلمت سے لڑے یا نہ لڑے رات خود صبح کے آثار تک آ جاتی ہے سیاسی بساط کے ساتھ ساتھ تہذیبی بساط پر بھی زندگی آموز تبدیلیاں رونما ہونے لگتیں، نئے تقاضوں اور نئی تبدیلیوں نے تکلفات کا طلسم توڑا۔ اور زندگی میں سادگی اور سچائی کی نئی روایات جگہ پانے لگیں۔ اردو ادب کا نگار خانہ میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہا ہے۔ اسمیں ایک سماجی احساس اور زندگی کے تقاضوں کا احترام موجود ہے۔ چنانچہ ان حقیقت پسندانہ تبدیلیوں کو جو انگریزی تسلط کے ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام کی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب لا رہی تھیں فروغ دینے میں اردو ادب زندگی کے کسی دوسرے شعبہ سے پیچھے نہیں ہے۔
نئے سائنٹفک ذہن بنانے اور سنوارنے میں اس کا قابل قدر حصہ ہے اس کار خیر کو بالعموم سرسید اور ان کے رفقاء کار سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ باوراپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے سرسید تحریک اس نکوکامی کی بجا طور پر مستحق بھی ہے۔ لیکن اس کی چمن بندی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور قدیم دلی کالج کی ان روایات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جنہوں نے عہد وسطیٰ کے اختتام پر ہمیں نئے مغربی نقطہ ہائے نظر سے مصالحت کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے وسط تک جو کارہائے نمایاں ان دوداداروں نے ادبی اور خصوصاً نثری سطح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرانجام دیئے ہیں انہیں نظرانداز کر کے اس پورے انقلاب کو سمجھنا جس کے نتیجہ میں ہندوستان قدیم سے جدید دور میں داخل ہوا۔قریب قریب ناممکن اور بڑی گمراہ کن بات ہے۔فورٹ ولیم کالج 1800ء میں صاحبان نوآموز کو اردو پڑھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔اسی لیے وہ صرف زبان دانی کا کالج ہو کر رہ گیا اور اس کا اثر بھی طرز و اسلوب کی مدد سے آگے نہ بڑھ سکا۔اس کے مخاطب ہندوستانی نہیں انگریز تھے اور اس کی تعمیر میں مستشرقین کے پیش نظر کچھ سیاسی مفادات کا حصول بھی تھا اس لیے بیرون کالج اس کا زیادہ اثر نہ ہو سکا لیکن دہلی کالج ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے قائم کیا گیا تھا۔اور اس کا اصلی مقصد ان کو اردو کے ذریعے یورپی علوم سے روشناس کرانا تھا اسلیے ایک نئی فضا اور ایک نئی کشش جہت پیدا کرنے میں دہلی کالج نے فورٹ ولیم کالج کے مقابلے پر زیادہ گراں قدر خدمات انجام دیں۔ہندوستان میں انگریزوں کے اثر سے بنگال میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی اس کی حیثیت ادبی ہے مگر دہلی میں اس کی حیثیت سائنسی ہے۔اس قدیم شہر میں جو پرانی تہذیب کا علامتی مرکز تھا مغربی تمدن کی برکتوں کا یہ احساس کبھی بھی اتنی جلد پیدا نہ ہوتا اگر دہلی کالج کی نامور شخصیتیں اس کے لیے شعوری کوشش نہ کرتیں اور وہ اپنی تصانیف کے ذریعہ ان خیالات کی باقاعدہ اشاعت نہ کرتیں۔مادری زبان میں تعلیم سے کس طرح علوم کے سب دروازے طلباء پر کھلتے ہیں اور ان کی شخصیت میں کس طرح استواری، گہرائی، حسن اور نکھار آتا ہے۔اس کی سب سے اچھی مثال دہلی کالج کی تاریخ ہے۔

دہلی کالج کے تعلیمی تجربوں کے ساتھ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔یہ سوسائٹی 1842ء میں قائم ہوئی۔اور غدر سے پہلے تک اسے ایک سو سترہ (117) کتابیں ترجمے اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ تیار کر لی تھیں!ان کتابوں کی تیاری میں علمی اصطلاحوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے جو اصول ملحوظ رکھے گئے تھے۔وہ آج بھی ہمارے لیے شمع راہ بن سکتے ہیں۔افسوس ہے کہ دارالترجمہ حیدرآباد نے ان متوازن اصولوں کا خاطر خواہ خیال نہ رکھا جس کی بناء پر اردو ترجمے کی روایت میں آگے چل کر کجی آ گئی اور انگریزی اصطلاحات کے مترادفات کے نام پر ثقیل عربی اور فارسی الفاظ نے ہمارے ترجموں کی افادیت کو مجروح کر دیا۔کچھ عرصے سے پہلے تک دہلی کالج کے کارناموں سے ناواقفیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ فورٹ ولیم کی ادبی اور علمی کوششوں اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے درمیان اس اہم اور وقیع کڑی کو لوگ جانتے ہی نہ تھے اور اس وجہ سے انیسویں صدی کے نصف اول کو اردو نثر کا تاریک دور کہا جاتا تھا، حالانکہ غالبؔ کے خطوط کی سادگی، سرسید کے اسلوب کی واقعیت اور اصلیت اور آزاد اور حالی کے افق ذہنی کی تعمیر میں دہلی کالج اور دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی پیدا کردہ نئی فضا کو جو دخل ہے وہ کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔دہلی کالج ان چند ہندوستانی اداروں میں سے ایک ہے جہاں 1824ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما کی سفارش پر برطانوی پارلیمنٹ کے ایک فیصلہ کی رو سے انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ان لوگوں میں جنہوں نے دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو فروغ دینے میں سعی بلیغ انجام دی،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسٹر بوترو، ڈاکٹر اشپرنگر، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء الہ، پنڈت رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرشاد، پیارے لال، ہردیو سنگھ اور ڈاکٹر ضیاء الدین قابل ذکر ہیں۔ اور ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اس انجمن نے جو مفید کتابیں شائع کیں وہ طلباء کے بہت کام آئیں اور ان کی دیکھا دیکھی آگرہ اور لکھنو میں بھی اس قسم کی کتابیں شائع کرنے کے لیے ادارے قائم کیے گئے اور یہاں سے بھی کئی کتابیں شائع کی گئیں۔ جو انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ان تراجم، تصانیف اور تالیفات سے ایک طرف تو اردو نثر بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو گئی اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مغربی علوم فلسفہ اور افکار سے ہندوستانی طلباء کو براہ راست واقفیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ کئی موقعوں پر جب مقامی زبانوں میں تعلیم و تدریس کا سرکاری جائزہ لیا گیا تو دلی کالج میں اردو کے ذریعہ جو سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی اسکی بڑی تعریف کی گئی۔ بقول مولوی عبدالحق ریاضی نیچرل سائنس، فلاسفی، اور تاریخ وغیرہ میں شعبہ انگریزی کے طلباء کو اردو ذریعہ تعلیم کے طلباء نیچا دکھلانے لگے تھے اور مقابلے کے امتحان میں بازی لے جاتے تھے۔ مادری زبان میں تعلیم دینے کا تجربہ دہلی کی اس قدیم درسگاہ میں جس قدر کامیاب ہوا اس کا اندازہ اس زمانہ کی تعلیمی رپورٹوں سے بخوبی کیا جاسکتا ہے البتہ اس راہ میں جو دشواری تھی وہ یہ تھی کہ جدید مغربی علوم پر ہندوستانی زبانوں میں کتابیں نایاب تھیں۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، علم کیمیا، نباتات، علم جراحی، علم تمدن، علم معاشرت پر اردو میں نہ تو خود تصنیف کردہ کتابیں تھیں اور نہ ہی تراجم دستیاب ہوتے تھے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے متعدد کوششیں کی گئیں ایک ایجوکیشنل کمیٹی بھی قائم ہوئی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر علم و ادب کے دلدادگان کے زیر اثر ایک تحریک چلی جس کے تحت انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنۂ ملکی وجود میں آئی۔ اس انجمن کے سرپرست اور معاون ہندوستانی اور انگریز دونوں ہی تھے۔ انتظامیہ کمیٹی مندرجہ ذیل چھ افراد پر مشتمل تھی۔

۱۔ ٹی منکاف ۲۔ سی گرانٹ ۳۔ اے سی، ریون شا ۴۔ ڈبلیو سین کونٹن، ۵۔ دوارکا ناتھ ٹیگور، ۶۔ دہلی کالج کے پرنسپل چونکہ اس کے فعال ممبر پرنسپل دہلی کالج مسٹر بوترو تھے، انہوں نے ہی نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور جب تک یہ جماعت قائم رہی دہلی کالج کے مدرسین اور طلباء ہی سب کام سرانجام دیتے رہے اس لیے اس انجمن کو بقول ڈاکٹر عبدالحق دہلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ یہ سوسائٹی ہندی اور بنگالی دونوں زبانوں میں کام کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ مالی مجبوریوں کے باعث اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اردو اپنی مقبولیت کی بنا پر مغربی علوم کی ترویج کا سب سے موثر آلہ ہے اس نے بعد میں صرف اردو تراجم ہی پیش کیے۔

دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر کا دامن وسیع کرنے میں جو اہم خدمت انجام دی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اٹھارویں صدی کے نصف اول میں اردو زبان میں متنوع مضامین اور موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کردیں اور اسی روایت نے آگے چل کر اردو نثر کی روایت کو اتنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فروغ دیا کہ بقول مہدی افادی یہ کل کی چھوکری یورپ کی بڑی زبانوں سے آنکھ ملانے کے لائق ہوگئی۔'' دہلی ورینکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی تالیفات اور تراجم سے کچھ اہم کتابوں کے نام ذیل کی فہرست میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ تاریخ انگلستان (خلاصہ تاریخ گولڈ اسمتھ)

۲۔ تاریخ یونان

۳۔ تاریخ روم

۴۔ رامائن

۵۔ مہابھارت

۶۔ دھرم شاستر

۷۔ رسالۂ اصول حساب

۸۔ مبادیات تفرقی احصاء و تکمیلی احصا

۹۔ روشنی کا انعکاس اور اجتماع شعاع

۱۰۔ تجزیاتی جیومیٹری

۱۱۔ ہائڈرو اسٹیٹیک

۱۲۔ حرارت

۱۳۔ برقیات

سب سے زیادہ اہم بات جس کا ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے ان قواعد و ضوابط کی ہے جو اس ادارے نے ٹرانسلیشن کے لیے مقرر کیے تھے۔ ان قواعد کی روشنی میں ہمیں آئندہ کے امکانات کی راہ متعین کرنی چاہیے۔ اور زبان کو اس نیچرل رجحان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے جس سمت میں یہ ادارہ تراجم اور تالیفات کی شکل میں لسانی پیش رفت کر رہا تھا۔

۱۔ جب سائنس کا کوئی ایسا لفظ آئے جس کا مترادف اردو میں.... نہیں مثلاً سوڈیم، پوٹاسیم، کلورین، وغیرہ تو ایسے لفظ بجنسہ اردو میں لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی قاعدہ ایسے خطابات والقاب کے بارے میں مدنظر رکھا جائے جس کے مساوی خطابات والقاب ہندوستان کی تاریخ میں نہیں پائے جاتے۔ مثلاً بشپ، ڈیوک، ارل، کلکٹر۔

۲۔ اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا سترادف اردو میں پایا جاتا ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کرنا چاہیے جیسے آئرن کے لیے لوہا، سلفر کے لیے گندھک منسٹر کے لیے وزیر سمتر کے لیے طلب نامہ۔

۳۔ اگر لفظ مرکب ہے اور ہر لفظ دو لفظ انگریزی میں اور دونوں میں سے کسی کا سترادف اردو میں نہیں تو وہ لفظ بجنسہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو میں منتقل کر دیا جائے جیسے ہائڈروکلورک کیونکہ ہائیڈروجن اور کلورین میں سے کسی کا مترادف اردو میں نہیں ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پورے انگریزی جملے کو بجنسہ اردو میں لے لیا جائے بلکہ اسے اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے مثلاً منٹ آرڈر آف دی باتھ کو شکری جماعت باتھ کی اور ملٹری اینڈ ریلیجس آرڈر آف مالٹا کو لشکری و مذہبی جماعت مالٹا کی ترجمہ کیا جائے۔

۴۔ اگر لفظ مرکب ہے اور اردو میں اسکا مترادف نہیں مگر الگ الگ لفظ کے مترادف اردو میں موجود ہیں تو یا ان دونوں لفظوں کو ملا دیا کسی دوسرے مساوی مفہوم کا الفاظ میں ترجمہ کیا جائے مثلاً ق کرانولوجی کا ترجمہ علم زماں ہاؤس آف لارڈز کا، کچہری امیروں کی اور ہاؤس آف کامنز کا کچہری وکلائے رعایا کی۔

۵۔ جب یہ قاعدہ یا قاعدۂ ذیل آسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر غیر زبان کا لفظ اردو میں لیا جائے جیسے ہائیڈروجن۔ نائٹروجن۔

۶۔ اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہے جن میں سے ایک کا مترادف اردو میں موجود ہے مگر دوسرے کا مترادف نہیں تو ایک انگریزی اور دوسرے اردو لفظ سے مرکب بنالیا جائے جیسے کورٹ آف ڈائریکٹرز کا ترجمہ کچہری ڈائریکٹروں کی آرچ بشپ، بشپ اعلیٰ کرلیا جائے۔

۷۔ بعض لفظ ایسے ہیں جیسے آرڈر، کلاس، جنیس، اسپشیز جن کے مترادف اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ اردو میں اس قسم کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں۔ اور اس سے ایک دوسرے کے مفہوم سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان الفاظ سے معانی کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت ہے۔

۸۔ درختوں کے انواع (خاندانوں) کے نام یا تو اس نوع خاندان کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا اس نوع کی مشترکہ خاصیتوں کی بنا پر نام رکھ لیا جاتا ہے اس قاعدے کی پابندی اردو میں کی جائے۔

اوپر کے قواعد میں اردو مترادف سے مطلب ایسا لفظ ہے جو ملک کے تعلیم یافتہ اور متوسط درجے کے طبقہ میں معروف ہے اگر ہماری مشرقی زبانوں کی ڈکشنریوں میں کوئی مترادف لفظ نہیں ملے اور پنڈتوں اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے یہ بہتر ہوگا کہ انگریزی لفظ ہی اختیار کر لیا جائے سائنس کا ترجمہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا۔ اسلیے انگریزی الفاظ سے زبان کو بچانا تقریباً ناممکن ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اس سے قبل لکھی جا چکی ہیں انہیں مہیا کرنے اور جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو انہیں الفاظ کے استعمال کرنے کی کوشش کرے۔ جو ان کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ جب کسی انگریزی کے جملے میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہندو واقف نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیہ میں یا مناسب ہو تو متن میں اسکی مختصر طور سے تشریح کر دے۔

مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمے کی کبھی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنی جملے کے معنی اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہے خواہ اس کی ساخت یا طرز ادا کیسی ہی مختلف نہ ہو۔

کیمسٹری کی اصطلاحات کے بارے میں یہ رائے دی گئی تھی کہ تمام اصطلاحات تو بجنسہ اردو میں لے لینا مناسب ہوگا۔ البتہ کیمیائی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں وہ ویسے ہی رہنے دیئے جائیں لیکن مرکبات میں انگریزی نام ہی رہیں۔ جیسے ہائیڈروسلفیورک۔ چونکہ اصطلاحی الفاظ کے مادے تعداد میں بہت زیادہ ہیں اس لیے انکے تفہیم میں زیادہ مشکل نہ ہوگی۔

نباتات کا ترجمہ بہت کٹھن ہے۔ یورپین مصطلحات کا لفظی ترجمہ بالکل مہمل ہو جائے گا۔ البتہ جو طریقہ درختوں کے نام رکھنے کا بتایا گیا ہے وہ بہتر رہے گا اور عام طور پر مستعمل ہے خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ یورپ کے کسی خاندان کے نہایت ممتاز افراد ہمیشہ وہی نہیں ہوتے جو ہندوستان میں ہیں۔ بہر حال یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی صاحب جو نباتات کا علم رکھتے ہوں اور اردو بھی خوب جانتے ہوں اس کام کو انجام دیں۔

اردو تراجم کے مذکورہ بالا اصول آج بھی ان اداروں کو سامنے رکھنے چاہئیں جو یہ کام کر رہے ہیں۔ دہلی ورنیکلر سوسائٹی نے غیر زبانوں سے تراجم اور تالیفات کا کام کر کے اردو نثر میں بڑی رنگارنگی پیدا کی ہے اور اس اعتبار سے اس سوسائٹی کے کارنامے ادب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے لائق ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سوسائٹی کے قیام سے پہلے اردو زبان دکن اور دہلی میں ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھیں لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے اس وقت یہ ابھی ابتدائی حالت میں تھی۔ گو فورٹ ولیم کالج کے ادیب اس سلسلے میں کچھ کام کر چکے تھے مگر یہ کام محدود تھا سوائے آرائش محفل، تاریخ شیر شاہی یا تاریخ نادری کے یا دو ایک تذکروں کے اور جو کچھ بھی لکھا گیا وہ افسانوی قسم کا تھا، درسی یا سائنسی قسم کا ادب یہاں لکھا گیا زبان کو سادہ اور کار آمد بنانے کا جو کام میر امن، حیدری اور اکرام علی کے ہاتھوں شروع ہوا تھا، دہلی کالج میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ دہلی کالج میں کام کرنے والوں نے نئی تہذیب سے مفاہمت کی ایسی فضا پیدا کی تھی جس سے بعد میں مرزا غالب، سرسید، نذیر احمد حالی اور آزاد سب متاثر ہوئے اس لحاظ سے دہلی کالج اردو ادب کے درمیانی ارتقاء کی وہ کڑی ہے جسکا ایک سرا فورٹ ولیم سے ملتا ہے تو دوسرا غالب و سرسید سے لہٰذا اردو ادب کے ارتقاء کے اس پہلو کا تفصیلی مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ: اصطلاحات کے مباحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل

آل احمد سرور

زبان کی سہولت کے لیے، تین قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ایک کاروباری زبان جس میں اپنا مطلب کسی طرح نکالنا ہوتا ہے، جس میں معنی کی ایک ہی سطح پر توجہ ہوتی ہے، جس میں منطقی ترتیب، بہتر لفظ یا موزوں ترین لفظ کی قید نہیں ہے۔ یہ زبان اسم، صفت یا فعل کے سیدھے سادے استعمال سے کام چلاتی ہے۔دوسری قسم ادبی زبان کی ہے جس میں لفظ کا تخلیقی استعمال شاعری میں اور تعمیری استعمال نثر میں ہوتا ہے۔ادبی زبان میں ماورائے سخن بھی بات ہوتی ہے۔ یہ زبان تشبیہ، استعارے، علامت اور رمزوایما کی وجہ سے گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتی ہے۔ یہاں کیا کہا گیا ہے اس سے زیادہ کیسے کہا گیا ہے پر توجہ ہوتی ہے۔ بقول ٹڈلٹن مرے یہاں الفاظ پر فتح کا ایک منظر سامنے آتا ہے کیونکہ لفظ ایک پہلودار ہیرے کی طرح بہت سی شعاعیں دیتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پیچیدگی، ابہام، اندیشہ ہائے دوردراز کی کافی گنجائش ہے۔تیسری قسم علمی زبان کی ہے جس سے ہمیں اس وقت بحث ہے۔علمی زبان میں اظہار منطقی ہوتا ہے، حقیقی مفہوم ادا کرنے پر توجہ ہوتی ہے، کاروباری زبان میں سیدھے سادے خیال اور فوری مطلب کو ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔علمی زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو اس طرح ادا کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن میں روشنی کر دے۔مہذب زبان کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ ادبی اظہار اور علمی اظہار دونوں کے لیے سرمایہ رکھتی ہو۔ کاروباری اظہار تو زبان کی ابتدائی حالت میں بھی کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔

مشرقی زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جذباتی اظہار پر تو پوری طرح قادر ہیں مگر ذہنی اظہار کے لیے انہیں ابھی بہت ترقی کرنا ہے۔گویا ادبی اظہار کے علاوہ علمی معیار سے بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ ایک زمانے میں شاعری علوم کی زبان بھی تھی مگر رفتہ رفتہ اس نے اپنے مخصوص کردار کو پہچان لیا۔اب مغرب میں کوئی تاریخ نظم نہیں کرتا نہ منظوم جغرافیہ لکھتا ہے، نہ نفسیات اور معاشیات کے مسائل نظم کرتا ہے۔شاعری فرد کے جذبے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ترجمان بن گئی اور نثر اس کے ذہن کی۔ علمی نثر کی ترقی اسی میلان کا نتیجہ ہے۔ اس ترقی نے شاعری کو بھی فائدہ پہنچایا، کیونکہ ادبی اظہار اور علمی اظہار الگ الگ راستوں پر گامزن ہونے کے باوجود چور دروازوں اور پگڈنڈیوں کے ذریعے سے ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مشرقی زبانوں میں علمی اظہار کی کوئی روایت نہیں ہے یا علمی زبان بہت کم ملتی ہے، خود اردو ہی کو لے لیجیے۔ اس میں علمی نثر انیسویں صدی کے وسط سے ملنے لگتی ہے۔ اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں اسے بڑی ترقی ہوئی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ علمی زبان پر ادبی زبان و اسالیب کا اثر زیادہ رہا ہے چنانچہ آج بھی علمی نثر کی تعریف کرتے وقت اس کی سلاست، شگفتگی، روانی پر زور دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں افسانے کی سی دلچسپی ہے۔

اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ہم آج کی صحبت میں سب سے پہلے علمی نثر کی ضروریات پر کچھ غور کر لیں کیونکہ ترقی اردو بورڈ کا کام اس علمی نثر کو فروغ دینا ہے۔ اس فروغ کا مقصد صرف معلوماتی ادب کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا ہی نہیں، خیال اور ذہن کو تقویت دے کر زیادہ سے زیادہ پیچیدہ مفاہیم اور نازک ترین کیفیتوں کے اظہار پر قدرت حاصل کرنا اور اس زبان کو وسعت اور جامعیت عطا کرنا ہے۔ علمی نثر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مشکل ہو یا آسان، عربی لے رکھتی ہو یا ہندی۔ علمی نثر علم کے مطالب کے اظہار کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں علم کے مبادیات عام فہم زبان میں بیان کرنا ہیں۔ وہاں وہ آسان ہوگی تو اس کے ساتھ موٹی موٹی باتوں پر اکتفا کرے گی۔ جہاں وہ اس علم کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالے گی وہاں اس کا فرض اتنا ہی ہوگا کہ وہ سچ اور صرف سچ بولے اور پوری بات کہے۔ اس سے اصطلاحات سے اسے لازمی طور پر کام لینا پڑے گا۔ اس کا مقصد معلومات عطا کرنا ہوگا، جذبات سے اپیل نہیں۔ علوم کی بہت قسمیں ہیں انہیں سہولت کے لیے تین خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ قدرتی علوم، جس میں طبعی علوم اور حیاتیاتی علوم آتے ہیں۔ سماجی علوم جن میں سیاسیات، اقتصادیات، نفسیات، لسانیات، جغرافیہ، تعلیم آتے ہیں۔ تاریخ کو پہلے انسانی علوم (Humanities) میں رکھا جاتا تھا، اب اسے سماجی علوم میں شامل کیا جاتا ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادبیات آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قدرتی علوم میں سے طبیعیاتی علوم میں نثر کی زبان خالص معلوماتی ہوتی ہے اور اس کا نصب العین ریاضی کی طرح قطعیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ حیاتیاتی علوم میں انواع کے رشتوں کی تفصیل اور ارتقا کی منزلوں کی تشریح کے سلسلے میں بیانیہ انداز کی وہ وضاحت بھی ضروری ہے جس میں ایک خوشگوار لہجہ ہو سکتا ہے مگر اسے کسی طرح نمایاں نہ ہونا چاہیے۔ اجتماعی علوم کے سلسلے میں معلومات ہی کا معاملہ نہیں۔ یہاں رشتوں کی پیچیدگی کے علاوہ اسباب و علل کے سلسلے کو بھی ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ قوموں کی تقدیر، سرا رامم، نفسیات کی بھول بھلیاں، سماج کی سیڑھیاں، کسب زر کی داستان، مختلف خطوں کی آب و ہوا کا طبائع اور نفسیات پر اثر، غرض سماجی علوم میں چونکہ تنہا معلومات کا سوال نہیں بلکہ معلومات کی ترتیب، بنیادی اور فروعی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسائل کی تشریح اور مختلف نظریات کے تحت ان کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے اس لیے سماجی علوم میں نثر کا کام قدرتی علوم سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قدرتی علوم میں زیادہ تر ایک نظریے کے مطابق اظہار خیال ہوتا ہے۔ سماجی علوم کے معاملے میں نظریوں کی کثرت ہے۔ قدرتی علوم کے سلسلے میں مکمل معروضیت ممکن ہے۔ سماجی علوم کے سلسلے میں اس کی کوشش ضروری ہے مگر شخصی نظریا داخلی انداز کا دخل بھی ہو ہی جاتا ہے جس کی وجہ سے جذبے کی زبان کو کچھ بار مل جاتا ہے۔ مگر نصب العین یہاں بھی معروضیت ہے۔ انسانی علوم میں فلسفہ علم کی وہ شاخ ہے جہاں مجرد تصورات سے بحث ہے، جلوؤں کی کثرت میں ایک وحدت دیکھنے کی سعی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایک نظام فکر بنانے یا ایک ذہنی محور پانے کی جستجو۔ اس لیے فلسفے کی بنیاد منطق پر ہے اور استدلال اس کا طریقہ کار ہے۔ برٹرنیڈ رسل نے کہا ہے کہ شوپنہار، نیٹشے اور برگسان کو خالص فلسفی اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے یہاں ادبیت بھی در آئی ہے۔ یعنی ان کی بظاہر طاقت دراصل ان کی کمزوری ہے۔ کانٹ کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ ادبیات کے سلسلے میں ادبی تنقید علوم کے ذیل میں آتی ہے۔ اس لیے جدید دور میں اسے زیادہ سائنٹفک بنانے پر زور دیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ بہرحال ادب کی ایک شاخ ہے اس لیے اور سائنسی ہوتے ہوئے بھی ادبی اظہار سے اپنا رشتہ توڑ نہیں سکتی، ہاں تاثرات کی دلدل سے اسے ضرور نکلنا ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہم علوم کی زبان کی خصوصیات ہی کو ذہن میں رکھیں، معلومات دینے کو سب سے زیادہ اہمیت دیں، پھر منطقی ترتیب، معروضیت اور ایک غیر جانب دار زبان کو جو جذبے گرمی یا شخصیت کے لمس سے بڑی حد تک آزاد ہو۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہمیں ترقی اردو بورڈ کے تراجم اور تصانیف کے کام کو آگے بڑھانا ہے۔

ترجمے کے کام کو اب تک تصنیف کے مقابلے میں عام طور پر حقیر سمجھا گیا ہے۔ یہ بہت غلط میلان ہے۔ ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق سے کم نہیں۔ ترجمے میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے اس لیے امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق (Recreation) کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ترجمے کے ذریعے سے ہم دوسری زبانوں کے افکار و اقدار سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایک فاضل کے الفاظ میں مترجم کا کام صرف لسانیاتی نہیں بشریاتی (Anthropological) بھی ہے یعنی اسے صرف اصل زبان (Source Language) سے ہی واقفیت نہیں ہونی چاہیے، اسے اس زبان کی تہذیب اور معاشرے سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔ اس کی دو مثالیں دینا ضروری ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے لیے روم کی تاریخ کے ترجمے میں (Papal Bulls) کا ترجمہ پاپائی سانڈ کیا گیا تھا۔ اردو کے ایک ممتاز ادیب نے اپنی کتاب میں شیکسپیئر کے ایک ڈرامے As you like it سے ژاک کی ایک تقریر کا حوالہ دیا۔ اس میں لفظ (Humour) کا ترجمہ مزاح کیا گیا تھا حالانکہ یہاں طبی اصطلاح خلط مراد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغرب کی رومانی تحریک میں مشرقی ادب کے تراجم کا بڑا اثر ہے۔ جدیدیت کی تحریک میں چین اور جاپان کی شاعری کے تراجم کا بھی دخل ہے۔ ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ پر مغربی ادب کے تراجم براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔ ہماری علمی نثر اور جدید نظم دونوں مغربی تراجم کے سہارے آگے بڑھے ہیں۔ اس لیے ترجمے کی اہمیت کسی طرح تخلیق یا تصنیف سے کم نہیں۔ یہ تخلیق کے لیے بھی نئے زمین وآسمان دیتا ہے اور علمی موضوعات پر تصانیف کے لیے بھی ذہنی غذا مہیا کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ علمی کتابوں کے ترجمے میں آزاد ترجمے یا اصل خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں وہی بات ہے کہ خوب پیو ورنہ مقدس چشمے کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہاں صرف لفظی ترجمے اور مطابق اصل ترجمے یعنی (Literal and Faithful)، پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ لفظی ترجمے میں لسانیات کی رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل متنی اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ترجمہ صرف لسانیاتی عمل نہیں بشریاتی عمل بھی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مطابق اصل کو ترجیح ہوئی چاہیے کیونکہ ہر زبان کی صرفی ونحوی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں۔ خصوصاً انگریزی ترجمے میں تو لفظی ترجمہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے اس لیے مطابق اصل کے معنی یہ ہوئے کہ اصل زبان کے متن کو ترجمے کی زبان کے ایسے الفاظ میں ڈھالا جائے جو ترجمے کی زبان کی جی نی اس (genius) کے مطابق ہوں مگر اصل زبان کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرنے پر قادر ہوں۔ یوں تو ایلیٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ کس زبان کی شاعری کا ترجمہ دوسری زبان میں ناممکن ہے مگر ترجمے ہوئے ہیں اور ان کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ ترجمے کو جووٹ نے ایک مفاہمہ کہا ہے۔ یہ مفاہمہ بہرحال کبھی زیادہ کامیاب ہوتا ہے کبھی کم۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ترجمہ نہیں ہو سکتا یا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک ادب العالیہ یا علمی سرمائے کے ترجمے کا سوال ہے اس سلسلے کی افادیت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں مطابق اصل ترجمے پر زور دیا جا سکتا ہے۔ اس ترجمے کے لیے چند شرائط ہیں۔ مترجم اس موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور اپنی زبان کے سرمائے پر بھرپور نظر کے علاوہ اصل زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ اگر وہ موضوع سے واقف ہے اور اصل زبان سے بھی بڑی حد تک آشنا ہے مگر اپنی زبان کے سرمائے پر اس کی نظر نہیں ہے تو وہ جابجا ٹھوکریں کھائے گا۔ اس کی زبان اکھڑی اکھڑی ہوگی اور اس کا ترجمہ پڑھنا ایسا ہوگا جیسا ناہموار راستے سے گزرنا۔ اگر وہ اپنی زبان پر عبور رکھتا ہے مگر اصل زبان سے اس کی واقفیت محدود ہے تو ظاہر ہے اور بھی خطرناک صورت پیدا ہو جائے گی پھر علوم کے تراجم میں زبان یا زبانیں جاننے سے بھی مقدم اس علم سے واقفیت ہے اس لیے بھول کر بھی صرف زبان پر یا زبانوں پر عبور کی وجہ سے ترجمے کا کام کسی کو نہ دینا چاہیے۔ موضوع سے واقفیت بنیادی شرط ہے، اس کے بعد اصل زبان سے اور پھر اپنی زبان سے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیٹ رائٹ (امریکہ) کی Mass translation project میں یہ طریقہ برتا گیا ہے۔

Translator-Quality Control, Technical Editor Language

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Editor.

مترجم، معیار کا نگران، ٹیکنیکل ایڈیٹر، زبان کا ایڈیٹر۔

اس لیے میری رائے میں ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے تو موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لیے ایک دوسرے ماہر کو کتاب دکھانا چاہیے جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو۔ اس کے بعد ٹیکنیکل ایڈیٹر سے مدد لینا چاہیے جو صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب، اعداد و شمار، چارٹ وغیرہ درست ہیں۔ آخر میں زبان کے ماہر کی نظر بھی ضروری ہے تاکہ ترجمہ زبان کی جی نی اس (genius) کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت اجنبی نہ معلوم ہو۔ علمی کتابوں کے ترجمے کے لیے اردو میں اچھے نمونے موجود ہیں۔ مرزا ہادی رسوا، عبدالباری، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالمجید سالک، فلسفۂ جذبات اور مکالمات برکلے والے مولانا عبدالماجد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی، عزیز احمد، اختر حسین رائے پوری، امتیاز علی تاج، لطیف الدین احمد، مبارز الدین رفعت، رحم علی الہاشمی نے قابل قدر ترجمے کیے ہیں۔ پھر بھی انہیں حرف آخر سمجھنا غلط ہوگا۔ ترجمے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اصل میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ یورپ میں ایک بین قومی جماعت ہے جس کا نام FIT ہے۔ یعنی فیڈریشن آف انٹرنیشنل ٹرانسلیٹرس۔ اس نے مترجموں کا ایک چارٹر مرتب کیا ہے۔ اس کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ مشکل فقروں کو مختصر کرنا یا انہیں خارج کر دینا غیر اخلاقی بات ہے۔ اس کے چند اور اصول قابل ذکر ہیں: ایک تو ''اصل زبان کے بجائے کسی درمیانی زبان کے ذریعے سے ترجمہ ایک ایسا مفاہمہ ہے جو غیر تسلی بخش ہے۔'' دوسرے ''نظم کا نثر میں ترجمہ فن پارہ کہلانے کا مستحق نہیں''۔ تیسرے ''اسٹائل اور فارم کے معاملے میں عملی طریقۂ کار اپنانا چاہیے''۔ مثلاً اصل زبان میں اگر کوئی ذو معنی لفظ ہے تو اس کا لفظی ترجمہ مناسب نہیں۔ یہاں اس سے ملتا جلتا ترجمے کی زبان کا لفظ ہونا چاہیے جس میں یہی رعایت ہو۔ اب میں چند مشہور ترجموں سے مثالیں دے کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ان کو نظر انداز کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں۔

ارسطو کی کتاب فن شاعری (Poetics) یا بوطیقا مغربی تنقید کا صحیفۂ اول کہی جا سکتی ہے۔ آج تک مغربی تنقید میں اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے پر بحث ہوتی ہے اور اس سے برابر نئے معانی اور مطالب نکالے جاتے ہیں۔ یہ ان بنیادی کتابوں میں سے ہے جس کا ترجمہ دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں موجود ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ عزیز احمد نے ۱۹۴۱ء میں کیا تھا۔ عزیز احمد کا ترجمہ عام طور پر اچھا ترجمہ سمجھا جاتا ہے مگر ارسطو کی ٹریجڈی کی تعریف کا ترجمہ ملاحظہ کر کے آپ خود فیصلہ کیجیے۔ پہلے انگریزی ترجمہ ملاحظہ کیجیے پھر عزیز احمد کا ترجمہ۔ پھر اس پر تنقید اور آخر میں میرا ترجمہ۔

"Tragedy, then, is an imitation of an
action that is serious, complete, and

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

of a certain magnitude; in language embellished with each kind of artistic ornament, the several kinds being found in separate parts of the play; in the form of action, not of narrative, through pity and fear, effecting the proper purgation of these emotions".

BUTCHER

ٹریجڈی نقل ہے، کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا ہو جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو جس سے حظ حاصل ہوتا ہو لیکن مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے جو دردمندی اور دہشت کے ذریعے اثر کر کے ایسے ہیجانات کی صحت و اصلاح کرے۔

اردو میں اوقاف کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ عزیز احمد نے صرف اُلٹے کاما اور وقفے کا استعمال کیا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں کاما اور کولن کا استعمال ہے، جملہ ایک ہی ہے۔ عزیز احمد نے ایک جملے کا ترجمہ چار جملوں میں کیا ہے اور بعض ضروری الفاظ چھوڑ دیے ہیں۔ بعض الفاظ کے ترجمے سے بھی میں متفق نہیں ہوں۔ Serious کا ترجمہ اہم کے بجائے سنجیدہ ہونا چاہیے تھا۔ Magnitude کے لیے اردو میں سامنے کا لفظ حجم موجود ہے، اس کے لیے مناسب عظمت اور پھر قوسین میں طوالت لکھنا غیر ضروری تھا۔ مزین زبان کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے حظ حاصل ہو In the form of action not of narrative کا ٹکڑا جو بہت اہم ہے چھوڑ دیا گیا ہے پھر purgation یا katharsis کے لیے ایک لفظ کے بجائے دو لفظ صحت و اصلاح ہیں اس لیے میرے نزدیک نہ تو اس شکل میں مطابق اصل ترجمہ ہے نہ لفظی ترجمہ بلکہ ادھورا اور ناقص ترجمہ ہے، اس سے اصل کی روح مجروح ہوتی ہے۔ میرے نزدیک انگریزی عبارت کا ترجمہ کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے:

> ''پس ٹریجڈی ایک ایسے عمل کی نقالی ہے جو سنجیدہ، مکمل اور مناسب حجم کا ہو، جس کی زبان ہر قسم کی فنی آرائش سے مزین ہو اور (آرائش کی) یہ قسمیں کھیل کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہوں۔ یہ عمل کے روپ میں ہو نہ کہ بیانیہ کے، اور رحم اور خوف کے ذریعے سے جذبات کا تنقیہ کرے''۔

تنقیہ کے علاوہ ایک اور لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، تزکیہ، فرق یہ ہے کہ تنقیہ طب کی اصطلاح ہے اور تزکیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصوف کی۔ تنقیہ میں فاسد مادے کے خارج ہونے اور پھر جسم کے نظام کے صحت پانے کا مفہوم موجود ہے۔ تزکیہ میں رفعت اور پاکی کا مفہوم ہے، صحت و اصلاح سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا جو میرے نزدیک katharsis کا ہے۔

بہرحال یہ تو واضح ہو ہی گیا کہ بنیادی کتابوں کے متن کا ترجمہ قطعی طور پر مطابق اصل ہونا چاہیے۔ اس میں تبدیلی کی گنجائش ہے نہ اضافے کی، نہ کسی لفظ یا فقرے کو حذف کرنے کی، اس لیے اردو میں فن شاعری کے ایک اور ترجمے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے عنوان بوطیقا جیسے ثقیل عربی لفظ کی بجائے صرف فن شاعری یا شعریات لکھنا کافی ہوگا۔ جمیل جالبی نے ایلیٹ کے کچھ مضامین کا ترجمہ کیا ہے جس کی عام طور پر تعریف کی گئی ہے۔ ایلیٹ کے مضمون Tradition & Individual Talent کے ایک اقتباس اور جالبی کے ترجمے پر غور کیجیے۔ دیکھیں آپ کے پلے کیا پڑتا ہے:۔

> "I am alive to a usual objection to what is clearly part of my programme for the metier of poetry. The objection is that the doctrine requires a ridiculous amount of erudition (pedantry), a claim which can be rejected by appeal to the lives of poets in any pantheon. It will even be affirmed that much learning deadens of perverts poetic sensibility.
>
> ''میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ نظریے کے لیے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی اور اصول پرستی کی ضرورت پیش ہے اور جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے ہی سے رد کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ زیادہ علمیت شاعرانہ احساس و ادراک کو کند کر دیتی ہے یا روک دیتی ہے''۔ (۴۳-۱۴۲)

پہلے جملے کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ ترجمہ یہ ہونا چاہیے: ''میں اس عام اعتراض سے واقف ہوں جو شاعری کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیشے کے سلسلے میں میرے پروگرام کے ایک حصہ پر کیا جاتا ہے''۔ اب دوسرا جملہ لیجیے: ''اعتراض یہ ہے کہ نظریے کے لیے مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (اور اصول پرستی) کی ضرورت پڑتی ہے اور جو ایک ایسا دعویٰ ہے جسے شاعروں کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے ہی رد کیا جاسکتا ہے''۔ یہاں نظریہ سے پہلے لفظ 'اس' ضروری ہے، پھر یہ جملہ اچھی اردو کا جملہ نہیں ہے نیز اس میں Pantheon کا ترجمہ سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ میرے نزدیک اس جملے کا ترجمہ یہ ہونا چاہیے: ''اعتراض یہ ہے کہ میرے نظریے کے مطابق مضحکہ خیز حد تک تبحر علمی (بلکہ فضیلت مآبی) درکار ہے یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو کسی مقدس سلسلے کے شعراء کے حالات زندگی کی روشنی میں رد کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ (معترض) اس پر بھی زور دیں گے کہ زیادہ علیت شعری حسیت کو مردہ کر دیتی ہے یا مسخ کر دیتی ہے''۔ ادبی تنقید کا ترجمہ اگرچہ آسان نہیں مگر فلسفے کا ترجمہ بہرحال بہت مشکل ہے۔ اردو میں افلاطون کی ریاست کا وہ ترجمہ جو ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا ہے، عابد حسین کا کانٹ کا 'تنقید عقل محض' کا ترجمہ، خلیفہ عبدالحکیم، مرزا ہادی رسوا اور مولانا عبدالباری کے ترجمے مجموعی طور پر اچھے ترجمے ہیں۔ اگرچہ عقل محض کے مقابلے میں میرے نزدیک عقل خالص شاید بہتر ہوتا۔ ظفر حسین نے 'انواع فلسفہ' کے نام سے Types of Philosophy کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے سماجی علوم میں قابل قدر ترجمے روسو کے معاہدہ عمرانی کا ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین کا کیا ہوا، کینس کا 'روزگار شرح سود وزر' ابوسالم کا کیا ہوا۔ ولیم جیمس کی مشہور کتاب 'نفسیات وواردات انسانی' کا ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم کا کیا ہوا، اچھے ترجمے کہے جاسکتے ہیں۔ پھر بھی سماجی علوم میں بہت سی بنیادی کتابوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے۔ ہمارے دستور کا جو ترجمہ اجمل خان، محمد مجیب اور ہارون خان شروانی نے کیا ہے وہ نہ صرف اردو میں انگریزی کی روح کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ تمہید ملاحظہ ہو:

> ''ہم ہند کے لوگوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ فیصلہ کیا ہے کہ ہند کو ایک پورے اختیار والی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کا بندوبست کریں کہ اس کے ہر شہری کو انصاف ملے، سماجی، معاشی اور سیاسی آزادی ملے، خیال، بیان، عقیدے، مذہب اور عبادت کی برابری ملے، حیثیت اور موقعوں میں۔ اور ہم نے طے کیا ہے کہ شہریوں کے درمیان اس طرح بھائی چارہ پھیلائیں کہ فرد کا وقار اور قوم کی ایکتا محفوظ رہے۔''

جہاں تک تصنیف وتالیف کا سوال ہے اس کے مسائل ترجمے کے مسائل سے خاصے مختلف ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تصنیف کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایک ابتدائی درجہ عام فہم انداز میں کسی مسئلے کے مبادیات کو بیان کرنے کا ہے، مثلاً سیاسیات یا نفسیات پر کوئی ابتدائی کتاب لکھی جائے، جو بی۔اے کے طالب علموں کے لیے ہو۔ اس میں نصاب کی ضروریات کو ملحوظ رکھنا ہوگا، طلباء کی عمر اور استعداد اور ان کی زبان پر قدرت کو بھی دیکھنا ہوگا۔ موضوع کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مناسب معیار کو دیکھنا ہوگا تا کہ اس ابتدائی منزل پر کوئی غلط نظریہ ذہنوں میں رائج نہ ہو جائے یہاں اصطلاحات کی تعداد زیادہ نہ ہوگی مگر یہ ضروری ہوگا کہ یہ اصطلاحات مستند ہوں۔ بی۔اے کی منزل کے بعد ایم۔اے کی منزل کے لیے کتابیں لکھوانے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کتاب کا معیار خالص علمی ہوگا۔ زبان کے عام فہم ہونے پر اصرار نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ کتابیں اس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پڑھی جائیں گے۔ اس منزل پر موضوع پر جدید ترین معلومات ضروری ہوں گی۔ ترقی اردو بورڈ ابھی تو پہلی منزل کے لیے کتابیں لکھوا رہا ہے دوسری منزل بعد میں آئے گی، اس لیے اس منزل کے مسائل پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تو یہ کہنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ میرے نزدیک ہر مضمون کے لیے تراجم اور تصانیف میں ایک خاص تناسب ہونا چاہیے۔ تراجم کی اہمیت مسلم مگر تصانیف بی۔اے کی منزل پر زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے اگر کسی مضمون پر چار کتابوں کا ترجمہ کر دیا گیا ہے تو کم سے کم چار تصانیف بھی ہونی چاہئیں۔ اگر کوئی ماہر فن اپنی نظر اور تجربے کی بناء پر سیاسیات یا اقتصادیات پر کوئی کتاب لکھے گا تو ہمارے طلباء اس مضمون سے زیادہ آشنا ہوں گے۔ ترجمے کے ذریعے اتنا ابلاغ نہیں ہوتا جتنا تصنیف کے ذریعے ہوتا ہے۔ سماجی علوم میں ویسے ہی ہندوستانی ماحول اور مشرقی فضا کو دیکھتے ہوئے تصانیف کی زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ مقامی مثالوں کے ذریعے بات کو زیادہ اچھی طرح ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ ترجمہ بہر حال پٹری پر چلنے کے مترادف ہے اور طالب علم اس پٹری سے اتر بھی سکتا ہے۔ تصنیف میں زیادہ آزادی ہے اور اس ذریعے سے زیادہ سے زیادہ وسیع فضا کی سیر کی جا سکتی ہے۔

اب مجھے اصطلاح سازی کے اصولوں کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں چاہیے کہ وحید الدین سلیم کی ''وضع اصطلاحات'' کو خاص طور سے نظر میں رکھیں۔ جو لوگ آنکھ بند کر کے انگریزی کی اصطلاحات بجنسہ لینا چاہتے ہیں۔ ان کے متعلق وحید الدین سلیم کی رائے یہ ہے:

> ''انگریزی زبان میں علمی الفاظ کی اس قدر کثرت ہے کہ اگر ان سب الفاظ کو ہم بگاڑ کر جاہلوں کی زبان کی خاطر پر چڑھا کر اپنی زبان میں داخل کر لیں تو ہماری زبان کا قدرتی حسن و جمال اور اس کے خط و خال کی قدرتی خوبیاں سب خاک میں مل جائیں گی۔ اجنبی زبان کے الفاظ کی کیسی ہی تراش خراش کیوں نہ کی جائے ان میں اجنبیت کی بو اس قدر باقی رہتی ہے کہ اہل زبان ان سے مانوس نہیں ہوتے۔ ہماری زبان میں موجودہ اصلی الفاظ کی تعداد ہی بمقابلہ مہذب زبانوں کے کم ہے۔ اگر انگریزی زبان کے تمام علمی الفاظ توڑ مروڑ کر اس میں بھر دیئے جائیں تو ان کی تعداد اصلی الفاظ سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اور ہماری زبان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لچک اور نزاکت سب ملیامیٹ ہو جائے گی اور ہم ایسی زبان بولنے اور لکھنے پر مجبور ہوں گے جس کے الفاظ کا کوئی جز گوش آشنا اور مانوس نہ ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے مقابلے میں ایسے الفاظ وضع کریں جن کے اجزاء پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں تو اس سے نہ تو زبان کی سلاست اور لوچ میں کوئی فرق آئے گا اور نہ ہم اپنی زبان میں کسی ناگوار مداخلت کے مرتکب ہوں گے۔''

(وضع اصطلاحات)

میں اس نظریے سے مجموعی طور پر اتفاق کرتا ہوں، ہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے باوجود بعض ایسے الفاظ کے لیے جو بالکل نئے ہیں اور جن کا مفہوم کسی طرح سے پرانے الفاظ سے ادا نہیں ہوسکتا، ایک دو جگہ انگریزی سے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کی تعداد اتنی ہونی چاہیے کہ مجموعی طور پر زبان کی جی نی اس (genius) مجروح نہ ہو۔ یہاں میں نے لفظ مزاج یا بناوٹ استعمال نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک جی نی اس (genius) میں انفرادیت کا جو پہلو ہے وہ مزاج یا بناوٹ سے ظاہر نہیں ہوتا پھر لفظ جی نی اس (genius) ہمارے صوتی نظام سے ہم آہنگ ہے اس لیے ایسے الفاظ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی آئیڈیلزم، مارکسزم، بیلٹ، اڈی پس کمپلکس (Oedipus complex) ایٹم، میزائل، ٹریبونل، اٹارنی، شیڈیول کو بجنسہ لے لینا بہتر ہوگا۔ انکا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ لفظ اخباروں میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

پھر بھی اصطلاح سازی کے لیے ہر جدید زبان کو کسی کلاسیکل زبان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ وحیدالدین سلیم نے اس پر زور دیا تھا کہ اردو کے آریائی مزاج کا خیال رکھا جائے گا مگر جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں طباطبائی کے اثر سے عربی سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھایا گیا۔ چند سال ہوئے کابل میں ترجمے پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں ایران، افغانستان، تاجکستان، ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے شریک ہوئے۔ میں اس سیمینار میں موجود تھا۔ ایران کے نمائندوں نے بتایا کہ ان کے یہاں عربی کی اصطلاحوں کے بجائے اب فارسی کی اصطلاحیں برتنے کا رواج ہے۔ انہوں نے اس کے علاوہ فرانسیسی کے اثر کی وجہ سے بہت سی فرانسیسی اصطلاحوں کو مفرس کرلیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تہذید کا یہ عمل ہمارے یہاں بھی جاری ہے اور جاری رہنا چاہیے مگر کچھ الفاظ پہلے فارسی سے پھر عربی سے پھر انگریزی سے لینے پڑیں گے اردو چونکہ ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اور اس کی بنیاد کھڑی بولی ہے جو شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے اس لیے اس کا تعلق اپ بھرنش کے ذریعے سنسکرت سے ہے۔ سنسکرت کا رشتہ فارسی سے مسلم ہے۔ کیونکہ دونوں زبانیں انڈو آرین خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے اگرچہ ہم اردو کی جی نی اس (genius) کو دیکھتے ہوئے سنسکرت کی اصطلاحوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے پھر بھی فارسی کی اصطلاحوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر زیادہ توجہ کر کے سنسکرت سے قریب رہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم (Subconscious Conscious, Unconscious) کے لیے شعور، تحت شعور اور لاشعور کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں، ان کی جگہ فارسی کی اصطلاحیں آگہی، زیر آگہی اور نا آگہی بے تکلف استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لیے میرے نزدیک اصطلاح سازی کے لیے ہمارا اصول یہ ہوگا کہ موجودہ اصطلاحوں میں سے جو ہمارے آریائی مزاج کے مطابق ہیں۔ وہ بجنسہ رہنے دی جائیں۔ نئی اصطلاحیں فارسی کی مدد سے بنائی جائیں اور جہاں انگریزی کی اصطلاح لینی ناگزیر ہو وہاں انگریزی کی اصطلاح تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کر لی جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اختیار کر لی جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک اصول کو چھوڑنا پڑے گا۔ جس پر اب تک ہمارے علماء اور خواص سختی سے عمل پیرا رہے ہیں۔ یعنی فارسی اور ہندی الفاظ کی ترکیب سے احتراز یا ہندی اور عربی کے مرکب الفاظ بنانے سے پرہیز۔ ہماری زبان میں جب لب سڑک، فوق البھڑک، چٹھی رساں، تماہی جیسے الفاظ موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم حسب ضرورت اس اصول پر اپنی اصطلاحیں نہ بنائیں۔ دراصل انشا نے 'دریائے لطافت' میں اردو زبان کی خود مختاری کا جو اعلان کیا تھا۔ اس سے پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ انشا نے کہا تھا کہ جو لفظ عربی یا فارسی کا اردو زبان میں مستعمل ہو گیا۔ وہ اب اردو کا لفظ ہے اور اسے اردو کے قاعدے سے برتنا چاہیے۔ اس اصول پر عمل کرنے سے ہماری بہت سی مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

میں چند مثالوں سے اپنی بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ہم Nature کے لیے فطرت، Natural کے لیے فطری، Naturalism کے لیے فطرت پرستی کی اصطلاحوں سے کام لیتے ہیں لیکن Supernatural کے لیے مافوق الفطرت کہتے ہیں حالانکہ فوق فطری کافی ہوگا۔ اسی طرح International کے لیے بین الاقوامی کے بجائے بین قومی لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نشاۃ الثانیہ کے لیے نئی بیداری مناسب ہوگا۔ ہم نے مذہب میں صلوٰۃ کے بجائے نماز کو اختیار کر لیا لیکن بہت سی اصطلاحیں عربی کی نہیں چھوڑ سکتے، حالانکہ فارسی کی اصطلاحیں یا ہندی کی وہ اصطلاحیں جو ہمارے صوتی نظام سے متصادم نہ ہوں ہمارے لیے زیادہ قابل قبول نہیں ہونی چاہئیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے۔ انگریزی میں لفظ نیشن سے نیشنلائز اور آئیڈیل سے آئیڈ لائز بنایا گیا ہے۔ اس نہج پر ہمیں قومیانہ اور آدرشیانا لکھنا چاہیے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ Idealization کے لیے آدرشیانے کا عمل Nationalization کے لیے قومیانے کا عمل لکھنا پڑے گا۔ قدیم اردو میں خرچ سے خرچنا استعمال ہوتا تھا۔ وحید الدین سلیم نے اس اصول پر برقانا کی حمایت کی تھی۔ اس طرح سے بہت سے فعل بنائے جا سکتے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہر جگہ یہ اصول کام نہیں دے گا۔ انگریزی میں بھی نہیں دیتا۔

اصطلاح سازی بہر حال ضروری ہے۔ نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ لینے ہوں گے۔ ہاں حالی کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق اس معاملے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ نئے الفاظ نئے ذہن کی تشکیل کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جدید اصطلاحیں بنائے بغیر چارہ نہیں۔ مگر کوئی جدید چیز بالکل جدید نہیں ہوتی، یہ کسی پرانی اور بھولی بسری روایت کی تجدید، توسیع یا ترمیم ہوتی ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سارے خزانے کو کھنگالیں، پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لیں اور نئی چیزوں، نئے خیالات، نئے لفظوں کو حسب ضرورت اختیار کریں۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ کتابیں کون پڑھے گا۔ طالب علم تو نہ اردو جانتے ہیں نہ ہندی نہ انگریزی۔ ایک طرف ہمیں اس پر اصرار کرنا چاہیے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ ثانوی تعلیم اردو کے ذریعے سے حاصل کریں تا کہ ان کی بنیاد مضبوط ہو۔ دوسری طرف ہمیں ان کو افسانہ وفسوں اور جذبات کے محشرستاں کے بجائے فکر ونظر کی رفعتوں کی طرف مائل کرنا ہوگا تا کہ وہ جدید ذہن پیدا کر سکیں اور اس جدید ذہن کی مدد سے موجودہ دور کی پر پیچ اور نت نئے روپ بدلنے والی زندگی کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ترقی اردو بورڈ کے سامنے اپنے تراجم اور تصانیف کے کام میں یہی آدرش ہونا چاہیے۔ اس آدرش تک پہنچنے میں دیر لگے گی مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اچھے راستے وہی ہوتے ہیں جو سب سے لمبے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں میں خلوص، ریاض اور خون جگر کی مکمل نقش گری ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصول وضع اصطلاحات

وحید الدین سلیم

حضرات محترم! میں آپ کے حسب الحکم آج اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ علمی اصطلاحات جو انگریزی زبان میں ہیں، ان کے لیے اُردو میں نئی اصطلاحات وضع کی جائیں، یا انہیں اصطلاحات کو بدستور قائم رکھنا چاہیے۔

جناب والا میں اس رائے کا حامی ہوں کہ یورپین زبانوں کی تمام اصطلاحات کے لیے اُردو اصطلاحات وضع کرنی چاہئیں۔ اس مسئلہ پر میں تیس برس سے غور کر رہا ہوں۔

میرے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

اول:۔ یہ کہ ہم انگریزی اصطلاحات یا الفاظ کو اُردو زبان میں صحیح طور سے نہیں لکھ سکتے۔ اس باب میں پنجاب اور بعض دیگر صوبوں میں بہت کوشش کی گئی ہے مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

(دوم) یہ کہ انگریزی زبان کی اصطلاحات یا الفاظ کو اس ملک کے عام آدمی صحیح طور سے نہیں بول سکتے۔ وہ ہماری زبان اور لب ولہجہ کے لحاظ سے کرخت اور ناموزوں ہیں۔

(سوم) یہ کہ وہ الفاظ اصطلاحی جن مادّوں سے بنائے گئے ہیں یا جن اجزاء سے مرکب کیے گئے ہیں وہ مادّے اور وہ اجزاء اس ملک کے باشندوں کے لیے غیر مانوس ہیں اور کسی طرح گوش آشنا نہیں ہیں سائی کالوجی یا نفسیات کے لحاظ سے اُن الفاظ کو یاد رکھنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے جن کے مادّے یا اجزاء پہلے سے مانوس یا گوش آشنا ہوں۔

(چہارم) یہ کہ ہم نے یونیورسٹی کے صرف چند طلباء ہی کو تعلیم دینا اپنے ذمّے نہیں لیا ہے بلکہ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ علوم جدیدہ ہمارے گھروں کے اندر داخل ہوں اور عوام کو بھی جو انگریزی زبان نہیں جانتے ان علوم تک دسترس ہو۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب کہ علمی اصطلاحات ہماری مادری زبان میں ہوں اور وہ ایسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادّوں اور اجزاء سے بنائی گئی ہوں جن سے عام پڑھے لکھے آدمی پہلے سے مانوس ہوں۔

(پنجم) یہ کہ علوم جدیدہ کی تعلیم اُردو زبان میں دینے سے ہمارا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اُردو زبان کی ترقی اور اس کا دائرہ وسیع ہو۔ اگر ہم اُردو زبان میں اصطلاحات نہ بنائیں، بلکہ انگریزی اصطلاحات بجنسہ اس میں داخل کریں تو اس سے زبان کی ترقی نہیں ہوگی بلکہ اس کے قدرتی خط و خال اور حسن و جمال پر پانی پھر جائے گا۔ ہر مذہب اور شائستہ زبان میں ایسے الفاظ جو باہر سے آ کر داخل ہوتے ہیں اور جو اس زبان کی قدرتی ساخت کے مطابق نہیں ہوتے وہ اسی لیے ناموزوں اور کرخت معلوم ہوتے ہیں اور بہ مقابلہ اُسی زبان کے اصلی الفاظ کے ہمیشہ نہایت کم ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں اس وقت تقریباً پچپن ہزار الفاظ شامل ہیں۔ انگریزی زبان کے علمی الفاظ اس تعداد سے بہت زیادہ ہیں۔ اگر ہم ان الفاظ کو داخل کریں گے تو ہماری زبان میں ایسا عظیم الشان انقلاب ہوگا جس کا یہ زبان کسی طرح تحمل نہیں کر سکتی۔ زبان کی ترقی کے معنی ہمیشہ یہ لیے گئے ہیں کہ جو نئے الفاظ زبان میں داخل ہوں وہ اُس زبان کی قدرتی ساخت اور گرامر کے مطابق بنائے گئے ہوں اور اُن کے مادّے یا اجزاء حتی الامکان پہلے سے گوش آشنا اور مانوس ہوں۔

اگر کہا جائے کہ انگریزی کے الفاظ بجنسہ داخل نہ کیے جائیں بلکہ پہلے اُردو زبان کی خراد پر چڑھائے جائیں اور ان میں تغیر و تبدل کر لیا جائے تو اُس کی نسبت بھی یہی دلیل کافی ہے، کیونکہ ان الفاظ میں کیسی ہی تراش خراش کی جائے۔ اجنبیت کی بو، اُن میں ضرور باقی رہے گی اور ایسے الفاظ ہمیشہ ہر مہذب اور ترقی یافتہ زبان میں اُس زبان کے اصلی اور طبعی الفاظ کے مقابلہ میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اس صورت میں بھی ہماری زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد اصلی الفاظ سے بہت بڑھ جائے گی اور اس زبان کی قدرتی لطافت ملیامیٹ ہو جائے گی۔

ششم:۔ یہ کہ یورپ کی زبانیں آریَن ہیں اور ہماری زبانیں بھی آریَن ہے۔ مگر لاطینی اور یونانی زبانیں جن سے علمی اصطلاحات بنائی گئی ہیں ان کو ہماری زبان سے بہت بُعد ہے۔ برخلاف اس کے یورپ کی زبانوں سے وہ بہت قریب ہیں، اس لیے کہ لاطینی اور یونانی زبانوں کے ہزاروں مادّے ادل بدل کر یورپ کی اکثر زبانوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس بناء پر لاطینی اور یونانی زبانیں ممالک یورپ کے لیے مشترک علمی زبانیں تسلیم کی جا سکتی ہیں، مگر اُردو بولنے والے ملک کے لیے وہ مشترک علمی زبانیں نہیں ہو سکتی۔

(ہفتم) یہ کہ ہم نے اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ انگریزی زبان کو لازمی رکھا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم سے دو فائدہ ہوں گے۔ پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری یونیورسٹی کے طلباء تمام علوم کو مادری زبان میں آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں گے اور اُن کو عوام میں جو انگریزی زبان نہیں جانتے اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے سہولت کے ساتھ پھیلا سکیں گے اور اس روشنی کو ہمارے گھروں کے اندر داخل کر سکیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ انگریزی زبان جاننے کے سبب ہماری یونیورسٹی کے طلباء یورپ کی جدید تحقیقات اور معلومات پر ہمیشہ مطلع ہوتے رہیں گے۔ اُن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کی علمی اصطلاحیں بالمقابل معلوم ہوں گی اُن کا دایاں ہاتھ ان کے علمی خزانوں تک پہنچ سکے گا جو یورپ کے علماء نے فراہم کیے ہیں، اور بائیں ہاتھ سے ان خزانوں کے جواہر کو اس ملک کے عام باشندوں پر نثار کریں گے۔ غرض کہ یہ طلباء مشرق اور مغرب کے درمیان واسطہ ہوں گے اور ایک طرف سے علمی روشنی حاصل کریں گے اور دوسری طرف اس روشنی کو عوام میں پھیلائیں گے۔

اگر اس موقع پر کہا جائے کہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کو علمی اصطلاحوں سے طلبہ کے حافظہ پر بار پڑے گا تو میں کہوں گا کہ اس بار کا برداشت کرنا ناگزیر ہے اور یہ اس عظیم الشان فائدہ کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے جو اس طریقہ سے ہمارے ملک کو حاصل ہوگا۔ آخر ہم اب بھی اپنے طلبہ کو دو اور بعض اوقات تین زبانیں سکھاتے ہیں، مثلاً اگر وہ جانتے ہوں کہ ایک خاص قیمتی دھات کو اُردو میں سونا فارسی میں زر عربی میں ذہب اور انگریزی میں گولڈ کہتے ہیں تو اس بات کی شکایت نہیں کی جاتی کہ ایک مفہوم کے لیے ان مختلف الفاظ کا جاننا اُن کے حافظہ پر بار ڈالتا ہے۔

(ہشتم) کہا جاتا ہے کہ انگریزی اصطلاحات جن معنوں کو ادا کرتی ہیں وہ معنی ہماری نئی اصطلاحات سے سمجھ میں نہیں آئیں گے، کیونکہ انگریزی اصطلاحات ایک مدت دراز کے استعمال کے بعد اپنے معنی بتانے لگی ہیں۔ نئی اصطلاحوں کو یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی، مگر نئی اصطلاحات کے خلاف یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں جو اصطلاحات موجود ہیں وہ ہمیشہ سے نہیں پائی جاتیں۔ ہر اصطلاح ایک خاص وقت میں وضع کی گئی ہے۔ اس وقت یہی اعتراض بجنسہ ان اصطلاحات پر بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ کی زبانوں میں اصطلاحات کا بننا رک نہیں گیا۔ ہر روز نئی اصطلاحات بنتی رہتی ہیں اور یہی اعتراض اب اُن پر کیا جا سکتا ہے۔ اصلی بات یہ ہے کہ یہ کام ملک کے صیغہ تعلیمات کا ہے کہ جو علمی الفاظ خاص معنوں کے لیے وضع کیے جاتے ہیں اور اُن الفاظ کو اُن معنوں کے ساتھ رائج کرتا ہے۔ تعلیم پانے کے بعد چند ہی روز میں وہ الفاظ ہر طالب علم کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ طلباء اپنی تحریر اور تقریر میں اُن الفاظ کو برابر استعمال کرتے ہیں۔ پھر عام آدمی بھی ان الفاظ کو انہی معنوں میں سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً پنجاب کے مدارس میں سائنس کی جو کتابیں اُردو میں پڑھائی جاتی ہیں جان کے اصطلاحی الفاظ اُن تمام طلباء کی زبانوں پر ہیں جنہوں نے ان مدارس میں تعلیم پائی ہے۔ اس ملک کا صیغہ تعلیمات بھی یہ کام اُسی طرح انجام دے سکتا ہے جس طرح ممالک یورپ کے صیغہ ہائے تعلیمات انجام دے رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے طلباء کی زبان اور قلم سے جب ہماری نئی اصطلاحیں نکلیں گی تو اُن اصطلاحوں سے بے تکلف وہ معنی سمجھ میں آنے لگیں گے جن کے لیے وہ وضع کی گئی ہیں۔ پھر عام آدمی بھی ان کی تقلید کریں گے اور لوگوں کے گھروں میں بھی وہ اصطلاحیں جاری ہو جائیں گی یہی طریقہ ہے جس سے اصطلاحیں اپنا مفہوم قائم کرتی ہیں ورنہ اصطلاحیں خود بخود اپنے معنی نہیں بتایا کرتیں اور لوگوں پر آسمان سے اصطلاحوں اور ان کے معنوں کے متعلق کوئی وحی نازل نہیں ہوا کرتی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(نہم) یورپین اصطلاحات کے حامی ان اصطلاحات کی حمایت میں ایک لطیفہ بھی بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب علوم جدیدہ کے ایجاد کرنے والے یورپ کے علماء ہیں تو جو خیالات انہوں نے ایجاد کیے ہیں یا جو معلومات انہوں نے پیدا کی ہیں ان کے نام رکھنے کا حق اُن کو اسی طرح حاصل ہے جس طرح والدین کو اپنی اولاد کے نام رکھنے کا حق ہوتا ہے اس بنا پر یورپ کی اصطلاحیں بغیر کسی تغیر و تبدل کے دوسرے ملکوں میں جاری ہونی چاہئیں۔ میں اس لطیفہ کا جواب بجز اس کے اور کچھ دینا نہیں چاہتا کہ جب کوئی یورپ کا باشندہ مسلمان ہوتا ہے تو اس کا وہ نام بدل دیا جاتا ہے جو والدین نے بچپن میں عطا کیا تھا اور ایک نیا اسلامی نام اس کو عطا کیا جاتا ہے۔

(دہم) کہا جاتا ہے کہ سب سے بڑی مشکل کیمیائی ناموں کی علامتوں اور ان کے فارمولوں میں ہے۔ اگر ہماری زبان میں کیمیائی نام جداگانہ رکھے جائیں تو ان کی علامتیں بھی جو ان کے ناموں سے شروع کے حرفوں کو مختصر کرنے سے مقرر کی جاتی ہیں، یورپ کی کیمیائی علامتوں سے جداگانہ نہ ہوں گی اور اس صورت میں جو فارمولے بنائے جائیں گے وہ ان فارمولوں سے الگ تھلگ ہوں گے جو یورپ کے کیمیادانوں میں مستعمل اور رائج ہیں۔ ایسا کرنے سے ہمارے طلباء کا رشتہ یورپ کی علمی دنیا سے باقی نہیں رہے گا اور وہ الجھن اور پریشانی میں پڑ جائیں گے اور ان کو یورپ کے کیمیائی فارمولوں کا سمجھنا جو جدید کیمیائی مرکبات کے لیے بنائے جائیں گے نہایت مشکل ہوگا میرے نزدیک یہ اشکال کچھ زیادہ اہم نہیں ہیں اور جو درجہ ان اشکال کو دیا جاتا ہے وہ اس درجہ کا مستحق نہیں ہے۔ ہم میں سے بہت سے آدمی ہیں جو ابجد کے حرفوں کی ترتیب اور ان حرفوں کی اعدادی قیمتوں سے واقف ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی تاریخ پیش کی جاتی ہے تو وہ بے تکلف اس تاریخ کے حرفوں کے اعداد اپنے ذہن میں جمع کر لیتے ہیں اور بغیر لکھنے کے وہ آپ کو زبانی طور سے وہ سنہ بتا دیتے ہیں جو اُس تاریخ سے نکلتا ہے۔ ابجد کے حرفوں کی ترتیب اور ان حرفوں کی اعدادی قیمتیں تھوڑی سی مشق میں یاد ہو جاتی ہیں اور وہ ہر وقت بغیر کسی وقت کے حرفوں کو اعداد میں اور اعداد کو حرفوں میں تبدیل کر سکتے ہیں کیمیائی عناصر کے نام محدود ہیں اور ان کی علامتیں بھی محدود ہیں جو علامتیں ہم نے اپنے وضع کیے ہوئے کیمیائی ناموں کے لیے تجویز کی ہیں وہ انگریزی کیمیائی علامتوں کے ساتھ طلباء کو تھوڑی سی محنت سے یاد کرائی جا سکتی ہیں اور تھوڑی مشق اور مزاولت سے یہ بات انکو حاصل ہو سکتی ہے کہ جب کوئی انگریزی کیمیائی فارمولہ ان کی نظر سے گذرے تو وہ اس کو اُردو کیمیائی فارمولے میں تبدیل کر سکیں اور جب کوئی اُردو کیمیائی فارمولہ ان کی نظر کے سامنے ہو تو اُس کو انگریزی کیمیائی فارمولے میں تبدیل کر دیں۔ مثلاً ہیڈروجن کی انگریزی علامت H ہے جو اُردو میں حمضین کی علامت ح کے ساتھ یاد کرائی جا سکتی ہے۔ اس طرح کلورین کی انگریزی علامت CL ہے اور اُس کے مقابل اُردو نام سبزین کی علامت سؔ ہے نائٹروجن کی انگریزی علامت N ہے اس کے مقابل اُردو نام شورین کی علامت شؔ ہے آکسیجن کی انگریزی علامت O ہے اور اس کے مقابل اُردو نام مائین کی علامت مؔ ہے۔ الورڈین کی انگریزی علامت L ہے اور اس کے مقابل اُردو نام بنفشین کی علامت بؔ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔

گویا بمقابلہ ح بمقابلہ س بمقابلہ ش بمقابلہ م بمقابلہ ب۔ اور اسی طرح باقی علامات بالمقابل یاد کرائی جاسکتی ہیں، اور یہ تھوڑی سی محنت سے حافظہ پر نقش ہوسکتی ہیں، اور تھوڑی سی مشق سے یہ بات حاصل ہوسکتی ہے کہ فارمولوں میں ایک قسم کی علامات کو دوسری قسم کی علامت سے ہمارے طلباء تبدیل کرسکیں۔ کیمیائی فارمولوں کے لکھنے کا طریقہ ہماری زبان میں بجنسہ وہی رکھا گیا ہے جو انگریزی زبان میں ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ انگریزی میں بائیں طرف سے دائیں طرف لکھا جاتا ہے اور ہماری زبان میں دائیں طرف سے بائیں طرف اس طریقہ تعلیم سے نہ ہمارے طلباء کسی الجھن میں پڑیں گے اور نہ مغربی اصطلاحات کی انٹرنیشنلٹی (بین قومیت) کو کوئی صدمہ پہنچے گا بلکہ اس طریقہ سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کیمیائی علوم جن پر آج کل کی صنعتوں اور حرفتوں کا مدار ہے آسان ہوکر ہمارے گھروں میں داخل ہوجائیں گے اور عام لوگ جو انگریزی نہیں جانتے اُن کو بے تکلف سیکھ سکیں گے برخلاف اس کے اگر ہم انگریزی کیمیائی مرکبات کے نام بجنسہ رہنے دیں گے اور کیمیائی عناصر کے نام اور ان کی علامات بھی وہی رہنے دیں گے جو انگریزی میں ہیں تو ان سے کیمیائی معلومات ایک خاص طبقہ میں محدود رہیں گی۔ جو انگریزی جانتا ہے اور ان سے اس ملک کے عام باشندے جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں مستفید نہیں ہوسکیں گے۔ ہماری یونیورسٹی برخلاف ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے اس غرض سے قائم کی گئی ہے کہ وہ علمائے سائنس کی ایک ایسی جماعت تیار کرے جو علوم جدیدہ کی تعلیم عام لوگوں میں پھیلائے اور ان علوم سے مستفید ہونے کا موقع ان کے لیے بہم پہنچائے۔ اگر یہ مقصد ہماری یونیورسٹی کا تسلیم نہ کیا جائے تو پھر ہماری یونیورسٹی اور ہندوستان کی دیگر یونیورسٹی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ کام یعنی چند ایسے طلباء کا مہیا کرنا جو خود تو علوم جدیدہ سے واقف ہوں مگر اپنے عام ہم وطنوں تک اُن کی روشنی کو نہ پہنچا سکیں، ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں۔ اُن کے ہوتے اس یونیورسٹی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یورپ کی صرف وہ اصطلاحیں تو قائم رکھی جائیں جو کیمیا یا کسی خاص علم کے متعلق ہیں اور باقی علوم کی نسبت اجازت دی جائے کہ اُن کی اصطلاحات کے مقابل اردو اصطلاحیں وضع کرلی جائیں تو یہ اُس یکسانیت کے خلاف ہوگا جو علوم میں درکار ہے اس صورت میں ایک طرف تو ایک علم یا چند علوم کی اصطلاحیں ہمارے یہاں انگریزی کی ہوں گی جن کے سمجھنے میں دقت ہوگی اور جو ہماری زبانوں پر مشکل سے چڑھیں گی اور دوسری طرف علوم کی وہ اصطلاحیں ہوں گی جن کے الفاظ کے مادے اور اجزاء ہمارے لیے مانوس اور گوش آشنا ہوں گے۔ کیا ہمارے اس طریقۂ تعلیم پر ''آدھے تیتر آدھے بٹیر'' کی مثل صادق نہیں آئے گی؟ اگر دوسری صورت یہ اختیار کی جائے کہ تمام اصطلاحات انگریزی سے لی جائیں اور وہ بجنسہ اُردو میں رائج کی جائیں تو وہ تمام دشواریاں پیش آئیں گی جن کو میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔ کیا ان مشکلات سے نپٹنے کا یہی آسان طریقہ نہیں ہوگا کہ ہم اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم نہ قرار دیں بلکہ انگریزی زبان ہی اُن علوم کی تعلیم اپنے طلباء کو دیں۔ اس حالت میں بھی ہماری یونیورسٹی کا وجود محض بیکار ہوگا اور اس مطلب کے لیے ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیاں کافی خیال کی جائیں گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(یازدہم) جدید اصطلاحات کے برخلاف ایک اور بات بھی سنی جاتی ہے۔ مغربی اصطلاحات کے حامی کہتے ہیں کہ کیمیا دانوں نے جو نام کیمیائی چیزوں کے رکھے ہیں انھی ناموں سے وہ چیزیں بازار میں مل سکتی ہیں۔ اگر ان چیزوں کے نئے نام لیے جائیں تو ان کو تاجر اور دوکاندار نہیں سمجھیں گے اور تجارت میں مشکلات پیش آئیں گی مگر یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ ہزاروں چیزیں اب بھی ایسی موجود ہیں جن کے نام انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں جب ہم یورپ سے وہ چیز طلب کرتے ہیں تو مطالبہ کی درخواست انگریزی زبان میں ہوتی ہے اور اس میں وہی نام استعمال کیے جاتے ہیں جو انگریزی میں رائج ہیں۔ برخلاف اس کے جب ہم اُن چیزوں کو اپنے ہم وطنوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں تو ان کے وہ نام لیتے ہیں جو ہماری زبان میں ہیں۔ ہماری جدید اصطلاحات جب طلباء کے ذریعہ سے عام اور رائج ہو جائیں گی تو ہمارے تاجر اور دکاندار بھی ان ناموں سے رفتہ رفتہ واقف ہو جائیں گے اور ان کو آسانی سے یاد کرلیں گے انگریزی نام اُن کو تجارتی ضرورت نے یاد کرائے ہیں۔ یہی تجارتی ضرورت ان کو مجبور کرے گی کہ نئے اشیاء کے ہماری زبان میں رکھے گئے ہیں ان پر وہ اطلاع حاصل کریں اور گاہکوں کو اپنی دوکان سے ناکام نہ جانے دیں۔ بازار کی یہ مشکلات بس اسی وقت تک باقی رہیں گی جب تک کہ ہمارے بنائے ہوئے نام عام اور رائج نہ ہوں۔ انکے عام اور رائج ہونے کے بعد پھر کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

(دوازدہم) بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ جاپان میں یورپ کی علمی اصطلاحوں کو جاپانی زبان میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں جاپانیوں کو ناکامی ہوئی ہے۔ مجھے اس واقعہ کا صحیح علم نہیں ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو میں اس ناکامی کے معنی نہیں سمجھا اگر جاپانیوں نے یہ کوشش کی ہوگی کہ اُن کی بنائی ہوئی اصطلاحوں کو جو انہیں کی زبانوں میں تھیں یورپ کے لوگ اختیار کریں تو اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ ان کو ضرور ناکامی ہوئی ہوگی۔ لیکن اگر انہوں نے اپنی زبان کی اصطلاحات کو اپنے ہی ہم وطنوں میں پھیلانا چاہا ہوگا تو اس میں ناکام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ کام جاپان کا صیغہ تعلیمات نہایت آسانی سے انجام دے سکتا تھا۔ اسی ذیل میں مصر اور شام کی ناکامی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مصریوں اور شامیوں نے مجبور ہو کر یورپ کی علمی اصطلاحوں کو عربی زبان میں معرب کرلیا ہے اور وہ اپنی خاص اصطلاحات اُن اصطلاحات کے مقابل قائم نہیں کرسکے۔ یہ ناکامی دوسری قسم کی ہے علمی زبان میں جہاں بہت سے مفرد مادوں کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ ان مفرد مادوں کو مرکب کرسکیں اور ان مرکبات کی گردان کر کے اُن سے اور نئے نئے مشتقات پیدا کرسکیں۔ یہ قابلیت آرین زبانوں میں ہے۔ شامی زبانوں میں جن میں سے ایک عربی ہے یہ لچک نہیں ہے۔ اس بنا پر مصری اور شامی یورپ کی اصطلاحات کے مقابلہ میں عربی زبان کی اصطلاحات وضع نہ کرسکے برخلاف اس کے ہماری زبان ''اردو'' آرین ہے اس میں وہ تمام طریقے مفرد اور مرکب الفاظ وضع کرنے کے موجود ہیں جو یورپ کی زبانوں میں ہیں۔ اور اُس میں علمی زبان بننے کی قابلیت موجود ہے۔ اگر ہم اس لچک سے کام لیں جو قدرتی طور سے ہماری زبان میں موجود ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو ایک دن ہماری زبان یورپ کی ترقی یافتہ علمی زبانوں کی ہمسری کرے گی۔ اس خاص مسئلہ پر میں نے ایک بسیط کتاب لکھی ہے جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اس میں اُردو زبان کی قدرتی بناوٹ پر بحث کی گئی ہے۔ وہ تمام طریقے تفصیل کے ساتھ معہ مثالوں کے درج کیے گئے ہیں جو مفرد اور مرکب الفاظ وضع کرنے کے ہمارے اسلاف نے ہم کو بتائے ہیں پھر انہیں طریقوں کو پیش نظر رکھ کر مفرد اصطلاحات اور مرکب اصطلاحات بنانے کے قاعدے شرح وبسط سے بیان کیے گئے ہیں۔

اس موقع پر یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کروڑوں باشندے جو اُردو زبان بولتے یا سمجھتے ہیں اُن کی نظریں آپ کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں صدیوں کے بعد ایک نادر موقع ملا ہے کہ آپ اُردو زبان کو علوم جدیدہ کے لیے ذریعہ تعلیم قرار دیں اور ایک ایسی جماعت طلبا کی تیار کریں جو ایک طرف کو انگریزی زبان جاننے کی وجہ سے یورپ کے علوم سے اور یورپ کے علماء کی نئی تحقیقات سے بے تکلف مطلع ہوسکیں اور دوسری طرف اپنے ہم وطنوں کو جو انگریزی زبان نہیں جانتے ان علوم کی قدیم وجدید تحقیقات سے فیضیاب کرسکیں۔ اور علم کو بادلوں سے اتار کر ہمارے گھروں کی چاردیواری میں داخل کرسکیں۔ پھر یہ موقع بھی آپ کو حاصل ہے کہ اُردو زبان کی پیشانی پر علمی لحاظ سے مفلس ہونے کا جو داغ نمایاں ہے اس کو اپنے مبارک ہاتھوں سے مٹاسکیں اور اس زبان کے دائرہ کو وسیع کر کے اس کو ترقی کے اس بلند درجہ پر پہنچا سکیں جس کا حق اس کو اپنی قدرتی بناوٹ اور طبعی لچک کی وجہ سے حاصل ہے یا دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ جو خواب سرسید مرحوم، نواب محسن الملک مرحوم، نواب وقارالملک مرحوم اور ہماری قوم کے دیگر بزرگوں نے دیکھا تھا اس خواب کو سچا کر دکھانا اور اس کی تعبیر کا نمایاں کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری تمام قوم اس وقت گردنیں اٹھائے آپ کی طرف نہایت اشتیاق اور اضطراب سے دیکھ رہی ہے کہ آپ اس نادر موقع سے کیا کام لیتے ہیں اور ہماری قوم کے علمی مستقبل اور اُردو زبان کی قسمت کی نسبت آپ کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپ حضرات کے نام ہماری قوم کے آئندہ تاریخی صفحات پر زریں حروف میں لکھے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ نسلیں جو کسی کی رعایت نہیں کریں گی اور اپنی رائے دینے میں آزاد ہوں گی آپ کی نسبت دوسرا فتویٰ دیں۔ غرض کہ یہ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں اگر گستاخی نہ خیال کی جائے تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس بات کا فیصلہ کہ انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات اُردو زبان میں بجنسہ قائم رکھی جائیں، یا اُن کے مقابل اُردو اصطلاحات وضع کی جائیں، پہلے کئی بار غلبہ آراء سے ہوچکا ہے اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات کے مقابل اُردو زبان میں اصطلاحات وضع کی جائیں، اس سے علم کیمیا یا کوئی دوسرا علم مستثنیٰ نہیں کیا گیا تھا، اسی فیصلہ کی بنا پر اب تک کام ہوتا رہا ہے اور کام کا ایک معتدبہ حصہ انجام پا چکا ہے۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اردو زبان میں وضع اصطلاحات کے مسائل

میر حسن

اب جب کہ اردو کی فطری ترقی کی راہ سے رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں ملک کی مختلف ریاستوں میں مرکزی ایماء پر اردو کی تعلیم اور اس کے علم و ادب کی نگہداشت اور توسیع کے امکانات پیدا ہوئے گئے ہیں، اس زبان میں جدید سائنس اور علوم عمرانی سے متعلقہ معلومات کے ذخیرے میں اضافے کے لیے وسائل مہیا کیے جا رہے ہیں، مختلف مدارج کی درسی اور غیر درسی کتابیں تالیف و ترجمے کے ذریعہ کی مرتب کی جا رہی ہیں، نئے خیالات اور تصورات کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرنے اور بنانے ہوں گے اور حسب ضرورت وضع اصطلاحات کے کام کو آگے بڑھانا ہوگا۔

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ ترقی اردو بورڈ کے تحت اصطلاح سازی کا کام باضابطہ طور پر اور بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ اصطلاح سازی کا جو کام پہلے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہو چکا ہو اس پر نظر رکھی جئے۔ اور اس سے مناسب حد تک استفادہ کیا جائے۔

سائنس اور دوسرے کار آمد مغربی علوم کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کا کام آج سے کوئی پونے دو سو سال قبل ہی شروع ہو چکا تھا اور اس طویل مدت میں مختلف عمرانی علوم اور سائنس کی جو کتابیں اردو میں ترجمے کے ذریعے داخل ہو چکی ہیں ان کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ اگر صرف ان کے نام گنائے جائیں تو ایک ضخیم رسالہ تیار ہو جائے۔

سائنس کے موضوع پر قدیم ترین تراجم میں ''بحر حکمت'' مولفہ پادری پرکنس شامل ہے۔ جس کا سن ترجمہ 1798ء ہے، اس میں ''اسٹیم'' یعنی ''بھاپ'' سے بحث کی گئی ہے اور اس کے کار آمد خواص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسٹیم کے لیے ''دخان'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس میں استعمال شدہ چند اصطلاحیں ''نقطہ جوش'' ''نقطہ جوش آب'' ''نقطہ انجماد'' وغیرہ ہیں۔ ''فیڈر'' کے لیے ''ارزق'' اور ''تھرمامیٹر کے لیے'' تابدرجہ نما'' کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ 1811ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت جہاز رانی شائع کی جس میں جہاز رانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ن اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے جو کمانڈاروں کے لیے میدان جنگ اور بارکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ انگریزی سے اردو ترجمے کے سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج کے ارباب کا کام زیادہ تر انگریزی اردو لغات کی اشاعت تک محدود رہا۔اس زمانے میں اردو ترجمے کا دوسرا اہم مرکز حیدرآباد دکن تھا۔امیر کبیر نواب فخرالدین خاں شمس الامراء نے مدارس اور صدگاہ جہاں نما کے علاوہ ایک دارالترجمہ بھی 1834ء میں قائم کیا تھا جس کی کتابیں ان کے سنگی چھاپے خانے میں چھپتی تھیں۔اردو میں مغربی علوم کی کتابوں کے تراجم اور تدریس کی ایسی منظم انفرادی کوشش شاید ہی کسی اور نے کی ہوگی۔شمس الامراء کے سررشتہ تالیف وترجمہ سے شائع شدہ حسب ذیل کتابوں میں سے چند کتابیں حیدرآباد کے کتب خانوں میں دستیاب ہیں''ستہ شمیہ'' جو رسالہ علم جرثقیل، رسالہ علیم ہیئت، رسالہ علم ادب، رسالہ علم ہوا، رسالہ علم انظار پر مشتمل ہے۔اور جس کے آخر میں علم مقناطیس پر مقابلہ بھی شامل ہے۔شمس الامراء کی دوسری کتابیں کیمسٹری کا مختصر رسالہ، رسالہ مفتاح الافلاک، رسالہ مختصر حیوانات مطلق، منتخب المبصر (دورنما) ہی۔ اس مرکز میں ایسڈ (Acid) کا ترجمہ، گھٹا اور نائٹرک ایسڈ (Nitric Acid) کا ترجمہ شورے کا کھٹا، ہیڈروسٹاٹکس (Hydrostatics) اور آپٹکس (Optics) کے لیے علم آب اور علم انظار کی اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں جس کے لیے نوابان اودھ کے دارالترجمے کے اراکین غلام محی الدین حیدرآبادی، میر امان دہلوی، مسٹر جونس، موسیو تندوسی، رتن لال اور مسٹر جوزف تھے۔بعض انگریزی اصطلاحوں کے لیے الفاظ اردو میں نہیں ملے تو ان کو ان کی اصل شکل میں برقرار رکھا گیا ہے۔شمس الامراء کے دارالترجمہ کی وضع کردہ چند اصطلاحیں یہ ہیں:

Stcking Pump	چوستے کا پمپ
Force Pump	زبردستی کا پمپ
Microscope	کلاں بیں
Monsoon	موسمی پون
Reflecting Telescope	منعکس دوربین
Parallel Rays	متوازی شعاعیں
Convergent Rays	انقباضی شعاعیں
Divergent Rays	انبساطی شعاعیں
Conductor	موصل

'تبدیلی پون' آلہ تحلیل، مدامی پون، جیسے الفاظ اور اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔ چند کتابوں کے شروع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اصطلاحات کی فہرست دی گئی ہے جن میں سے چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں۔

Suphuric Acid	گندھک کا کھٹا
Muraic Acid	کھاتے نمک کا کھٹا
Turmeric Paper	ہلدی کے پتے کے رس میں بھیگا ہوا کاغذ
Symthesis	سنتھیس
Analysis	اینلیس
Thermometer	تھرمامیٹر
Banometer	بونامیٹر

جیسی بعض انگریزی اصطلاحیں بجنسہ استعمال کی گئی ہیں۔اور بعض کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔

اس عہد میں اردو ترجمے کا کام لکھنؤ میں بھی ہوا۔شاہان اودھ نے مغربی علوم وفنون کی بعض کتابوں کا ترجمہ کروایا جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئیں۔سید کمال الدین حیدر نے مغربی علوم کے 19 رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا جن میں رسالہ ہیئت،رسالہ علم الہوا،رسالہ علم الحرارت شامل ہیں۔انیسویں صدی کے اوسط میں مغربی تصانیف کے اردو تراجم کا ایک اہم دور شروع ہوا۔اس دور سے قبل کی کوششیں اس درجہ منظم اور وسیع پیمانے پر نہیں تھیں جتنی کہ دہلی کالج کی تھیں۔اس کلیہ کے ارباب علم نے جس میں رام چندر بھی شامل تھے ترجمے کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے بعض اصول پہلی مرتبہ مرتب کیے جو یہ تھے کہ اگر مترادف اردو میں نہ ملے تو اصل لفظ استعمال کیا جائے،اردو لفظ ملے تو وہی استعمال کیا جائے۔سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی سے کیا جائے گا اس لیے انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال ناگزیر ہے۔انگریزی جملے میں اگر کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو،جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیے یا متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے،ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔دہلی کالج کے مترجمین نے علم ہیئت،کیمسٹری،پولیٹیکل،اکانومی،قانون مال،میکانیات،تاریخ عالم،جغرافیہ،طبعی،مقناطیس،جراحی،حرکیات وسکونیات،علم المناظر،حرارت،ہیڈروسٹاٹکس علم برق اور طب سے متعلق کوئی تیس کتابوں کا ترجمہ شائع کیا۔رسالہ مقناطیس میں جو اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

Strong Magnet	قوت ور مقناطیس
Tomagnetise	مقناطیس کرنا
Dip and Inclination	غرق وانحراف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Attraction and Ripulsion	جذب واندفاع
Fibre	ریشہ
Experiment	تجربہ

اس رسالے میں بیشتر اصطلاحات کا ترجمہ درج کیا گیا ہے۔صرف معدودے چند انگریزی الفاظ الیکٹریسٹی ،کمپاس وغیرہ بجنسہ مستعمل ہوئے ہیں۔

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی قائم شدہ 1863ء کو مغربی علوم اور سائنس کے تراجم اور اصطلاح سازی کے اعتبار سے کافی اہمیت حاصل ہے۔اس سوسائٹی نے چھوٹی بڑی تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروائیں۔اس کی مطبوعات زیادہ تر تاریخ،سوانح جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات پر مشتمل ہیں۔ سوسائٹی نے اصطلاحات کے ترجمے میں سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی وضع کردہ بعض اصطلاحیں یا تو اپنی اصل حالت میں یا تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اردو میں مستقل طور پر داخل ہوگئیں۔"رسالہ انتظام مدن" "پولیٹیکل اکانومی Political Economy کا ترجمہ ہے۔ایلیمنٹز آف پولیٹیکل اکانومی Elements of Political Economy کا ترجمہ اس سوسائٹی کی جانب سے شائع ہوا اس کا نام اصول سیاست مدن ہے۔

اس مرکز میں وضع شدہ چند اصطلاحیں حسب ذیل ہیں:

Factors of Production	لوازم پیدائش
Production	پیدائش یا صنعت کاری
Consumption	صرف
Exchange	مبادلہ
Production Labour	پیدا کرنے والی محنت
Unproductive Labour	غیر پیدا کرنے والی محنت
Capital	راس المال
Co-operation	عمل بہ اتفاق
Necessities	اشیائے احتیاجات
Luxuries	سامان عیش وکامرانی

اردو میں جدید علوم عمرانی اور سائنس کی کتابوں کے ترجمے کا وسیع پیمانے پر ضروری اہتمام کے ساتھ انتظام جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کیا گیا۔جامعہ عثمانیہ کی جنرل کمیٹی نے جس میں زبان اور علم کا صحیح مذاق اور مہارت رکھنے والے بزرگ شامل تھے، یہ اہم مسئلہ کثرت رائے سے طے کردیا تھا کہ انگریزی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تغیر و تبدل کے ساتھ اردو زبان میں نہ لی جائیں بلکہ انگریزی اصطلاحوں کے مقابلے میں اردو اصطلاحیں وضع کی جائیں۔ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا تھا کہ جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں ان کے الفاظ عربی، فارسی اور ہندی سے بے تکلف لیے جائیں۔ ان ہدایات کی روشنی میں جامعہ کے ماہرین نے اصطلاح سازی کے لیے کئی راہیں نکال لیں اور پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی نے مختلف وکاوش سے وضع اصطلاحات کے اصول مرتب کیے۔ نئے الفاظ کی تلاش و وضع اصطلاحات کے اغراض کے لیے اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا جائزہ لیا گیا۔ مفرد اور مرکب الفاظ اور تراکیب کی ساخت اور مشتقات کے اصولوں کی جانچ کی گئی۔ حسب ضرورت دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال جائز قرار پایا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ فارسی، عربی یا ہندی جس زبان سے بھی مادہ لیا جائے وہ اردو میں آنے کے بعد اردو ہو جائے گا۔ اور اس پر اردو قواعد کی چھاپ لگ جائے گی۔ اپنی عہد آفریں تالیف ''وضع اصطلاحات'' میں پروفیسر وحید الدین سلیم نے اصطلاح سازی کے اصول، امکانات اور دشواریوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وضع اصطلاحات کے میدان کو وسیع کرنے کے لیے اس امر کو پیش رکھنا ضروری ہے کہ بنیادی الفاظ اور دوسری خصوصیات کے اعتبار سے اردو کا تعلق سنسکرت، ہندی، فارسی کی طرح آریائی خاندان السنہ سے ہے اور اس خاندان السنہ سے تعلق کی بنا پر اس کا رشتہ انگریزی اور بعض دوسری مغربی زبانوں سے بھی جا ملتا ہے۔ نئے خیالات اور الفاظ کی تلاش اولاً خود اردو ادب میں کی جانی چاہیے۔ یہ داخلی جائزہ مفید ثابت ہو سکتا ہے اور ممکن ہے موزوں الفاظ نئے خیالات اور اصطلاحوں کے لیے مل جائیں۔ دکنی ادب اور قدیم اردو ادب ہندی سے قریب تھا جس میں سنسکرت کے الفاظ بھی مروج تھے اور مذہب اور اخلاق سے متعلق ہندی اصطلاحیں اولیاء اللہ کی تحریروں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ الفاظ بعد میں متروک ہو گئے مگر اب بہ شرط موزونیت انہیں پھر سے رائج کیا جا سکتا ہے کیونکہ اردو کو آزاد ہندوستان میں ملک کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش آگے بڑھنا ہے۔ پروفیسر سلیم اور ان کے ہم نوا ہندی سے استفادہ کے حامی تھے اس بارے میں ''وضع اصطلاحات'' میں موصوف نے لکھا ہے۔

> اردو کے لیے ہندی بمنزلہ زمین کے ہے اس زمین پر فارسی اور عربی کے پودے لگائے گئے ہیں۔ اسی تختے پر غیر زبانوں نے آ کر گل کاری کی ہے اگر یہ زمین نکال دی جائے تو پھر اردو کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہندی کو ہم اپنی زبان کے لیے ''ام اللسان'' اور ''ہیولائے دل'' کہہ سکتے ہیں اس کے بغیر ہماری زبان کی کوئی ہستی نہیں ہے۔ اس کی مدد کے بغیر ہم ایک جملہ بھی نہیں بول سکتے۔''

یہ خیال درست ہے اور وضع اصطلاحات میں اس کو رہنما بنا جا سکتا ہے۔ وضع اصطلاحات میں اردو کے مفرد الفاظ، مرکبات، تراکیب اور مشتقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور الفاظ کی ساخت کے اعتبار سے آریائی زبانوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشترکہ اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔اردو میں مرکب امتزاجی اور مرکب ارتباطی کی مثالیں پیش کی گی ہیں۔جن کے نمونے پرنئی اصطلاحیں وضع کی جاسکتی ہیں۔آریائی زبانوں کا مشترک اصول، سابقوں لاحقوں، نیم سابقوں اورنیم لاحقوں کا استعمال ہے۔جو مادے کے آگے پیچھے اضافہ کیے جاتے ہیں اور جن کی بدولت نئے مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔پروفیسر سلیم نے عملاً ثابت کردکھایا ہے کہ اس اصول کے تحت فارسی، عربی اور ہندی کے مادوں کو استعمال کرکے بے شمار تراکیب اور اصطلاحات وضع کی جاسکتی ہیں۔مثال کے طور پر موصوف نے صرف ایک لفظ ''برق'' کے ساتھ سابقوں، لاحقوں، نیم سابقوں، نیم لاحقوں کا اضافہ کرکے (300) سے زیادہ تراکیب اوراصطلاحات بناڈالیں۔ایک اوراصول جوآریائی زبانوں میں مشترک ہے یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق ہرلفظ سے فعل بنالیا جائے جیسے انگریزی میں (Nation) سے (Nature) (Nationalise) سے (Naturalise) اسی طرح اردو میں ''قوم'' سے ''قومانا'' یا ''قومیانہ''، ''برق'' سے ''برقانہ''، اردو سے ''اردوانا''، ''ہندی'' سے ''ہندیانہ''، ''مقناطیس'' سے ''مقنانا''، ''ترشہ'' سے ''ترشانا''، ''قلم'' سے ''قلمانا'' ''مرکز'' سے ''مرکزانا''، ''نمک'' جیسے ''نمکانا'' سے افعال بنائے جاسکتے ہیں۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے طریق کار کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترجمہ طلب اصطلاحات کا انتخاب لغات یا گلاسری سے نہیں کیا جاتا تھا۔جامعہ کی نصابی مجلسیں اپنی اپنی ضروریات کی کتابوں کا انتخاب کرتی تھیں جوترجمے کے لیے دارالترجمہ روانہ کی جاتی تھیں۔ترجمے کے دوران مترجمین ایسے الفاظ اور اصطلاحات کی فہرستیں متعلقہ مجالس وضع اصطلاحات میں بھیجتے تھے جن کے مترادفات انہیں اردو میں نہ مل سکے ہوں۔مجالس وضع اصطلاحات کا کام جدید علوم کی ضروریات کے مطابق اردو میں علمی اور فنی موزوں اور زرخیز اصطلاحیں یعنی ایسی اصطلاحیں وضع کرنا تھا جن سے مشتقات نکل سکیں اور مجالس کے اراکین دوقسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اس علم کے ماہر ہوں جس کا ترجمہ زیرغور تھا۔اوردوسرے ایسے علماء جوعربی فارسی اوراردو میں کامل دست گار رکھتے ہوں۔ماہرین زبان کی حیثیت سے مجالس وضع اصطلاحات میں شرکت کرنے والوں میں نواب حضور جنگ، نظم طباطبائی، علامہ عبداللہ عمادی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالہادی ندوی، وحیدالدین سلیم پانی پتی اورڈاکٹرمحی الدین قادری زورشامل تھے۔اصطلاحات کی صحت وسقم اوراردو کے لیے انکے قابل قبول ہونے یانہ ہونے کا اندازہ کالج کی جماعتوں میں تدریس کے دوران ایک حدتک ہوجاتا تھا۔

اصطلاح باہمی قرارداد اور آپس کی مفاہمت کا نتیجہ ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے کسی لفظ یا ترکیب کے جومعنی مقرر کیے جائیں، وہی متعلقہ گروہ میں سمجھے جائیں گے۔اور یہ ضروری نہیں کہ اصطلاحی لفظ یاترکیب میں متعلقہ تمام مفہوم موجود ہو۔کل کے لیے جزو کے اصول کے تحت اس خاص علم سے تعلق رکھنے والوں کے لیے خفیف سا اشارہ کافی ہوسکتا ہے۔اصطلاح کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ اگر اصطلاحیں جوخیالات کے مجموعے کی جانب رہبری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتی ہیں استعمال نہ کی جائیں تو مطالب کے اظہار میں طوالت سے بچا جا سکتا۔ اس کی ایک مثال شمس الامراء کے دارالترجمہ کی کتاب ''رسالہ کیمسٹری'' میں ملتی ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جس میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ مطلب سمجھانے کے لیے ہلدی کے پتے کورس میں بھیگا ہوا کاغذ لکھا گیا ہے۔ یہ اصطلاح متن میں بار بار آتی ہیں اور ہر جگہ ہلدی کے پتے کورس میں بھیگا یا ہوا کاغذ سے لکھا گیا ہے۔ اس طول لاطائل سے بچنے کے لیے اصطلاح سازی ضروری ہے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ناموزوں اور بے ضرورت اصطلاحیں مفقود ہو جاتی ہیں جیسے آکسیجن (Oxygen) کا ترجمہ مائین ''ہائیڈروجن'' (Hydrogen) کا ترجمہ حمضین مقبول نہیں ہوا۔ ان ناموں کے ترجمے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں یہ نام بجنسہ مستعمل ہیں اصطلاح اور معمولی طرز اظہار میں فرق بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے صفحات میں اصطلاحات کا جو ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صحیح معنی میں اصطلاحیں نہیں ہیں اور ان سے مشتقات بھی نہیں نکل سکتے۔ جیسے ''پیدا کرنے والی محنت'' غیر پیدا کرنے والی محنت'' اور اب ان کے بجائے ''محنت پیدا آور'' اور ''محنت غیر پیدا آور'' کی اصطلاحیں مروج ہیں۔ ''پولیٹیکل اکانومی (Political Economy) کا ترجمہ ابتداء ''علم انتظام مدن'' کیا گیا۔ پھر اس کے لیے ''علم سیاست مدن'' ''علم الاقتصاد'' اور ''اقتصادیات'' کی اصطلاحیں بنیں۔ اور بالآخر ''معاشیات'' کی اصطلاحات مقبول ہوئی ایسڈ کا (Acid) ترجمہ بھی ارتقا کی منزلیں طے کر کے کھٹے سے ترشہ اور بالآخر تیزاب بن گیا۔ تھرمامیٹر (Thermometer) کا ترجمہ ابتدا میں ''تابدرجہ نما تھا اس کے بعد'' مقیاس الحرارت'' ہوا پھر'' حرارت نما'' اور بالآخر'' تپش نما'' لیکن تھرمامیٹر اپنی اصلی شکل میں زیادہ قابل قبول ثابت ہوا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ چیزوں کے نام کا ترجمہ ضروری نہیں جب تک یہ نام اردو کے لیے قطعاً ناقابل قبول نہ ہوں اور کتر بیونت کے ساتھ زبان پر رواں نہ ہو سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ٹرمرک پیپر کا ترجمہ بھی قابل ذکر ہے جو ابتداء میں '' ہلدی کے پتے کورس میں بھیگا یا ہوا کاغذ کیا گیا۔ پھر'' ہلدی رس کاغذ'' ہوا۔ اور بالآخر جامعہ عثمانیہ میں'' ہلدی کاغذ'' ہو گیا۔

غرض وضع اصطلاحات سے متعلقہ مسائل بہت سے ہیں۔ لیکن ہندی، فارسی عربی جس زبان سے بھی موزوں مفید اور گوش آشنا مادہ مل سکے لیا جا سکتا ہے، وقت زیادہ تر دو سے زیادہ لفظوں کے باہمی ربط کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندی اور دوسری آریائی زبانوں اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مانوس اور موزوں الفاظ کے ساتھ عربی فارسی جوڑ جائز سمجھا جائے، ان الفاظ کے ساتھ عربی، فارسی سابقے اور لاحقے بے تکلف استعمال کیے جائیں جس کی مثالیں اردو میں موجود ہیں۔ جیسے سمجھدار، بے کل، بے چین، اگالدان وغیرہ۔ جو اصطلاحیں مروج ہیں ان کو برقرار رکھنے کا اہتمام بھی ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس وقت تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ بے کار ہو جائیں گی۔ ان سب سے پیشتر اصطلاحات کا پتہ دوسرے ذرائع کے علاوہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دارالترجمہ کی مطبوعات ''فرہنگ اصطلاحات علمیہ'' اور ''اصطلاحات پیشہ وران'' کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ماہرین سائنس عمرانیات کی اردو تالیقات کی مدد سے چلایا جاسکتا ہے۔

موجودہ مرحلہ اصطلاح سازی میں اگر یہ امر بھی ملحوظ رہے تو مناسب ہوگا کہ جو مادے منتخب کیے جائیں وہ ممکنہ حد تک ہندوستان کی زبانوں اور خصوصاً آریائی زبانوں میں مشترک ہوں۔ اگر اس سمت میں سلیقے کے ساتھ قدم اٹھایا گیا تو زبانوں کی گوناگونی کے باوجود اصطلاحات کے کل ہندروپ کے لیے بنیادیں استوار ہوسکیں گی۔

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ: لسانی و ساختیاتی مباحث

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فن ترجمہ کا لسانیات سے تعلق

خالد اقبال

علم لسانیات کی ترقی سے "فن ترجمہ نگاری" کے زاویے بھی بہت حد تک تبدیل ہو گئے ہیں۔ "ترجمہ نگاری" کو ابتداء میں دوسرے درجے کا کام کہا جاتا رہا ہے۔اس کی وجہ ترجمہ نگاری کی اہمیت اور افادیت سے بے خبری اور کم علمی تھی اسی بناء پر ترجمے کو ماضی میں وہ مقام و مرتبہ نہ مل سکا۔ادب۔تنقید کی تمام تحریکیں زبان سے متعلق ہیں حتیٰ کہ ہم عصر تنقیدی نظریات کا تعلق بھی لسانیات سے ہے۔فن ترجمہ نگاری کو اس کے صحیح تناظر میں جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس فن کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے اصولوں سے واقفیت حاصل کی جائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ترجمے کا بالخصوص لسانی اور دیگر پہلوؤں سے جائزہ لیا جائے۔

"The subject of translation is an interdisciplinary topic. Naturally, in the investigation of translations one utilises such lingustic theories as phonology, syntax, semantics and Praggmatics,.However these are also extralinguistic factors inrolved in translation and to additional theories of their enviornment, culture and beliefs (1) (T. Tymoczko)"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات بہت حد تک درست ہے کہ زبان کا مسئلہ باہمی روابط سے ہی منسلک ہے اور زبان کے استعمال میں بہت نظریات بھی جڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح صوتیات (Phonology, Syntax) یعنی جملے کی ساخت وغیرہ۔ اس کے علاوہ فن ترجمہ نگاری کیلئے ایک اہم بات جس کی طرف T.Tymoczk نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ماورائے طریقے بھی استعمال کرنا چاہیں۔ اس کے علاوہ دوسری اہم بات جسے ہم آگے لے کر چلیں گے وہ یہ ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ماحول۔ ثقافت اور اعتقادات کا معاملہ بھی بہت اہم ہے۔ لیکن ان جملہ پہلوؤں پر بات سے پہلے زبان کی لسانی پہلو سے سرسری جائزہ لے لیا جائے۔

لسانیات (Linguistics) جسے کسی بھی زبان کی Science یا کسی بھی زبان کے بارے میں جاننے کا علم کہا جاتا ہے۔ اس علم کو جاننے کے لئے Phonetics (صوتیات) پر بات کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ صوتیات Phonetecs کسی بھی زبان کی آوازیں (Sounds) کا مطالعہ ہے یعنی صوتیات انسانی آوازوں کی Science ہے کیونکہ ہر زبان کا ایک مخصوص صوتیاتی نظام (Sound syestem) ہے جسے ماہرین لسانیا نے فونیمیات (Phonology) کا نام دیا ہے۔ فونیمیات (Phonology) لسانیات کی وہ شاخ ہے جو مارفیم اور فونیم کو دنیا کی تمام زبانوں کے تقابلی موازنے، مآخذات، سماجی حالت اور دیگر کئی پہلوؤں کو پس منظر میں رکھ کر دیکھتی ہے۔

علم لسانیات میں استعمال ہونے والے ان الفاظ مارفیم اور فونیم کی وضاحت ضروری ہے اور صوفیات۔ فونیمیات میں فرق کو بھی ملحوظ نظر رکھنا ہوگا۔

''صوتیات'' میں زبان کی آوازوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو کسی ایک زبان تک محدود نہیں ہوتا۔ جبکہ ''صوفیات'' میں کسی ایک خاص زبان کی مخصوص آوازوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور یہ علم الفاظ کی شناخت سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر خلیل صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ایک زبان میں فونیمی حیثیت نہ رکھنے والی ایک آواز دوسری زبان میں لازماً صوتیے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ ایک زبان کے مختلف صوتیے دوسری زبان میں ایک صوتیے کے ذیل میں آسکتے ہیں''۔ (۲)

لفظ مارفیم اور فونیم کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر جمیل آذر لکھتے ہیں: جرمنی کا لفظ ہے۔ ماہرین لسانیات اسے کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ چیمبر ٹوئنٹیتھ سنچری ڈکشنری ایڈیشن ۱۹۸۳ء صفحہ ۸۵۶ پر اس کے ''بامعنی لفظ'' کے ہیں یعنی A word that has meaning مثلاً قلم، دوات۔ میز۔ کاغذ۔ چاند۔ سورج۔ ذہن انسان۔ پاکستان۔ ترکی۔ چائے بسکٹ وغیرہ.... فونیم (Phoneme) بھی جرمنی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ''حروف اصوات'' کے ہیں یہ حروف ہیں جو ہماری آواز کی نشان دہی کرتے ہیں۔ محولہ بالا ڈکشنری کے صفحہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

۲۰۰۱ء پر اس کے معنی اس طرح سے درج ہیں:۔

A group or family of speech sound felt in any one languae to be merely Variants of one sound.

"حروف کا تعلق ہماری بول چال کی سب سے چھوٹی اکائی سے ہوتا ہے مثلاً اُ بُ پُ تُ وغیرہ۔ ان حروف کو عام طور پر حروف تہجی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق تلفظ، ہجوں اور آواز سے ہوتا ہے آواز کا تعلق اعراب (یعنی زبر۔ زیر۔ پیش اور تشدید) سے بھی ہوتا ہے جو تلفظ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں"۔(۳)

گویا مارفیم (Morpheme) اور فونیم (Phoneme) اگرچہ غیر ملکی زبان کے الفاظ ہیں جن کو ہم اپنی آسانی کے لئے "حروف وصوت" اور "الفاظ" کہہ سکتے ہیں۔ حروف اپنی لسانی تشکیل کے عمل میں جملے بنتے ہیں جبکہ جملے یا فقرے، جذبات، خیالات انسانی کے اظہار را ورسیلہ بنتے ہیں اسی طرح انگریزی الفاظ Semantics اور Synatax بھی لسانی پہلو سے تشریح طلب کرتے ہیں:

- لفظ بہ حیثیت حصہ زبان (تحریری حالت) (Taxt)
- لفظ بہ حیثیت تمثال صورت (Intonations)
- لفظ بہ حیثیت ماخذ معنی (Semantics)

مارفیم کی اصطلاح Semantics اور Phonetics میں لفظ کے مختلف حصوں اور اس کے سٹرکچر سے متعلق بحث کے لئے استعمال کی جاتی ہے جب کہ لفظ کے لئے ان subjects میں Lexeme کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ مارفیم کو بہ حیثیت حصہ زبان As a written form لیا جائے گا تو لفظ نہیں کہلائے گا کیونکہ اس کے لئے Lexeme کی اصطلاح موجود ہے "Synatax" یعنی لفظ کی نحوی صورت کوئی بھی لفظ اپنے تہذیبی، تاریخی اور زبان میں موجود اپنی نحوی Syntax درجہ بندی سے ایک ہو کر معنی پیدا نہیں کر سکتا۔ اگرچہ معنی خیزی کے عمل میں وہ معنی پیدا کر رہا ہوتا ہے مگر حتمی طور نہیں۔

یہاں ہمیں ڈریڈا (Drada) کی Theory of Defference کے تین اہم نکات کو دیکھنا ہوگا۔

"The entire history of the concept of sturcture, before the rupture of which

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

we are speaking, must be thought of as a series of substitutions of centre forcentre, as a linked chain of determinations of the entre. Successively, and in a regulated fashion, the centre receives different forms or names. the history of etaphysics, like the history of west,is the history of these metaphors and metonymies. its matrix [...] is the determinations of being as presence in all senses of this word. it could be shown that all names related to fundamentals, to principles, or to the centre have always designated an invariable presence- eidos, arche,telos, energeia, ousia (essence, existence, substance, subject), a l e t h e i a , transcendentality,consciouysness, God, man, and so forth."Structure, Sign and Play" in Writing and Difference , P. 353. (4)

- زبان میں موجود ظاہر عناصر سے معنی کا افتراق پیدا ہوتا
- ظاہری لسان میں موجود ظاہری عناصر کی عدم موجودگی جسے Trace کا نام دیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

o۔ خاموشی کا وقفہ جسے Spacing کا نام دیا گیا ہے ٹکڑا بھی معنی کے افتراق کا موجب بنتا ہے

دریڈا نے معنی کی عدم قطیعت کی بجائے کثیر المعنیت پر زور دیتے ہوئے لفظ کے حاضر اور غائب' Traces کا نظر یہ پیش کیا یعنی کثیر المعنیت کا مطلب یہ نہیں کہ لفظ کا معنی آزاد پرواز کرتا ہوا خطوں کی ڈھود سے ماورا ہو جائے۔ اس لئے استعمال شدہ لفظ کے تناظرات اخیال رکھتا ہے۔

دریڈا کے مطابق معنی/مطلب (Difference) تغیر پذیر ہوتے ہیں اس لیے مترجم کو چاہیے کہ وہ ہم عصر مطالب کو بھی مدنظر رکھے۔ زبان مسلسل ارتقاء پزیر ہے اور ساکت یا جمود کا شکار نہیں رہتی۔

سٹرکچرل ازم (Structuralism) اور ڈیڈرا کے حامی ماہرین لسانیات کے حوالے سے بی جے کما رداس کہتے ہیں:

" The Structuralists belive that a work can be peeled off to express avoid atcentre and that makes translation diffcult. Derrida and his followers. They say that words carry with them no difinite meaning but they are characterized by an indeterminacy of meaning."(5)

لفظ اور معنی کے التواء کے حوالے سے دریڈا نے جو نظریہ پیش کیا ہے اسے تمام تخلیق ادب پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''مغرب میں فروغ پانے والی تنقید (Theory) میں ساخت کے حوالے سے جو پیش رفت ہوئی ہے وہ بالآخر دریڈا سے اخذ کردہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ کائنات ایک ایسا گورکھ دہندہ ہے جس کی کنہ تک پہنچنا ناممکن ہے وجہ یہ ہے کہ اس کی کنہ موجود ہی نہیں موجود صرف التوا کا منظر ہے جو اصل معنی کے التوا کو پیش کرتا ہے زبان اور اس کے حوالے سے تحریر یعنی (Text) بھی ایک گنجھلک ہے جسے کسی ساخت، مرکز ے، منبع یا مصدر سے ہم رشتہ نہیں کیا جاسکتا۔ صوفیاء نے بھی اس گنجھلک کا ادراک کیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مگر پھر وہ اس کے عقب میں یکتائی کے اس مقام کو بھی چھونے میں
کامیاب ہوئے تھے۔ جہاں کثرت کے جملہ مظاہر ختم ہو جاتے
ہیں‘‘(۶)

مارفیم اور فونیم کا تعلق ڈریڈا کی Theroy of Difference سے ہے اس لئے (Phonology) کی اس مختصر بحث (جو کہ زبانوں کے تقابلی جائزے، مآخذات، سماجی معاشرتی حالات اور فلسفے کے پس منظر سے تعلق رکھتی ہے) کے بعد اس نکتے پر پہنچتے ہیں کہ مارفیم۔ کی ایک حیثیت زمانی اور دوسری مکانی بنتی ہے یہ دونوں حیثیتیں اگر چہ بہ یک وقت موجود ہوتی ہیں۔ جس طرح ثقافتیں اور تہذیبیں ایک دوسرے سے کچھ لو اور دو کے اصول پر کاربند ہوتی ہیں اسی طرح زبانوں کے آپس کے تعلقات ایجاب وقبول کے مرحلے سے گزرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے:

’’مارفیم کو نئی تھیوری کے تحت ضرور بروے کار لانا چاہیے لیکن اس امر کا
خیال رکھتے ہوئے کہ لسانیات کی اپنی ثقافتی حیثیت بھی برقرار ہے اور
بین الاقوامی سطح پر اپنے مآخذات سے بھی انحراف نہ برتا جائے یعنی زبان
کا وہ تشخص بھی برقرار ہے جو اسے ایک طویل عمرانی عمل سے گزرنے کے
بعد نصیب ہو‘‘۔(۷)

اس بات سے اتفاق ضروری ہے کہ کسی بھی زبان کا تشخص اور اسکی ثقافتی حیثیت کو برقرار رکھا جائے کیونکہ کوئی بھی زبان اچانک وجود میں نہیں آجاتی۔ ہر زبان تاریخی سماجی ثقافتی پس منظر کی حامل ہوتی ہے جو اسے ایک طویل سفر کے بعد میسر آتا ہے۔ تاہم واضح رہے کہ ہم زبان کے لسانی پہلو سے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں:۔

۱) تفاعلی Functional

۲) رسمی Formal

’’جب ہم کہتے ہیں کہ زبان خیالات کی ترسیل کا اہم ذریعہ ہے تو اس کا
مطلب یہ ہوا کہ اپنی معلومات، خیالات کو دوسروں تک پہنچانا یعنی مر
سل الیہ (Receiver) تک اپنا پیغام پہنچانا۔ زبان کے اس ترسیلی
عمل میں مبدا ابلاغ (Source) دونوں مرسل الیہ انسان ہوتے
ہیں گویا زبان بنیادی طور پر انسانی عمل ہے‘‘۔(۸)

زبان جو کہ ہمارے خیالات کے ابلاغ کا ذریعہ ہے یہ ’’حرف‘‘ اور ’’صوت‘‘ کی شکل اختیار کر کے ’’مفہوم‘‘ میں ڈھلتی ہے۔ یہی ’’مفہوم‘‘ ایک انسان سے دوسرے تک پیغام بن کر پہنچتا ہے اسے زبان کا سماجی معاشرتی اظہار بھی کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتا ہے۔

علم لسانیات کی رو سے زبانوں کی درجہ بندی تین طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔

۱) جغرافیائی Geographically

۲) جینیاتی Genetically

۳) نوعی Topologically

اس وقت ہمارا موضوع بحث زبان کا نوعی (Topologically) پہلو ہے جس میں زبان کی درجہ بندی، داخلی ساخت ہیئت' الفاظ گرامر۔ فقرات کا جائزہ لیا جائیگا۔ کیونکہ زبان کے جملہ پہلو فن ترجمہ نگاری میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

> ''تحریری طور پر زبان کا کنیڈا اور محض کسی نہ کسی نظر آنے والی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جسے ہم متن کہتے ہیں ہر متن اپنی مخصوص صفات رکھتا ہے اور اس سے معنی انسان اپنے سابقہ تجربہ کے توسل (Mediation) سے سمجھ پاتا ہے۔ توسل اور معنی کے رشتوں کو سمجھنے کے لئے جس علم کی ضرورت در پیش ہوتی ہے اسے لسانیات کا نام دیا گیا ہے گویا لسانیات بنیادی طور پر زبان' متن اور معنی کا سائنسی جائزہ لیتی ہے''۔(۹)

Text

Textuality

Mediation

Meanings

Linguistic's

جیسا کہ ہم جانتے ہیں زبان کے لفظوں۔ جملوں' محاوروں اور ان کی ساخت کا مطالعہ ''نحوی'' علم ہوتا ہے۔ جن کا براہ راست تعلق کسی زبان کے متن اور معنی سے ہوتا ہے۔ کسی زبان کے فقروں کے صحیح معنی کا ادراک کرنا فقروں یا جملوں میں فرق کو محسوس کرنا فن ترجمہ نگاری میں حد درجہ اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ جملوں میں لفظیات کا استعمال اور لفظوں کی ترتیب سے کئی طرح مفہوم واضح ہوتا ہے جو بظاہر کچھ فرق نہیں رکھتا کیونکہ جملے اپنی ساخت کے لحاظ سے بھی درست ہوتے ہیں لیکن کسی زبان کے متن میں ان کے استعمال سے معنی بدل جاتے ہیں جس کے لئے زبان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ن لفظیات (Vocabulary) اور لغت (Lexicon) کا مطالعہ ماہرین لسانیات کے نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے۔ گویا

"ترجمہ بنیادی طور پر لسانی فن ہے اس کی ابتداء بھی لسان سے ہوتی ہے
زبان کے ساتھ وسعت بھی پاتی ہے اور زبان کیساتھ ہی اپنی اختتامیہ بھی
کرتی ہے ترجمے میں زبان کا ہدف زبان ہوتا ہے"۔(۱۰)

فن ترجمہ نگاری اور لسانیات کا چولی دامن کا ساتھ رکھتے ہیں۔ کوئی ترجمہ اس وقت تک حقیقی معنوں میں کامیاب نہیں کیا جاسکتا جب تک اسکی زبان کے بنیادی ڈھانچے (Basic Structure) کا مطالعہ نہ کرلیا جائے۔ کیونکہ کسی بھی زبان میں جس طرح لفظیات کی کئی تہیں ہوتی ہیں اسی طرح زبان کے محاورے اس کے مترادفات (Synanyms) اور متضاد الفاظ (Anonoyms) کا گہرا مطالعہ زبان کی ہیئت اور مفہوم تک پہنچنے کے لئے از حد ضروری ہے جن کا تعلق زبان کی نچی سانچوں سے بنتا ہے جو کہ علم لسانیات کی رو سے معنیات (Semantics) کا مطالعہ کہلاتا ہے اور یہ کسی زبان کی ساخت کا آخری پہلو کہلاتا ہے۔ جس کی رو سے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی زبان میں استعمال ہونے والے اسماء اور ان کا اشیاء کے ساتھ کس نوعیت کا تعلق ہے۔
لسانیات محدود علم نہیں بلکہ بہت بلکہ وسعت اور اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

۱)	صوتیات	(Phonoetics)
۲)	فونیمیات	Phonology
۳)	قواعد	Grammar
۴)	لفظیات	Vocabulary
۵)	معنیات	Semantics

علمی صوتیات/اور معنی کی ماہیت کا علم مترجم کیلئے نہایت ضروری ہے۔

جدید دور کے معروف ماہر لسانیات Roman jakobsn اپنے ایک مضمون On Liguistic Aspects of Translation میں ترجمہ نگاری کے تین پہلوں کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔

1. Intralingual Translation (An interpertation of verbal sign menas ofothers sgnin the same language).

2. Interlingual Transltion or translation Proper (and interpretation of verbal singns by means of same other language).

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3. Intersematic translation of translation (an interpretation of verbal singns by means of signs of non verbal sign systems.(11).

ترجمہ کے لسانی پہلو کے حوالے سے Roman Jakbosan نے تین طرح کے طریق کار بتائے ہیں ایک یہ کہ لفظی علامتوں میں منتقل کیا جائے جسے انہوں نے Intralingual Translation کا نام دیا ہے جبکہ ایک زبان کے مطلب کی دوسری زبان میں تشریح یا آزاد ترجمہ کو Interlingual Translation کہا گیا ہے اسی طرح Intersematic Translation سے مراد کسی زبان کے لفظی مطالب کو دوسری زبان کے غیر لفظی یا علامتی طور پر مطالب بیان کرنا کہا گیا ہے۔

Roman Jakbosan ''ترجمے کا لسانی پہلو'' کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کسی بھی لسانی Sign کے ترجمے کا مطلب اس کو کسی متبادل Sign میں تبدیل کرنا ہے خاص طور پر اس لسانی Sign میں جو زیادہ مکمل طور پر Develop ہو۔

> "Any Comparison of two languages implies an examination of their Translatability; wiedespread practice of interlingual communication, particularytranslating activities, must be kept under constant scruting by linguistic science.(12)

دو زبانوں کا تقابل ان کے ترجمے کی صلاحیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انٹرلینگوئل ابلاغ کی پریکٹس بالخصوص ترجمے کے کام کو زبان کی سائنس کی کڑی مخالفت میں رکھا جانا چاہیے۔

فن ترجمہ نگاری میں ایک جملے کی بہت اہمیت ہوتی ہے کیونکہ ایک مکمل جملہ ہی اپنا مفہوم واضح کرتا ہے۔

> " By defination , a sentence in a second language which mean the same as the original. under this conception a translator begins with

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

sentences which have meaning in the semantic strcture of one language and attempts to construct equlivalent sentence using the semantic devices of the second language. Hence semantic theory, sufficient to provide an adequate theory of translation. Translation theory is applied semantics".(13)

تشریح: کہا جا سکتا ہے کہ جس زبان میں آپ ترجمہ کر رہے ہیں اس کا جملہ اصل زبان کے عین مطابق ہونا چاہیے جس سے ترجمہ کی جا رہی ہے اس تصور کے مطابق ایک مترجم جملہ شروع کرتا ہے جس کا تعلق ایک زبان کی ساختیات میں ہوتا ہے اور مترجم کوشش یہ کرتا ہے کہ اسی طرح کا جملہ استعمال کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اس کی ساخت کو ملحوظ نظر رکھے۔ چنانچہ ساختیات کا نظریہ جس کا دارومدار جملوں کی بناوٹ اور صوتیات پر ہوتا ہے۔ یہ انداز ترجمے کے صحیح نظریے کو پیش کرتا ہے ترجمے کا نظریہ عملی ساختیات سے ہے جبکہ Derrida اور Paul de man ترجمے کو ایک تحریر یا مترجم کو مصنف کا درجہ نہیں دیتے بلکہ وہ علم زبان کی رو سے (Semantic Unity) مصنف کی Originality اور Copy right تحریری ملکیت یعنی کسی ترجمے سے کی گئی تحریر کے بارے میں شک کرتے ہیں ان کے نزدیک دونوں قسم کے مواد اختراعی Derivative اور Heterogeneous یعنی مختلف زبانی اور ثقافتی مواد پر مشتمل ہوتے ہیں اس لئے وہ تحریر کی Signification میں توازن کو برقرار نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ اصل تحریر سے مختلف ہو جائے تو مشکلات اور شک پیدا ہوتا ہے ترجمے کی یہ مشکلات صرف زبان اور ثقافتی حوالے سے نہیں بلکہ متن (Text) کے داخلی مواد بھی ہوتی ہیں۔

ترجمہ نگاری و لسانیات کے تناظر میں اپنے نظریات آگے بڑھانے والوں میں Catford (1965ء (1958/95)

Vinay 'Darbelnet جبکہ Leubven Zawart (1989/1990) Kitty کے نام زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ Darbelnet اور Vinay نے ترجمہ نگاری میں انداز اور اسلوبیاتی تجزیہ (Stylistic analysis) کے نقطہ نظر کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے دو زبانوں کے مابین ترجمہ نگاری کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلسلے میں براہِ راست ترجمہ (Direct Translation) اور (Oblique Translation) کے طریقہ کار کو روشناس کرایا۔

براہِ راست ترجمہ نگاری کے حوالے سے انہوں نے تین اقسام بتائی ہیں۔

۱۔ Borrowing

ترجمہ کرتے ہوئے S.L کے الفاظ کو براہِ راست T.L میں منتقل کرنا تاکہ مقامیت کا عنصر نمایاں رہے۔

۲۔ Calque

یہ ترجمہ نگاری ایک قسم ہے جس کے تحت S.L کے تاثر کو تحقیقی (Literal) انداز میں (T.L) میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور اس میں تھوڑے بہت فرق سے معنی کی تبدیلی بھی جاتی ہے۔

۳۔ Literal Translation

ترجمہ نگاری کی یہ قسم اس وقت بروئے کار لائی جاتی ہے جب زبانوں کے مابین لسانی ثقافتی تعلق ایک جیسا ہو

۔

اسے لفظ سے لفظ (Word to Word) ترجمہ نگاری بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ Vinay اور Darbelnet نے ترجمہ نگاری کی اس قسم یعنی Literal Translation کو قابل قبول قرار نہیں دیا کیونکہ ساختیاتی اعتبار سے ناممکن ہے۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے ترجمے کے سلسلے میں نئی حکمت عملی متعارف کرائی جو کہ Oblique Translation کہلاتی ہے اور اس کے چار طریقہ کار ہیں:

۱۔ Transposition

کسی زبان کے خیال (Sensse) کو تبدیل کیے بغیر (Part of speech) کو تبدیل کرنا

۲۔ Modulation

اس طریقہ کار کے مطابق Sematic نقطہ نظر S.L میں تبدیلی کی جاتی ہے۔

۳۔ Equivalence

جب دونوں زبانوں کے ترجمے کے عمل میں ایک ہی طرح کی سرگرمیاں یا حالت بیان کرنا مقصود ہو تو ہم پلہ Equivalence عنصر کو آزمایا جاتا ہے یہ Idioms اور Proverbs کے ترجمے کی صورت میں مددگار ہے۔

۴۔ Adaptation

یہ طریقہ کار اس وقت زیادہ قابل استعمال تصور کیا جاتا ہے جب ثقافتی وسیلہ دوسری زبان (T.L) میں میسر نہ آئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

J.C Catford نے format Correspondence اور Textual equivalence کا نظریہ پیش کیا ہے۔اور وہ فن ترجمہ نگاری کو لسانیات کا عمل کہتے ہیں اور اسی حوالے سے انہوں نے ایک کتاب A Linguistic Theory of Translation بھی لکھی۔جس میں انہوں نے ترجمہ نگاری کا تعلق لسانیات سے جوڑا ہے۔ان کے نظریے کے مطابق

"Translation is an opration performed on Languages: a process of substititing a text in one language for a text in an other. Clearly, then , any theory of trnaslation must draw upon a theory of language-a General linguistic thoery. General Ligustic is , primarly , a theory about howlanguages work. (J.C Catford)(14)"

ترجمہ زبانوں کے حوالے سے عمل جراحی کی طرح ہے گویا ایک متن کا دوسری زبان میں ہو بہو انتقال ہے چنا چہ ترجمہ کا جو نظریہ ہے اس کا تعلق لسانیات سے بنتا ہے۔جسے ہم عام لسانی نظریہ کہیں گے۔جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ زبان سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔

1. Formal Correspondent. mean's if a word, class, unit, element of structure etc;of T.L occupies the nearest possiblity of S.L lit is called a formal cossrspondent.

2. Textual Equivalent. means, If any T.L text or portion of text which is obsereved on a particular occasion to be equivalent of a given S.L text or portion of the text, this type of text is called textual equivalent.

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ کو اطلاقی لسانیات کی ایک شاخ کہا گیا ہے اس تناظر میں جب ہم بات کریں گے تو پھر ہمیں چارٹ کی مدد سے یہ دیکھنا ہوگا کہ زبان کس طرح سے ذریعہ اظہار بنتی ہے۔

What is Language

Language way of Communication

Spoken	Written
Registers	Genres
way of Taking in different Situations	Social Convention of writing
Baby talk, teacher's talk	Poetry, Novel Prtical etc

جب ہم کسی زبان کا لسانیاتی جائزہ معنی پر بحث کریں گے تو پھر ہمیں زبان کے متن (Text) کی جانب کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ زبان کی نوعیت مختلف طرح کی ہوتی ہے زبان کا ثقافتی پہلو کینڈا کہلاتا ہے جبکہ زبان کے متنی پہلو کو محضر یا (Disourse) کہا جاتا ہے۔

بول چال یا گفتگو کے مختلف انداز رجسٹر (Register) یا سانچے کہلاتے ہیں مثلاً مختلف طبقات کا انداز گفتگو جو کہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگا اسی زمرے میں شامل ہے۔ مختلف طبقات کی باہمی گفتگو کے مختف سانچے یا (Register) میں معنویات میں رکھنا ضروری ہے۔ گویا یہ دیکھنا ہوگا کہ لفظ اور معنی کا ایک دوسرے سے کیا تال میل یا تعلق بنتا ہے۔ اسی طرح سے ادبی تحریری زبان کا اسلوب یقیناً مختلف ہوا ہے انہیں لسانیات کی رو سے کینڈے یا (Genre) کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے M.A.K Halliday نے زبان کا سماجی اور ثقافتی تعلق نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے زبان کے سانچے یا (Register) کے تین بنیادی عناصر بتائے ہیں۔

1. Field:

What is being written aobut.

2. Tenor:

From whom and to who is Communication taking place.

3. Mode:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

The form of Communication.

" In the 1990, discourse analysis came to prominence is translation studies Holiday model of discourse analysis, on based what he term " Systemic Functional Grammar, is geared to study of languages as commincation" (15) Holiday.

1990 میں ترجمہ نگاری میں محضر یا اسلوبیاتی حوالے سے تجزیے کی پیش رفت ہوئی جسے ہالیڈے نے متعارف کرایا جس میں انہوں نے زبان کی ساخت کو گرائمر کی رو سے کسی منصوبہ بندی کے عمل کے ماتحت دیکھنے کا نظریہ پیش کیا۔ کہ زبان کی ابلاغی صورتحال کا جائزہ لیا جائے۔

ہالیڈے کے نظریے کے مطابق Field کا تعلق کسی تحریرا متن کے اضافی معنی کے ساتھ بنتا ہے مثلاً ورب Verb کی اقسام Active, Passive وغیرہ جبکہ Tenor کا متن کے ساتھ تعلق Interpersonal meaning کو Verb/Adverb سے بنتا ہے جبکہ Mode کا تعلق متن کے مطالب سے بنتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد اپنے اپنے انداز سے زبان کا استعمال کرتے ہیں جسے ہم ان کے پیشے کے اعتبار سے مخصوص کرتے ہیں مثلاً صحافتی زبان، قانونی زبان، دفتری زبان، سائنسی زبان، ادبی زبان وغیرہ وغیرہ زبان کا یہ استعمال یا انداز لسانیات کی رو سے (Discourse) یا محضر کہلاتا ہے۔ گویا زبان کا ایسا استعمال جسے کوئی خاص گروہ با آسانی سمجھ سکے کیونکہ جب مختلف طبقات کی زبان تحریری صورت میں سامنے آتی ہے تو وہ الفاظ، جملوں۔ جملوں کی ساخت اور نحو کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتی ہے۔

کسی زبان کے مزاج کی دریافت اگرچہ مشکل معاملہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہو اس زبان کے ماضی اور حال سے ادراک اور احساس کو قبول کیا جائے۔ کیونکہ الفاظ، جملوں کی ساخت اور اصطلاحات کے استعمال کرنے کے عمل میں زبان کا مزاج پوشیدہ ہوتا ہے۔

زبان کے اندر زبان کا مطلب یہ ہے کہ ایک زبان کو مختلف طبقات الفاظ اور محاورں کو مختلف طرح سے بولتے ہیں۔ ایک ہی جملے کو بسا اوقات مختلف گروہ یا طبقات کے افراد جب بولیں گے تو ان کا انداز بیاں انکے لہجے، انکی ادائیگی، تلفظ اور جملے کی ساخت سے ان کے سماجی رتبے کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت زبان کا فرد کی نفسیات کے مطابق ہم آہنگ ہونا بہت ضروری ہے جیسا کہ ڈراموں یا فلموں کی ڈبنگ (دوسری زبان میں منتقلی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمل میں کیا جاتا ہے یعنی نوکر کا کردار ادا کرنے والا کسی طرح کی زبان یا جملہ ادا کرے گا۔ اگر ڈرامے یا فلم میں ہیرو بولتا ہے تو اس کی زبان کیسی ہوگی۔ ترجمہ کرتے وقت زبان کے اس پہلو کو مدنظر رکھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

T. Language یعنی جس زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہو، اس کے کے مزاج کو جاننا سمجھنا اشد ضروری ہے کیونکہ ہر زبان میں جملے بنانے کا اپنا انداز اور طریقہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ جملے میں قول محال (paradox) یا جملہ معترضہ کا ہونا۔ ایسے میں مترجم کو چاہیے کہ وہ زبان کے مزاج کے مطابق ترجمے کو ڈھالے، ایسے الفاظ، مرکبات اور تراکیب سامنے لائے جو اصل متن کی روح سے ہم آہنگ ہوں۔ جملے بے ربط نہ ہوں۔ ان باتوں پر توجہ برتنے سے مترجم ایک نیا اسلوب دریافت کر سکتا ہے۔ جس سے نئی زبان وجود میں آسکتی ہے اور زبان اظہار کی تخلیقی سطح تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

حوالے

1. Tymoczk, (Essay) (Translation & meaning) Philosophical and linguistic approaches, Edited by F. Guenttner and Guenttner Rentter, New york, New Yark University press 1978, page (29)

۲۔ خلیل صدیقی، پروفیسر، آواز شناسی، بیکن بکس، گلگشت کالونی، اشاعت ۱۹۹۳ء ص ۱۱۱

۳۔ جمیل آذر، پروفیسر، سمپوزیم، مافیم اور فلیم، ماہنامہ کاغذی پیرہن، لاہور، جولائی، اگست ۲۰۰۸ء ۳/۷ ساہوواڑی، شالیمار لنک روڈ لاہور، ص: ۱۰۔

4. Derrida, Jacques, " Structure, Sign and play" in writing and difference. Wikipedia, the free encyclopidia. P: 350.

5. Das, Bija Kumar, A Hand Book of Translation, ATlantic Publisher's and Distributor's, B-2 Vishal Enclave, opp, Rajouri Garden New Dehli, P: 353.

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، مضمون، "سٹرکچر اور اینٹی سٹرکچر" مشمولہ معنی اور تناظر، مکتبہ نردبان سرگودھا، ۱۹۹۸ء۔ ص: ۱۰۲۔۱۰۳۔

۷۔ مطلوب احمد یار، سمپوزیم، مافیم اور فلیم، ماہنامہ کاغذی پیرہن لاہور، جولائی اگست ۲۰۰۸ء، ۷/۳ ساہوواڑی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

،شالیمار لنک روڈ لاہور، ص ۱۷۔

۸۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، نگارشات، میاں چیمبرز ٹمپل روڈ لاہور، مترجم: ڈاکٹر نصیر احمد، اشاعت ۱۹۹۷ء ص ۲۷۔

۹۔ عطش درانی، ڈاکٹر، تقابلی لسانیاتی تحقیق کے مسائل، علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد، درسی کتاب، اشاعت اپریل ۲۰۰۶ء ص ۱۲۔۱۱۔

۱۰۔ احمد سہیل، ڈاکٹر، مضمون، ترجمہ نگاری کے چند پہلو، مشمولہ سہ ماہی سمبل، مدیر علی محمد فرشی، جلد ۲ شمارہ ۱۳/۴ جنوری تا جون ۲۰۰۸ء رانی مارکیٹ، پنج بھاٹا، راولپنڈی کینٹ، پاکستان ص ۳۵۴۔

11. Roman Jakobsn. on Linguistic aspect of translation, The Translation Studies Reader, Edited Lawrence Venuti, Published 200, New Fetter Lan London. P: 113.

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

14. J.C Catford. "A Linguistic Theory of Translation", Oxford University Press, 1965 P.1.

15. Mohammad Ahmed, " Translation theory and Practic, M.Phil Thesis, Department of English B.Z.U Multan, 2004. P: 39.

☆☆☆

(مشمولہ: فن ترجمہ (اصول و مبادیات تحقیقی مطالعہ) مصنف خالد اقبال)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے کا ساختیاتی نظریہ

احمد سہیل

ترجمہ لسانی وتنی "میٹا فورسیس" (Metamorphosis) ہے جو ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اپنے نفوذ کا عمل کرتے ہے۔ اس عمل میں تخلیق یا تحریر اپنی مخصوص ماحولیاتی قیود سے باہر نکل کر جہاں ایک طرف نئے معاشرتی گروہ کو فکر کی دعوت دیتا ہے تو دوسری جانب اس حوالے سے اس کی فکری گہرائی اور گیرائی کو صحیح طور پر پرکھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یوں ترجمے کا فنِ تقابل اور افتراق کے عمل سے گذر کر اپنا مجموعی اور دیانت دارانہ انکشاف کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ترجمہ جذبات، احساسات اور اظہار کی مشابہت کا فن بھی ہے جس کے پس منظر میں اصل متن کی زبان کی آگہی اور دوسری زبان (جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے) میں مہارت اور اظہار پر قدرت ہونا ضروری تصور کیا گیا ہے کیونکہ تخلیق کی اصل زبان کو نئی زبان میں منتقل کر دیا جاتا ہے تو ذخیرۂ الفاظ میں ہی وسعت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ذہنی اور لسانی ساختیہ بھی ترجمہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی ساختیاتی منتقلی مشاہدے میں آنے والا منطق مظہر بھی ترجمہ ہو جاتا ہے جو دو زبانوں کے درمیان کو وحدت کے دائرے کو مکمل کرنے میں بھی سرگرم نظر آتا ہے جس سے ارتباط کا محور ساختیے کے بنیادی ماخذات، میکانیت، فکری یگانگت اور ماحولیاتی جبر کے تصورات ترجمہ کرنے والے کے فنی تجربے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

لسانی رشتے اور معنویت کی بازیافت

اردو میں ترجمے کی تھیوری پر بہت کم لکھا گیا ہے جو تھوڑی بہت تحریریں سامنے آئی ہیں وہ قدرے موضوعی اور تاثراتی نوعیت کی ہیں۔ گو ان میں سے چند تحریریں فکر انگیز بھی ہیں لیکن ابھی تک اس موضوع پر اس طور پر پیش رفت نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔ اردو کی تاریخ میں ترجمے کا بیش بہا خزانہ موجود ہے اور یوں اردو کی نشو ونما بھی تراجم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے حوالے سے ہوئی اور لسانی نفوذ کا وسیع ساختیہ ہی ایک ایسا عامل ہے جس نے ترجمے کے ذریعے اردو زبان وادب کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ خاص طور پر عربی، فارسی اور ہندی نے اردو کے ساتھ جو تراجم کے روابط قائم رکھے اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عربی قواعد، فارسی زبان کی شیرینی اور ہندی زبان کی فطری معصومیت اردو زبان کے مزاج کا حصہ بنی جو ترجمے کے بعد ترجمے کی تفہیمیت کے مزاج میں بھی مددگار ثابت ہوئی، جس نے لسانی ماہیت کے کئی سوالات اٹھاتے ہوئے عقل عمومی کے کئی روایتی تصورات سے مبارزت کی، اور ساتھ ہی بنیادی لسانی حصار سے باہر نکل کر ان مسائل کو اٹھایا جو اس سے قبل عملی اور ادبی چلن کا حصہ تصور نہیں کیے جاتے تھے یا پھر دانستہ طور پر ان مسائل کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اس کی مثال محمد حسین آزاد کی ترجمہ کی ہوئی تھامس مور کی نظم ''بہار کا آخری پھول''، ضامن کنتوری کے انگریزی نظموں کے متراجم کے مجموعے ''ارمغان فرنگ'' (۱۹۵۱ء) سے دی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال نے دیم کاوپر کی نظمیں ''پرندہ اور جگنو''، ''پرندے کی فریاد''، ''ماں کی تصویر دیکھ کر''، تلوک چند محروم نے بائرن کی نظم ''یونان کے جزیرے'' کو ترجمہ کر کے نئے شعری ساختیے پر غور و فکر کی دعوت دی۔ میرا جی نے ''مشرق ومغرب کے نغمے'' مرتب کر کے اردو شاعری میں نئے فکری دروازے کھولے جبکہ متعدد معرجمین نے ای ای کمنگسن اور ایلین گنزبرگ کی شاعری کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اردو شعریات کو نئے تجربات اور نئے فکری رویوں سے آشنا کیا۔

ترجمے میں صرف معنویت ومتن ہی کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ انسانی ذہن کے اس ''وژن'' کو بھی دریافت کیا جاتا ہے جو اشیاء اور معروض کے اثرات سے معنویت کا یقین کرتے ہوئے قاری کے برتاؤ متن خوانی، ثقافتی اثرات اور مصنف، قاری اور متراجم کی اہلیت اور اس جیسے کئی اہم سوالات اٹھاتی ہے۔ ترجمہ عقل عمومی سے نظریں بچا کر اس بات سے سروکار رکھتا ہے کہ مصنف نے جو بات متن میں بیان کی ہے، وہی قاری تک پہنچائی جائے کیونکہ معروضی حقیقت اصل کتاب یا مسودے کی ہوتی ہے۔ لسان اور الفاظ کو ویسے ہی ترجمہ کی ہوئی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے جو کہ اس کی اصل یا قریب ترین معنویت ہوتی ہے لیکن اصل میں صرف زبان ہی معنویت کا سبب نہیں ہوتی کیونکہ زبان کی نوعیت ایک ساکت مجسمے کی سی ہوتی ہے جس کو معرجم اٹھا کے نئی زبان میں منتقل کر دیتا ہے جبکہ ترجمے کا مزاج متن کے اصل مسودے کا مزاج ہوتا ہے۔ اگر کوئی برقیات کی کسی کتاب کا ترجمہ کرے گا تو اسے ویسی ہی زبان استعمال کرنا ہوگی جو عموماً برقیات کے موضوع کے لئے ہوگی۔ اگر اس موضوع پر ترجمہ کرنے والا شاعرانہ زبان اور الفاظ کا استعمال کرے گا تو یہ ترجمہ کتاب کی اصل فطرت سے مختلف ہی نہ ہوگا بلکہ موضوع کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔ کسی تحریر کا حول ہی زبان کے اس مخصوص ساختیے کو تشکیل دیتا ہے جو ترجمہ ہو کر بھی اسی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے، مترجم کا اظہار ذاتی نہیں بلکہ مبادلیاتی ہوتا ہے جو وہ اصل مسودے سے اخذ کرتا ہے۔ یہی ترجمے کی ساختیاتی حقیقت ہوتی ہے۔ اگر مترجم کے ذہن کی نظریاتی آمیزش اور اس کے تجربات ومشاہدات ترجمے میں در آئیں تو وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ''ماخوذ'' بن جاتا ہے۔ ترجمے میں لسانی مشابہتوں کے علاوہ لسانی نشست و برخاست بھی اس بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ جو جملہ ترجمے کی زد میں آیا ہے اس کے ردّعمل کے طور پر قاری کیا معنی اخذ کرے گا اور اگر ذو معنی ترجمہ ہوا ہو تو اس سے اصل تحریر کے ادراک میں گنجلک پیدا ہو جائے گی۔ ترجمہ کی جانے والی تحریر میں لسانی رشتوں کا جال پھیلا ہوا ہوتا ہے اور یہی تانے بانے ہی معنویت کو دریافت کرتے ہیں۔ مترجم کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ وہ ان میں بین لسانی باریکیوں کو سمجھنے کا تردّد کرے بلکہ اس کی گہرائیوں میں بھی اتر کر تحریر کی اصل روح کو پالینے کی بھی کوشش کرے انہی لسانی رشتوں کی مدد سے ہم علامات، رمزیات، تمثالی پیکروں کی تشکیل کر پاتے ہیں۔ یہی رشتے جو کسی صورت میں ہوں۔ ''سچائی'' کو پالینے میں مددگار ہی نہیں بلکہ حقیقت کے ادراک کے انکشاف میں بھی مددومعاون ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک چیز کو مشاہدہ کر کے ردّ و قبول کے مراحل سے گذرتا ہے یہی کچھ مترجم کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی کتاب کو پڑھ کر اپنے طور کئی قیاسات ترتیب دیتا ہے اور اس کے آگے کی طرف سوچتا ہے۔ یہ اس کا فکری حق تو بنتا ہے لیکن ترجمہ اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ وہ اصل تحریر کو اصل معنویت اور مفاہیم کے ساتھ منتقل کرنے پر زور دیتا ہے۔ قاعدیات کی لسانی تفاوت کے سبب کئی تکنیکی مسائل درآتے ہیں جو ''مکمل'' ترجمے کے تصور کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ محاورات و تشبیہات اور استعاروں کے تمثالی پیکر اردو ترجمے میں بعض دفعہ مسائل کا سبب بنتے ہیں۔ بہت سے عربی اور ہسپانوی محاورے اردو کے روپ میں براہِ راست منتقل نہیں کئے جاسکتے۔ اردو میں زیادہ تر ترجمے انگریزی کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ براہِ راست ترجمے بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر انگریزی اور ہسپانوی قواعدیات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہسپانوی قواعدیات کے اصول انگریزی قواعدیات کے اصولوں سے زیادہ آسان اور عام فہم ہیں۔

ترجمہ اور آفاقی عناصر

ترجمہ جدید لسانی حوالے سے زبان کیا امکانات سے بحث نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں اس بات کی اہلیت ہوتی ہے کہ وہ کلی طور پر کسی تحریر کی پوری فضا کو ایک زبان سے دوسری زبان کی فضا میں ویسے ہی تبدیل کرلے جو کسی ترجمہ کی جانے والی اصل تخلیق کی فضا ہوتی ہے، مترجم کسی آفاقی قواعد کو تشکیل دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ مترجم تو اپنے ہی رائج قواعداتی نظام سے جمالیاتی اظہار اور ترسیل کی تکنیک اخذ کر کے ترجمے کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ترجمے میں کئی اصول آفاقی نوعیت کے ہوتے ہیں جو اصل میں انسانی سائیکی یا مخصوص اساطیر کے شعور سے متاثر ہوتے ہیں لیکن مترجم کو ترجمہ کرتے ہوئے یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ترجمے کے اصولوں کو بیان نہیں کر رہا بلکہ اصل متن سے ترجمہ ہونے والے متن میں ساختیاتی ارتباط کی کرن کو پھوٹتا محسوس کر رہا ہے لیکن یہ ترجمے کے باطن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں موجود تخیلاتی مظہریت ہیں، جن میں تخیلاتی، مظہریاتی اور معاشرتی وظائف (تفاعل) شامل ہیں، جو معنویت کی ساختیاتی خودکاریت تجریدی نظام میں خوداحتسابی کے عمل میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

ذہن اور حقیقت کے مابین ساختیاتی وحدت

بعض دفعہ فقروں کی ساخت یا مکمل جملوں کی قرأت کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے معنی کیا تھے؟ مصنف کا اصل منشا کیا تھا؟ پھر بھی مترجم اس حقیقت کو پالینے کے لئے ادراک کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ وہ ذہن اور حقیقت کے مابین رشتوں کی پیچیدگیوں میں ساختیے کی وحدت تلاش کرتا ہے کیونکہ ثقافتی اور معاشرتی بین العمل کی کیفیت میں ''نشان'' کی اہمیت ہے جو ترجمے کے مظہر کی اصل ہوتی ہے۔ ''نشان'' یعنی رموز اور علامات کا نظام تمام معاشرتی رشتوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اس کا ادراک ہی معنویت کے ابلاغ میں اپنی حرکیات کے سبب شناخت کیا جاسکتا ہے۔ ہر تخلیقی عمل میں کسی نہ کسی طور پر کوئی نہ کوئی نظریات حیات پوشیدہ ہوتا ہے کہیں نظریۂ حیات کی شدت گہری ہوتی ہے کہیں یہ تہذیبی جبر کی صورت میں اُبھرتا ہے جو خاص تخلیقی فکر نہیں ہوتی بلکہ نسل در نسل منتقل ہونے والی وہ ثقافت ہوتی ہے جو ساختیات کے علامتی بین العمل اور لسانی رموز اور اشاروں کی مدد سے نسل در نسل سفر کرتے ہیں۔ نئے ثقافتی نفوذ اور لسانی آمیزش سے اس کو کوئی رنگ عطا کرتے ہیں۔ نظریۂ حیات مدلل بیان کو لسانی حوالے سے بھی ترجمہ کرتا ہے لیکن اصل مسئلہ ''خیال'' ہی ہوتا ہے بغیر خیال کے لسان تشکیل نہیں پاتی اور بغیر لسان کے ترجمہ ناممکن ہے، پھر بھی لسانی ترجیحات کا جبر ترجمے کے عمیق اور سطحی لسانی ساختیے میں انسانی تجربے اور مشاہدے کے اس تفاوت سے بھی دوچار ہوتا ہے جو کہ مصنف اور مترجم کے مابین عدم ذہنی روابط کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو کہ تمدنی احوال سے عدم آگاہی، لسانی عدم آگاہی سے زیادہ پریشان کن ہوتی ہے کیونکہ لغت خوانی کے بعد کسی طور پر زبان کی معنویت کو حاصل کر لینے میں کامیابی تو ہوتی ہے لیکن ثقافتی و معاشرتی حرکیات کو عموماً اس وقت ہی ترجمہ کیا جاسکتا ہے جب مترجم اس کے اصل تجربے سے دوچار ہوا ہو اور ایک ایسی حقیقت کا انکشاف مقامی لسان میں کرے، بلکہ بصیرت اور سچائی کی ترسیل کے عمل میں اصل جوہر کو تلاش کرنے کی سعی کرے ترجمہ دراصل صداقت کی توسیع میں حصہ لیتے ہوئے ان باتوں کو بھی بین السطور میں شامل کردیتا ہے کہ ہم جیسے ایک عرصے سے نظریۂ حیات کا حصہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں جن کا اصل میں کوئی منطقی اور انسانی جواز نہیں ہوتا یعنی ہم جس شعور یا معاشرتی لاشعور کو عمومی اور اجتماعی شکل میں استدلالی تصور کرتے ہیں وہ اصل میں استدلالی نہیں ہوتے۔ ترجمہ عینیت پسند ساختیے سے حقیقت پسند ساختیے میں تبدیل ہوکر کسی تخلیق کی فکری دھاریں بدل دیتا ہے۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ ترجمہ ہو کر کسی تخلیق میں سچائیوں کی نئی پرتوں کا انکشاف ہوتا ہے جس کا اصل کتاب کو پڑھ کر ادراک نہیں ہوتا تو دوسری طرف قاری ترجمے کو قرأت کرتے ہوئے کئی مسائلی ساختوں سے دوچار ہوتا ہے لیکن جب یہ ساختیاتی محرک ردِ تشکیل میں تبدیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جاتا ہے تو یہ جغیاتی رجنی اور بعض دفعہ ادراک کے نت نئے مسائل چھیڑتا ہے۔

ذہنی اور فکری ساختیے میں تفاوت

ترجمہ فکر کے مختلف ہائے نظام کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کا وظیفہ مکمل طور پر انجام نہیں دیتا لیکن کسی حد تک فکری روابط کی صورتیں ضرور پیدا ہوا کرتا ہے مگر ذہنی ساختیہ فکری ساختیے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہوتا ہے۔ ذہنی ردوقبول کے مراحل سے گذر کر ایک حتمی فکری ساختیہ ترتیب دیتا ہے بہر حال ساختیاتی عنصر کے شدید قسم کے اثرات اپنے تجریدی رشتوں سے ترجمے کی معنویت کو ممکن بناتے ہیں لیکن لسانی عوامل ترجمے میں پابند مظہریاتی حرکیات کو جنم دیتے ہیں۔ لسانی زندان کے حصار میں ترجمے کا عمل جاری ساری رہتا ہے لہٰذا مترجم اپنے محدود لسانی استحقاق کے دائرے میں رہ کر اپنی لسانی اور اظہار کی ترجیحات کی درجہ بندی کرتا ہے۔ اشاریت، رموز وعلائم کی ترجمانی درجہ بندی کرتے ہیں مترجم بیان کے سیاق وسباق کے تناظر کو اپنے تصور میں تشکیل دیتا ہے۔ یہ قیاسی قواعدیات کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کا حاصل ہوتا ہے جو اشاروں اور بیان کے مابین کئی رشتوں کو سامنے لاتا ہے، یہ رشتے خاصے عمیق نوعیت کے ہوتے ہیں کیونکہ اس عمل میں مصنف اور مترجم ایک دوسرے سے ابلاغ کرتے ہیں یوں ان دونوں اشخاص کے درمیان مشترکہ میدان (Common Ground) دریافت ہونے کی توسیع کی جاسکتی ہے، یوں دیئے ہوئے معروض کی معنویت میں ارتباط کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اس عمل میں میدان (اصل معروض کی حرکیات کا امتیازی تصور پیش کرتا ہے جو "نشان" کی خودمختاری سے پردہ اٹھاتے ہوئے "نشان" کو ٹھوس معروض کی صورت میں تبدیل کر دینے کے بعد معروض حرکیات "نشان" کا محرک بنتی ہے اور ذہنی جبر، خیال اور موضوعی حوالے سے اپنے چہرے کی تزئین کرتی ہے۔ جس کی مدد سے ہی مترجم معنویت کے احساس کو "فتح" کرتے ہوئے تخلیق کے بنیادی مقبوضات کو دریافت کرتا ہے۔

ترجمے کے عمل میں میدان معنویت اور بیان کی مفہومیت

اس عمل میں ایک قباحت یہ بھی درآتی ہے کہ سکہ بند معنویت فطری طور پر صحیح زبان میں منتقل ہو جاتی ہے لہٰذا کتاب کا واضح ڈھانچہ صوری معروض میں تبدیل ہو کر معنیاتی رسائی کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور مترجم کے ذہن میں کئی زاویۂ نگاہ ابھرتے ہیں۔ "میدان"، "معنویت" اور "بیان" ترجمے میں ایک ہی چیز کے تین مختلف نام ہیں لہٰذا ان میں سے ایک لفظ کو بیان کرنے کے لئے دوسرے اور تیسرے لفظ کو بھی بیان کرنا پڑتا ہے، لفظ سے لفظ کی معنویت کا مبادلہ کیا جاتا ہے تاکہ معروضی حرکیات اور معنیات کا نظام اپنے طور پر رواں دواں رہے۔ معنیاتی حوالے سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترجمے میں معروضی حرکیات کی تفہیمیت کمپوزیشن کے اُفق پر ساختیاتی عملیات سے منسلک ہوتی ہیں، جس میں اصل تجربہ متوقع معروض کے مطلق تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔

معنویت کی تشکیل	میدان	بیان
مترجم کا اظہار	متن	لفظ کو لفظ میں تبدیل کر دینا
معروضی حرکیات	معنیات	
مترجم	موضوعی جبر	

وجودی نقطہ نظر سے ترجمے کا متوقع معروض ''معروض مطلق'' کا ہی حصہ ہوتا ہے جو لسانی تغیر کے ایک مخصوص نظام کو ترتیب دیتا ہے جس کو متنی ساختیہ کہا جاتا ہے۔ لسانی درجہ بندی ایک نئے متنی نظم (Order) کا پتا دیتے ہوئے افتراق کے عمل سے گذر کر معنویت کی مباحث کی ابتدا کرتی ہے کہ کس طرح ترجمہ کے عمل میں تبدیلی کا عنصر اپنا مقام بناتا ہے۔ یہی وابستگی غالب عنصر کی صورت میں اُبھر کر تفہیمیت کے تغیراتی نظریے کو تشکیل دیتی ہے جس کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے، تبدیلی کا یہی تصور وظائف کے باطنی مزاج پر بھی اثر انداز ہوتا ہے جس کو ترجمے کا محرک عنصر کہا جاتا ہے لیکن جب کے عمل میں در آئے ہیں اس میں تعارض کی صورت بھی ابھرنے کے سامنے آ رہی ہے لیکن یہ کوئی منفی وظیفہ نہیں ہوتا کیونکہ تعارض کی یہی صورت حال ترجمانی نظام کے ارتباط کا کلیدی وظیفہ ثابت ہو کر وظائف کی عمومیت میں آلات (Instruments) کی صورت اختیار کر جاتی ہیں لیکن ایک مسئلہ نہایت ہی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ عام لسانی و عمرانیاتی معمولات ادراک کے نظام میں مغایرت کے عنصر کو شامل کر دیتے ہیں۔ یہ مغایرت محض واقعہ تصور اور عملیات کے درمیان تصادم کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے کیونکہ مترجم کی ''خواہش'' اور ''شدت اظہار'' (قوت) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو جاتی ہے، جہاں مترجم اپنے طور پر ترجیحات اور متبادل راہوں کو تشکیل دیتا ہے۔ ارتباط کے مثبت رویوں سے قطع نظر ادراک ترجمے کے تناظر کو ایک بڑے عملی اور تخلیقی حوالے سے بیان نہیں کر پاتا لیکن اصل موضوع ترجمے کے ارتباط میں پائے جانے والے عناصر کی کسی نہ کسی طور پر نفی کرتے ہیں لیکن پھر بھی ترجمے کے عمل میں تبدیلی کا عنصر نظم (Order) کے تصور کو وظائف انتشار کے باعث نظر انداز کرتے ہوئے لسانی کمزوریاں اور اظہار کی مختلف تکنیک سے بھی نظریں چراتی دکھائی دیتی ہیں۔ بیانیہ کا ڈھانچہ عموماً پیچیدہ ہوتا ہے بلکہ ترجمے کے عمل میں بیانیہ ایک ایسا قومی مظہر ہوتا ہے جو تحریر کی معنویت اور ظہور سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شعور سے متن کی معنویت کی وابستگی

فطری ترجیحات اور توجیحات کا مزاج اپنے طور پر اُبھر کر ادراک کی بیانیہ تہہ میں بیٹھ جاتا ہے لیکن نشان کی معنیات ایک معروض کی صورت میں زندہ رہتے ہوئے اختتامی وظیفہ ثابت ہوتی ہے۔ عملیاتی تصور قیاسی بلاغت کا چراغ روشن کرتے ہوئے ترجمے کی تفہیمیت کو ممکن سے ممکن تر بناتا ہے۔ معروض کی معنویت آزادانہ طور پر نشان کے اندر چھپے ہوئے افکار سے پردہ اٹھاتی ہے جو الفاظ اشیاء کی فطرت سے اخذ کیے جاتے اور لسانی معروض چہرہ نمائی کر کے کسی بھی شے کا تصور خلق کرتے ہیں لہٰذا مترجم کے یہاں زبان تصور کے پردے سے غائب ہو کر معنی اور مفاہیم سے رابطہ کرتی ہے یوں زبان پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ زبان معنویت کی صداقت کو متعارف کروا کر مترجم کی مڈبھیڑ کی تکرار عناصر سے کرا دیتی ہے اس مقام پر متن کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جبکہ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ الفاظ کے درمیان مترجم جس قسم کی حقیقت تلاش کر رہا ہوتا ہے وہ ابہام کا شکار ہو جاتی ہے۔ مترجم کے یہاں متن کی معنویت شعور سے وابستہ ہوتی ہے لیکن مفاہیم کی آگاہی کے بغیر ترجمہ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ یہی ترجمے کی ساخت کی بھی تزئین کرتے ہیں۔

نئی ترجماتی ساخت کا ظہور

اصل مسودے کا مواد اور بنیادی ساخت اپنے تخلیقی یا تنقیدی متن کے تصور کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اس کی شناخت کے لئے مترجم کو زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑتا کیونکہ اصل مسودے کے بنیادی مقالے کا خلاصہ وہ ایک دو قرأت کے بعد پا لیتا ہے۔ جب متن ترجمہ ہو جاتا ہے تو قریب، لیکن پھر بھی متن کا ''اصل خیال'' کامیاب ترجمہ میں خاصی حد تک اپنی اصل صورت میں منتقل ہو جاتا ہے جو درحقیقت متن کے ساختیاتی نظام کے باطن میں پوشیدہ وہ رشتے ہوتے ہیں جو آپس میں ارتباط کے عمل سے گذر کر معنویت کو واضح کرتے ہیں۔ اس مقام پر آ کر کئی بار اس قسم کے مواقع آتے ہیں کہ مترجم کو متن میں کئی ایسی قوتیں نظر آنے لگتی ہیں جو متن کو رد کر رہی ہوتی ہیں، وہ خساب بس بھی ہو جاتا ہے اس کو متن کی تشریح کرنے یا اس میں اضافہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ عمل مترجم کے لئے بے تنی صورت حال پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ معنی کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے اصل تحریر میں پوشیدہ تمدنی، عمرانیاتی اور فکری نظام کی حیثیت محض معروضات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ترجمے کا کلیدی عمل کسی مخصوص نظام کا محتاج نہیں ہوتا، مترجم متن کے اصل مقدمے کو تبدیل نہیں کرتا۔ قاری ترجمے کی قرأت کے بعد تجزیہ کرتا ہے یا وہ ائل یا واردات کے سلسلے میں اثبات یا عدم اثبات کی باریکیوں میں اترتا ہے تو اس کا رابطہ مترجم سے نہیں بلکہ اصل لکھنے والے سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اصل تحریر کا متن ابہام کے پردے میں پوشیدہ ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض تصانیف چیستان بن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لسانی عوامل مصنف پر ہی نہیں بلکہ مترجم کے عمل میں بھی جبر کی صورت میں اثرانداز ہوتے ہیں اور یہ لسانی جبر مصنف یا مترجم کو آہنی حصار میں گرفتار کر دیتا ہے لہٰذا مترجم کو متن کے بہاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے متن کی وجہ بندی کر کے جزوی نمونے تشکیل دینے پڑتے ہیں تاکہ متن کی شناخت ممکن ہو لیکن مترجم متن میں مقید معنویت کو پا لینے کے بعد اس حالت میں نہیں ہوتا کہ اسے رد کرے یا وکالت کرے، کیونکہ عموماً متن کی لسانی بدیعیات ترجمے کی معنویت کی بساط پلٹنا چاہتی ہے۔ مترجم کو ترجمہ کرتے ہوئے جگہ جگہ خیال آتا ہے کہ اصل متن اس طور پر ترجمہ نہیں ہو رہا جیسے ہونا چاہیے، یہ اس سبب ہوتا ہے کہ اسے ''خیال دیگر'' کی فضا اپنے اطراف کھڑی ہوتی نظر آتی ہے کیونکہ مصنف اپنی تحریر کے بعد ''نرگسیت'' کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ اس قسم کی ''نرگسیت'' مترجم کو نہیں ہوتی، مترجم نرگسیت شکن ہوتا ہے لیکن وہ مصنف کی نرگسیت کو اس کی حد تک ہی محدود رکھتا ہے اور متن کے اصل جوہر کو بہتر طور پر اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔۔

ترجمے کے لسانی ساختیے کی پیچیدہ صورتحال

لسانی ساختیہ ترجمے کے عمل میں انتشار کا باعث ہوتا ہے کیونکہ زبان کی فطرت ایک طرف پیچیدہ ہوتی ہے تو دوسری طرف زبان کا مزاج کئی ذیلی پوشیدہ صورتوں میں اپنی معنویت اور مفہوم مختلف ہوتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے کو بھی تشکیل دیتی ہے یہ مخصوص لہجہ ایک زبان کی مختلف مقامی شاخوں میں مغائرت کے سبب کو کمزور بناتی ہے لہٰذا مترجم ان ساختیاتی وظائفی لسانی رشتوں کے تانے بانے سے واقفیت رکھتے ہوئے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جو ذیلی ثقافتوں کی زبانوں کو جاننے والا بھی سمجھ سکے اور ترجمے سے محظوظ ہو سکے۔

قاری اور ترجمہ شدہ متن

مترجم کو دو تمدنی دنیاؤں کے درمیان خود کو معلق کر کے ترجمے کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہوتا ہے، اس کو کئی جبروں کو خوش آمدید کہنا پڑتا ہے اور کئی کڑوی گولیوں کو ہضم کر کے اپنے قاری تک اظہار کی کوئی ایسی راہ نکالنی پڑتی ہے جو ان کٹھن مراحل سے گذر کر قاری کو ترجمہ کی ہوئی تحریر پڑھنے پر اکساتی ہے بلکہ اس کی معنویت میں قاری خود شامل ہو کر اپنے شعور کی مدد سے کئی اہم نکات کا انکشاف کرتا ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ مصنف کی جس بات کو مترجم بیان کر رہا ہے وہی بات صحیح ہو، فکری وسعت کا یہی نکتہ مترجم قاری کو منتقل کرنے کے بعد عموماً منظر سے غائب ہو جاتا ہے، اب قاری پر منحصر ہے کہ وہ کس انداز سے ترجمے کی قرأت کر رہا ہے اور اس کی اپنی فکر اور حسیت کے حوالے سے کتنے گہرائی سے قرأت کے عمل میں سے گذر رہا ہے۔ متن کے معروضی تجربے سے کئی موضوعی نکات ابھرتے ہیں،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معروض اور موضوع کے اس سنگم پر ایک خام قسم کا تخلیقی عنصر ابھرتا ہے جو مزید غور و فکر کے بعد کسی اہم تنقیدی یا تخلیقی جہت کی نشاندہی کرتا ہے لیکن یہ تب ہی ممکن ہوتا ہے جب قاری ترجمہ شدہ متن کو سنجیدگی سے پڑھے اس لئے کہ قاری کا کردار ہی متن کی معنویت کو وسعت دینے کا سبب بنتا ہے۔ قاری کا عنصر کسی ترجمے کے متن کو روشن کرتے ہوئے اپنے طور پر مفاہیم و معنویت سے رجوع کرتا ہے جس کا خاص کر اس کے ذہن میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے لیکن یہاں بھی لسانی تضادات کا پیچیدہ اور اذیت ناک عمل سر اٹھاتا ہے خاص طور پر انگریزی، جرمن، فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی زبانوں کے کئی الفاظ اس وجہ سے اردو میں منتقل نہیں ہو پاتے اور ان کے مترادفات اردو زبان کی لغت یا عام بول چال میں نہیں مل پاتے۔ لہٰذا اکثر و بیشتر مترجمین کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ تخلیق کا ترجمہ لفظ بہ لفظ کر دیا جائے۔ مترجم سوچتا ہے کہ اس کو سلیس یا عام فہم بنانا اس کا کام نہیں چونکہ اردو کا ذخیرۂ الفاظ محدود ہے لہٰذا متن کو لغوی سطح پر ادھر اُدھر کر دیا جاتا ہے جس میں قاری کو بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ ترجمہ چیستان بن کے رہ جاتا ہے۔ کچھ مترجم یہ کرتے ہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیتے ہیں۔ لیکن بہت سے متنازعہ مفاہیم کو حاشیہ دے کر بیان کر دیتے ہیں یہ خلوص نیتی اچھی چیز ہے لیکن اس سے قرأت کی روانی کو جھٹکے لگتے ہیں، سوچ کے تسلسل کا عمل بار بار ٹوٹ کر انتشار کا شکار ہو جاتا ہے، حاشیہ بندی اور اصل متن کے درمیان فکر کے رشتے آپس میں جڑ نہیں پاتے۔ اس قسم کے مترجم اپنے طور پر محض رابطے کا کام کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ قاری مصنف سے براہ راست تعلق قائم کر لے۔ اس تکنیک سے ذراہٹ کر بعض مترجم یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح متن کا مفہوم قاری تک پہنچ جائے۔ الفاظ کے اجتماعی ترجمے وہ آزادی کے ساتھ لفظیات سے انحراف کرتے ہوئے مفہومیت کی اساس بناتے ہیں اور دلکش پیراؤں میں بیان کرتے ہیں جس کی مثال ٹامس مور کی نظم The Night of Other Days جس کو اسی انداز میں نادر کاکوروی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہی کچھ مسئلہ نظم طباطبائی کے معروف ترجمے ''گورغریباں'' کے ساتھ بھی ہے۔ جہاں تک شاعری کے ترجمے کا تعلق ہے یہ بہت ہی نازک ہوتا ہے۔ سموئیل جانسن نے لکھا ہے کہ ''شاعری ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی۔'' لیکن شعر کو ترجمہ کرتے ہوئے بہت سے مترجم اسی شعری تکنیک کو اپناتے ہیں۔ یعنی شعر کا شعر میں ترجمہ کر دیتے ہیں (اس کی بہترین مثال میراجی کے ترجمے ہیں) زمانے کے ساتھ ساتھ کئی مترجمین اس تکنیک کو خیر باد کر چکے ہیں۔ ان ترجموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ طریقہ کار پرانا ہو چکا ہے لہٰذا شاعری کو شاعری میں ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی شاعری کے ترجمے میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اس میں مترجم کی ذات شامل ہو جاتی ہے، ہر مترجم ایک ہی نظم کا ترجمہ ''ساز مغرب'' کی دوسری جلد میں موجود ہے، جن کی ایک نظم ''نابینا پھول والی کا گیت'' کو پانچ مختلف مترجمین نے مختلف طور پر ترجمہ کیا ہے جس میں نظم کا سراپا، تخیلات، آہنگ، بحر اور جمالیات کے عناصر خاصے مختلف ہیں لیکن فضا قریب قریب یکساں ہے۔ ترجمے میں اظہار کی ترسیل تو ہو جاتی ہے لیکن درجہ بندی کے اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کس ترجمے کو فوقیت دی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے۔نظم کے پہلے شعر کے پانچ مختلف تراجم دیکھیں:

لوگوں میرے پھول خریدو
کہتی ہوں عجز سے پھول خریدو
(محمد حسین آزاد)

لوگوں چلو مرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو
(سرور جہاں آبادی)

خریدو پھول میرے لینے والو
ذرا ان بہاروں کا مزا لو
(آشک بلند شہری)

میں پھول بیچنے لائی ہوں لو، پری زادو
بن آنکھ والی سے ان کو نجات دلوادو
(سید محمد ابراہیم اشک)

گو وہی مالن کے ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول
(احسن لکھنوی)

ان تراجم کو دیکھ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ انگریزی زبان کی استعداد اور تربیت ان مترجمین کو کس حد تک ہے؟ آزاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صرف واجبی سی انگریزی جانتے تھے جبکہ دیگر مترجمین کے متعلق بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان سب کی بھی انگریزی کی استعداد نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے ہر مترجم نے اپنے مزاج کے تحت نظم کو ترجمہ کر ڈالا۔ مختلف اجزاء کو وحدت کی شکل دے کر ترجمے کے سانچے کو دریافت کر لیا گیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے زبان کئی تضادات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی الفاظ اختیار کرتی ہے جس سے مفاہیم کی تفہیم ہو جائے لہٰذا مترجم کا ذہن شعری ترجمے کے سانچے کو تشکیل دیتا ہے۔ اوپر دیئے ہوئے پانچوں ترجموں میں شعر کا مفہوم کا ابلاغ ہو جاتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ''اندھی مالن پھول فروخت کرنا چاہتی ہے۔'' اس سے قطع نظر کہ تمام مترجمین کا شعری ذوق اعلیٰ درجے کا ہے، شعر کے مزاج سے تو وہ سب واقف ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ انگریزی کے لسانی ڈھانچے اور اس کی قواعدیاتی باریکیوں سے مترجمین کو واقفیت نہیں لہٰذا اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لسانی ساختیاتی نفوذ سے انحراف

اپنی زبان میں کسی متن کو ڈھالنے کا فن بہت کم مترجمین کو آتا ہے۔اس مجبوری اور کمزوری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مترجمین لسانی سانچے کی باطنی حرکیات سے واقف نہیں ہوتے کہ وہ جس زبان سے ترجمہ کر رہے ہوتے ہیں اس زبان کے اندر کئی لہجے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔مفہوم اور متوقع تفہیم زبان میں موجود الفاظ اپنی معنویت کے خود حامل ہوتے ہیں کیونکہ الفاظ کا باہمی رشتہ ہی ترجمے کے نظام کو مستحکم بناتے ہیں۔یہ تمام کا تمام عمل صرف اور صرف کسی حد تک پیچیدہ لسانی نظام کی وجہ سے سامنے آتا ہے اور مترجم شعوری یا لاشعوری طور پر الفاظ کے پیچھے چھپی ہوئی معنویت کو بھی باہر نکال کر قاری کو بھی اپنی قرأت میں شامل کر لیتا ہے۔مترجم کو اس سلسلے میں وسیع القلب ہونا چاہئے کہ ترجمہ کی جانے والی زبان کو قاری ویسی ہی دلچسپی سے پڑھے جیسے وہ اپنی زبان پڑھتا ہے، ورنہ مغائرت کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور ترجمہ ہونے والی زبان کا جبر مترجم پر حاوی ہو کر کمزور قسم کے ترجمے کا سبب بنتا ہے جس کو ''ترجماتی خودکشی'' کہا جاتا ہے۔لسانی ساختیاتی نفوذ سے انحراف اور محض خارجی سج دھج سے متاثر ہو کر مترجم کبھی بھی کامیاب ترجمہ نہیں کر پاتا۔

متن کی تمدنی فضا سے مترجم کی آگہی

بسا اوقات مترجم کی ذاتی پسند ہی ترجمے کا سبب بنتی ہے۔بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیقی اور تنقیدی میدان میں ناکام انسان ترجمے راغب ہوتے ہیں۔وہ جو ایک عرصے سے کہا جا رہا ہے کہ بگڑا ہوا افسانہ نگار نقاد بن جاتا ہے۔یہ بات تو اب ضرب المثل بن چکی ہے۔اب تک یہ بات اس سے بھی آگے تک چلی گئی ہے کہ بگڑا ہوا نقاد مترجم بن جاتا ہے۔خیر یہ تو تفریح کی بات ہے اصل میں ترجمے کے لئے یہ تصور کیا گیا ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر دسترس حاصل ہو۔یہی نہیں بلکہ متن کی اصل تمدنی فضا سے بھی وہ کسی حد تک آگاہ ہو۔یہی خرابی اردو تراجم میں بعض دفعہ شدید قسم کے مغالطے پیدا کرتی ہے۔اردو تراجم میں تو یہاں تک ہوتا آیا ہے کہ مصنفین کے ناموں کا تلفظ بھی غلط ہوتا ہے یا دانشور قسم کے مترجم ناموں کے تلفظ کے گورکھ دھندے میں پڑ کر بہت کچھ کھو دیتے ہیں اور صلاحیتوں کو غلط سمت پر ڈال کر خود تو پریشان ہوتے ہی ہیں، قاری کو بھی الجھا دیتے ہیں۔مثلاً اردو والے انگریزی کے حوالے سے مصنفین کے نام اردو میں منتقل کر دیتے ہیں جبکہ کوئی شخص جو تھوڑی بہت بھی جرمن، فرانسیسی یا ہسپانوی یا کوئی اور زبان جانتا ہے فوراً تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس کو ایسا لکھا جائے۔ابھی تک ہم یہ طے نہیں کو پائے کہ سارتر کو سارتر، کامیو کو کامو، ہرل کو ہوسرل، جاسپر کو یاسپر، رکیو کو ریکوع، بریخت کو بریشت لکھیں کہ نہیں۔یا کونسا نام اردو میں لکھا جائے۔اس بات کا شکوہ منیر الدین احمد نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔انھوں نے ایک مترجم سے شکایت کی ہے کہ وہ نظمیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں سمجھ پارہا۔اور جرمن زبان سے مترجم کو شدبد نہیں ہے۔انھوں نے جرمن زبان کی شاعرہ انگے ماخ من کی ایک نظم کا اصل متن سے موزانہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مترجم نسیم شاہد نے شاعرہ کا نام انغ بورگ بشمین لکھا ہے جس کا تلفظ غلط ہے۔منیر الدین احمد نے اردو مترجم کے تراجم کا موازنہ پیش کیا ہے۔جس میں نظم کے عنوان تک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔نسیم نے نظم کے ترجمے میں اپنی طرف سے بہت کچھ ردو بدل کر دیا۔

''سایہ''

ہم گلابوں کے طوفان میں گھر جاتے ہیں
تو کانٹے
رات کی تاریکی کو مزید گہرا کر دیتے ہیں
ان ٹہنیوں پر خاموش رہنے والے پتے
ہماری ایڑیوں تلے آکر
آسمان کو سر پر اٹھا لیتے ہیں

(ترجمہ: نسیم شاہد)

''گلابوں کی بارش''

گلابوں کی جھری میں ہم جس طرح بھی رُخ پھیرتے ہیں
رات کو کانٹوں سے منور کر رکھا ہے اور پتوں کی
گھن گرج، جو جھاڑیوں میں اتنی مدھر تھی
اب ہمارے تعاقب میں ہے۔

(ترجمہ: منیر الدین احمد)

(ادب لطیف، لاہور، دسمبر ۹۰ء، ص ۱۲۴۔۱۲۵)

اردو میں زیادہ تر ترجمے انگریزی کی وساطت ہوئے ہیں، بہت کم تراجم ایسے ملیں گے جو براہ راست کئے گئے ہوں۔اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اردو کے عالمی فکر کا ادب کے سلسلے میں جو بھی حوالہ بنتا ہے وہ نوآبادیاتی نوعیت کا ہے۔اردو کے بعد لوگوں کی قریب ترین جو زبان ہے وہ انگریزی ہے اور مبادلے کا لسانی سیاق بھی انگریزی زدہ ہے۔مثال کے طور پر جب ٹیگور کو ادبیات کا نوبیل انعام ملا تو ''گیتا نجلی'' کے شمولہ گیتوں کے تراجم ہندوستانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زبانوں میں کئے گئے۔ اس زمانے میں گیتوں کے درجنوں تراجم بنگالی سے ہندی میں ہوئے جبکہ اردو میں زیادہ تر تراجم بنگالی سے نہیں بلکہ انگریزی کی وساطت سے ہوئے، جو برصغیر کے کئی اردو رسائل کے علاوہ مرحوم رسالوں ''مست قلندر''، ''لطف شباب'' اور ''مستانہ جوگی'' (یہ تینوں رسالے لاہور سے شائع ہوتے تھے) میں شائع ہوتے رہے (مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ کریں ''آنند، ستیہ پال، ساؤتھ جرنل اسٹڈیز آف لٹریری اسٹڈی تھرڈ کوارٹر ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۲ تا ۱۲۳)

ترجمہ شدہ متن ساخت میں اصل کے حوالے سے تھوڑا بہت فرق ضرور آجاتا ہے لیکن جب ترجمہ در ترجمہ ہوتو مسئلہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے مترجمین متن کے بنیادی مفہوم کو سمجھے بغیر صرف ترجمہ کر دیتے ہیں جو کہ سراسر علمی اور ادبی بدیانتی ہے۔ ترجمہ کرنے سے پہلے متن کے اصل مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ متن کی فضا سمجھ میں آجانے کے بعد اچھے مترجم اس فضا کو اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔

مترجم کا تمام کا تمام عمل موتیت کے رویوں کی نفی کرتا ہے کیونکہ ترجمانی عمل میں مترجم کا عمل دخل بحیثیت فرد کے مصنف سے مغائرت کی نوعیت کا ہوتا ہے لیکن مترجم کا تخلیق سے اصل تعلق ہوتا ہے کیونکہ اس کا واسطہ ترجمے کے متنی ساختیے کے علاوہ تخلیق کی نامیاتی ساختیاتی فضا سے بھی ہوتا ہے۔ اس دوہرے ساختیاتی عمل میں مترجم اور مصنف کا بین العمل ''حقیقی'' کم اور علامتی بین العمل نوعیت کا زیادہ ہو جاتا ہے۔ ترجمے کے اختیاطی یا روایتی اصول تجریدی ہیں اور دوسری جانب ساختیاتی موتیت کا تمام کا تمام ڈھانچہ لسانی ثقافتی افتراق اور لسانی رموز، دو نامیاتی وحدتوں یا دو افراد کے درمیان ابہام اور مغالطوں کا سبب بنتا ہے۔ ترجمے کی ساختیات متن کی لسانی مکانیت کی تفہیم کا بھی فن ہے، جو ساختیے کی علامتی و رموزی فضا میں رچ کر سماجیانے، ساختیانے اور ترجمیانے کی تکون تشکیل دیتے ہوئے کسی نئی تخلیق (ترجمے) میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

پس منظر اور ماخذات

احمد فخری ''دو تراجم'' رسالہ اردو، انجمن ترقی اردو (دکن) اکتوبر ۱۹۲۹ء، ص ۵۹۳ تا ۶۰۹

ظ۔ انصاری ''ترجمے کے بنیادی مسائل'' ادب لطیف، لاہور، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۹ تا ۱۱

منیر الدین احمد ''ترجمے کے آداب'' ادب لطیف، لاہور، دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۹

محمد حسن عسکری ''گر ترجمہ سے فائدہ اخفائے حال ہے'' ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۴ء

صلاح الدین احمد (مولانا) ''میراجی کے چند منظوم تراجم'' ادبی دنیا، لاہور، ۱۹۵۵ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

REFFERNECES

Alisson, David b., "The difference of translation", 177 - 190 in silverman, Hugh J. (Ed.) the textural sublime: Deconstruction and its differences. Albany: State University of New york Rress, 1990 274pp.

Anand, Satya Pal, "Traslation in Translingual Context: A study of Togore's GEETANJLI in multiple Hindi and Urdu versions" South Asian Journal of Literature Studies, Bombay, 3rd Quarterly 1979. vIII (3) pp 12-123.

Bassnett, Susan, "Beyond Translation", New Comparision: A Journal of comparative and General Literary Studies, 1989 Autumn V8 p. 1098.

Fischer, Michael M.J., Abedi, Mehdi "Translating Quar'anic Dialogues: Islamic Poetics and Politiex for Muslims and for us." Translation Perspective 1990 V5p. 111-129.

Gaun, Hexin, "Cultural Difference and Untranslatibility", Waiguoyu, 1990 DEc. V (70)p. 66-69.

Jordan, Albert, "Translation and Interculture Understanding",

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Bulletin de 1'ACLA/Bulletin of the CAAL fall VII (2) 1990.

Li, Miqling, "Styles of Translation", Waiguoyu 1990, Apr. V2 (66)p. 51-42, 62.

Lash, Scott, post Structuralism and post Modernist Sociology, An Elgar Reference Collection, Brookfield, Vermonth 05036, U.S.A.

Nida, Eugene A., "Theories of Translation", Waiguoyu, 1980, Dec. V6 (64) P. 2-B.

Niran Jana, Tejaswini, Sitting Translation: History, post Structuralism and Colonial Context, University of California Press 1992.

Rabassa, Gregory, (Introduction), "The World of Translation, PEN American Centre.

Ross, Stephen David "Translation As Transgression", Translation Perspective, 1990 V5. 25-42.

Schmidt, Denis J., "Hermeneutics and Literature Three", The Literary Critertion 1990 V25 (3) P. 1, 12.

☆☆☆

(مشمولہ "ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید"، دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۹ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بین المتنیت اور ترجمہ

ڈاکٹر فاخرہ نورین

بین المتنیت کی اصطلاح ایک فرانسیسی ماہر لسانیات جولیا کرسٹیوا سے آئی۔ بین المتنیت ایک متن کے اندر دوسرے متن کی موجودگی ہے۔ یہ موجودگی ترکیب، صورتِ حال، جملے، اقتباس اور تاثر کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے میڈیم آف آرٹ کی لفظی عکاسی کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔ مثلاً کسی ناول میں کسی مجسمے یا تصویر کی لفظی صورت گری، فلم ڈرامے یا گیت کا حوالہ، نظم یا شعر کا تذکرہ، یہ سب بین المتنیت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسکی مثالوں میں انگریزی کے نامور شاعر کیٹس کی شہرہ آفاق نظم "Ode On a Grecian Urn"، اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ، جان ملٹن کی فردوسِ گم گشتہ، ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ وغیرہ شامل ہیں۔

اردو میں چونکہ یہ اصطلاح نہ ہونے کی حد تک مستعمل ہے اور ترجمے کے نظری مباحث پر موجود کتب اس سے قطعی نا آشنا ہیں لہٰذا اس باب میں راقمہ نے انگریزی زبان سے تین مضامین کی مدد لی ہے، ان مضامین کی مدد سے بین المتنیت کی مختلف اقسام اور اشکال، بین المتنیت کے وظائف اور اثرات، ترجمے کے مسائل اور انکے حل کی حکمتِ عملیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین میں

1 -"Translation and Discourse" by Tim Ennis

2-"Intertextuality in Literature,Film, and other popular Media:Intermediality and signs relation" by Stephen Awung

3-"Whatis intertextuality" by Tracy Lemaster

شامل ہیں۔ اس موضوع پر پڑھتے ہوئے راقمہ کو اس نظریے میں ٹی ایس ایلیٹ کے مضمون "Tradition and Individual Ta ent" اور اسرائیلی عالم زوہر کی پولی سسٹم تھیوری کی جھلک محسوس ہوئی، لہٰذا زوہر کی کتاب 'Poly System Studies" سے استفادے کا موقع بھی ملا۔ اس باب میں ان دو ناقدین سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی خوشہ چینی کی گئی ہے تاکہ راقمہ اپنی بات کی وضاحت بہتر طریقے سے کر سکے۔

بین المتنیت کی تعریف اور تعارف:

بین المتنیت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ان تعریفوں کو آسان زبان میں یوں تحریر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) بین المتنیت کسی بھی ادبی، فنی یا سماجی متن میں کسی دوسرے ادبی، فنی یا سماجی متن کی موجودگی یا اسکی موجودگی کا اشارہ ہے۔گویا کسی کتاب میں دوسری کتاب، میڈیا، یا سماجی کتاب کا حوالہ کتاب کا عنوان، اقتباس، یا محض اس کی طرف اشارہ بین المتنیت کہلائے گا۔یہ کتاب، فلم، ڈرامہ، سماجی واقعہ اس زبان اور معاشرے کا بھی ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے ملک، زبان یا سماج سے بھی لیا جا سکتا ہے۔

(۲) کوئی بھی متن دوسرے متون کے اقتباسات، اقوال یا حوالوں کو ترتیب دے کر یا انکے انجذاب کے بعد وجود میں آتا ہے۔یہ انجذاب دو صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اولاً پہلے سے موجود حقیقت یا خیال کی حقیقی یا متنی صورت کی نقل کی جاتی ہے۔یعنی پہلے سے موجود اور مستحکم خیالات اور نظریات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ثانیاً، اقوال یا اقتباسات کی شکل میں پہلے سے موجود خیالات وافکار کو متن میں بعینہ نقل کر دیا جاتا ہے۔بعض متون میں اقتباسات کو واوین میں درج کر کے انکی علیحدہ شناخت کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور بعض اوقات واوین نہیں لگائے جاتے جسکی بناء پر قاری اگر پہلے سے واقف نہ ہو تو اقتباسات کو بھی متن کا حصہ ہی سمجھنے لگتا ہے۔

(۳) متن دراصل کسی مصنف کے دائرہ علم اور مشاہدے میں اسکے اپنے تصورات کی آمیزش سے وجود میں آتا ہے۔مصنف کوئی ایسی چیز یا بات تحریر نہیں کر سکتا جو اس نے پہلے سے پڑھی، دیکھی، سنی یا مشاہدہ نہ کی ہو۔ہر متن میں اپنے سے پہلے کے متون کی بازگشت اور اپنے بعد آنے والے متون کی جہات پوشیدہ ہوتی ہیں۔کسی متن کی مکمل تفہیم کے لئے اس میں موجود تمام حوالوں کی تفہیم ضروری ہے۔ایسا نہ ہونے کی صورت میں متن کی جزوی تفہیم ہو پائے گی۔

ان تعریفوں کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متن کی مکمل تفہیم قاری کے لئے بھی اتنی آسان، پھر مترجم جو نہ صرف متن کا قاری بلکہ اسکا باز تخلیق کار بھی ہوتا ہے، اسکے لئے متن کے اندر موجود متون کو پہچاننا اور انکی تفہیم کے بعد ترجمے میں کامیابی سے منتقل کرنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔اس باب کے آغاز میں راقمہ نے ٹی ایس ایلیٹ اور ژو ہر کے پولی سسٹم کا تذکرہ کیا تھا، بین المتنیت کی تعریفوں کو پڑھتے ہوئے یقیناً ان دو ناقدین کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کے نظریہ روایت کے مطابق ناقدین کسی شاعر کے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے اپنی پوری طاقت اسکی انفرادیت اور ایسے پہلوؤں کی تلاش میں صرف کرتے ہیں جو اسے اپنے پیش روؤں اور خصوصاً ہم عصروں سے ممتاز قرار دے سکیں۔ناقدین مصنف کی اپنی شخصیت اور انفرادیت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ٹی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایس ایلیٹ کے نزدیک یہ ایک تعصب ہے اور اس سے نجات حاصل کر کے دیکھیں تو کسی شاعر کی فنی پختگی کے دور کی تحریروں میں سب سے زیادہ اسکے پیش روؤں کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس اصول کا اطلاق اسکی تحریر کے ان حصوں پر خاص طور پر کیا جا سکتا ہے جس کو ناقدین اسکی انفرادیت قرار دے رہے ہوں۔(۱)

اسی مضمون میں آگے چل کر ٹی ایس ایلیٹ لکھتے ہیں" کسی شاعر، کسی بھی فن سے متعلق فنکار کے تنہا اپنے کوئی معانی نہیں ہوتے۔ اسکی اہمیت، اسکی ستائش مردہ شاعروں اور فنکاروں سے اس کے تعلق کی ستائش ہوتی ہے۔ اسکی قدر پیمائی تنہا نہیں کی جا سکتی؛ آپکو موازنے اور مقابلے کے لئے اسے مرحومین کے درمیان رکھنا پڑے گا"(۲)

گویا کسی بھی مصنف شاعر یا فنکار کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے معاصرین اور پیش روؤں سے الگ راہ نکال سکے۔ اس ضمن میں ہم اس بچے کو یاد کر سکتے ہیں جو باپ کے کندھوں پر بیٹھ کر میلہ دیکھنے جاتا ہے۔ اسکے قد کی لمبائی میں اسکے والد کے قد کی لمبائی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ لہٰذا کسی متن کی خوانی میں یہ امر ذہن سے نہیں نکلنا چاہئے کہ اس میں موجود دیگر متون کی مختلف صورتیں پہچانی جائیں۔ مترجم کی مشکلات اور کسی متن کے ناقابلِ ترجمہ ہونے کے امکانات بین المتنیت کی بدولت بڑھ جاتے ہیں۔

زوہر کے پولی سسٹم کے مطابق ادب کوئی تنہا وحدت نہیں ہے بلکہ یہ ایک پورے ادبی نظام کا اثر پذیر اور تاثر پذیر محرک حصہ ہے۔ اس پر اثر انداز ہونے اور اس سے اثر قبول کرنے والے اثرات معاشرتی، ادبی، ثقافتی اور تاریخی پہلو کے حامل ہیں۔ ادب نہ تو کسی خلا میں تخلیق ہوتا ہے نہ مصنف اپنے گردوپیش سے بیگانہ رہ سکتا ہے۔ جب ہم کسی متن کی علاقائیت اور عالمگیریت پر بات کرتے ہیں تو ہماری مراد یہی علائق اور اثرات ہوتے ہیں۔ ادبی سطح پر دخل اندازی ادبی تاریخ کا حصہ رہی ہے۔ کسی مقام پر بھی دخل اندازی کو روکا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ ایک غیر ارادی اور غیر شعوری عمل ہے۔ خود مصنف آگاہ نہیں ہو پاتا کہ ادبی تاریخ یا اسکا پڑھا ہوا ادب کیسے اسکی تحریر کا حصہ بن جاتا ہے۔ ادبی دخل اندازی سے زوہر کی مراد کوئی سے دو ادب کے مابین تعلق ہے۔ ترجمہ خاص طور پر اس دخل اندازی کا فعال حصہ ہے۔(۳)

بین المتنیت کی نوعیت کو اب سمجھ لینے کے بعد ضروری ہے کہ اسکی اقسام پر تھوڑی روشنی ڈالی جائے۔

بین المتنیت کی اقسام:

بین المتنیت کی دو اقسام یا صورتیں ہیں۔(۴)

۱۔ افقی یا عمودی بین المتنیت

۲۔ بین یا ترکیبی بین المتنیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان دونوں اقسام کے لئے اگر چہ مختلف اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں لیکن ان کی نوعیت یا معانی میں فرق نہیں تھا، دیگر اصطلاحات سے مراد بھی یہی اقسام یا صورتیں تھیں لہٰذا میں نے یہ اصطلاحات ٹم اینس (Tim Ennis) سے مستعار لے لیں۔ ان اقسام کی مزید تفصیل درجِ ذیل ہے۔

۱۔ افقی یا عمودی بین المتنیت

کسی متن میں دوسرے متن کی واضح موجودگی جسے سمجھنے کے لئے زیادہ غور وفکر کی ضرورت نہ ہو۔ یہ کسی کتاب سے متاثر ہو کر اسکے تسلسل کے طور پر لکھی گئی، یا کسی کتاب کے جواب میں اسکے رد یا تصحیح واعتراض کے لئے لکھی گئی کتاب ہو سکتی ہے۔ عموماً یہ اکادمیاتی یا تحقیقی وتنقیدی کتب کی صورت میں ہوتا ہے۔ مرزا غالب کی قاطع برہان، اور سر سید احمد خان کے خطبات احمدیہ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ کسی ایک ادبی متن میں کسی دوسری کتاب یا ادبی متن کا مختصر یا تفصیلی ذکر اور حوالہ بین المتنیت کی عمودی شکل ہے جبکہ کسی متن کے کسی ایک حصے، منظر یا کہانی کا خلاصہ بیان کرنا افقی صورت ہے۔

۲۔ بین یا ترکیبی بین المتنیت

کسی ادبی متن میں دوسرے ادبی متن کے اقتباسات اور اقوال کا نقل کیا جانا اس امر کا اعتراف ہے کہ مصنف نے دوسرے متن سے واضح استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ ایک متن میں دوسرے متن کی موجودگی اور دخل اندازی کی وہ صورت ہے جس میں عموماً مصنف واوین کے ذریعے قاری پر واضح کر دیتا ہے کہ اس نے کہاں سے خوشہ چینی کی ہے۔ یہ صورت اپنے پیش روؤں کی موجودگی کو قبول کرنے کی شعوری کوشش بھی ہے اور انکی دخل اندازی کے ناگزیر ہونے کا اعتراف بھی۔

متن میں ترکیبی بین المتنیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ زبان اور ادب میں روایت کے تصور کو سامنے رکھا جائے۔ ہر مصنف اور ادیب اس ادبی اور لسانی روایت کا خوشہ چین ہوتا ہے۔ ترکیب سازی ہو یا خیالات وافکار میں جدت کا معاملہ، روایت کے حوالے اور سہارے کے بغیر وہ تن تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بین المتنیت کے وظائف کیا ہیں؟ Tracy Lemaster نے ان وظائف کو تین نکات کے تحت بیان کیا ہے۔ (۵)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ا۔موازنہ

بین المتنیت ایک متن کے اندر دوسرے متن کی واضح موجودگی کی صورت میں بنیادی اور ثانوی متن کے درمیان موازنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ثانوی متن کو اصل شکل میں پڑھ کر قاری یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ بنیادی متن کے مصنف نے متن کو کس حد تک اصل شکل میں پیش کیا یا اس میں کیا کیا تبدیلیاں کی ہیں۔بین المتنیت اپنی نوعیت کے اعتبار سے دومتون میں مقابلے اور موازنے کا ذریعہ بنتی ہے۔اس موازنے اور مقابلے سے دومتون میں اشتراکات اور اختلافات متعین کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔مکالمہ

بین المتنیت دومتون کے مابین مکالمہ بھی ہے کیونکہ دونوں متون اپنی انفرادی حیثیت میں بنیادی متن ہوتے ہیں۔چونکہ ایک متن میں دوسرے متن کا حوالہ کسی اشتراک یا اختلاف کی صورت میں دیا جاتا ہے لہٰذا دونوں متون کا بیانیہ باہم کلام کرتا ہے۔دونوں بیانیوں کے اختلاف کی صورت میں قاری کے پاس دونوں میں سے بہتر یا برتر بیانیے کی تلاش کا موقع ہوتا ہے۔یوں دومتن ایک دوسرے سے اختلافی مکالمہ کرتے ہیں۔

۳۔عدم استحکام

قاری اگر ثانوی متن سے واقف ہو اور اسکی تفہیم پہلے سے موجود ہو،تو ممکن ہے بین المتنیت اسکی اس تفہیم کو عدم استحکام کا شکار کردے۔ممکن ہے جس متن کو قاری نے محض سطحی اور سپاٹ بیانیے کی شکل میں پڑھا ہو وہ ایک اعلیٰ درجے کی علامتی حیثیت میں سامنے آئے۔بین المتنیت کی صورت میں متن کی پرانی تفہیم میں تبدیلی یا اس میں وسعت آجاتی ہے۔بعض اوقات بنیادی متن میں جاری بیانیہ اس دوسرے متن کی دخل اندازی کی بدولت متاثر ہوتا ہے اور اس کی تفہیم آسان نہیں رہتی۔

بین المتنیت ،یعنی متن میں دوسرے متن کی آمد اور اور موجودگی کی تعریف اور وظائف کے تعین کے بعد اب ضروری ہے کہ ترجمے کے عمل میں بین المتنیت کی بدولت حائل مشکلات کا جائزہ لیا جائے۔

بین المتنیت اور ترجمے کی مشکلات

اس کتاب میں راقمہ نے قاری کی اہمیت پر بارہا بات کی ہے لہٰذا اس کو بار بار دہرانے کی ضرورت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں۔ترجمے کا مقصد قاری کی تفہیم بھی ہے اور بین المتنیت اصل متن کی تفہیم میں بھی مشکل پیدا کرتی ہے۔ضروری نہیں کہ ماخذ زبان کا قاری بھی متن میں بین المتنیت کی ہرصورت کو پہچانتا اور سمجھتا ہو۔ہدفی زبان کے قاری کے لئے متن کے اندر موجود متون کو پہچاننا اور انکی تفہیم کے قابل ہوسکنا بہت ضروری ہے۔یہاں آکر مترجم کو لسانی مسائل کے ساتھ ساتھ تہذیبی مسائل سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔اس موقع پر مساویت کی تکنیک بھی استعمال کی جاسکتی ہے لیکن اگر ثقافتی اور تہذیبی فرق بہت زیادہ ہوگا تو مساویت ممکن نہیں ہو پائے گی۔

مترجم کی حکمتِ عملی

بین المتنیت سے پیدا ہونے والی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مونا بیکر نے پانچ حکمت عملیاں بتائی ہیں۔(٦)

١۔ لغوی ترجمہ
٢۔ ثقافتی متبادل کی فراہمی
٣۔ متن یا حاشیے میں وضاحت
٤۔ تخریج (omission)
٥۔ اصل زبان کے اظہارات کی ترجمے میں منتقلی

ان تمام حکمت عملیوں پرعمل کے بعد بھی یہ ممکن ہے کہ ترجمہ ہونے والا متن اصل سے اتنا دور جا پڑے کہ خود مصنف کے لئے پہچاننا مشکل ہو جائے۔نیز ہر مترجم کے لئے اس درجے کی علمی و ذہنی مشقت ممکن بھی نہیں۔مترجم اگر پیشہ ور ہے تو اسکی روزی روٹی ترجمے کے ساتھ جڑی ہے۔مترجمین کا عمومی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ پیشہ ورانہ سطح پر کام کریں تو گھنٹوں بیٹھ کر ایک اظہار اور طرزِ اظہار کو منتقل کرنے اور متبادل ڈھونڈنے کی سعی نہیں کریں گے کیونکہ ایک قابلِ خوانی، رواں اور آسان اسلوب کا حامل متن تیار کرنا انکا مقصد ہوتا ہے۔بنیادی طور پر یہ قاری کی سہولت اور ظاہر ہے خود قاری کی اپنی سہولت کے لئے ہوتا ہے۔ایسے تراجم محض پیسہ کمانے کا ذریعہ اور قاری کی گمراہی کا سبب بن جاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات

1. Eliot,T.S,"Tradition and Individual Talent",Perspecta Vol.19 p.36

2. Eliot p .37

3 .Zohar,Evan Itemar,"Polysystem Studies" Poetics Today 1990,p 53-70

4.Ennis,Tim,"Translation and Discourse", M.A Translation Studies,Question 5,p.3

5.Lemaster,Tracy,"What is "Intertextuality"?",Great World Texts:A Programm of the Center for the Humanities,University of Wisconsin,2012, p.1

6.Baker,Mona," In Other Words:A Coursebook on Translation",London:Routledge,p.71-77 and 228-243

☆☆☆

(مشمولہ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محمد ابوبکر فاروقی یونیورسٹی آف گجرات میں اُردو ادبیات کے استاد ہیں۔ وہ پچھلے پانچ برسوں سے تعلیم و تدریس کے شعبہ سے منسلک ہیں اور ان دنوں منہاج یونیورسٹی لاہور میں پی۔ایچ ڈی کے اسکالر بھی ہیں۔ ترجمہ اب وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے اس لیے ترجمہ کے فن پر اُردو میں پچھلے کچھ سالوں سے ناقدین اور ماہرین نے نہ صرف مختلف مباحث اُٹھائے بلکہ ان پر غور و فکر بھی جاری رکھا۔ محمد ابوبکر فاروقی نے اسی ضرورت کے تحت اپنی اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔

''تراجم کے مباحث'' میں انہوں نے تراجم سے متعلق اُن نایاب مقالات کو مرتب کر دیا ہے جو اب مارکیٹ میں آسانی سے دستیاب نہیں تھے۔ ان کے ساتھ کچھ ایسے مقالات بھی جو مختلف رسائل میں حالیہ برسوں میں شائع ہوئے مگر کسی اور ترجمہ کے حوالے سے مرتب کردہ کتاب میں جگہ نہ پا سکے، وہ بھی یہاں شامل کر لیے گئے ہیں۔ ہم، محمد ابوبکر فاروقی کو اس اہم کام پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ماریہ تبسم